# دل کے رستے دُشوار بہت تھے

سلویٰ علی بٹ

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فرمانِ پاک ہے۔

''جو تمہیں دکھ دے، اسے چھوڑ دو۔ مگر جسے چھوڑ دو، اُسے دکھ نہ دو۔''

رات کے تین بجے کا عمل تھا۔ کمرے میں زیرو پاور کے بلب کی غیر واضح سی روشنی اور سرد سی خاموشی تھی۔

ساری کائنات، ہُو کے عالم میں ڈوبی ہوئی لگ رہی تھی۔ رات کے اس پہر وہ گم صم، شعور سے بے گانہ، جاگتے ہوئے تیسری رات بِتا رہا تھا۔ نیند بہت بے کل سی اُس کی کھلی آنکھوں کو بند کرنے کے لئے کروٹیں بدل رہی تھی۔ مگر اُس کے ماتم کناں وجود کا نیند اور سکون سے رابطہ ٹوٹ چکا تھا۔ اس کے کئے گئے پختہ ارادے، سجائے گئے خواب، لا حاصل کا دکھ اُس کے اندر بین ڈال رہے تھے۔ متضاد سوچوں کی آماجگاہ بنا بوجھل اور بھاری سر اُس نے بمشکل اُٹھایا۔

خالی خالی آنکھوں سے خود اپنے ہاتھوں سے اُجاڑے ہوئے کمرے کا حلیہ اجنبیت سے دیکھا۔ بیڈ کی چادر دوہری ہو کر آدھی کارپٹ پر رُل رہی تھی۔ بیڈ اور نیچے کارپٹ پہ سارے بے بسی اور مایوسی سے پھاڑے گئے تکیوں کی رُوئی، مدھم روشنی میں برف باری کے نرم گداز گولوں کے رقص کرنے کا منظر پیش کر رہی تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل پہ دھری پرفیومز کٹ، اسپرے، کلون، ہیئر برش، لوشن وغیرہ کی سب بوتلیں زمین پر زور سے پٹخنے سے ٹوٹ چکی تھیں یا یونہی اِدھر اُدھر لڑھک گئی تھیں۔ اس نے ان دنوں میں بے تحاشا اسموکنگ کی تھی۔ حالانکہ وہ سگریٹ پینے کا عادی نہیں تھا۔ ایش ٹرے، سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھر گیا تھا۔ گلاس ٹیبل، جا بجا راکھ سے اٹا تھا۔

کمرے کا جائزہ لے کر اُس نے سر کو دائیں سے بائیں جھٹکا۔ اپنے پژمردہ اور تھکن سے بھرے وجود میں بہت سی ہمت مجتمع کرتا وہ اپنے گھٹنے پر ہاتھ کا بوجھ ڈالتا اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کا جوڑ جوڑ دُکھ رہا تھا۔ ملگجی روشنی میں بکھری چیزوں کو مزید قدموں تلے روندتا وہ

ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ کافی دیر وہ بے یقینی سے آئینے میں اپنے عکس کو تکتا رہا، پھر بلا ارادہ ہی وہ اپنی دونوں کھلی ہتھیلیوں سے گالوں کو رگڑنے لگا۔

غیر محسوس انداز میں وہ کسی ذہنی مریض کی طرح یہ عمل بار بار دہرا رہا تھا، جیسے اُسے کسی اور کے چہرے کا گمان ہو۔ ایسے کرتے ہوئے اُسے اپنے ہاتھ کے زخم کا بھی احساس نہیں تھا، جس پر اس نے بینڈیج کی تھی۔ اس کی دونوں ہتھیلیاں چکنی سی ہو گئیں۔ اس نے چہرے کو آئینے کے مزید قریب لے جا کر غور سے دیکھا۔ گھنے بال خاصے اُلجھے ہوئے تھے۔ اس کا ہلکا سانولا رنگ، سیاہی مائل لگ رہا تھا۔ آنکھوں کے پپوٹے رت جگے اور زیادہ اسموکنگ کی وجہ سے سُوجے ہوئے تھے۔ آنکھیں بے تحاشا سرخ اور ہونٹ سیاہ ہو چکے تھے۔ اُس کے جسم پر تین دن پرانے کپڑے تھے۔ اُسے یاد آیا کہ وہ تین دن سے بھوکا ہے۔ ہر زاویے سے اپنا جائزہ لینے کے بعد وہ میکانکی انداز میں وارڈروب کی طرف بڑھ گیا۔ ہینگر میں لٹکتے کپڑوں کو تنقیدی نظروں سے اُلٹتے پلٹتے اُس نے سیاہ شلوار قمیض منتخب کر لیا۔

شاور پوری رفتار سے کھولے وہ ٹھنڈے یخ پانی کے نیچے پندرہ منٹ کھڑا رہا تھا۔ ایک طویل باتھ لے کے وہ باہر آیا۔ باتھ کے بعد بھوک کا احساس شدت سے جاگا تھا۔ کچن فریج میں رات کا بنا کھانا پڑا تھا۔ کھانے کے ڈونگے دیکھتے ہی اس کا جی پھر سے اُچاٹ ہو گیا۔ ہاتھ میں پکڑا ڈونگا واپس رکھ کر اس نے دودھ کا ڈبہ نکال لیا اور چائے بنانے لگا۔ اس دوران اس کے ذہن میں کتنی ہی یادیں اُبھرنے لگی تھیں۔ کسی کا وجود، باتیں، قہقہے، چھیڑ چھاڑ اُسے خود سے بے گانہ کرنے لگے۔ ان تکلیف دہ سوچوں سے فرار پانے کے لئے اس نے برنر کی آنچ تیز کر دی۔

دھیان بٹانے کے لئے وہ بلا وجہ ہی کیبن کھول کھول کر بند کرنے لگا۔ ایک کیبن میں بسکٹ کا پیکٹ نظر آنے پر اس نے اُٹھا لیا۔

چائے کے سپ بھرتے اُس کا سامنے دھری بسکٹ کی پلیٹ پر یا تو دھیان نہیں گیا تھا، یا پھر وہ کھانا نہیں چاہ رہا تھا۔

خالی دل.....

خالی دماغ.....

خالی جسم.....

اور خالی روح!



چائے کے آخری گھونٹ تک ان الفاظ کی گردان اُس کے ذہن میں چلتی رہی۔ اچانک کسی کی یاد اُس کے اندر اُبھری۔ وہ جلدی سے مگ رکھ کر بکھری چیزوں کو مزید بکھیرتا اپنا موبائل ڈھونڈنے لگا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد موبائل اُسے مل گیا۔ اس شخصیت سے بات کرنے کے لئے شاید بڑا حوصلہ درکار تھا۔ اُس نے اپنے اندر کی گھٹن کو باہر نکالنے کے لئے کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیئے اور نمبر ڈائل کرنے لگا۔

☆☆☆

اُس نے بہت آہستگی سے وزنی لکڑی کا بھاری دروازہ دھکیل کر کھولا۔ اُس کی ماں نے بتایا تھا کہ اس کا بیٹا اندر سو رہا ہے، وہ اس سے آخری بار ملنے آئی تھی۔ اُس کا دل چاہا کہ کاش! وہ جاگ رہا ہوتا، وہ اُس سے چند باتیں کر لیتی۔ مگر یہ بھی شکر تھا کہ وہ سو رہا تھا۔ اگر وہ جاگ رہا ہوتا تو اس سے سوال و جواب کرتا، جانے نہ دیتا۔ جبکہ اُس کے پاس کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔ اس نے تو بڑی ہی ہمت سے قسمت کی چال کو ہموار کیا تھا۔ مگر زندگی ہمیں وہی دیتی ہے، جو قسمت میں لکھا جا چکا ہو۔ اور قسمت، لوح پر محفوظ الفاظ سے پھرتی ہے۔

دھیرج سے قدم اُٹھاتی، ہیل کی آواز پیدا کئے بغیر وہ سنگل بیڈ پہ محوِ خواب بچے کے سرہانے آ بیٹھی۔ بچے نے سینے تک کمبل اوڑھا تھا۔ ایک ہاتھ کان کے نیچے رکھے وہ گہری نیند میں تھا۔

کتنے ہی لمحے وہ معصوم فرشتے سے نظریں نہ ہٹا پائی۔ حتیٰ کہ اُس کی آنکھوں میں نمی اُترنے لگی۔ اُس نے بہت ڈرتے ڈرتے اپنا سفید مرمریں ہاتھ اُس کے سیاہ ریشم جیسے ماتھے پہ بکھرے بالوں میں پھیرا۔ بالوں کو سنوارتی وہ کہیں کھو سی گئی۔ اُس کی اُنگلیاں سرکتی ہوئی آنکھوں پہ آ رُکیں۔ بچے کی آنکھیں بالکل اپنے باپ جیسی تھیں۔ ویسی ہی چمک اور ذہانت سے بھرپور۔ چھوٹی سی کھڑی ناک، گلابی مائل ادھ کھلے ہونٹ، جن سے موتیوں کے مانند شفاف دانت ہلکی سی جھلک دکھلا رہے تھے۔ سوتے میں اُس کے ادھ کھلے ہونٹوں سے نکلتی گرم تپش، غیر محسوس انداز میں چھوتے اس کے ہاتھ کو بھی گرما رہی تھی۔

یہ بچہ اُس کا سات سال کا بیٹا، اُس کا خواب تھا جس کی تعبیر کے لئے اُس نے جو رشتہ چنا تھا، تھوڑی دُور جا کے ہی ناہموار اور دُشوار گزار ہو گیا تھا۔ واپسی بھی ممکن نہیں رہی تھی مگر اب اسے چلتے ہی رہنا تھا، چاہے کتنی ہی کھائیاں آتیں۔ اُس کے گال، آنسوؤں سے بھیگ رہے تھے۔ اپنی ممتا کی آگ کو بجھانے کے لئے وہ اُسے جھک کر

چومنے لگی۔ ابھی وہ مکمل سیراب بھی نہ ہو پائی کہ اُس کی ماں دروازے پہ آ کھڑی ہوئی۔

''یہ اُٹھ جائے گا۔'' اس نے محتاط انداز میں اُسے احساس دلایا۔ جس کا مطلب تھا، اب اُسے مزید بچے کے پاس رُکنا نہیں چاہئے۔

اس نے شفقت سے بچے کو چھوتے، دُھندلائی آنکھوں سے ماں کو دیکھا۔ اُس کا بے قرار دل، بیٹے کو سینے سے بھینچ لینے کو چاہ رہا تھا۔ اُس کی ماں نے آگے بڑھ کر اسے کندھوں سے تھام کر اٹھا دیا۔ اسے نواسے کے اُٹھ جانے کا خدشہ بہت زیادہ تھا، جسے سنبھالنا اس کے لئے مشکل ترین ہوتا تھا۔ اپنی بیٹی کے جذبات کی اُسے قطعاً پروا نہیں تھی۔ دروازے میں رُک کر اُس نے اپنے لختِ جگر پر تپتی الوداعی نظر ڈالی اور اپنے کٹتے جگر کے ساتھ باہر آ گئی۔

بیرونی برآمدے کے ستون کے پاس زنک کلر کے پینٹ کوٹ میں ملبوس سگار کے کش لگاتا، بارُعب پرسنالٹی والا شخص اُس کا منتظر تھا۔ اُس کے چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ جیسے اُس کے انتظار سے کوفت میں مبتلا ہو۔ اپنی ماں سے گلے مل کر اس نے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے ہی تھے کہ پھر بند کر لئے۔ اس کے حلق میں آنسوؤں کے گولے پھنس رہے تھے۔ ماں نے دلاسا دینے کے لئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس سے زیادہ وہ کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی۔ یوں بھی اسے اپنی بیٹی کی اس قدر بے قراری سے چڑ تھی۔

''آر یُو گوئنگ ماما؟'' ابھی وہ ستون کے پاس کھڑے شخص کے قریب پہنچی ہی تھی کہ اس آواز نے اُٹھتا اگلا قدم روک لیا۔

آسمانی رنگ کے گاؤن میں ملبوس، آنکھوں میں نیند کی ہلکی ہلکی سرخی اور آواز میں ناراضی نمایاں تھی۔

اس کے پاس بیٹے کے سوال کا جواب، جھوٹ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ جس ماں نے اپنی اولاد کو سات سال تک راست گوئی کا سبق پڑھایا ہو، خود اپنے پڑھائے سے انحراف کرنا کتنا مشکل تھا۔ وہ ہاں یا ناں میں سر بھی نہ ہلا پائی۔

اس کے برابر کھڑے شخص نے ناگواری سے بچے کو دیکھا۔

''ماما! آپ نے لاسٹ ٹائم پرمس کیا تھا کہ مجھے ساتھ لے کر جائیں گی۔'' اُس نے ماں کا کہا دُہرایا۔ ''میں، آپ کے ساتھ جاؤں گا۔ مجھے نانو کے پاس نہیں رہنا۔'' وہ بھاگتا ہوا اماں کے پاس پہنچا اور مضبوطی سے ہاتھ دبوچ لیا۔

''میں نیکسٹ ٹائم، آپ کو ضرور ساتھ لے جاؤں گی۔'' اپنے اُمڈتے آنسوؤں کو



روکتے، خود کو مضبوط بناتے اس نے بیٹے سے زیادہ اپنے آپ کو تسلی دی۔

''آپ جھوٹ بول رہی ہیں ماما!'' اس نے گلوگیر لہجے میں ضدی پن سے کہا۔

''ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ، ماما کی جان!''

بیٹے کی نم آنکھیں دیکھ کر اس کا سارا حوصلہ ڈھے گیا تھا۔ اس نے ننھے ہاتھوں کو باری باری چوما۔

اُس کی ماں اور بیزار شخص نے کوفت سے ماں، بیٹے کے التفات کو دیکھا اور پھر ایک دوسرے کو۔

''نو..... نیور ماما!..... میں آپ کو کہیں نہیں جانے دوں گا۔ آپ ان انکل سے بولیں کہ یہ یہاں اسے چلے جائیں۔ آپ میرے ساتھ رہیں گی، جیسے ہم پہلے رہتے تھے۔''

وہ کسی صورت بھی آج بہلنے والا نہیں تھا۔ وہ پچھلے کافی عرصہ سے تھوڑی دیر کے لئے آتی اور جلد واپس لوٹ جاتی۔ ابھی اُسے یہ خبر نہیں تھی کہ اب ماں دنوں کے لئے نہیں، سالوں کے لئے دُور ہو رہی ہے۔

''اب کی بار جانے دو، پھر میں ہمیشہ کے لئے آپ کے پاس آ جاؤں گی۔ ہم دونوں اکٹھے رہیں گے، کھیلیں گے، باتیں کریں گے، بہت کچھ.....''

بیٹے کو بہلانے کے لئے اُسے جھوٹ کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ وہ اپنا وعدہ کبھی بھی ایفا نہیں کر سکے گی۔''

''ہمیں دیر ہو رہی ہے۔'' اس نے اپنے پیچھے مرد کی سرد سی آواز سنی۔

موقع کی نزاکت سمجھتے ہوئے کب سے چپ کھڑی اُس کی ماں آگے بڑھی اور مضبوطی سے نواسے کو بازو سے پکڑ لیا۔ ایسا وہ اپنی بیٹی کی ہر بار واپسی پہ کرتی تھی۔

اُس شخص کے ماتھے کے بلوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے بے بسی سے بیٹے کے ہاتھ چھوڑ دیئے۔

''چھوڑیں نانو! مجھے..... دُور ہٹو..... مجھے ماما کے پاس جانا ہے۔'' اُس نے مچلتے ہوئے نانی سے اپنے آپ کو چھڑانا چاہا۔ بیرونی گیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے وہ مسلسل روتے ہوئے، بیٹے کو تڑپتا دیکھ رہی تھی۔

''ڈونٹ پلیز ماما!..... چھوڑیں نانو! مجھے۔'' وہ نانی کی بانہوں میں بری طرح مچل رہا تھا۔

وہ دونوں ماں بیٹا، ایک جیسی بے بسی میں جکڑے ہوئے تھے۔

نانی نے مضبوطی سے اُسے دبوچ کر اندر گھسیٹنا شروع کر دیا تھا۔ اُس کی ماں بھی روتی ہوئی، گیٹ پار کر گئی۔

جس کی واپسی پھر کبھی نہ ہوئی۔

☆☆☆

اُس نے لکڑی کا بوسیدہ، سیلن زدہ دروازہ دھیرے سے کھولا، جس کی چنگاٹھ کو دیمک چاٹ گئی تھی۔ اس چنگاٹھ (چوکھٹ) کے اندرونی دونوں اطراف میں اینٹوں کے سہارے سے دروازہ کھڑا تھا، جس کا بیرونی کنڈا کسی زمانے کی یادگار بن چکا تھا۔ اس مکان کے واحد مکین کے خیال میں یہاں ایسا کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا، جسے کھو کر وہ ملال میں گھرتی۔ اس کے گھر کے دروازے کے ساتھ ہی سے چھوٹی سی کچی مٹی کی دیوار شروع ہو جاتی، جس کے کہیں کہیں سے اوپری حصے لوگوں کے دیوار کے اس پار کودنے سے اُکھڑ گئے تھے۔ یہ قبرستان کی دیوار تھی، جس کا کچھ حصہ پے در پے بارشوں سے ڈھے گیا تھا۔ دیوار چھوٹی ہونے کی وجہ سے قبرستان کا اندرونی منظر، باہر کھڑے ہو کر بھی دیکھا جا سکتا تھا۔ قبرستان کی پکی سڑک کے اس طرف کالونی آباد تھی، جہاں سے رات کو چور، چوری کرنے کے بعد آسانی سے اس طرف کود کر اپنا بچاؤ کر لیتے۔ بہت سے لوگ باہر کھڑے ہو کر فاتحہ خوانی کرتے۔

وہ بہت سست روی کے ساتھ دیوار کے ساتھ چلتی جا رہی تھی۔ بڑی سی سیاہ کھلی چادر، پیروں میں مٹی سے اٹی پلاسٹک کی چپل، چادر سے سیاہ و سفید کھچڑی نما بال نظر آ رہے تھے۔ چہرے پر جھریوں نے وقت سے پہلے ہی اپنے نشان چھوڑ دیئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں زیادہ دیر دیکھتے رہنا ممکن نہیں تھا۔ کبھی یہ آنکھیں بہت خوب صورت رہی ہوں گی۔ مگر اب اُن میں خالی پن، اُداس سی وحشیانہ جھلک تھی۔

اُس کے ایک ہاتھ میں پیتل کا پرانا سا جگ تھا، جس کی چمک گھس گھس کر اُتر چکی تھی۔ دوسرے ہاتھ سے وہ بار بار ڈھلکتی چادر درست کرتی جاتی۔ اور ہمیشہ کی طرح اِدھر اُدھر دیکھنے کے بجائے دیوار کے ساتھ سوئے ہوئے کتوں کو خالی نظروں سے دیکھا۔ قبرستان کے اندر داخل ہونے کے لئے ایک لوہے کا جنگلا تھا۔ اس جنگلے کے دائیں طرف سبز رنگ کی ترپال بچھا کر لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کی ترپال پہ گلاب کے پھولوں، لڑیوں اور موتیے کے ہار اور پتیوں کی الگ الگ ڈھیریاں تھیں۔ جنگلے کے بائیں طرف پانی کی ٹونٹی لگی ہوئی تھی، جہاں سے لوگ پانی بھر کر قبروں پہ چھڑکاؤ کرتے۔ وہ پھولوں والے لڑکے



کے پاس آ کر رک گئی۔ وہ کئی سالوں سے روزانہ قبرستان جاتی تھی، مگر ہمیشہ پھول لے کر۔ کبھی خالی ہاتھ نہ گئی۔ اس نے اپنی سیاہ چادر کے پلو کی گانٹھ میں بندھا ہوا پانچ روپے کا سکہ کھولا اور چودہ پندرہ سال کے لڑکے کی طرف بڑھا دیا۔ دو سال پہلے تک اس ترپال پہ لڑکے کا باپ بیٹھا کرتا تھا۔ پھر اس نے کہیں اور ٹھیلا لگا کر یہ جگہ اپنے بیٹے کو دے دی۔ اس نے پانچ کا سکہ بچے کی طرف بڑھایا، جسے اس نے چمکتی آنکھوں اور مسکراتے ہونٹوں سے لینے سے انکار کر دیا۔

یہ انکار اس بچے کے باپ کا بھی معمول تھا۔ وہ بھی اس عورت سے پیسے نہیں لیتا تھا اور بیٹے کو بھی یہی نصیحت کی تھی۔ وہ بھی ہمیشہ سکہ ضرور دیتی تھی، جیسے اُسے یقین ہو کہ ایک دن وہ پیسے پکڑ لے گا۔ اُس نے پیسے واپس باندھ کر کھلی سیاہ چادر کا دامن پھول سے بھرنے کے لئے پھیلا دیا۔ بچے نے دامن میں اونچی ڈھیری سے دو ہتھیلیاں بھر بھر کے گلاب کی پتیاں ڈال دیں۔ چادر کو مضبوطی سے سینے کے ساتھ لگائے اُس کی آنکھوں میں تشکر بھری ممنونیت تھی۔ اس نے قریبی ٹونٹی سے پیتل کے جگ میں پانی بھرا اور جنگلے کو دھکیل کر دیوار کے پاس چلی گئی، جہاں اُس کی قیمتی متاع ابدی نیند سو چکی تھی۔

☆☆☆

موبائل کی مسلسل ہوتی بیپ نے اسے گہری نیند سے جگایا تھا۔ کسلمندی سے ہلتے اُس نے آنکھیں کھولے بغیر اندازاً اپنا بستر ٹٹولنا شروع کر دیا۔ مگر موبائل وہاں ہوتا تو ملتا۔ چیختی بیل سے تنگ آ کر اس نے نیند سے بھری آنکھیں بمشکل کھول کر اپنے اطراف میں نظر دوڑائی اور بیڈ کراؤن پر وائبریٹ ہوتے، نیچے گرنے کو تیار موبائل کو اٹھا لیا۔

''ہاں، کیا تکلیف ہے تمہیں صبح صبح؟''

نمبر دیکھے بغیر بھی وہ جانتی تھی کہ اسے تنگ کرنے والا ایک ہی شخص ہے۔

''خدا کا خوف کرو، ساڑھے گیارہ ہو گئے ہیں، تم صبح کہہ رہی ہو۔ یہاں لوگوں نے اپنی آدھی دیہاڑی بھی لگا لی ہے۔'' اس کی آواز سنتے ہی وہ شروع ہو گیا تھا۔

''کیا تم نے داڑھی لگا لی ہے، مگر کیوں؟ کل تک تو تمہاری شیو تھی۔''

غنودگی میں ڈوبے ذہن نے الفاظ کو اور ہی رنگ دے دیا تھا۔ جبکہ دوسری طرف ارسل کے قہقہے نے اُس کے سوئے ہوئے حواس کو یک دم الرٹ کر دیا۔

''کیوں فون کیا ہے؟'' اس نے دانت پیسے۔

''تمہیں ویکنگ کال دی ہے۔ اب اُٹھو اور جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ساڑھے بارہ

بجے تک مجھے لنچ پہ ملو۔" ارسل نے اسے وجہ بتائی، جسے جاننے کے باوجود بھی وہ روز پوچھتی تھی۔

"تم نے کیا قسم کھا رکھی ہے، روز میرے ساتھ لنچ کرنے کی؟"

وہ اس کی نیند خراب کرتا تھا تو وہ بھی اسے تپائے بغیر اتنی جلدی اس کا کہا نہیں مانتی تھی۔

"چلو ٹھیک ہے، تم کل مجھے جوائن کر لینا۔ فی الوقت میں اپنے آفس کی کسی ورکنگ گرل سے کام چلا لیتا ہوں۔ کیونکہ تم تو جانتی ہو، مجھ سے لنچ کسی کی کمپنی کے بغیر نہیں کیا جاتا۔" جان بوجھ کر لاپروائی سے کہتے اس نے کافی عجلت دکھائی تھی۔

"ارسلن! تمہارا زندہ رہنے کا ارادہ ہے کہ نہیں؟" اس کے سیل فون آف کرنے کے خیال سے اس نے تیزی سے پوچھا۔

"مرتو میں چکا ہوں، تم پہ۔ اب ساتھ نہیں دو گی تو مجھے تو اِدھر اُدھر منہ ماری کرنا پڑے گی۔" وہ بڑی معصومیت سے کہہ رہا تھا۔

"آ لینے دو مجھے۔ تمہارا منہ ہی توڑ دینا ہے میں نے۔ بچو گے نہیں تم۔"

چبا چبا کر کہتے اس نے فون بند کر دیا تھا اور سستی سے اُٹھ بیٹھی۔

☆☆☆

ساڑھے گیارہ بجے اس نے پورچ میں گاڑی کھڑی کر کے اندر قدم رکھا تھا تو ابھی تک سارے گھر میں خاموشی اور نیند کا غلبہ چھایا تھا۔ گھر میں نوکروں کے علاوہ اسے ملا کر کُل پانچ افراد تھے۔ ایک اُس کی محبوب چہیتی بیوی ماہم، دو کیوٹ سے ٹوئنز بیٹے اور ایک لاڈلی سالی، شاہم۔ بچوں کی دیکھ بھال کے لئے گورنس تھی۔ باقی وہ دونوں ابھی تک سو رہی تھیں۔

اُس کی شادی کو تقریباً چار سال ہو چکے تھے۔ مگر پہلے دن سے لے کر آج تک اُس کی یہی روٹین تھی کہ صبح وہ ناشتے کے بغیر تیار ہو کر گھر سے نکل جاتا اور پھر گیارہ، ساڑھے گیارہ کے قریب گھر آ کر ماہم کو اُٹھاتا اور دونوں مل کر ناشتہ کرتے۔

بیڈروم میں پردے برابر ہونے کی وجہ سے ابھی تک اندھیرا تھا، جسے اُس نے لائٹ جلا کر دُور کیا۔ بیڈ کے وسط میں بے خبر سوتی ماہم کو مسکرا کر دیکھا اور بیڈ پہ ایک ٹانگ چڑھا کے بیٹھ گیا۔

"ماہی، ماہی پلیز! اُٹھو ناں۔ کتنا وقت ہو گیا ہے؟" اُس کے ایک ہاتھ کو اپنائیت



سے پکڑے دوسرے ہاتھ سے اس نے کندھا ہلایا۔

ماہم کو وقت سے کیا لینا دینا تھا، جو وہ حساب کتاب رکھتی۔

"ماہی! اُٹھو یار..... بہت بھوک لگی ہے۔" اس نے مزید قریب ہوتے اُس کے چہرے پہ بکھرے بالوں کو نرمی سے ہٹایا۔

اُس کے لہجے میں اپنی بیوی کے لئے مٹھاس گھلی ہوئی تھی۔ اُس کی پکار میں محبت بہت واضح تھی۔

"نہیں منصور! ابھی نہیں پلیز۔"

اُس نے ہلکا سا کسمساتے ہوئے غنودگی میں ڈوبی آواز میں صاف انکار کر دیا۔

"جلدی اُٹھو یار! مجھے واپس بھی جانا ہے۔"

اُس کے انکار کو خاطر میں نہ لاتے وہ اُس کا گال تھپک کر بولا۔

ماہم کے یہ لاڈ، نخرے روز کا معمول تھے۔ منصور عادی تھا۔ روزانہ اُسے جگانے میں پندرہ بیس منٹ ضائع کرتا۔

"نہیں، میری نیند ابھی پوری نہیں ہوئی۔" کہنے کے ساتھ ہی اُس نے سر مزید تکیے میں گھسیڑ لیا۔ ماہم کی آنا کانی، جانے کتنی دیر اور جاری رہتی۔ مگر منصور نے اسے بازو سے پکڑ کر اُٹھا دیا۔

"پلیز منصور! آپ بارہ بجے آیا کریں۔"

چہرے سے بال سمیٹتے وہ اپنی نیند پوری نہ ہونے پر روہانسی ہو رہی تھی۔

اسے منصور کی اس عادت سے بہت چڑ تھی۔ وہ اُس کی ہر بات مانتا تھا۔ یہ واحد امر تھا، جس میں وہ اُس کی بات سنی ان سنی کر دیتا۔ اُس کا بس چلتا تو وہ لنچ بھی گھر آ کر کرتا۔ اُس کے چپل پہن کر واش روم میں جانے تک وہ وہیں کھڑا رہا تھا۔ جب تک وہ فارغ ہو کر باہر آئی، وہ ٹیبل کا جائزہ لے کر آ چکا تھا۔

منصور کے ساتھ چلتے ہوئے اس نے خود سے چھوٹی بہن شاہم کے دروازے پر بھی دستک دی۔

"شاہم! بریک فاسٹ اِز ریڈی۔ پلیز کم۔"

منصور نے اُس کے لئے کرسی سیٹ کی اور اس کے بیٹھنے کے بعد خود بھی بیٹھ گیا۔

"بچوں نے ناشتہ کر لیا؟" دودھ کا جگ رکھتی ماجدہ نے اس سے پوچھا۔

"جی صاحب!"

''ماہی! تم نیند کچھ زیادہ ہی نہیں لینے لگی؟'' اس کے لئے بریڈ پیس پر جیم لگاتے منصور نے پوچھا۔ آج کل اسے ماہم کو اُٹھانے میں کافی دقت پیش آ رہی تھی۔

''یہ بھی آپ ہی کی مہربانی ہے۔ بلکہ میں تو حیران ہوں، آپ اتنا صبح اُٹھ کر آفس کیسے چلے جاتے ہیں؟'' اس نے جوس کے بھرے ہوئے گلاس کو گھور کر دیکھا۔

وہ منصور کی طرح اتنا ہیوی ناشتہ نہیں کر سکتی تھی، مگر منصور اُسے کھانے پینے کے معاملے میں بچوں کی طرح ٹریٹ کرتا تھا۔ اگر وہ ہاتھ روک لیتی تو خود نوالے بنا بنا کر اُس کے منہ میں ڈالنے لگتا۔

منصور نے زبردست قہقہہ لگایا جبکہ ماہم کو منصور کی اتنی ڈھٹائی پہ کوفت ہونے لگی۔

''شاہم آ رہی ہے'' اپنی طرف جھکے منصور کو اس نے فوراً پرے دھکیل دیا۔

''یوں کہو، ہڈی آ رہی ہے۔'' شاہم کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے اُس نے آہستگی سے کہا۔

''گڈ مارننگ، ہاؤ آر یُو؟'' اپنی رِسٹ واچ پر ٹائم دیکھ کر وہ بیٹھنے کے بجائے منصور کی کرسی کے پاس رُک گئی۔

''فائن، تم بتاؤ، کہاں جا رہی ہو؟'' اس نے شاہم کے کندھے پر لٹکتے ہینڈ بیگ کو دیکھ کر اندازہ لگایا۔

''وہ.....ب.....بس ایک دوست کی طرف، ضروری کام سے۔'' وہ سٹپٹا سی گئی۔

ماہم اسے روک لیتی تو وہ انکار نہیں کر سکتی تھی۔ جبکہ ارسل سے وہ لنچ کا کہہ چکی تھی۔

''روزانہ دوست کے ساتھ ٹائم ویسٹ کرنے سے بہتر ہے۔ کوئی کورس وغیرہ کر لو۔'' سلائس کا نوالہ چباتے منصور نے بھی اسے ٹوکا۔

''وہ شاہم کے ایم اے کو کافی نہیں سمجھتا تھا۔

''آپ بھی نا منصور! پھر سے کتابوں کا جھنجٹ۔ بچی ہے۔ یہی تو دن ہیں اس کے گھومنے پھرنے کے۔''

ماہم کو ہمیشہ کی طرح منصور کے ہر فیصلے اور مشورے سے یہاں بھی اختلاف تھا۔ وہ شاہم سے بہت محبت کرتی تھی، اسی حساب سے اسے رعایت بھی دیتی رہتی تھی۔

''ایکسکیوز می آپی! مجھے آپ کا خود کو بچی کہنے پر اعتراض ہے۔ پلیز منصور بھائی!'' منصور کے کندھے پر بازو پھیلا کر اُس نے احتجاجاً دہائی دی۔

''ڈونٹ کرائے، بے بی! تمہاری آپی محاورتاً کہہ رہی ہیں۔ دراصل یہ تمہیں بچی بنا



کر اپنی عمر چھپانے کے چکر میں ہیں۔''

''واٹ؟.....منصور! میں تمہیں.....'' ماہم شروع ہو گئی۔ منصور نیوز پیپر پر سر جھکائے مسکرائے جا رہا تھا۔ شاہم نے اس لمحے کھسک جانے میں ہی عافیت جانی۔ وہ نان اسٹاپ بولتی، ماہم کے گال پر بوسہ دے کر ''خدا حافظ'' کہہ کر باہر بھاگی۔

وہ جانتی تھی، اس کے منظر سے ہٹتے ہی منصور اپنی بلبل کو چپ کروا لیں گے۔''

☆☆☆

''کیوں بلوایا ہے مجھے؟'' ارسل کے سامنے بیٹھ کر اس نے کمال بے اعتنائی کا مظاہرہ کیا تھا۔ جیسے اس نے آ کر ارسل پر احسانِ عظیم کیا ہو۔

''بڑی فرماں بردار ہو میری۔ میں نے بلایا اور آ گئی۔'' اس کے چہرے کو ہر زاویے سے اپنی نظروں میں مقید کرتا وہ دوبدو بولا۔ ان کی اکثر ملاقاتیں ناخوشگوار ہی ہوتی تھیں۔ اس کے باوجود ایک دن جو ایک دوسرے کی شکل دیکھے بغیر گزر جاتا، دونوں کو سالوں پہ محیط لگتا۔

''اگر تمہاری یہی حرکتیں رہیں تو وہ وقت دور نہیں، جب تم ایک بار چھوڑ سو بار بلواؤ گے تو میں تب بھی نہیں آؤں گی۔'' یہ صاف جھوٹ اس نے نظریں چرا کر بولا تھا۔

''ہاں۔ اور خود تم کیا کہہ رہے تھے؟ وہ آفس گرل۔'' اس نے بھی ارسل کی دھمکی اسے یاد کروائی۔

''تم سے پہلے تھی نا۔'' ارسل نے بڑی روانی سے اس کی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

''چونکہ تم سے میرے اتنے پرانے مراسم ہیں، یقیناً تمہیں اسے دیکھ کر دُکھ ہوتا۔ اسی لئے میں نے جلدی فارغ کر دی۔'' وہ ستانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ اس کے ساتھ پوری مقابلہ بازی کرتا تھا۔

''اوکے، فائن۔ تم اس کی کمپنی میں لنچ کر چکے ہوں گے، تو پھر میں چلتی ہوں۔'' ایک جھٹکے سے وہ بیگ اُٹھا کر کھڑی ہو گئی۔

''سنو تو، ایسا تو مت کرو۔ رُکو.....میری بات تو سن لو.....پلیز ٹھہرو یار!'' وہ اُسے روکنے کی ناکام کوشش میں اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوٹل سے پارکنگ ایریا تک آ گیا۔ وہ منہ پھیر، کان لپیٹے چلتی جا رہی تھی۔

''شامی! میری.....''

''خبردار، جو میرا نام اپنی زبان سے لیا۔ آئندہ مجھ سے کانٹیکٹ کرنے کی بھی کوشش

نہ کرنا۔ تمہارا میرا ہر تعلق ختم۔"

وہ ایسی ہی تھی۔ جذباتیت میں آخری حدوں تک جانے کے لئے تیار، معصوم، سادہ دل اور محبت کرنے والی۔ جبکہ ارسل اس کے بالکل برعکس تھا۔ شوخ و چنچل، غیر سنجیدہ، بات کو گھما دینے والا مگر متحمل مزاج۔ فی الحال اس کا سمجھ داری کا مظاہرہ کرنے کا موڈ نہیں تھا۔

"ٹھیک ہے، مجھے بھی کوئی ضرورت نہیں، صبح سویرے تمہاری منحوس آواز سننے کی۔ بلاوجہ ہی سر چڑھتی جا رہی ہو۔ بس منتیں کئے جاؤ میڈم کی۔" شاہم کے اتنے سخت الفاظ اُسے بھی تپا گئے تھے۔ اپنے غصے میں وہ بالکل بھول گیا تھا کہ شروعات اُس کی طرف سے ہوئی تھی۔

"کیا کہا تم نے؟ میری منحوس آواز....." اس کی آنکھوں میں نمی بھرنے لگی تھی۔ ان کی زیادہ تر لڑائیوں کا اختتام شاہم کے رونے یا ارسل کی معافی پہ ہوتا تھا۔

"نن..... نہیں یار! وہ میں..... میں، ہاں مانوس کہہ دیا تھا۔ یُو نو..... مانوس۔" اُس کا اگلا اقدام بھانپ کر وہ ہکلاتے ہوئے وضاحت دینے لگا۔

"سب سمجھتی ہوں میں۔ اب میری اُردو اتنی بھی کمزور نہیں ہے۔ بس تم ہٹ جاؤ میرے راستے سے۔" آنکھوں میں آئی نمی کو رگڑتے ہوئے وہ اُسے اپنی گاڑی سے پیچھے ہٹانے لگی۔

"دیکھو شامی! اگر تم گئیں نا تو..... تو میں..... میں کسی گاڑی کے نیچے آ کر خودکشی کر لوں گا اور میرے اس فعل کی سراسر ذمہ داری تم پر عائد ہو گی۔" اس نے مصنوعی جذباتی پن سے کہتے سامنے رواں دواں ٹریفک کی طرف اشارہ کیا۔

"گاڑی کے نیچے کیوں آتے ہو؟ اس کی تو بریکیں ہوتی ہیں۔ خدانخواستہ تم معجزانہ طور پہ بچ بھی سکتے ہو۔ مرنا ہے تو گدھا گاڑی کے نیچے آؤ۔"

اُس کی ایکٹنگ سے متاثر ہونے کے بجائے اس نے خودکشی کی نئی نادر و نایاب قسم بتائی۔ ہاتھ پہ ہاتھ مار کر قہقہہ لگاتے وہ اُسے زہر لگا تھا۔ وہ اُس کی گاڑی کے سامنے مزید بازو پھیلا کر جم گیا۔

"ارسل! اب اگر تم باز نہ آئے تو میں سامنے کھڑی پولیس کو بلا لوں گی۔"

"میں بھی اُنہیں بتاؤں گا کہ یہ چورنی ہے۔" گاڑی کی چھت پر انگلیوں کو ایک رِدھم سے بجاتے وہ خاصی بے نیازی سے بولا۔



"میں چورنی ہوں؟" ارسل کے اس الزام پر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"میں نے کیا چرایا ہے تمہارا؟"

"میرا دل۔" اُس کی کیفیت سے محظوظ ہوتا وہ گنگنایا۔

"ارسل! میں تمہیں بہت ماروں گی۔"

زور سے چلاتے ہوئے وہ اُس پر جھپٹ پڑی تھی۔

☆☆☆

آفس سے گھر آ کر وہ سیدھا بچوں کے کمرے میں گیا تھا۔ انہیں پیار کر کے وہ اوپر آ گیا خالی کمرہ پا کر کوٹ اور بریف کیس ایک طرف پھینکتے وہ کافی جھنجلایا۔ ماہم سے وہ کتنی مرتبہ کہہ چکا تھا کہ۔

"جب میں آفس سے آؤں، تم مجھے بیڈ روم میں ملا کرو۔ مگر نیچے میرا انتظار کرتی ہوئی ماہم نے کبھی منصور کی کسی بات پر کان نہیں دھرا تھا۔ وہ سنتی ضرور تھی، لیکن کرتی اپنے من کی تھی۔ وہ اسے ڈھونڈتا ہوا باہر آ گیا۔

کچن کاؤنٹر کے قریب اس کی طرف پشت کئے وہ کچھ پکا رہی تھی۔ گھر میں کُل وقتی شیف موجود تھا۔ منصور کو اس کا کچن میں آنا قطعاً پسند نہیں تھا۔ خود وہ بھی اپنے موڈ کے تابع ہی آتی تھی۔

اُسے دیکھ کر وہ اندر تک شاد ہو گیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے والی گھٹن خاصی کم ہو گئی تھی۔

"کیسی ہے میری زندگی؟" اس نے اپنے بازو اُس کے گرد لپیٹ دیئے۔

"کیا کر رہے ہیں منصور! یہ کچن ہے، بیڈ روم نہیں۔ کوئی آ جائے گا۔" وہ اُس کی مضبوط گرفت میں ہلکا سا کسمسائی۔

وہ منصور کی اس طرح کی حرکتوں سے اکثر نالاں ہی رہتی تھی۔ وہ اُس کے التفات سے بچتی تھی۔ منصور اُسے جتنی محبت دیتا، وہ اتنا ہی اس سے بدکتی۔ اس کا اندازہ منصور کو بھی بخوبی تھا مگر محسوس وہ کبھی کبھار ہی کرتا تھا۔

بیڈ روم ہو یا کچن، گھر تو ہمارا ہے۔ اور پھر تم میری جائز، شرعی اور قانونی بیوی ہو۔ کسی کو بھلا کیوں اعتراض ہو گا؟" اس کے گرد بازوؤں کا گھیرا مزید تنگ کرتے وہ بڑی دلکشی سے بولا۔

"اچھا چھوڑیں بھی۔ بریانی کو دم پہ رکھنا ہے، پھر سارے کام ختم۔" اُس نے

مسکراتے ہوئے منصور کو زبردستی خود سے الگ کیا۔

''ماہی پلیز! تم کچن میں مت آیا کرو۔ اب یہ روٹین کی ڈشز شیف بھی تو بنا سکتا ہے۔ آخر اتنے ملازم تمہارے آرام کے لئے تو رکھے ہیں۔'' وہ وہیں کاؤنٹر کے ساتھ ٹیک لگائے اسے دیکھنے کے لئے کھڑا ہو گیا۔

''شیف بالکل بنا سکتا ہے، بلکہ روز بناتا ہے۔ مگر آج میرا دل چاہ رہا تھا۔ بور ہو جاتی ہوں منصور!'' چاولوں کی برابر تہہ لگا کر ڈھکن دیتے برنر کی آنچ ہلکی کر دی۔

''اسی لئے تو کہتا ہوں، باہر نکلو، شاپنگ پلان کرو، کلب یا جم جاؤ، خود کو تھوڑا سوشل کرو، کم از کم گیٹ ٹو گیدر پارٹیز ہی اٹینڈ کر لیا کرو۔'' اس کے ساتھ کچن سے باہر نکلتے منصور نے اسے ہمیشہ والا مشورہ دیا۔

''مجھ سے نہیں ہوتا۔'' اس کا بھی ہمیشہ والا جواب حاضر تھا۔ باتیں کرتے ہوئے وہ بیڈروم میں داخل ہو گئے۔ منصور کی وجہ سے اس نے سارا پھیلاوا سمیٹنے کا کام ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

اس سے قبل کہ منصور تنہائی پا کر پھر سے رومانٹک ہوتا، وہ جلدی سے وارڈروب کی طرف بڑھ گئی۔

''منصور! آپ شاور لیں۔ میں جب تک کپڑے نکال لوں۔'' اسے اپنی طرف بڑھتا دیکھ کو اس نے تیزی سے کہا۔

''کر لیتا ہوں چینج یار!'' ادھر میرے پاس تو آ کر بیٹھو۔'' منصور نے اس کا ہاتھ بے خودی کے عالم میں پکڑا تھا۔

''چینج، اس کے بعد کچھ اور۔'' اس نے بھنویں اُچکا کر نرم مسکراہٹ سے اسے ٹوکتے ہوئے واش روم کی طرف دھکیل دیا۔

''ابھی آتا ہوں، کہیں غائب مت ہو جانا۔'' اس کے حاکمانہ انداز پر سر جھکاتے اس نے ماہم کی ناک کو چھوا۔

''جی۔'' وہ مؤدب ہو کر بولی۔

واش روم کے بند دروازے کو دیکھ کر اس نے لمبی سانس خارج کی تھی۔

☆★☆

''ماہم آپی!'' اس نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔

''شاہم! آؤ، اندر آ جاؤ۔'' وہ جو بڑے انہماک سے مووی دیکھ رہی تھی، تاہم کے



آنے سے سیدھی ہو گئی۔

ماہم کے کمرے میں وہ کبھی کبھار ہی آتی تھی، اسے اچھا نہیں لگتا تھا، کسی کی پرائیویسی میں مداخلت کرنا، آج بھی وہ ارسل کا ذکر کرنے آئی تھی۔

اس کی ملاقاتیں جوں جوں ارسل سے بڑھنے لگی تھیں۔ ماہم کی نظروں میں بھی وہ آنے لگی تھی۔ ماہم اس کے آنے جانے کی بہت کم خبر رکھتی تھی۔ وہ نوکروں کو پیغام دے کر کہیں بھی چلی جاتی تھی، مگر اب ہر بار واپسی پر ماہم ضرور پوچھتی تھی کہ وہ کہاں ہے، کس دوست سے مل کر آ رہی ہے؟ وہ اس کی تمام فرینڈز کو جانتی تھی، پھر وہ کب تک بہانے گھڑ سکتی تھی۔ ارسل نے اور اس نے اپنے گھر والوں کو بتانے کا مشورہ کیا تھا۔ وہ بھی اپنے باپ کے ساتھ بزنس میں سیٹل ہو چکا تھا اور شاہم کو بھی کوئی پرابلم نہیں تھی۔

''کچھ کہنا چاہتی ہو؟'' اس کی گومگو کی کیفیت کو ماہم جانچ گئی تھی۔

''نن..... نہیں تو.....'' وہ یک دم گھبرا کر ماہم کے پاس جا بیٹھی۔

وہ کتنا سوچ کر آئی تھی۔ اب ماہم کے بڑے پن کا لحاظ آڑے آ رہا تھا۔ اس نے ابھی ٹھیک سے ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کہ ماہم کی شادی ہو گئی، سو وہ بہنوں والی چھیڑ چھاڑ ان میں کبھی ہوئی ہی نہیں۔ ویسے بھی ماہم ریزرو ڈسی تھی اور ہمیشہ شاہم کو معصوم بچی کی طرح ہی ٹریٹ کرتی۔

ماہم نے مسکرا کر اس کے سر میں انگلیاں پھیریں۔

''شادی سے پہلے آپ کے بال شارٹ تھے نا؟'' اس نے ماہم کے لمبے ریشمی بالوں کو پکڑ کر لپیٹتے ہوئے کہا۔

''ہاں، مگر منصور کو لمبے بال اچھے لگتے ہیں۔'' اس کے ہاتھ میں کیچر پکڑاتے اس نے بال بڑھانے کی وجہ بتائی۔

''میں نے منصور بھائی میں ایک بات ایکسٹریملی فیل کی ہے۔ وہ جو چیز عورتوں میں لائیک کرتے ہیں، سب آپ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ ایم آئی رائٹ؟'' اس نے آگے کو جھک کر ماہم سے تصدیق چاہی۔

''یس، یو آر رائٹ۔'' ماہم نے اسے ہاتھوں سے پکڑ کر اپنے سامنے بٹھا لیا۔

''آپ بھی ویسا ہی کر لیتی ہیں، آپ کا اپنی مرضی کرنے کو جی نہیں چاہتا۔'' ٹھوڑی کے نیچے وہ ہاتھ دبائے ماہم سے پوچھ رہی تھی۔

اس نے شادی کے بعد کبھی ماہم کو سجتے سنورتے نہیں دیکھا تھا۔ حالانکہ ماہم ایسی تو

نہ تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید منصور بھائی کو عورتوں کا بننا سنورنا ناپسند نہیں، جبکہ سادگی
لبادہ ماہم کی اپنی من مرضی تھی۔

''منصور میرے شوہر ہیں، پھر ان کی ماننے میں حرج ہی کیا ہے؟'' اس نے شاہم
مطمئن کرنے کے لئے لاپروائی سے کندھے اچکائے، جبکہ اس کے اندر ایک کسک
اُٹھی تھی۔

''ویسے منصور بھائی آپ کو بہت چاہتے ہیں۔ بے تحاشا۔ اگر آپ چند منٹ
لئے انہیں نظر نہ آئیں تو باؤلے ہو جاتے ہیں۔'' شاہم نے شرارت سے مسکراتے ہو
منصور کی حالت یاد کی۔

''آئی نو ویل۔'' اس میں بلاشبہ کوئی شک نہیں تھا۔

''آپی! آپ بھی ان سے محبت کرتی ہیں آپ نے کبھی محبت کا اظہار نہیں کیا؟''

شاہم کے پہلے سوال کا جواب وہ غلط بیانی میں دے سکتی تھی، مگر دوسرے میں اس
پکڑائی تھی۔ ماہم اس گھر کی فرد اور چشم دید گواہ تھی۔ وہ بے اختیار انگوٹھے کو مروڑتی
کھڑکی سے نظر آتے سفیدے کے درختوں کو ہلتا دیکھنے لگی۔

''شاید کبھی کسی کی بے تحاشا محبت کی گرماہٹ بھی آپ کے سرد جذبات کو حدت نہیں
پہنچا پاتی۔ آپ ٹھٹھرتے ہوئے، زندگی گزارے چلے جاتے ہیں۔ ویسے بھی ہر کوئی ا
انداز سے محبت کرتا ہے۔'' کچھ تو کہنا تھا اور جو کہا تھا، وہ شاہم کے خاک پلے نہیں
تھا۔

''ماہم آپی! اگر محبت ہو جائے تو کیا کرنا چاہئے؟'' سر جھکائے، بیڈ پر آڑی ترچھی
لکیریں کھینچتے اس نے بڑی ہمت کی تھی۔ موضوعِ گفتگو خود بخود ہی محبت پہ آ رُکا تھا۔

''اسے حاصل کر لینا چاہئے۔ چاہے وہ اچھا ہو یا برا۔ محبوب کو پا کر جو نقصان
میں آئے، وہ پھر بھی قابلِ برداشت ہوتا ہے۔ مگر جو نقصان اسے کھونے سے ہو، وہ آ
کی باقی ساری زندگی کو خلا میں معلق کر جاتا ہے۔''

ماہم نہ جانے کون سی راہوں پہ بھٹکتی اس کے تمام سوالات کا بڑی روانی اور تحمل
بغیر نوٹس لئے جواب دیتی جا رہی تھی۔

شاہم نے سر اٹھا کر بڑی بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ تب ہی ماہم نے
کھڑکی سے باہر ٹکی نظریں ہٹا کر اس کو دیکھا۔ شاہم کتنی ہی دیر پلک نہ جھپک پائی۔ جو
وہ خود سے کہنے کی ہمت نہیں کر رہی تھی، ماہم کی زیرک نگاہیں پڑھ گئیں۔



جو خود اس کیفیت سے گزرے ہوں، وہ دوسروں کے بھید بن کہے ہی پڑھ لیتے
ہیں۔''

''کون ہے وہ؟'' اس نے نظریں ہٹائے بغیر پوچھا۔

''کک..... کون؟'' وہ ماہم کے اس قدر صحیح اندازے پر یک دم سٹپٹا گئی۔ ماہم
خاموش رہی۔

''یونیورسٹی میں مجھ سے سینئر تھا۔ ارسل نام ہے، اپنے بابا کے ساتھ بزنس کرتا
ہے۔'' اس نے ٹھہر ٹھہر کر ابھی اتنا ہی بتایا تھا کہ ماہم بول پڑی۔

''اسے جلد از جلد گھر بلواؤ۔'' ماہم کے لہجے میں چھپی بے چینی بہت واضح تھی۔

شاہم محسوس نہ کر سکی، اسے تو ماہم کے منہ سے نکلے الفاظ پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔
اسے ماہم سے اتنی جلدی مان جانے کی توقع نہیں تھی۔

''وہ..... وہ منصور بھائی.....''

''میں منصور سے بات کر لوں گی۔'' وہ اسے بیچ میں ہی ٹوک گئی۔

☆☆☆

ماہم نے منصور کو ارسل کے گھر آنے کے متعلق بتا دیا تھا۔ منصور اس شام جلدی گھر آ گیا تھا۔ ارسل شام کی چائے پر آ رہا تھا۔

چھ بجے کے قریب گاڑی کا مانوس ہارن سن کر شاہم اردگرد کی پروا کئے بغیر باہر کی طرف لپکی۔ منصور صرف مسکرا کے رہ گیا۔ مگر ماہم کو ذرا اچھا نہ لگا تھا۔

''اتنی دیر کر دی آنے میں۔ کب سے کال ملا رہی ہوں۔'' وہ ابھی آدھا گاڑی کے اندر اور آدھا باہر تھا کہ وہ کلاس لینے لگی۔

''تم نے مجھے چھ بجے کا ٹائم دیا تھا اور چھ بجنے میں ابھی سات منٹ باقی ہیں۔'' گاڑی کو لاک کرتے اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

''دیکھو، ذرا تمیز کے ساتھ ملنا۔ منصور بھائی مہذب لوگوں کو پسند کرتے ہیں، زیادہ جہالت کا مظاہرہ نہ کرنا، اپنی زبان پر بھی کنٹرول رکھنا، بلاوجہ بڑبڑاتے مت رہنا اور نہ ہی اُلٹا سیدھا جوک مارنا۔ جو بھی پوچھیں، اس کا صحیح صحیح جواب دینا، زیادہ تفصیل میں مت جانا، کانفیڈنٹ رہو اور سب سے اہم یہ کہ اپنی نظریں جھکا کر رکھنا، مجھے بار بار مت گھورنا۔''

اس کے ساتھ اندر کی طرف بڑھتے ہوئے وہ ایک ہی سانس میں ہدایات دیتی جا رہی تھی، وہ اس کی تمام باتیں بغور سنتا اور سر ہلاتا آخر پہ رُک گیا۔

''یہ تمہیں نہ دیکھنے والی نصیحت پر مجھے اعتراض ہے۔ تم میرے سامنے ہو اور میری نظریں تم پر نہ بھٹکیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔''

کوئی اور موقع ہوتا تو شاہم اپنی اس قدر تعریف پر جھوم جاتی، مگر اس وقت اسے ارسل کا انکار کھولا گیا تھا۔

ماہم اور منصور جو آپس میں کوئی بات کر رہے تھے، انہیں اندر آتا دیکھ کر اُٹھ کھڑے



ہوئے۔ منور کا ارسل نے گرم جوشی سے مصافحہ کرنے اور ماہم کا خوش دلی سے مسکرا کر سلام کا جواب دینے پر شاہم کی اٹکی ہوئی سانسیں بحال ہوئی تھیں۔

بیٹھ جانے اور ایک دوسرے کی خیر خیریت معلوم کرنے کے بعد ماہم تب سے وہیں جمی کھڑی شاہم سے مخاطب ہوئی تھی۔

''جاؤ شاہم! ماجدہ سے کہو ٹیبل لگائے۔'' ماہم نے صرف شاہم کو وہاں سے ہٹانا چاہتا تھا، تاکہ وہ آسانی سے اپنی تفتیش مکمل کر سکے۔

''تعلیم کہاں تک حاصل کی ہے؟'' شاہم کے جاتے ہی ماہم نے پہلا سوال داغ دیا۔ وہ شاہم کے سامنے ارسل سے زیادہ پوچھ گچھ نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''بزنس ایڈمنسٹریشن میں ماسٹرز کیا ہے؟'' خشک ہوتے گلے کو تھوک نگل کر تر کرتے اس نے خود کو حوصلہ دیا۔

''کتنے بہن، بھائی ہو؟''

''دو بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ سب شادی شدہ ہیں۔'' وہ اپنی ازلی روانی سے بولا۔

اُس کے اس جواب پر ماہم اور منصور نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

''والد صاحب کا کیا نام ہے؟'' اب منصور شروع ہو گیا۔

''ان کا نام مطیع الرحمان ہے۔'' اس نے اپنا رخ منصور کی طرف کیا۔ اتنے میں شاہم بھی منصور کے صوفے کی پشت سے قدرے پرے ہٹ کر آ کھڑی ہوئی۔ اس طرح کہ ارسل اس کے بالکل سامنے تھا۔

''ہابیز کیا ہیں؟''

''خاص نہیں۔ بس بکس وغیرہ پڑھتا ہوں۔'' اس بار اُس کی زبان پھسلتے پھسلتے بچی۔ اس نے کبھی جاب کے لئے انٹرویو نہیں دیا تھا اور رشتہ انٹرویو دیتے اُسے گہری احتیاط میں بھی مزہ آ رہا تھا۔ روایات سے ہٹ کر لڑکی سے پہلے اس کا مواخذہ کیا جا رہا تھا۔

''اپنے پیرنٹس سے شاہم کے بارے میں بات کر چکے ہو؟'' ماہم نے اچانک ہی پوچھا۔

''جی..... جی ابھی نہیں۔ ایکچوئیلی میں نے اور شاہم نے اچانک پروگرام بنایا تھا، گھر والوں کو انفارم کرنے کا۔ میں بھی اُنہیں عنقریب بتا دوں گا۔''

بظاہر تو نہیں، مگر اندر ہی اندر وہ سہم گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا ہچکچانا اسے مشکوک کر سکتا ہے۔ وہ اسے کوئی فلرٹ یا سڑک چھاپ عاشق بھی سمجھ سکتے ہیں اور

ابھی اسے اپنے والدین کو بتانا ہی نہیں، منانا بھی تھا۔ جو کہ ایک دُشوار گزار مرحلہ تھا۔ اتنے میں ماجدہ بھی ٹیبل سیٹ کر کے بلانے آ گئی۔ چائے کے دوران ماہم بالکل خاموش ہو گئی تھی، جبکہ منصور اس سے ان کے بزنس کی نوعیت، وسعت اور دیگر روٹین میٹرز پر بات چیت کرتا رہا۔ ارسل، شاہم کے آنکھوں ہی آنکھوں منع کرنے کے باوجود تھوڑی دیر بعد محبت بھری نظر، شاہم کے گھبرائے ہوئے چہرے پر بھی ڈال لیتا۔ اس کا دیکھنا، منصور سے چھپا نہیں رہ سکا تھا۔ ارسل آیا تو صرف چائے پہ تھا، نہ جانے کیا سوچ کر منصور نے اسے کھانے پہ بھی روک لیا۔ جب وہ رات کو دس بجے رخصت ہوا تو ماہم کافی سے زیادہ خاموش، شاہم اور ارسل قدرے مطمئن اور منصور بہت خوش تھا۔

☆☆☆

ارسل اپنے والدین میں سے اپنے باپ سے زیادہ قریب تھا۔ کیونکہ سائرہ رحمان کی سخت مزاجی نے کبھی اپنے سے قریب ہونے ہی نہیں دیا تھا۔ مطیع الرحمان بھی اپنی باقی ساری اولادوں میں سے ارسل کے لئے خاص نرم گوشہ رکھتے تھے۔ باقی سب تو اپنے گھروں کو سدھار چکے تھے۔ ان کا بڑا بیٹا معاذ بھی اپنی ماں کے رویے کی وجہ سے الگ ہو چکا تھا۔ ارسل کو بھی ماں کے رویوں اور فیصلوں پہ اعتراض ہوتا تھا۔ اس لئے بھی ارسل ماں سے دُور ہوتا چلا گیا۔ خود سائرہ رحمان نے بھی کبھی اپنی ذمہ داری قبول نہیں کی۔

اب بھی ارسل نے شاہم کا ذکر باپ سے کیا تھا اور ان کے گھر ہو آنے کا بھی بتایا تھا۔ مطیع الرحمٰن ہمیشہ کی طرح اُس کے اس فیصلے پر بھی بنا پس و پیش کئے رضامند ہو گئے۔ خود مطیع اور سائرہ رحمان کی بھی لو میرج تھی۔ پھر ان کی بڑی تین اولادوں نے بھی اپنی مرضی کے شریک سفر چنے تھے۔ مطیع الرحمٰن خوش تھے۔ انہوں نے رات کو سائرہ سے ذکر کیا تو وہ بھڑک گئیں۔ مطیع الرحمان کے ساتھ طویل بحث کر کے بھی وہ قائل نہ ہو سکیں۔

☆☆☆

''گڈ مارننگ ماما! اینڈ بابا جان!''



ماں کو زبانی وِش کر کے، باپ کے گال پہ اُس نے ہمیشہ کی طرح بوسہ دیا تھا۔

''اُٹھ گیا، میرا شیر۔'' انہوں نے بڑی محبت سے اپنے جوان خوبرو بیٹے کو دیکھا۔

''یس بابا! ناشتہ لیں۔'' وہ آفس جانے کے لئے مکمل تیار تھا۔

اس نے سلائس اور جیم لگاتے ذرا کی ذرا خاموش بیٹھی ماں کو دیکھا اور پھر بھنویں اُچکا کر باپ سے استفسار کیا۔

بابا نے اسے ''سب ٹھیک ہے'' کا اشارہ دیا تھا۔

''ارسل! تم نے بابا سے کیا کہا ہے؟'' سائرہ رحمان اس سے زیادہ دیر خاموش بھی نہیں رہ سکتی تھیں۔

مطیع الرحمان کی زبانی ارسل کا کارنامہ سن کر تب سے وہ کھول رہی تھی اور ناشتے کی ٹیبل تک آنے کی زحمت بھی انہوں نے ارسل کی کلاس لینے کے لئے کی تھی، ورنہ انہیں یوں باپ بیٹے کے ساتھ مل بیٹھنے کا قطعی شوق نہیں تھا۔

''سائرہ! صبح صبح اس ٹاپک کو مت چھیڑو۔ ارسل کہیں بھاگا جا رہا ہے؟'' سائرہ کے خواب تیور تو وہ رات سے دیکھ رہے تھے۔

''آپ خاموش رہیں رحمان! مجھے اس سے پوچھنے دیں۔''

''کس کے متعلق پوچھ رہی ہیں آپ؟'' وہ اطمینان سے بولا۔

''اس لڑکی والے چکر کے متعلق، جس کی رام کہانی تمہارا باپ سنا رہا ہے۔'' انہوں نے گلاسز اُتار کر زور سے میز پر پٹخ کر غصہ اُتارا۔

''میرا اس لڑکی کے ساتھ کوئی چکر نہیں ہے، اِن فیکٹ شی اِز مائی لو۔'' (حقیقت میں وہ میری محبت ہے)

نوالہ توڑ کر منہ میں رکھتے ہوئے اس کا اطمینان قابلِ دید تھا۔

''شرم نہیں آتی، ماں کے سامنے اتنی ڈھٹائی سے لڑکی اور محبت کا ذکر کرتے ہوئے۔'' سائرہ نے غصے سے سرخ ہوتے ہوئے کہا۔

''شرم کی کیا بات ہے؟ ہمارے گھر میں یہ سب پہلی بار تو نہیں ہو رہا۔'' وہ اپنا سابقہ پُرسکون انداز اپنائے ہوئے تھا۔

''آپ سن رہے ہیں رحمان! یہ کس طرح بی ہیو کر رہا ہے۔'' انہوں نے اپنی مدد کے لئے مطیع الرحمان کو پکارا۔

''میری تو سمجھ سے باہر ہے کہ تم اتنی ہائپر کیوں ہو رہی ہو؟ جبکہ تم اچھی طرح سے

جانتی ہو کہ ارسل کو اپنی زندگی کا فیصلہ اپنی مرضی سے کرنے کا پورا حق ہے۔"

"میرا کوئی حق نہیں ہے، میں مرگئی ہوں۔" انہوں نے جان بوجھ کر لہجہ گلوگیر کرلیا۔ ان کی ناراضی کی وجہ اُن کی کروڑوں کی جائیداد کی مالک بہن کی اکلوتی بیٹی تھی۔

"آپ کیوں مرنے لگیں ماما؟ اللہ آپ کو لمبی زندگی دے۔ بڑے تینوں کی دفعہ آپ کو کچھ ہوا نہیں، میری ساری خوشیاں آپ کے دم قدم سے تو ہیں۔"

ماں کی جذباتی بلیک میلنگ سے وہ ذرا بھی متاثر نہ ہوا۔

"تم ہمارے گھر کے سب سے چھوٹے اور لاڈلے بیٹے ہو۔ مجھے تمہاری شادی کا بڑا ارمان ہے۔ میں تمہاری شادی اپنی مرضی سے کرنا چاہتی ہوں۔"

"کس سے کرنا چاہتی ہیں ارسل کی شادی.....؟" ارسل سے پہلے مطیع الرحمان بول پڑے۔ "ارے اپنی مائرہ کی بیٹی، ایمن ہے نا!"

"وہ فضول لڑکی....." وہ ماں کی بات بیچ میں ٹوک کر بھڑک اُٹھا۔

ابھی وہ ایمن کی مزید خوبیاں گنواتا کہ سائرہ رحمان کا موبائل بجنے لگا۔ انہوں نے غنیمت جانا تھا۔ باپ، بیٹے تک وہ اپنی مرضی پہنچا چکی تھیں، باقی کی بحث پھر کسی دن پہ اُٹھا کر وہ موبائل لے کر اُٹھ گئیں۔

"ماما کو ہمیشہ میرے ہر فیصلے پر اعتراض ہوتا ہے، انہیں کبھی میری خوشی میں خوش ہونا نہیں آیا۔" مایوسی سے سر ہلاتا کرسی گھسیٹ کر وہ ناشتہ پورا کئے بغیر جانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"ڈونٹ ڈسٹرب بیٹا! کچھ غلط نہیں ہوگا۔" مطیع الرحمان نے اپنے مخصوص انداز میں دلاسہ دیا۔

"پر بابا جان! میں، شاہم کی فیملی سے مل چکا ہوں۔ اب وہ آپ لوگوں کا ویٹ کر رہے ہیں، میں کب تک اسے ٹالوں گا؟"

"تم ایسا کرو کہ..... فی الحال شاہم کو مجھ سے ملواؤ۔"

ارسل کی پریشانی اور مایوسی کو کم کرنے کے لئے انہیں فی الوقت یہی تدبیر سوجھی تھی۔ وہ اثبات میں سر ہلاتا، آفس کے لئے اُٹھ گیا۔

☆★☆

ماہم نے چہرے پر کلینزنگ مساج کرتے ہوئے شیشے میں نظر آتے، بیڈ پہ بیٹھے



منصور کو دیکھا۔ جو فائل یوں ہی گود میں رکھے، گاہے بگاہے اس کے عکس پر میٹھی میٹھی محبت بھری نظر ڈالتا جا رہا تھا۔ اس کی توجہ کا مرکز صرف ماہم تھی۔

ماہم اور منصور، کمرے میں ہوتے تو ماہم کچھ بھی کرتی، منصور کی نظریں ماہم کا طواف کرتی رہتیں۔ ماہم کے ٹوکنے پر وہ "محبت مجبوری ہے" کہہ کر مسکراتے ہوئے کندھے اُچکا دیتا۔

"منصور! آپ کو ارسل کیسا لگا؟" منصور کا ارتکاز محسوس کر کے اُسے اُٹھتے ہی بنی۔ مساج کرتے ہوئے وہ وہیں بیڈ کے کونے پر ایک ٹانگ اوپر چڑھا کے بیٹھ گئی۔

"بہت اچھا ہے۔" اسے ارسل واقعی بہت پسند آیا تھا۔

"منصور! آپ ایسا کریں، اس لڑکے کے بارے میں معلومات کروائیں۔ اس طرف سے تسلی ہو جائے تو وہ بھی اپنے پیرنٹس کو لے آئے گا، تب ہمیں سب فائنل کرنے میں آسانی ہوگی۔"

ماہم کو بھی ارسل اچھا ہی لگا تھا۔ مگر وہ اس کی ظاہری شخصیت سے مرعوب ہونے والی نہیں تھی۔ شاہم سدا سے اس کے نزدیک ایک بے وقوف اور جذباتی لڑکی رہی تھی۔ وہ اس کی زندگی بھر کا فیصلہ صرف محبت کی بنیاد پہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ورنہ اسے ارسل پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔

"میرے خیال سے تو معلومات کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔" پنسل کے آخری سرے سے فائل بجاتے وہ ٹھہر ٹھہر کر بولا۔

"واٹ نان سینس منصور! شاہم کی زندگی کا اتنا بڑا معاملہ ہے اور آپ فرما رہے ہیں، ضرورت ہی نہیں۔ کیا ہو گیا ہے آپ کو.....؟" وہ کل سے ہی نوٹ کر رہی تھی کہ منصور، ارسل کے جانے کے بعد سے اس کی تعریف میں رطب اللسان ہے، جو اس کے نزدیک جلد بازی تھی۔

"وہ بہت اچھا لڑکا ہے۔ اور پھر شاہم بھی....."

"پلیز منصور! کیا آپ نے اچھے اچھے کی رٹ لگا رکھی ہے؟ آپ کوئی اس کے اندر گھسے ہیں۔ شاہم تو ابھی بچی ہے۔ میں نے جو کہا ہے، وہ کریں۔ خود سے قیاس آرائیاں نہ کریں، پلیز! ایویں فضول میں۔"

منصور کی بات کاٹتے اسے اپنے لہجے کی تیزی اور بگڑتے تیور کا بالکل احساس نہیں رہا تھا۔ منصور کی خود پہ ٹکی ساکت نگاہوں نے اسے خفیف سا کر دیا۔ مگر اسے اپنے رویے

کی بدصورتی کا کبھی افسوس نہیں ہوا تھا، اس کے نزدیک کسی دوسرے کے احساسات کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ یک دم اُٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

یہ پہلی بار نہیں ہوا تھا، نہ ہی غیر ارادی ایسا ہوتا تھا۔ وہ اکثر منصور کے ساتھ بدتمیزی کر جاتی اور ڈھٹائی یہ کہ معافی تو دُور، وہ کبھی شرمندہ بھی نہیں ہوئی تھی۔ اگر منصور کوئی غلطی کرتا تو فوراً اس سے معافی مانگ لیتا اور آئندہ سے اس بات یا کام کے لئے خاص محتاط ہو جاتا جو اس کے غصہ اور ناراضی کا باعث بنے۔ اسے حسرت ہی رہی تھی کہ کبھی ماہم بھی اپنے کئے کا احساس کرے گی۔ اب بھی وہ فائل سائیڈ پر رکھ کر لیٹ گیا۔ وہ ماہم کے اتنے شدید اور تلخ ردِعمل پر ناراض نہیں ہوتا تھا، بس کچھ دیر کے لئے اسے عجیب سی چپ لگ جاتی، جس کی ماہم کو قطعاً پروا نہیں ہوتی تھی۔ پھر وہ اسے منانے میں خود ہی پہل بھی کر لیتا۔

آدھی رات کے قریب اس نے کروٹ کے بل لیٹی ماہم کا رخ اپنی طرف موڑ لیا اور اس کے سر کے نیچے اپنا بازو رکھ دیا۔ وہ اس کے اتنا قریب لیٹ کر بھی دُور ہی لگتی تھی۔ وہ اب بھی کچھ نہیں بولی تھی۔ دونوں چت لیٹے کافی دیر خاموش رہے۔

''منصور! آپ ارسل کی اتنی طرف داری کیوں کر رہے ہیں؟'' اس کا ذہن ابھی بھی وہیں اٹکا ہوا تھا۔ اپنی بدتمیزی وہ بھول چکی تھی۔

''کیا یہ جاننا ضروری ہے؟'' اس نے مدھم لہجے میں پوچھا۔

''ہاں، بہت ضروری ہے۔ کیونکہ شاہم میری چھوٹی بہن ہے۔'' اس نے قطعی انداز میں کہا۔

''میں نے ارسل میں اپنا آپ دیکھا ہے۔ شاہم پہ ٹھہری آنکھوں میں وہ ہی روشنی بھرا تاثر جو تمہارے لئے میری آنکھوں میں ہوتا ہے، حق جتاتا، اس کے ہر انداز میں شاہم کے لئے ایک خاص والہانہ پن جھلکتا تھا، جیسے..... جیسے وہ اسے ساری دنیا سے چھپا لینا چاہتا ہو صرف اپنا بنا کر، بالکل میری طرح محبت کی لو دیتی گرم نگاہیں، مضطرب رکھنے والی بے قراری اور اپنی محبت کو سر کر لینے کی جستجو، بے قراری میں بھی پوشیدہ سکون۔

یہ سب بتاتے ہوئے وہ بہت بے اختیار سا کہیں اور ہی پہنچا ہوا لگ رہا تھا۔ ماہم سانس روکے اسے سنتی چلی گئی۔ اس نے کتنی باریک بینی سے ارسل کا تجزیہ کیا تھا۔

''اور شاہم۔'' اس نے ذرا خائف ہوتے پوچھا۔



شاہم کی بڑی بہن ہونے کے دعوے کے ساتھ منصور سے یہ سوال کرتے اُس کا جی چاہا تھا کہ وہ خود کہیں غائب ہو جائے، منصور کی نظروں سے دُور۔ اس نے ٹھنڈی سانس خارج کی، جس کی ساری ٹھنڈک ماہم کے وجود میں سرایت کر گئی۔

اب موازنہ اس کا اور شاہم کا تھا۔

''شاہم کی آنکھوں میں جو محبت تھی، اس پہ خوف کی تہہ چڑھی ہوئی تھی۔ عورت مرد سے محبت میں کتنی سچی ہے، اس کی گواہی عورت کی آنکھوں میں ٹھہرا خوف دیتا ہے، محبوب سے بچھڑنے کا دھڑکا، اپنی بے قراری کو پوشیدہ رکھنے کے لئے عورت، مرد کی آنکھوں میں دیکھنے سے گریز کرتی ہے۔ شاہم کا سرخ ہوتا چہرہ، ہونٹوں کے کٹاؤ میں چھپی مسکراہٹ اور جھکا سر بہت کچھ عیاں کر رہے تھے۔''

''آپ نے اتنے غور سے مشاہدہ کیا، شاہم کا۔'' اس کی آواز اور دھیمی ہو گئی تھی۔

''ہاں، اسی لئے میں نے ارسل کو کھانے کے لئے روک لیا تھا۔ میں نے پہلی بار اتنے قریب سے کسی عورت کے چہرے پر بکھرتی، سمٹتی محبت کو دیکھا۔ محبت کے ایسے ایسے دھنک بھرے رنگ، جو اپنے لئے تمہارے چہرے پہ دیکھنا چاہتا ہوں، بہت سالوں سے۔''

بلا ارادہ ہی منصور کے منہ سے آخری جملہ نکل گیا تھا۔

گزرے عرصہ میں اس نے کبھی بھی یہ گلہ نہیں کیا تھا۔ ماہم اپنی سرد مہری اور بے اعتنائی سے منصور کو بے خبر ہی سمجھتی تھی۔

اب پتہ چلا تھا کہ بے خبر وہ خود تھی۔

محبت کرنے والے، محبوب سے بے خبر نہیں ہوتے۔

''میری اور شاہم کی نیچر ٹوٹلی ڈیفرنٹ ہے۔'' کافی توقف کے بعد اس نے منصور کی دلدہی کرنے کی غرض سے کہا۔ منصور بھلا کب مطمئن ہو سکتا تھا۔

''نیچر کا اُتار چڑھاؤ، انسانوں میں ہوتا ہے ماہی! محبت کی ازل سے ابد تک ایک ہی نیچر رہے گی۔''

''مجھے نیند آ رہی ہے منصور!'' منصور جانتا تھا، اب وہ یہی کہے گی۔

اس کا سر، منصور کے بازو پر ہی رہا تھا، کیونکہ اس کی وہ عادی تھی۔ رُخ وہ اس کی طرف سے پھیر گئی تھی۔

''سو جاؤ۔''

اسے سلا کر وہ خود ساری رات جاگتا رہا تھا۔

☆★☆

وہ آفس کے لنچ آورز میں شاہم کو مطیع الرحمان سے ملوانے لایا تھا۔ اگر مطیع الرحمان شاہم کو اوکے کر دیتے تو پھر سارا معاملہ ہی سیٹ ہو جاتا۔ اس کا کام صرف سہرا سجانا رہ جاتا۔

''اگر تم نے خود کو نیک بی بی ثابت کرنے کے لئے شلوار قمیض پہن ہی لی تھی کم از کم دوپٹہ تو ٹھیک سے سنبھال لو۔'' ارسل نے گز بھر دوپٹہ پیچھے زمین پر رُلتے اُسے ٹوکا۔

''واٹ ڈو یو مین، نیک بی بی؟ مجھے کسی کو انسپائر کرنے کے لئے اس طرح کوشش کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ شلوار قمیض کا مشورہ تمہارا ہی تھا۔'' وہ آفس میں داخل ہوتے ہوئے وہیں اڑ گئی تھی۔

''میں نے کہا تھا نا، اب بھی میں ہی کہہ رہا ہوں۔ دوپٹہ اچھی طرح، پھیلا کے لو۔ سارے کوریڈور میں جھاڑو پونچھا ہو رہا ہے۔''

ارسل نے رات سے اس کے ناک میں دم کر رکھا تھا کہ کپڑے ایسے ہونے چاہئیں بابا کے سامنے نظریں نیچی رکھنا، دھیمی آواز میں بولنا، کسی بات پر منہ کھول کر قہقہہ مت لگانا، کچھ شرمانے کی ایکٹنگ بھی کر لینا وغیرہ وغیرہ۔ وہ ''فرسٹ امپریشن از دا لاسٹ امپریشن'' والا معاملہ چاہتا تھا۔

ایک تو شاہم اُس کے بابا سے ملنے سے خوف زدہ تھی اور کل سے اوپر تلے ارسل کے فون اور ہدایات نے اسے مزید کنفیوز کر دیا تھا۔

''مجھے نہیں ملنا، تمہارے بابا جانی سے۔'' ساتھ ہی حسبِ عادت آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تھی۔

تب ہی مطیع الرحمان، آفس کا دروازہ کھول کر اچانک نمودار ہوئے تھے۔ آفس کے بالکل باہر کھڑے دونوں بری طرح چونکے۔

''وہ..... وہ..... بابا! یہ شاہم..... اور شاہم! میرے بابا جانی۔'' ارسل نے گھبراہٹ میں ہونقوں کی طرح دونوں کا تعارف کروایا۔

''السلام علیکم!'' شاہم نے دھیرے سے سلام کرتے، سر کو تھوڑا سا جھکا دیا۔



''وعلیکم السلام!'' انہوں نے مبہم سا مسکراتے ہوئے اس کے جھکے ہوئے سر پر شفقت سے ہاتھ دھیر دیا۔

''تم لوگ باہر کیوں کھڑے ہو؟ اندر آؤ۔'' وہ اُنہیں لئے واپس مڑ گئے۔

''کیا کرتی ہو آپ بیٹا!'' صوفے پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے نرمی سے گفتگو کا آغاز کیا۔

''گھر کے کام کاج۔'' جواب شاہم کے بجائے ارسل کی طرف سے موصول ہوا۔

''پڑھ چکی ہو؟'' وہ نوٹ کر رہے تھے کہ شاہم کافی جھجک رہی ہے۔

''جی..... ماسٹرز میں لٹریچر کیا ہے۔'' اُس نے تھوک نگل کر خود کو پُراعتماد ظاہر کرنے کے لئے جتنی برجستگی دکھائی تھی، اتنا ہی غلط بول گئی تھی۔

ارسل کے ساتھ مطیع الرحمان کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ ٹھہر گئی۔ شاہم سر جھکا ہونے کی وجہ سے دیکھ نہ سکی۔

''ہابیز کیا ہیں؟'' انہوں نے مزید پوچھا۔ وہ اس کی جھجک پوری طرح محسوس کر رہے تھے۔

شاہم کی بار بار اُٹھتی، گرتی پلکیں، گھبراہٹ میں پنہاں خوف..... بظاہر پُراعتماد ہونے کی کوشش کرتی یہ لڑکی، اپنے بیٹے کے لئے دل و جان سے پسند آ گئی تھی۔ اگر وہ اتنی معصوم اور اچھی نہ بھی ہوتی، وہ تب بھی اسے قبولیت کی سند بخش دیتے۔ کیونکہ یہ ان کے لاڈلے بیٹے کی چاہ تھی۔

''وہ..... وہ ہابیز.....'' اسے کوئی مناسب سا جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔ ہابیز تو اس کی کبھی کوئی خاص نہیں رہی تھیں، مگر وہ خود کو بہترین ثابت کرنا چاہتی تھی۔

''ہابیز اُس کی مجھے سارا دن ایس ایم ایس کرنا، چھوٹی چھوٹی باتوں کے لئے کال کر کے میرا دماغ جاٹنا، وقت بے وقت لنچ اور ڈنر کی فرمائش کر کے میری جیب ہلکی کروانا اور سب سے اہم، مجھ سے بے تحاشا محبت اُس کے معمول کا حصہ ہے۔'' اس کی ایک لمحے کی خاموشی نے ارسل کی زبان کی رفتار بڑھا دی تھی۔

''جھوٹ بول رہا ہے انکل! میں اتنا سب کچھ نہیں کرتی۔ سارے کام یہ خود کرتا ہے، الزام تراشی ہے یہ۔''

گردن موڑ کر ارسل پہ خفگی سے آنکھیں نکالتے ہوئے اپنی صفائی دیتی وہ رو دینے کو تھی۔ کل سے اُسے سبق پڑھانے والا، سب کچھ خود ہی بھولے بیٹھا تھا۔

''اچھا، تو سب کچھ یہ کرتا ہے۔'' مطیع الرحمان نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں گھور کر باز رہنے کو کہا۔ اس نے تیزی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ٹھیک ہے، اِٹس اوکے۔'' انہوں نے اس کی مشکل آسان کر دی۔ اسی وقت ملازم اندر داخل ہوا۔

''سر! آپ لنچ نہیں لیں گے؟'' اُس نے مؤدب ہو کر پوچھا۔

''ہاں۔ ہم تینوں مل کر لنچ کر لیتے ہیں۔'' مطیع الرحمان نے ان سے رضامندی چاہی۔

''سوری بابا جان! آپ کا یہ لنچ اُدھار رہا۔ کیونکہ آج لنچ کی پلاننگ آپ کی بہو پہلے سے کر چکی ہیں۔ اب آپ کی اجازت ہو تو ہم نکلیں۔''

ارسل نے اس کی جان خشک کرنے کے لئے نیا جھوٹ گھڑا۔

اُس کی اس درجہ غلط بیانی پہ شاہم اُسے دیکھتی رہ گئی۔ پریشانی میں اُس کے منہ سے اپنی صفائی کے لئے ایک لفظ بھی نہ نکل پایا۔

''یہ تمہیں اسی طرح تنگ کرتا ہے؟'' انہوں نے آنسو پیتی شاہم سے پوچھا۔ وہ دھیرے سے اثبات میں سر ہلا گئی۔ اس سے بولنا دشوار ہو رہا تھا۔

''چلو، ہم باپ بیٹی مل کر ان سے نمٹا کریں گے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

''دِس اِز ناٹ فیئر، بابا جانی! آپ نے قبل از وقت ہی پارٹی بدل لی۔'' ارسل نے باپ کی بے وفائی پہ دُہائی دی۔

''یہ میرے بیٹے کی گڈ لک ہے کہ تم اتنی نائس بچی ہو۔ اگر تم ایسی نہ بھی ہوتیں، تب بھی ہم تمہیں ہی اپنی بیٹی بناتے۔ کیونکہ تم میری جگر گوشے کی محبت ہو۔''

انہوں نے شاہم کو پیار دیتے ان دونوں کے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ ارسل نے تشکر بھری نظروں سے باپ کو دیکھا اور مسکرا دیا۔

پارکنگ تک وہ دونوں بہت خاموشی سے آئے تھے۔ اندر ہی اندر بے حد خوش مگر بظاہر لڑنے کو پھر تیار۔

''میں کیب سے گھر جا رہی ہوں۔'' وہ گاڑی کا لاک کھول رہا تھا، جب شاہم نے آغاز کیا۔ ارسل نے جتنا تنگ اسے باپ کے سامنے کیا تھا، وہ سب کا بدلہ لینے والی تھی۔

''کیوں؟ لنچ کیا، میں انفرادی طور پر کروں گا؟'' لاک کھول کر وہ ایڑی کے بل اُس کی طرف گھوما۔



''انفرادی طور پر کرو یا اجتماعی، مجھے گھر جانا ہے۔'' اُس نے اُسے دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے جواب دیا۔

''گھنی، میسنی! وہاں تو بڑی مؤدب، فرماں بردار بنی بیٹھی تھیں اور اب باہر آتے ہی اپنی اصلیت پہ آ گئی ہو۔''

''اور تم بدتمیز انسان! نصیحتیں کر کر کے میرا دماغ پلپلا کر دیا۔ اور خود وہاں کیا جھک مار رہے تھے؟'' وہ بھی دوبدو بولی۔

''ایک تو میرے بابا جانی نے تم جیسی معصوم لڑکی کو اپنے لاڈلے، ڈیشنگ، چاکلیٹی ہیرو، ویل ایجوکیٹڈ، ڈیسنٹ بیٹے کے لئے منتخب کر لیا اور اب تم ماسی فضیلت کی طرح نخرے دکھا رہی ہو۔'' شاہم کے حیرت سے کھلے منہ کی پروا کئے بغیر وہ بولتا جا رہا تھا۔

''شکل دیکھی ہے کبھی آئینے میں۔'' شاہم چبا چبا کر صرف اتنا ہی کہہ پائی۔ اُسے ارسل کی چلتی زبان کی برابری کرنا نہیں آتی تھی۔

''روز دیکھتا ہوں۔'' بالوں میں اُنگلیاں پھیرتے اُس کی بے نیازی عروج پہ تھی۔

''مگر تم پھر بھی شرمندہ نہیں ہوتے۔'' ارسل کو تپانے کے لئے اُس نے بڑے سکون سے کہا۔

''تعریف کا تو کبھی ایک لفظ نہ پھوٹا، اور اتنی بکواس کس خوشی میں کر رہے تھے؟'' اس نے تیوریاں چڑھائے تنک کر پوچھا۔

''گاڑی میں بیٹھو، بتاتا ہوں کیوں؟'' اس نے فرنٹ ڈور کھولتے ہوئے کہا۔

پھر گاڑی ریسورس کرتے ہوئے وہ بے حد اطمینان سے بولا تھا۔

''ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ می، شامی! میں ایک راست گو بندہ ہوں، پھر اچھا دوست تو وہ ہی ہوتا ہے نا، جو ہماری خامیاں چھپائے اور خوبیوں سے ہمیں آگاہ کرے، تاکہ مزید امپروومنٹ ہو سکے۔'' اس کی آنکھوں میں شرارت کا عکس نمایاں تھا۔

''واٹ، تم.....'' شاہم کو بہت جلد اس کے جملے کا ردّ و بدل سمجھ میں آ گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اُترتی، ارسل گاڑی فُل اسپیڈ پر چھوڑ چکا تھا۔

☆☆☆

''منصور! اب بس بھی کریں۔'' اس نے جھنجلا کر سر دائیں سے بائیں طرف مارا۔ اسے اپنے سر پر چلتی منصور کی اُنگلیاں بھاری بوجھ کی طرح محسوس ہو رہی تھیں۔

چھٹی والے روز بھی منصور کوئی نہ کوئی کام نکال کر رکھتا تھا۔ اُسے چین سے بیٹھنا نہیں آتا تھا۔ ابھی بھی وہ ماہم کو گھیرے ہوئے تھا۔

''ابھی تو صرف دو منٹ ہوئے ہیں۔ دس منٹ اور.....'' اس نے اپنے ہاتھوں رفتار مزید تیز کر دی۔

''منصور! میرے سر میں درد شروع ہو جائے گا۔'' اب اُس کے اصرار میں سخ کوفت تھی۔ اسے اپنی جان بچانا مشکل لگ رہا تھا۔

''پین کلر لے لینا۔'' چلتی اُنگلیاں روکے بغیر بڑا ہی نادر مشورہ دیا گیا۔

اسی وقت شاہم بھی لاؤنج میں داخل ہوئی۔ درمیانے صوفے پر بیٹھے منصور کارپٹ کشن پہ برے برے منہ بناتی بے زاری ماہم کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔ منصور قریب ہی تیل والی شیشی پڑی تھی۔ ماہم اپنے کمرے سے نیچے تک جاتے بال کھول احتجاجاً اس کے آگے بیٹھی سر میں تیل لگوا رہی تھی۔ منصور بڑی مہارت سے اس کے مساج کر رہا تھا۔ شاہم کے لئے یہ منظر حیران کن تھا۔ پھر دلچسپ ہو گیا۔

''داؤد منصور بھائی! امیزنگ۔'' اس نے زور سے قہقہہ لگایا۔ ماہم اسے دیکھ کر بلا ہی خفیف سی ہو گئی۔ جبکہ منصور نے اس سے بھی زیادہ زور کا قہقہہ لگا کر اس داد کو سمیٹا۔

''آپ نے کبھی بتایا ہی نہیں منصور بھائی! کہ آپ مالشیے بھی ہیں۔'' شاہم شرارت سے اسے چھیڑا۔

''ہم آج جو کچھ بھی ہیں، سب تمہاری بہن کی محبت کی دین ہے۔'' اس کی شرارت برا منائے بغیر وہ بولا تھا۔

''توبہ کریں، منصور بھائی! ایک بزنس ٹائیکون ہو کر آپ کیسی کیسی حرکتیں کرتے ہیں اگر آپ کا کوئی فرینڈ دیکھ لے تو یقیناً صدمے سے اس کا انتقال ہو جائے۔''

ماہم کے لئے منصور کی محبتوں کے رنگ وہ اکثر و بیشتر دیکھتی رہتی تھی۔ ماہم کو وہ لحاظ سے بہت خوش قسمت لوگوں میں گردانتی تھی۔

اُس کی چھٹی والے روز کی روٹین سے وہ واقف تھی۔ سارے گھر میں ماہی، الاپتے پھرتے۔ ایک سیکنڈ کے لئے بھی ماہم کو اُس کی نظروں سے دُور ہو جانے اجازت نہیں تھی۔

''بہت بولنے لگی ہو تم شاہم!'' ماہم نے مصنوعی گھوری اُس پر ڈالی اور اوپر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔



''منصور بھائی! کارڈ کھیلیں۔'' وہ بھی ٹی وی بند کر کے نیچے کارپٹ پہ آ بیٹھی۔

''بہت شوق ہے تمہیں مجھ سے ہارنے کا۔'' منصور اُٹھ کر ٹرالی سے کارڈز نکالنے لگا۔

''ہار جیت کا فیصلہ کھیل کے اختتام پہ ہوگا۔'' اس نے اتنے یقین سے یہ سب کہا کہ منصور مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

☆☆☆

''تو پھر تم نے کیا ڈیسائیڈ کیا، ارسل؟''

سائرہ رحمان، کندھے پر بیگ لٹکائے ہوئے آئی تھیں۔ بالوں میں گلاسز بھی اٹکے ہوئے تھے۔ وہ شاید کہیں جا رہی تھی۔

''مجھے کچھ ڈیسائیڈ کرنا تھا، ماما؟'' وہ ناسمجھی سے اُلٹا اُن سے پوچھنے لگا۔

''میں ایمن کے متعلق پوچھ رہی ہوں۔ اگر تم نے اپنا مائنڈ سیٹ کر لیا ہے تو میں مائرہ کو کوئی حتمی جواب دوں۔ ویسے بات تو طے ہے، یہ تو صرف فارمیلٹی ہے، دنیا دکھاوے کے لئے۔ ورنہ تم دونوں اپنے گھر کے ہی بچے ہو۔ ایمن، مائرہ کی اکلوتی اولاد ہے، جس کے وہ سارے ارمان پورے کرنا چاہتی ہے۔ پھر ہمارے گھر کی بھی آخری شادی ہو گی۔''

ارسل کی خاموشی کو قدرے رضامندی جان کر وہ بیگ گود میں رکھے اس کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔ جبکہ ارسل نے ماں کی ساری گفتگو بڑے تحمل سے سنی تھی۔ وہ بھی سو کر اُٹھا تھا، آفس سے اُس نے آف لیا تھا اور اب چائے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ سائرہ رحمان تک اپنی پسندیدگی واضح طور پر پہنچا چکا تھا، اُس دن کی بحث کے بعد ان کے بیچ یہ ٹاپک پھر نہیں چھڑا تھا۔ اس کا خیال تھا، وہ بھی اس قصے کو بھول چکی ہیں۔ مگر اس کا خیال غلط ثابت ہو گیا تھا۔ سائرہ رحمان، بھولنے والی نہیں تھیں۔

''میرا مائنڈ آل ریڈی سیٹ ہے۔ اور کس کے لئے ہے، یہ آپ اچھی طرح سے جانتی ہیں۔'' اس نے بہت سکون سے جواب دیا۔ وہ ان کے ساتھ کوئی تلخ کلامی نہیں چاہتا تھا کیونکہ مطیع الرحمان گھر پر نہیں تھے۔

''تو تم اس لڑکی کے چکر سے باہر نہیں نکلو گے، اپنی ماں کو انکار کرو گے اس کی وجہ سے۔ میں کیسی ماں ہوں کہ میرا اپنا بیٹا، میرا خون میری چھوٹی سی خواہش نہیں پوری کر سکتا۔ کسی دوسری عورت کو اپنی ماں پہ ترجیح دے رہا ہے۔'' سائرہ رحمان ایک دم ہتھے سے

اُکھڑ گئیں۔

''چھوٹی سی خواہش ماما؟'' اس نے ماں کے الفاظ دُہرائے۔

''یو نو واٹ ماما! شی اِز مائی لائف۔ نہ خواہش، نہ ضرورت، زندگی ہے اور میں زندگی داؤ پہ نہیں لگا سکتا۔ آئی ایم سوری ماما!''

''میں اچھی طرح جانتی ہوں، تم یہ اتنی دیدہ دلیری صرف اور صرف اپنے باپ شہہ پہ دکھا رہے ہو۔ جب وہ تمہیں سپورٹ کر رہا ہے تو تمہیں کیا پڑی ہے، اپنی ما بھی توجہ دو۔ ماں جائے بھاڑ میں۔ تم اپنی من مانیاں کرتے پھرو۔''

سائرہ رحمان غصے سے سرخ ہوتے تیز تیز بولنے لگیں۔ انہیں گھر میں موجود ملاز کی بھی پروا نہیں تھی۔

''بابا جانی مجھے سپورٹ نہ کریں، تب بھی مجھے اپنی ہی مرضی کرنی ہے۔ اس روز تُو، میں میں کا کچھ حاصل نہیں ماما! اینڈ آف دا ڈے، ہونا تو وہی ہے جو میں کروں آپ کیوں اپنا بی پی ہائی کرتی ہیں۔ ساتھ میں مجھے گناہ گار بھی..... پلیز ماما! ڈ ڈسٹرب می۔''

اُس نے بہت بے بسی سے ماں کو دیکھا، جیسے رحم کی اپیل کر رہا ہو۔

''مائی سن! تمہارے لئے بہت بہتر سوچ رہی ہوں۔'' اب وہ بھی نرمی پہ اُتر آئیں

''آپ کی اپنی ہی لاجک ہے ماما! آپ میرا مسئلہ حل نہیں کر سکتیں تو مزید کری بھی مت کریں۔ آپ میری ماں ہیں، آپ کی خاطر میں اپنا آپ مار کے اپنی محبت بھی دوں تو اس کا نعم البدل ایمن کبھی نہیں ہو سکتی۔ ہر ماں اپنی اولاد کے لئے بہتر رکھتی ہے۔ مگر جو میں نے اپنے لئے سوچا ہے، وہ بھی برا نہیں ہے۔ اس کو چھوڑنا میر بس میں ہوتا تو بار بار آپ سے نہ کہتا۔ میں جتنی محبت بابا سے کرتا ہوں، اتنی ہی آپ بھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ مجھے اچھی طرح سمجھتے ہیں اور میں اپنی فیلنگز اُن سے شیئر لیتا ہوں۔ اور کچھ نہیں۔''

اس نے نیچے کارپٹ پر بیٹھ کر سائرہ رحمان کے دونوں ہاتھوں کو تھامے بڑی اور سنجیدگی سے انہیں سمجھایا تھا۔

وہ جیسی بھی تھیں، اس کی ماں تو تھیں، جنہیں وہ ناراض نہیں کر سکتا تھا۔

''کچھ بھی ہے ارسل! تمہاری شادی ایمن سے ہی ہو گی، نیکسٹ ٹائم مجھے مطلوبہ جواب دینا۔''



وہ ارسل کے ہاتھ جھٹک کر چلتی بنیں۔ اس نے تاسف سے جاتی ہوئی ماں کو دیکھا تھا۔

☆☆☆

ماہم، ڈنر کی تیاری دیکھنے کے لئے کچن میں آئی تھی۔ منصور نے دوپہر میں لنچ نہیں لیا تھا۔ اب وہ کب سے بھوک بھوک چلّا رہا تھا۔ شاہم، منصور کے ساتھ بیٹھی اسے مسلسل تنگ کر رہی تھی۔ ماہم ٹیبل لگوانے کے لئے اُٹھ گئی۔ کچن میں پکتی مختلف ڈشز کی خوشبو سے اچانک اُس کا جی بھاری ہونے لگا۔ وہ باہر جانا ہی چاہتی تھی کہ اُس کا جی اُلٹ گیا۔ وہ تیزی سے کچن کے ساتھ بنے واش روم میں گھس گئی۔ اماں حاجراں، جو اس کے نیچے آئی تھیں، اسے وومٹنگ کرتا دیکھ کر اُلٹے قدموں واپس مُڑ گئیں۔

''منصور بیٹا!..... منصور بیٹا! ماہم کو دیکھو، کیا ہو رہا ہے۔''

اُن کے ہوش اتنے اُڑے ہوئے تھے کہ منصور ور شاہم، حواس باختہ سے کچن کی طرف بھاگے، وہ واش روم کے دروازے کو تھامے بے جان سی کھڑی تھی۔

''ماہی! کیا ہوا؟'' اس نے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا۔

''ماہم آپی! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' شاہم نے بھی اسے ایک طرف سے پکڑ لیا۔

''منصور! میرا سر..... پلیز ڈاکٹر.....'' ماہم ان دونوں سے اپنا آپ چھڑاتی نیچے بیٹھتی چلی گئی۔

''کریم!... کریم!'' منصور نے وہیں سے ڈرائیور کو پکارنا شروع کر دیا۔ ظفر (خانساماں) ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کا کہنے کے لئے باہر بھاگا۔

ماہم کی غیر ہوتی حالت نے اس کے ہاتھ پاؤں پھیلا دیئے تھے۔

اس نے ماہم کو بازوؤں میں بھر لیا۔

''منصور بھائی! میں بھی ساتھ آتی ہوں۔'' خوف زدہ سی روتی ہوئی شاہم اُس کے پیچھے تھی۔

''نہیں، کسی کی ضرورت نہیں۔ ڈونٹ وری۔ میں تمہیں کال کر دوں گا۔''

''آپ کو اندر ڈاکٹر صاحبہ بلا رہی ہیں۔'' ایک نرس نے اسے اطلاع دی۔

ڈاکٹر کے ہاں ویٹنگ روم میں چکر لگا لگا کے اُس کی ٹانگیں شل ہو چکی تھیں۔

ماہم، ڈاکٹر تبسم کی ٹیبل کے سامنے والی چیئر پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ وہ اُس کے برا
بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر تبسم اُن کی فیملی ڈاکٹر تھیں۔ وہ ان کے کلینک پہ ہی ماہم کو لایا تھا۔

''کانگریچولیشن، آپ پھر سے فادر بننے والے ہیں۔'' ڈاکٹر تبسم نے مسکراتے ہو
بتایا۔ منصور نے بے یقینی سے ڈاکٹر تبسم اور پھر ماہم کے جھکے سر کو دیکھا۔

''اوہ رئیلی..... تھینک یُو! اینڈ آف کورس تھینکس گاڈ!''

اس کے پریشان چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ اسے بچوں سے جتنا پیار تھا، ماہ
اتنا ہی الرجک۔

''انہیں ویک نیس بہت زیادہ ہے، خاص خیال رکھو۔ میں میڈیسن لکھ رہی ہوں
ریگولر یوز کرنی ہیں اور پھل اسپیشلی دودھ ڈیلی ڈائٹ میں شامل رکھنا۔'' وہ تیزی سے
پہ لکھنے کے ساتھ ماہم کو ہدایات بھی دیتی جا رہی تھی۔

پھر وہ نسخہ، منصور کی طرف بڑھاتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''کانگریچولیشن ماہی!''

اس نے ماہم کے کندھے کے گرد بازو لپیٹ کر جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔ ماہم نے
جانے والی نظروں سے اسے گھورا۔

منصور اس کی وجہ جانتا تھا۔ واویلا تو اس نے تب بھی کیا تھا، جب وہ پہلی بار
بن رہی تھی۔

گھر واپسی تک کا راستہ بہت خاموشی سے کٹا تھا۔ منصور نے اسے ایک آدھ
مخاطب کرنے کی کوشش بھی کی، مگر اُس نے جواب نہ دیا۔

شاہم، اماں ہاجرہ اور ماجدہ لان میں ہی ان کا انتظار کر رہے تھے۔ گاڑی رُکتے
وہ ان کی طرف لپکے۔

''کیسی ہیں ماہم آپی! کیا ہوا تھا انہیں؟'' شاہم نے بہن کی طرف کا دروازہ کھو
استفسار کیا۔

''کچھ نہیں ہوا۔'' ماہم کہتی ہوئی رُکے بغیر اندر چلی گئی۔

شاہم نے اس ردِعمل پر حیرانی سے منہ کھولے منصور کو دیکھا، جس نے مسکرا
کندھے اچکا دیئے۔ وہ سب بھی چلتے ہوئے اندر آ گئے۔ ماہم اوپر اپنے کمرے میں
چکی تھی۔

''سب خیریت ہے بیٹا؟'' اماں حاجراں، منصور سے بولیں۔



''جی اماں! وہی جو عمیر اور حمزہ (بیٹا) کی باری ہوا تھا۔'' اُس نے آہستگی سے اماں
ریب ہو کر کہا۔

''مبارک ہو بیٹا! یہ تو بہت خوشی کی خبر ہے۔''

''اماں! آپ اوپر دودھ کا گلاس بھجوا دیں۔ میں ماہی کو دیکھ لوں۔''

''بیٹا! کھانا تو کھا لو۔ تمہیں بھوک لگی ہوئی تھی۔'' انہوں نے اس کی بھوک یاد
ا۔

''نہیں اماں! بھوک مٹ گئی ہے۔''

ماہم نیچے کارپٹ پر ہی گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی تھی۔ منصور دروازے کو لاک کر کے
کے برابر ہی بیٹھ گیا۔

''ماہم! یہ سب اللہ کی دین ہے، کفرانِ نعمت نہیں کرنا چاہئے۔'' اُس نے بڑی نرمی
تمہید باندھی۔

''اللہ کی نہیں، تمہاری وجہ سے سب ہو رہا ہے۔'' وہ دوبدو تیزی سے بولی۔

''اچھا چلو، اس سب میں اللہ کی رضا بھی تو شامل ہے، اب جو ہو گیا، سو ہو گیا۔''

''تم مردوں نے اپنے فائدے اور حصول کے لئے، ہم عورتوں کو خدا کے نام پہ
انے، دھمکانے کے لئے ایسی بہت سی آیتیں اور احادیث یاد کی ہوتی ہیں۔ مگر میں کوئی
کل وومن نہیں ہوں، جو تمہاری باتوں میں آ جائے گی۔ اگر تمہیں یونہی بچوں کی لائن
نی تھی تو چک 42 کی کسی جاہل گنوار سے بیاہ کرتے منصور! جو تمہارے درجن بھر بچوں
اماں بنتی۔'' وہ غصے سے بولتی چلی گئی۔

''درجن بھر نہیں ماہی! صرف تین۔''

''مجھے نہیں چاہئے مزید بچہ۔ دو بیٹے کافی ہیں۔'' اُس نے گویا فیصلہ سنایا۔

''ماہی! ہر عورت اس دور سے گزرتی ہے۔ یہ سب تو قدرتی ہے۔''

''میں مزید ایک لفظ نہیں سنوں گی۔'' اس نے منصور کی بات جیسے سنی ہی نہیں تھی۔

''کیا کرو گی تم؟'' اس نے بھی ٹھنڈے لہجے میں پوچھا۔

''نہیں ہو گا یہ بچہ..... میں اس کا.....''

''جسٹ شٹ اَپ ماہی! شرم آنی چاہئے اتنا گھٹیا سوچتے ہوئے۔''

اس نے پہلی بار اسے اتنی سختی سے ٹوکا تھا۔ اس کے ماتھے پر پڑے بل ماہم کو مزید
غضب ناک کر گئے۔ دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ ماجدہ دودھ لائی۔ اس سے دودھ کا

گلاس لیا اور وہ پھر اس کے پاس آ بیٹھا۔

''یہ پی لو۔'' اس نے نظریں چراتے، گلاس اُس کی طرف بڑھا دیا۔

''نہیں پینا میں نے دودھ۔ کچھ نہیں کھانا مجھے۔ اب تم مجھ پر چلاؤ گے۔ مجھ
ڈھونگ رچاتے ہو۔ میری ٹینشن کی تمہیں پروا نہیں۔ زرخرید غلام ہوں میں؟.....
مشین ہوں؟''

دودھ کا گلاس اس نے ہاتھ مار کر گرا دیا۔ وہ ہذیانی انداز میں چلا رہی تھی۔ ن
نے اسے سنبھالنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔

☆☆☆



''السلام علیکم بابا جانی!'' اس نے آفس میں داخل ہوتے ہی حسبِ معمول سلام کیا۔
مطیع الرحمان فون پر بزی تھے۔ سر کے اشارے سے اس کے سلام کا جواب دے کر
جلدی سے بات سمیٹنے لگے۔

''ٹھیک ہے، آپ میری سیکرٹری سے ڈیٹیل لے لیجئے گا..... میں اسے بریف کر
ں گا۔''

''جی، اوکے۔ اللہ حافظ!''

ریسیور کریڈل پہ ڈال کر انہوں نے حیرانی سے ارسل کو دیکھا۔

'ارسل! آپ نے تو آج آف کرنا تھا۔''

''ہاں، گھر میں سکون ملتا، تب نا۔'' تھکا ہوا لہجہ بہت دھیما سا تھا۔

''تمہاری ماں نے کچھ کہہ دیا؟'' وہ لمحہ بھر میں معاملہ بھانپ گئے۔

''پاپا! آپ صرف ''کچھ'' کہتے ہیں۔ شاہم میری زندگی ہے اور اس سے جدائی کا
ظ بھی موت ہے، میرے.....''

''ارسل!'' اُن کا دل ڈوب سا گیا۔

''تمہاری حسبِ خواہش ہی سب ہوگا۔ اسے میں خود ہینڈل کروں گا۔ تم ناحق ٹینشن
لے رہے ہو۔''

''بابا جانی! وہ مجھے ٹارچر کرتی ہیں، میں کیسے انہیں سمجھاؤں کہ شاہم ایک اچھی لڑکی
ہے۔'' وہ ذرا توقف کر کے بولا۔ ''اور اگر اچھی نہ بھی ہوتی تو تب بھی بابا! جن سے محبت
لی جاتی ہے، ان کے عیبوں کو انگلیوں پر نہیں گنا جاتا۔''

انہوں نے ارسل کو نہیں بتایا تھا کہ انہوں نے سائرہ سے اس موضوع پر پھر بات کی
تھی۔ ان کے انکار کا اٹل اور حتمی انداز ایسا تھا کہ مطیع الرحمان سمجھ گئے کہ وہ کسی بھی
صورت ماننے والی نہیں ہیں۔

''ابا جانی! آپ لوگ ابھی تک شاہم کی فیملی سے نہیں مل سکے، وہ تو مجھے فراڈ سمجھ
گے۔ میں کب تک اسے ٹالوں؟''

اب اُس کی پریشانی میں غصہ شامل ہونے لگا تھا۔

''مجھے ہی کوئی حتمی فیصلہ لینا پڑے گا۔'' وہ پُرسوچ انداز میں بولے۔

''سائرہ بہت ضدی ہے، جب اڑ جاتی ہے تو پھر بمشکل ہی مانتی ہے۔ تمہیں یاد ہو
معاذ (بڑا بیٹا) کی دفعہ اس نے کیسا ہنگامہ کھڑا کیا تھا۔ معاذ اور اس کی بیوی کا جینا ح
کر دیا تھا۔ حالانکہ وہ تمہاری ماں کا کتنا لاڈلا تھا۔ مگر اس نے معاذ کی بیوی کا و
برداشت نہیں تھا۔ کیونکہ وہ معاذ کی پسند تھی۔ اب..... اب تمہاری شادی اس
رضامندی کے بغیر اور میرے ایما پر شاہم سے کر دی جاتی ہے، وہ بھی اس صورت میں
تم اس کی بھانجی کو ریجیکٹ کر رہے ہو، تو اندازہ لگا لو کہ وہ شاہم کا کیا حال کرے گی۔''

''آئی تھنک..... تم آل ریڈی ہی اپنی زندگی الگ سے سیٹل کر لو تو یہ ہم دو
باپ بیٹے کے لئے بہتر ہوگا۔'' یہ سب ارسل سے کہتے ہوئے وہ ہچکچا رہے تھے۔

ایک بیٹا پہلے ہی ماں کے روّیے سے دل برداشتہ ہو کر جا چکا تھا دوسرے کو وہ دل
پتھر رکھ کر خود جانے کا کہہ رہے تھے۔

''پلیز بابا جانی! میں آپ سے ایک دن بھی دُور نہیں رہ سکتا۔'' وہ باپ کی پلاننگ
کر بھونچکا رہ گیا۔

''میں کون سا تم سے دُور جا رہا ہوں۔ ہمارا آفس ایک ہے، میں تمہاری طرف آ
کروں گا۔ بس کچھ عرصہ کے لئے۔ جب تمہاری ماں کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا تو تم
کے لئے واپس آ جانا۔'' انہوں نے بڑی شفقت سے اسے سمجھایا۔

''آپ پھر سے اچھی طرح سوچ لیں، بابا جانی! کہیں میری اتنی بڑی جرأت
مجھے ہمیشہ کے لئے گھر سے بے دخل نہ کر دیں۔ ساتھ میں آپ کا ناطقہ بھی بند۔'' اس
زیرِ لب مسکراتے ہوئے تصویر کا دوسرا رخ بھی دکھایا۔

''ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ تم اپارٹمنٹ کی چابی مجھ سے لے لو، اس کا فرنیچر چینج کر
ڈیکوریٹ کرو، میں تمہاری ماں کے ساتھ لاسٹ ٹرائی لوں گا۔ شاید وہ مان جائے،
اب میں تمہاری شادی میں تاخیر نہیں چاہتا۔''

اُس نے ہولے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆



اس رات سے ہی ماہم نے پُراسراری خاموشی اختیار کر لی تھی۔ وہ منصور سے بہت
نے لگی تھی۔ منصور نے بھی اس کی بدتمیزی اور غلط سوچ کا احساس نہیں دلایا۔ وہ معاملے
مزید طول نہیں دینا چاہتا تھا۔ ماہم نے دوبارہ بچے کا ذکر نہیں کیا۔ وہ اتنے پہ ہی خدا کا
رادا کر رہا تھا۔ وہ کوئی بات کرتا یا پوچھتا، وہ بس ہوں، ہاں میں جواب دیئے جاتی۔
سور کو اُس کی یہ لاتعلقی بہت چبھ رہی تھی۔ اس پر مستزاد، وہ کھانے پینے پہ بالکل توجہ
ں دے رہی تھی۔ ٹیبل پہ سب سے آخر میں آتی اور تھوڑا سا کھانا ٹونگ کر اُٹھ جاتی۔
دنوں اسے خوراک کی زیادہ ضرورت تھی۔ عمیر اور حمزہ کی دفعہ بھی اس نے اپنے ساتھ
سور کی جان بھی عذاب میں ڈالے رکھی تھی۔

رات کو اُس کی ضروری میٹنگ تھی۔ وہ ڈنر کئے بغیر ہی گھر سے نکل گیا۔ پھر ساڑھے
یارہ بجے اُس کی واپسی ہوئی تھی۔ دن بھر آفس کے بکھیڑے اور اس میٹنگ نے اُسے
ت تھکا دیا تھا۔ وہ تھوڑا ستانے کے لئے اوپر اپنے کمرے میں جانے کے بجائے
ڈرائنگ کے صوفے پر پٹا کوٹ اور بریف کیس پھینک کر ٹانگیں آگے کو پھیلائے بیٹھ گیا۔

''صاحب جی! چائے پئیں گے؟'' ماجدہ ابھی تک کچن میں مصروف تھی، اس کی آمد
پوچھنے آ گئی۔

''نہیں، تم ابھی تک فارغ نہیں ہوئیں؟''

اُس نے صوفے کی پشت سے سر کو تھوڑا سا اوپر اُٹھا کر پوچھا۔

''وہ بی بی جی کھانا نہیں کھا رہی تھیں۔ دو بار میں ٹرے لگا کر لے گئی۔ مگر شاہم بی بی
نے بھی منت سماجت کی مگر وہ مانی نہیں۔ ان کا بی پی لو تھا، بڑی ہی چڑچڑی ہو رہی ہیں،
ں لئے میں لیٹ ہو گئی۔''

ماجدہ کی بات سن کر وہ یکدم سیدھا ہو گیا۔ مایوسی اور فکرمندی اس کے چہرے پر ظاہر
ورہی تھی۔ وہ سیدھا اوپر چڑھ گیا۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور لائٹ بھی جل رہی تھی۔

''ماہی!'' اس نے بے تابانہ اس کے چہرے سے بازو ہٹا دیا۔

''کچھ سنبھلی تمہاری طبیعت یا ڈاکٹر کے پاس لے چلوں؟''

اس کی آنکھوں اور چہرے سے فکرمندی عیاں تھی۔

ماہم یونہی اسے تکے چلی گئی۔

''میں اب بہتر ہوں منصور! پلیز مجھے نیند آ رہی ہے۔''

''بالکل جھوٹ، بھوکے پیٹ بھلا کسے نیند آتی ہے؟'' اس نے فوراً تردید کی تھی۔

''میرا جی کھانا کھانا کو نہیں چاہ رہا۔'' اس نے صاف انکار کر دیا۔

''او کے، مگر دودھ اور ایک سیب تو کھالو، میڈیسن لو اور سو جاؤ۔'' وہ ذرا بھی اس کے انکار کو خاطر میں نہ لایا۔

اس نے بیڈ کراؤن کے دراز میں لا کر رکھی گئی اس کی میڈیسن چیک کیں۔ ساری کی ساری دوائیاں ویسے ہی دھری تھیں۔ اس نے ایک گولی بھی نہیں لی تھی جو یقیناً منصور سے واضح ناراضی کا اظہار تھا۔

وہ خود کچن میں چلا آیا۔ ماجدہ شاید جا چکی تھی، اس نے دوبارہ بلانا مناسب نہ سمجھا فریج میں سے دودھ نکال کر ساس پین میں گرم کرنے لگا۔ پھر سیب نکال کر سنک میں دھویا اور پلیٹ میں چھری کے ساتھ رکھ لیا۔

خود اُس نے بھی کب کچھ کھایا تھا۔ مگر اس کے ناز نخرے کس نے اٹھانے تھے۔ ماہم نے تو مروّتاً بھی نہیں پوچھنا تھا۔

''اب سے صلح ہے ہماری۔ تم تو ناراضی کی آڑ میں اپنی صحت برباد کر لو گی۔'' سیب کا کاش قاش کر اس نے ماہم کے منہ میں ڈالی۔ دوسری قاش کے لئے منصور کا منہ کی طرف جاتا ہاتھ اس نے پکڑ لیا۔ خود دانتوں سے کتر کتر کر کھانے لگی۔

پلیٹ اس کی گود میں دھر کے وہ چینج کرنے کے لئے اُٹھ گیا۔

☆★☆

اس نے مایوسی سے موبائل آف کر کے بیڈ دراز میں ڈال دیا۔ وہ پچھلے تین دن ارسل سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر اس کا سیل فون مسلسل آف مل رہا تھا۔ ا نے آخری دفعہ شاہم سے بہت روکھے انداز میں بات کی تھی اور بتایا تھا کہ وہ چار دن لئے کہیں جا رہا ہے۔ شاہم نے بھی غصے میں آ کر اپنا فون بند کر دیا۔ اس کا کسی کام بھی دل نہیں لگ رہا تھا۔ عجیب عجیب سے وہم اسے ستاتے رہے۔ ارسل کی ماما کا انکار جانتی تھی۔

متضاد سوچوں سے اس کے اندر گھٹن بڑھنے لگی تو اس نے گھبرا کے کمرے کی کھڑ کھول دی۔ نیچے لان کے منظر میں ماہم اور منصور بیٹھے ہوئے تھے۔ ماہم اسے کچھ بتا رہی تھی۔ منصور اس کی بات پر ہمہ تن گوش تھا۔ منصور کو دیکھ کر اسے پھر ارسل یاد آنے لگا بظاہر بہت لاابالی، کھلنڈرا، شوخ سا ارسل اس کی ہر سیدھی بات کو توڑ موڑ کر اپنے مطلب کے جملے میں ڈھال لینے والا، بالکل اسی طرح اس کے چہرے پر نظریں گاڑے ہو



ں اور محبت سے اس کی گفتگو سنا کرتا۔

منصور دھیما دھیما مسکرا رہا تھا۔ اس کی نظریں مہم کے چہرے کا گھیراؤ کئے ہوئے ۔ پھر ماہم کے اُٹھنے کے ساتھ ہی منصور بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔

وہ دونوں اندرونی حصے کی طرف آ رہے تھے، جب منصور کو شرارت سوجھی۔ وہ ماہم وقدم پیچھے تھا۔ اس نے گھاس پر پڑے پانی کے پائپ کو بہت محتاط انداز سے اٹھا سیدھا رخ ماہم کی پشت کی طرف موڑ دیا۔ ماہم بجلی کی سی سرعت سے پلٹی۔ وہ اس کے لئے بالکل تیار نہیں تھی۔

وہ اپنا بچاؤ کرنے کے ساتھ منصور کو وارن بھی کرتی جا رہی تھی۔

پانی پانی کے اس کھیل سے لطف اندوز ہوتی شاہم بھی اپنا سارا دکھ بھول کر لانے لگی۔

اہم نے شیفون کی باریک ہاف سلیوز کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ وہ پوری کی پوری وئی اپنا بچاؤ کرتی منصور تک پہنچ گئی تھی۔ اس نے تھوڑی سی کوشش سے منصور کے سے پانی کا پائپ جھپٹ لیا۔ اب پانی کی موٹی دھار، منصور کی طرف مڑ چکی تھی۔ مگر نے جلد ہی ماہم پر قابو پا لیا۔

''یہ منصور بھائی کبھی کبھی ارسل کی طرح شرارتیں کرنے لگتے ہیں۔ بالکل بچوں ۔'' وہ پھر بے خیالی میں ارسل کو سوچنے لگی۔

☆★☆

پانچویں دن شام کے وقت ماہم، لان میں بیٹھی تھی۔ ملازم نے ارسل کے آنے کی دی۔ ماہم نے اسے وہیں اپنے پاس بلا لیا۔

''السلام علیکم ماہم آپی!'' وہ مؤدب سا بولا۔

''وعلیکم السلام! آؤ ارسل! بیٹھو۔'' ماہم نے سامنے والے صوفے کی طرف اشارہ

''وہ شاہم ہے گھر پر؟'' وہ ذرا نروس ہوا۔

''ہاں گھر پر ہی ہے۔ اس نے کہاں جانا ہے۔ جب سے تم اسلام آباد گئے ہو، وہ ن اپنے کمرے میں بند پڑی رہتی ہے۔''

رسل کے اسلام آباد جانے کا جھوٹ شاہم نے ہی ماہم کو سنایا تھا۔

رسل، شاہم کے جھوٹ کی گہرائی جان کر دل ہی دل میں شرمندہ ہوا۔

''چائے پیو گے یا کافی؟'' ماہم نے گود میں دھرا اخبار اٹھا کر سائیڈ ٹیبل پر دھر
''نہیں، تھینک یُو۔ ابھی آفس سے چائے پی کر آ رہا ہوں۔ آپ سے ایک
لینی تھی بلکہ ریکویسٹ ہے۔'' اس نے بہت عاجزی سے کہا۔
''ہاں کہو۔'' ملازمہ کو پکارتی ماہم رک گئی۔
''وہ میں شام کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں، ڈنر کا پروگرام ہے۔ ایکچو
ناراض ہے تو.....'' اس نے زمانے بھر کی مسکینیت اپنے چہرے پر طاری کر لی۔
''ٹھیک ہے مگر..... مگر ذرا جلدی چھوڑ جانا۔ ورنہ منصور ناراض ہوں گے۔''
اس نے ماجدہ کو شاہم کو بلانے کے لئے کہا تھا۔
تھوڑی ہی دیر میں سر جھاڑ منہ پھاڑ، شاہم حاضر تھی۔
جہاں شاہم کو اتنے دن بعد ارسل کو دیکھ کر خوشی اور حیرانی ہوئی تھی، وہاں ار
اسے اس حالت میں دیکھ کر بے اختیار کھڑا ہو گیا۔
''شاہم! ارسل تمہیں لینے آیا ہے۔ جاؤ جلدی سے اپنا حلیہ درست کرو۔''
''جی۔'' وہ ماہم کے حکم کی تعمیل کے لئے تیزی سے پلٹی۔
ماہم یہاں موجود نہ ہوتی تو وہ بھی اسے خوب کھری کھری سنا کر ساتھ جا
انکار کر دیتی۔
پھر سارے راستے گاڑی میں بھی ارسل چپ رہا۔ شاہم کی بھی کچھ کہنے کی
ہوئی۔ تقریباً آدھے گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد وہ ایک بلڈنگ کے نیچے اپنی گاڑی
کرنے لگا۔ ایک اپارٹمنٹ کے باہر اسے رکنے کا کہہ کر وہ خود اندر چلا گیا۔ ا
اندھیرے میں ڈوبا تھا۔ لائٹس روشن کر کے وہ اسے لینے باہر آیا۔
''اب آؤ۔'' اس نے بیرونی دروازہ کھول دیا
وہ جو ڈیڑھ گھنٹے سے ارسل کی سنجیدگی سے شش و پنج میں مبتلا تھی، آگے بڑھی
پر قدم دھرتے ہی وہ رُک گئی۔ گلاب کی پتیوں کا ریڈ کارپٹ کافی اندر تک جا کر
کمرے پر ختم ہوتا تھا۔ اسے یونہی کھڑا دیکھ کر ارسل نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ا
ایک ہاتھ سے دروازہ بند کرتے ہوئے وہ اس کے ہمراہ بڑا دھیرج سے چلنے لگا۔
بھینی بھینی سی خوشبو چاروں اور پھیلی ہوئی تھی۔ ایک بہت معنی خیز سی پُراسرار خا
کے حواسوں پر چھائی جا رہی تھی۔ ارسل نے ہینڈل گھما کر کمرے کا دروازہ کھ
کمرے کا منظر دیکھ کر وہ ساکت رہ گئی، جیسے ابھی یہاں کسی دُلہن نے آ کر سج



عنابی بیڈ شیٹ، عنابی پردے اور عنابی ہی رنگ کا قالین بچھا ہوا تھا۔ بیڈ کا سارا وسط
ائی میں گلاب کی پتیوں سے بھرا تھا۔ چھت سے بہت نازک، خوب صورت سا کرسٹل
نوس لٹک رہا تھا۔ بیڈ کے اطراف میں باریک ریشم جیسا ریڈ کلر کا پردہ بہت اچھا تاثر
رہا تھا۔ کمرے میں صرف کینڈل اسٹینڈ کی روشنی تھی۔ اس ٹھنڈی مدھم روشنی میں کمرہ
کسی حیرت کدے کا ہی حصہ لگ رہا تھا۔ وہ سانس روکے بت بنی کھڑی تھی۔
''ارسل!'' وہ جیسے ٹرانس کی حالت میں بولی۔
''ہوں۔'' اس نے ہنکارا بھرا۔
''واٹ اِز دِس؟''
''یہ سب کا سب صرف تمہارے لئے ہے۔'' وہ ایک جذب کے عالم میں بولا۔
ریڈ کڑھائی والی لونگ شرٹ اور تنگ چوڑی دار پائجامہ میں ہلکا سا سنگھار کئے وہ
ے مکمل طور پر اس کمرے میں سج کے بیٹھنے والی چیز لگ رہی تھی۔ اس کی بڑی آرزو تھی
جب شاہم اس کمرے میں آئے تو اس نے ریڈ کلر پہنا ہو۔
''اب بس ایک چیز کی کمی ہے۔ آں، آں، کہاں گئی؟ جسٹ ون سیکنڈ۔'' وہ اپنے
ٹ کی جیبیں ٹٹول کے تلاشی لے رہا تھا۔
''مل گئی۔'' اس نے گولڈن کلر کا کیس نکالا تھا۔ پھر اس کے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی
ں ڈائمنڈ رِنگ بڑی محبت سے پہنا دی۔
''یہ کس لئے؟'' اس نے اپنی خوشی کو چھپاتے ارسل کی محویت توڑی۔
''جہاں تک میری معلومات ہے، منہ دکھائی کا تحفہ دیا جاتا ہے۔''
اپنے نچلے ہونٹ کا بایاں کونا دانتوں تلے دبائے اس کی آنکھوں میں شرارت کی
ک تھی۔
''ارسل! تم.....'' اسے مارنے کے لئے آنکھیں نکال کر اس نے بازو اُٹھایا مگر پہلی
فعہ اُسے سچ مچ حیا آ گئی۔
''یُو نو، میں ناراض تھی تم سے بہت زیادہ۔'' شاہم نے یاد آنے پر اسے بتایا۔
''ہم نہ ہوں گے تو کون منائے گا تمہیں؟''
''یہ بری بات ہے، ہر بات پہ رُوٹھا نہ کرو۔'' مدھم لہجہ کی سرگوشی اُسے مدہوش کئے
دے رہی تھی۔

''ارسل! تم یہاں کیوں شفٹ ہو گئے ہو؟'' اس نے ماحول کے فسوں کو کم کر
کے لئے موضوع بدل دیا۔

''یہاں شفٹ نہیں ہوا فی الحال۔ باقی تفصیل فارغ وقت میں سناؤں گا۔ ابھی
ڈنر کے لئے جا رہے ہیں۔ میں نے ماہم آپی سے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں جلدی چھوڑ جاؤں
گا۔'' اس نے ابھی اسے کچھ بھی بتانا مناسب نہ سمجھا تھا۔

☆☆☆

وہ آج منصور کے بے حد اصرار پر شاپنگ کے لئے نکلی تھی۔ اسے خریداری کر
دکان سے دکان تک پھرنا، بھاؤ تاؤ، گھنٹوں کپڑوں کی چھان پھٹک سے سخت چڑ تھی۔ اُ
کی ہر طرح کی شاپنگ منصور ہی کرتا تھا۔ کبھی کبھار منصور اس کا ہر اعتراض اور بے زار
بالائے طاق رکھ کر اسے اپنے ساتھ گھسیٹ لاتا۔ یہ الگ بات تھی کہ تب بھی ہر چیز منص
کی مرضی کی ہوتی۔

الٹرا ساؤنڈ رپورٹ کے مطابق اس بار بیٹی کی پیدائش متوقع تھی۔ منصور بہت خو
تھا۔ بار بار ماہم سے کہتا۔

''بیٹی کے آ جانے سے ہماری فیملی کتنی کمپلیٹ اور خوبصورت لگے گی۔ بیٹی تو خدا
رحمت ہوتی ہے۔''

وہ بہت چاؤ سے بیٹی کے لئے پہلی خریداری کرنے آیا تھا۔ ہر طرح کے بے
شاپس اس نے کھنگال ڈالیں۔ شاپنگ مکمل کر کے اس نے ڈرائیور کو سامان گاڑی
رکھنے کے لئے بھیج دیا۔

اس نے ماہم کے لئے صرف تین سوٹ خریدے تھے۔ اب اس کا خیال تھا ک
اسے جیولر کے پاس لے جائے۔ اوپر سے سیڑھیاں اُترتے ہوئے منصور اُسے احتیاط
پاؤں رکھنے کی ہدایت کر رہا تھا، جب اچانک ماہم کی نظر تھوڑی دُور واچ شاپ سے
وجود پر پڑتے ہی ٹھہر سی گئی۔ وہ منصور کے سہارے آخری سیڑھی اُتر تو گئی تھی، مگر م
ایک قدم چلنے کی ہمت نہ رہی۔ اسی لمحے وہ لاپروا سا شخص جو اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا، ماہ
اس کی نظریں جم گئیں۔ اس کی آنکھوں میں بھی وہ ہی چمک اور چہرے پر تاثرا
اُبھرے تھے، جو ماہم کے تھے۔

''چلو بھی ماہی! رُک کیوں گئیں؟'' منصور نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ہلایا۔ اس کا
یک دم ٹوٹا۔



''من..... منصور! گھر چلیں پلیز۔'' اس نے التجائیہ کہا۔

''ہاں چلتے ہیں۔ بس تمہیں جیولری دلوا دوں۔'' منصور اُس کی حالت سے بے خبر

''نہیں منصور! میرا دل گھبرا رہا ہے، میں ٹھیک نہیں ہوں۔'' اس نے اپنے گرتے
کو سنبھالنے کے لئے منصور کا بازو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس کی رنگت لمحوں میں متغیر ہو
تھی۔

''اچھا، دھیان سے۔''

اُس نے منصور کے ساتھ پلٹتے ہوئے دُھندلی سی آخری نگاہ اُس پہ ڈالی، جو ابھی
وہیں پر کھڑا تھا۔

☆☆☆

وہ بہت ریش ڈرائیونگ کر کے گھر پہنچا تھا۔ اس نے دو، تین بار ماہم سے کہا بھی کہ
اکٹر کے پاس چلتے ہیں۔'' مگر اس نے سختی سے انکار کر دیا۔ ماہم کی زردی مائل رنگت
پھر ڈاکٹر کے پاس نہ جانے کی ضد، منصور کو غصہ تو آیا تھا، مگر وہ مجبور تھا۔ بیڈ پہ بٹھا کر
نے جگ سے پانی کا گلاس بھر کر اس کے منہ سے لگا دیا۔ چند گھونٹ بھر کر اس نے
س ہاتھ سے پرے کر دیا۔

''پلیز منصور! میں ریسٹ کرنا چاہتی ہوں۔'' وہ تا دھیما بولی تھی کہ اسے سننے کے
ے اس کی طرف جھکنا پڑا۔

پھر اس کے پیچھے تکیے درست کرتے اس نے احتیاط سے لٹا کر کمبل اس کے اوپر
ھا دیا۔

''میں ایسا کرتا.....''

''پلیز منصور! جسٹ لیو می الون۔'' (پلیز منصور! مجھے اکیلا چھوڑ دو۔'' اس نے سرخ
ھیں کھول کر منصور کو بیچ میں ٹوک دیا۔

''فائن.....'' اُسے بے بسی سے تکتا، وہ اس کے پاس سے اُٹھ گیا۔ اسے ماہم کا
ں اپنے پاس سے اُٹھا دینا اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ لاؤنج میں آ کر بیٹھ گیا۔ رات ہو گئی، مگر
اپنے کمرے میں نہیں گیا۔ ماجدہ نے کھانا لگنے کی اطلاع دے دی۔ اس نے ماجدہ کو
ہم کو بلانے بھیجا۔ ماجدہ اکیلی ہی واپس لوٹ آئی۔

''بی بی جی کہہ رہی ہیں، بھوک نہیں۔ دوبارہ انہیں کوئی نہ بلانے آئے۔'' وہ کوئی

منصور کے علاوہ بھلا کون ہو سکتا تھا؟ اکیلے کبھی اس نے بیٹھ کر کھایا نہیں تھا۔ وہ بھی اس طرح کی صورتِ حال میں کہ اس کی محبوب بیوی کی حالت ناساز تھی۔ منصور کے دل پر ماہم کی طرف سے ایک بوجھ سا آ پڑا تھا۔ وہ اُس کا دل رکھنے کے لئے ہی ٹیبل تک جاتی۔

رات کو وہ جان بوجھ کر دیر سے اوپر آیا تھا۔ اسے شاید ماہم کے بلاوے کا انتظار تھا مگر..... جب وہ کمرے میں آیا تو وہ سلیپنگ پلز لے کر گہری نیند سو رہی تھی۔ وہ کا حیران ہوا۔ کیونکہ ماہم کی نیند بہت اچھی تھی۔ وہ کبھی بھی پلز کا استعمال نہیں کرتی تھی۔

☆☆☆

''کہاں تھے تم؟'' اس نے اپنے گرم ہوئے دماغ کو فی الحال ٹھنڈا رکھ کے پوچھا۔

''تم سوئے نہیں ابھی تک۔'' ریفریجریٹر سے بوتل نکالتے وہ اُلٹا اس سے پوچھ لگا۔

''تھکتا نہیں ہے، روز رات کو ایک ہی سوال کرتے۔'' بوتل کا ڈھکنا کھول کر اس منہ سے لگا لیا۔

''تم بھی تو ہر روز ایک ہی جواب دیتے ہو۔'' اس نے ناگواری سے اسے دیکھا ت

''تُو نے میری نیندیں حرام کر دی ہیں۔'' اس نے گھورتے ہوئے کہا۔

''نہ تو میں کوئی تئیس سال کا نوجوان ہوں، نہ ہی تم کوئی الہڑ مٹیار، پھر نیند کیوں آتی؟''

''کس کے ساتھ تھا اب تک؟'' وہ خود بھی جانتا تھا، مگر اس کے منہ سے سننا چ تھا۔ یہ سوال بھی تھوڑے سے ردوبدل سے وہ اکثر ہی کرتا تھا۔

''سلونی میرے ساتھ تھی۔''

رات کے تین بجے فریج سے کھانا ڈھونڈتے اس نے اس کا مطلوبہ جواب اُ دے دیا تھا۔

''سلونی کی ماں کا منہ بند کر کے نہیں گیا تھا۔ سارا شہر اس نے سر پر اٹھایا ہوا۔ سات سو فون مجھے کھڑکا چکی ہے، تیرے سیل فون کا سوئچ آف کیوں تھا؟'' اس نے ساتھ ہی سب پوچھ لیا۔

''وہ اسے ساتھ نہیں بھیج رہی تھی، میں وہاں رُکنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی ڈیمانڈ زیادہ اس کے منہ میں ٹھونس کر گیا تھا۔''



چکن کا سالن اس نے اپنے لئے نکال لیا۔ سلاد اور رائتہ، ٹیبل تک منتقل کرتے اس نے بتایا۔

''ٹائمنگ میں گڑبڑ کیوں کی؟''

''اس سلونی..... کو پہلے شاپنگ کروائی۔'' اوون میں سالن گرم کرتے وہ بڑے تحمل سے اس کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا، بالکل اپنی طبیعت کے برعکس۔

''ابھی بھی.....''

وہ کچھ اور کہنے ہی والا تھا کہ فون کی بیل چیخنے لگی۔ غنی نے بڑے معنی خیز انداز سے اس کی طرف دیکھا۔ سلونی کی ماں کا ہی فون تھا، جواب اُس نے ریسیو نہیں کرنا تھا۔

مگر وہ اپنی ازلی لاپروائی اور ڈھٹائی سے بریانی کو فل سائز پلیٹ میں نکال رہا تھا۔

دوسری دفعہ فون کی پانچویں بیل پہ اس نے باہر آ کر بے نیازی سے فون ریسیو کیا۔

''ہاں بول، کون ہے؟'' وہی مخصوص لب و لہجہ۔

''ہاں، سلونی..... اسے تو راستے میں پولیس نے اریسٹ کر لیا۔ بلکہ میں نے خود دیا ہے اسے پولیس کو۔ ابھی تھوڑی دیر میں صبح ہونے والی ہے، تیری دکانداری تو ویسے بھی ٹھپ ہو چکی ہو گی۔ سویرے نہیں تو کل شام تک وہ خود ہی تیری عزت مآب بیٹی کو چھوڑ جائیں گے۔'' تفصیل سنا کر مفید مشورہ بھی بتا دیا تھا۔

''بکواس بند کر بڑھیا! لاکھ سے زیادہ کی تو شاپنگ کر لی ہے اس نے۔ مجھے مزید بحث میں مت ڈالو۔ دوبارہ فون کیا تو میرا بھیجہ اُلٹ جائے گا، پھر تیرے پاس آ کر تیری ہی زبان میں سمجھاؤں گا۔'' ریسیور زور سے پٹخ کر وہ غصے سے پلٹا۔

غنی نے واپس کچن میں جاتے اُس من موجی بندے کو دیکھا۔ وہ اُس کی رگ رگ سے واقف تھا۔ جلد ہی بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔

ہاف پینٹ، چوڑے اور مضبوط کسرتی جسم پر ہاف سلیولیس ٹی شرٹ چڑھائے، بائیں کان میں وائٹ گولڈ کی بالی۔ شاور لے کر بالوں کو اُنگلیوں سے سلجھایا گیا تھا، جن سے ابھی بھی پانی کے ننھے قطرے اس کی پیشانی پر گر رہے تھے۔ یہ کاشف حسین عرف کاشا چوہدری تھا۔ دنیا بھر سے اُکھڑا ہوا، من موجی، اپنے آپ میں مست و مگن رہنے والا۔

''کاشا! اگر پولیس نے روک ہی لیا تھا تو کیا اس کی اصلیت بتانا ضروری تھا؟ خود تو انہیں چار چھلڑ دے کے بچ گیا اور اسے پھنسا دیا۔ یار! تُو اسے بھی اپنی بہن یا کزن بتا

سکتا تھا۔'' غنی نے تاسف سے کہا۔

''غنی.....!'' اس نے کچن کے شیلف کے قریب ایستادہ غنی کو یک دم ہی گر
سے دبوچ لیا۔

''ایسی لڑکی، جسے کوئی بھی پیسے دے کر لے جا سکتا ہے، اسے اپنی ماں، بہ
لوں؟'' اس کی سرخ آنکھوں میں غراہٹ تھی۔

''میرا گریبان چھوڑ، کاشا!'' غنی نے اپنا گریبان دبوچے اس کے دونوں ہاتھو
دباؤ بڑھایا۔ اس نے جھٹکے سے اپنے ہاتھ ہٹا لئے۔

''سات سال سے تم کاشا کو نہیں سمجھ سکے۔'' وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ ''پی کر
رہا ہوں، مدہوش تم ہو رہے ہو۔'' نفی میں سر ہلا کر اس نے اطمینان سے کھانا کھانا ش
کر دیا۔

''اب میرا منہ نہ دیکھ، بیٹھ کھا لے تُو بھی۔'' اس بار بت بنے کھڑے غنی ک
دعوت دی۔

''تھینک یو، میں کھا چکا ہوں۔'' وہ چبا چبا کر بولا۔

''یوں مسکینوں کی طرح کھڑا نہ ہو۔ جا میرے لئے ایک کپ چائے بنا د
پلیز!'' اس نے پچکارا۔

غنی نے چپ چاپ اس کے لئے چائے کا کپ بنا دیا۔ وہ کھانا ختم کر چکا تو
نے برتن اٹھا کر سنک میں دھر دیئے۔ وہ اپنے کمرے میں داخل ہوتے، دروازے میں
گیا۔

''غنی! آج میں نے مارکیٹ میں ماہم کو دیکھا تھا۔'' اتنا کہہ کر اس نے کھٹاک
دروازہ بند کر دیا۔ غنی اُس کے الفاظ پہ غور کرتا رہ گیا۔

☆☆☆

اُس کے آفس جانے تک وہ نیند میں تھی۔ وہ تیار ہو کر آفس کے لئے نکل
ساڑھے گیارہ بجے وہ ناشتے کے لئے آیا تو ماہم نہ صرف اُٹھ گئی تھی، بلکہ گم صم سی
چائے پی رہی تھی۔

منصور نے بہت غور سے اسے دیکھا تھا۔ ایک ہی رات میں اس کی آنکھوں
مدھم سے حلقے پڑ گئے تھے۔ آنکھوں میں ہلکی ہلکی سرخی ابھی بھی تھی۔ چہرہ بہت ہی ڈل
رہا تھا۔



''کیا بات ہے ماہم؟'' اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''کچھ نہیں۔'' اس نے نظریں جھکا دی تھیں یا چرا لی تھیں، وہ جان نہ پایا۔

''اوں..... ہوں۔ تم اچھی بھلی تھیں۔ شاپنگ کے دوران بہت فریش تھیں۔ پھر
چانک کیا ہو گیا تھا؟'' منصور بغور اسے دیکھ رہا تھا۔ ایک سیکنڈ کے لئے وہ بھونچکا رہ گئی۔

''کوئی پرابلم نہیں ہے منصور!'' اس نے غیر محسوس انداز سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ ''یُو نو
یل، میں ہمیشہ شاپنگ کرنے سے گھبراتی ہوں۔ تم نے اتنا اصرار کیا تو میں چلی گئی۔''
ں نے بوکھلا کر وضاحت دی۔

''آپ بریک فاسٹ لیں منصور! میں روم میں جا رہی ہوں۔'' وہ اس سے کنی
لتراتی اُٹھ کر چلی گئی۔

''تو تم کہتی ہو، کچھ خاص نہیں۔'' اپنے برابر ماہم کو خالی جگہ دیکھ کر وہ بڑبڑایا۔

اتنے سال سے جو اس کے اندر چور چھپا بیٹھا تھا، وہ مارکیٹ میں کاشا کو دیکھتے ہی
برار ہو گیا تھا۔ وہ اپنے تئیں منصور سے شادی والے روز اپنا ماضی دفن کر چکی تھی۔ وہ
نی، جو نظر اندازی کے باوجود ہمیشہ اس کے سنگ رہا تھا۔ اگر وہ اپنے ماضی کو بھول چکی
ی تو منصور کے ساتھ اُس کے اُکھڑے اور قدرے لاتعلق روّیے کی وجہ کیا تھی؟

منصور کی محبت وہ اپنا حق سمجھ کر وصول کرتی، جہاں دینے کی باری آتی، وہ خود پہ بے
زی، بے حسی کا خول چڑھا لیتی۔ منصور کے حصے میں بے زاری، اُکتاہٹ اور اُس کی
ٹ دھرمی ہی آتی۔ اور یہ سب کرنے میں وہ خود کو حق بجانب ٹھہراتی۔

گزرے کل سے وابستہ اس شخص سے اس کی رفاقت محض دو برس کی تھی۔ منصور کے
اتھ کو پانچ سال ہونے کو آئے تھے۔ منصور اس کا شوہر، بچوں کا باپ، اس کا سائبان،
ما کی عزت کا محافظ تھا۔ اس کی عقل، یہ سب تسلیم کرنے سے قاصر تھی۔

☆☆☆

اُس نے آنکھیں بند کر کے، ذہن کو سونے پر آمادہ کرنا چاہا، پھر تھوڑی دیر میں بے چینی
ے آنکھیں کھول دیں۔ منصور کو تکنے لگی، جو سو رہا تھا۔ منصور کا بازو ابھی بھی اس کے سر
ے نیچے تھا۔ اس نے بہت آہستگی سے اپنا سر اُٹھا کر منصور کا بازو نیچے سے نکال دیا اور
ما جگہ پہ تکیہ درست کر لیا اور کروٹ کے بل لیٹ گئی۔ بیڈ شیٹ پر آڑی ترچھی لکیریں
ینچتے اس کی نظروں کے سامنے کسی کا چہرہ تھا۔

پچھلے تین دن سے وہ اذیت سے گزر رہی تھی۔ جو ہو چکا، وہ اسے یاد نہیں کرنا چاہتی

تھی۔ جو تھا اس کے پاس، اس کے ساتھ رہنے میں بھی اسے دشواری ہوتی تھی۔
وہ جھٹکے سے اُٹھ بیٹھی۔ رخ موڑ کر منصور کو دیکھا۔ کافی دیر اس بے خبر کو تکتے گئی۔
''میں بے وفا نہیں ہوں، مگر تم سے وفا نہ کر سکی۔'' اس نے دل ہی دل میں ا
مخاطب کیا
تکیے کے پاس دھرا موبائل اٹھایا، احتیاط سے چلتی ہوئی ٹی وی لاؤنج میں آ گئی۔
سی روشنی میں وہ صوفے میں دھنس کر اسی لینڈ لائن نمبر کو یاد کرنے لگی، جو کبھی اس کی
ٹیک کا اکلوتا نمبر ہوتا تھا۔ جو اتنا عرصہ گزرنے پر بھی اسے یاد تھا۔
بیل ہو رہی تھی، مگر کوئی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ اس نے دوبارہ کوشش کی۔
وہ رات کو اپنے بیڈ روم فون سیٹ کا پلگ نکال کر سوتا تھا۔ اس رات اسے یاد نہیں
تھا۔ بجتی گھنٹی نے اُس کی نیند خراب کر دی تھی۔ منہ پر رکھا تکیہ اس نے پرے ہٹایا،
ہوئی سرخ آنکھوں سے فون کو گھورا۔ حواس تو بیدار ہو ہی چکے تھے۔ اوندھے منہ لیٹ
اُس نے کال ریسیو کر لی۔
''ہیلو.....'' اس کی آواز میں کھا جانے والی غراہٹ تھی۔
دوسری طرف مکمل سکوت چھا گیا۔ الفاظ اس کے حلق میں ہی پھنس گئے۔
''ہیلو.....'' اب وہ کافی سختی سے بولا۔
اب بھی اگر جواب نہ ملتا تو وہ گالیوں کا طوفان اُگلنے والا تھا۔
''ہ.....ہیلو.....'' خاموش گھر میں اس کی مدھم سی آواز دل کی دھڑکنوں کو منتشر کر
کاشا کی آنکھیں اس ڈری سہمی ''ہیلو'' پر کھل گئیں۔ اس کی یادداشت بہت اچھ
اس یادداشت نے تو اسے اب تک خوار کر رکھا تھا۔ وہ پہچان گیا تھا۔ اسے خود بھ
کال کا شدت سے انتظار تھا۔
''ماہم.....'' اس نام کو لیتے وہ سیدھا ہو گیا۔
''ابھی تلک یاد ہے تمہیں۔'' اس کے منہ سے اپنا نام سنتے ہی اس کی آنکھوں
تیر گئی۔
''بھولی ہی کب ہو۔'' اس نے گمبھیر لہجے میں کہا۔
''ٹھیک ہو؟'' اس کے اقرار نے اسے حوصلہ دیا۔
یہ احساس بہت پُرسکون کرنے والا ہوتا ہے کہ جس کے لئے ہم بے چین
ہیں، چین اسے بھی نہیں۔



''ہاں تقریباً۔ اینڈ یُو؟'' کاشا کے لہجہ میں آپوں آپ نرمی گھلتی جا رہی تھی۔ ورنہ کاشا
نیند خراب کرنے والے کی شامت بہت بری آتی تھی۔
''چھوڑو میری.....''
''تمہیں ہی تو نہیں چھوڑ سکتا۔''
ماہم کے اندر کا قفل ٹوٹ گیا۔ اس کے خود پر بٹھائے گئے سارے پہرے اُٹھ گئے۔
''مل سکتے ہو؟''
کاشا کے ایک جملے نے اس سے کتنا بڑا فیصلہ کروا لیا تھا۔ اپنے اس اقدام کی وجہ وہ
سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔

☆☆☆

''ارسل! میں کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ.....''
''میں جانتا ہوں کہ تم کبھی کبھی ہی سوچتی ہو۔'' اس کی اچکی بات کو اپنے مطلب میں
نکلتے اس نے ''ہی'' پر خاصا زور دیا۔
''تم کہاں کے مفکر، فلاسفر ہو؟ میں ان پڑھ، جاہل، عقل سے پیدل۔'' وہ چڑ کر بولی۔
''شکر ہے۔'' اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر شکر ادا کیا۔ ''میں تو سمجھتا تھا کہ مجھے
حقیقت سے روشناس کروانا پڑے گا۔ مگر تھینکس گاڈ، تم خود ہی اپنا ٹیلنٹ جانتی ہو۔'' اس
نے آمین کے انداز میں ہاتھ منہ پر پھیرے۔
''اگر مجھ میں اتنی ہی خامیاں نظر آتی ہیں تو ڈھونڈ لو، کوئی اپنی جیسی خوبیوں سے پُر۔
میں چلتی ہوں۔''
''ہاں ہاں، جاؤ۔ ڈھونڈ لوں گا۔ تم جیسی ہزار ملیں گی۔'' ارسل نے اپنا نچلا ہونٹ
دانت میں دبا کر اپنی آواز میں ذرا رعب پیدا کیا۔
شاہم نے سب سے بڑا اور وزنی فلور کشن اٹھایا اور اس کی کمر پر پوری طاقت سے
مار دیا۔
''ہائے اللہ! میں مر گیا..... ہائے بابا جانی۔'' وہ منہ کے بل صوفے پر گر کر زور زور
سے چیخنے لگا۔
''چلاؤ، مرو، میں جا رہی ہوں۔'' اس کے واویلا کی پروا کیے بغیر وہ دروازے کی
طرف بڑھی۔
''ہائے..... میری ریڑھ کی ہڈی کے سارے مہرے ہل گئے۔ میرا نچلا دھڑ بے کار

ہو گیا۔'' اسے باہر جاتا دیکھ کر اُس نے اور اونچی دردناک آواز میں پکے بین ڈالنا شروع کر دیئے۔ شاہم جیسی کمزور دل اور معصوم لڑکی۔ ارسل کے درد کو کیسے نظر انداز کر دیتی دبے دبے قدموں چلتی اس کے قریب آ بیٹھی، جو اب صوفے سے قالین پر گرا ہوا تھا۔

''ارسل! کیا ہوا؟'' اس کا بازو ہلاتے اس کے اندر خوف سا بھر گیا۔

''کوئی ہے جو اس قاتل حسینہ کی معصومیت کو دیکھے۔ مارتی بھی خود ہے، پھر پوچھتی بھی مرنے والے سے ہے کہ کیا ہوا؟'' وہ ابھی بھی باز نہیں آ رہا تھا۔

شاہم کا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔

''اب ٹکر ٹکر کیا تکے جا رہی ہو؟ مجھے پکڑ کر سیدھا کرو اور میرا موبائل پکڑاؤ۔''

شاہم نے اس کا حکم بجا لانے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہ کی اور ایڑیوں تک زور لگا کر اسے بمشکل سیدھا کیا اور ریک پہ پڑا موبائل اُٹھا کر اسے پکڑا دیا۔ موبائل تھامتے ہی وہ نمبر ڈائل کرنے لگا۔

''کسے فون کر رہے ہو؟'' اس کی اتنی عجلت شاہم سے ہضم نہیں ہوئی تھی۔

''پولیس کو، ابھی جیل بھجواتا ہوں تمہیں۔ یہاں کا ایڈریس اور تمہارے اس جارحانہ اقدامِ قتل کے متعلق بتاؤں گا۔ دیکھنا، لیڈیز پولیس کیسی تمہاری چھترول کرتی ہے۔'' بولتا جا رہا تھا اور شاہم کا خون خشک ہو رہا تھا۔

''قسم لے لو ارسل! میں نے جان بوجھ کر اتنی زور سے نہیں مارا۔'' اس نے ارسل سے موبائل چھین لیا۔

ارسل کی ایکٹنگ اتنی زبردست تھی کہ وہ خوف اور پریشانی سے جان نہ پائی۔

''ادھر دو موبائل۔ سب سمجھتا ہوں میں۔ سیدھی سیدھی ٹارگٹ کلنگ تھی۔ جوان، مرد کے گھر میں دن دہاڑے گھس کر اسے مارنے کی کوشش کے بعد اس کی کمر توڑ کر معاشرے کا بوجھ بنا دیا۔'' وہ پھر نمبر ڈائل کرنے لگا۔

''تم خود جو چاہو، مجھے سزا دے لو مگر اس.....''

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ منت کے انداز میں سر جھکائے ہونٹ کاٹنے لگی۔ ارسل کی ساری شوخیاں اس کے آنسوؤں تک ہی تھیں۔

''نن.....نن.....نہیں.....روؤ مت، چونکہ میرے تم سے پرانے مراسم ہیں، ان کو مدِنظر رکھتے ہوئے میں تمہاری سزا میں تخفیف کر سکتا ہوں۔''

اس کے چہرے کو ٹھوڑی سے پکڑ کر اونچا کرتا وہ بولا۔



تخفیف کا لفظ اس کے بالکل پلے نہیں پڑا تھا۔ ''کیا کر سکتے ہو؟''

''تمہاری کم سے کم سزا یہ ہے کہ تمہیں میرے ساتھ چائے پینی ہو گی۔'' اس نے احسانِ عظیم کرتے ہوئے جتایا۔

''میں ابھی بنا لاتی ہوں۔'' وہ پھرتی سے اُٹھنے لگی۔

''نہیں، تم بیٹھو۔ تمہارے ہاتھ کی بنی چائے پینے سے بہتر ہے کہ میں جا کر گٹر میں ڈبکیاں لگا لوں۔'' اس نے دھیمی بڑبڑاہٹ سے کہا، جو وہ سن نہ سکی۔

''پھر چائے کون بنائے گا؟'' ارسل کی حالت کے پیشِ نظر اس نے پوچھا۔

''میں بناؤں گا، بذات، بقلم خود۔'' وہ بالکل ٹھیک ٹھاک کھڑا ہو گیا۔

''ارسل!'' وہ اتنی زور سے چلائی کہ وہ کان دبا کر باہر بھاگا۔

مگر اس بار وہ کمرے کا دروازہ لاک کرنا نہیں بھولا تھا۔

☆☆☆

''کاشا! تُو اس رات کیا بتا رہا تھا؟'' آج سنڈے تھا۔ وہ دونوں باتوں کے موڈ میں تھے۔

''کیا بتایا تھا؟'' اسے بالکل یاد نہیں آیا

''ماہم کا ذکر کیا تھا، تُو نے۔''

غنی کو وہ معصوم سی لڑکی آج بھی یاد تھی، جو کاشا کے لئے بہت بے تاب رہتی تھی۔

''ہاں، ماہم ملی تھی..... میرا مطلب تھا، نظر آئی تھی، اپنے شوہر کے ساتھ۔'' کاشا نے ٹی وی کی آواز کم کرتے ہوئے اسے بتایا۔

''تجھے کیسے پتہ کہ اس کے ساتھ جو مرد تھا، وہ شوہر تھا اس کا؟''

کاشا کے ساتھ اتنا وقت گزار کے بھی غنی اسے سمجھنے میں اکثر غلطی کر جاتا تھا۔ یا کاشا کی باتیں ہی ایسی تھیں کہ دونوں میں مطابقت نہیں پائی جاتی تھی۔

''جہاں تک میں اسے جانتا تھا، آئی تھنک وہ تجھ سے اتنی محبت کرتی تھی کہ تیری خاطر ساری عمر کنواری رہ سکتی تھی۔

غنی نے سگریٹ کے تمباکو اور چرس کو برابر مسلتے ہوئے ماہم کے بارے میں اپنی رائے پیش کی۔

''وہ نہ صرف شادی کر چکی ہے، بلکہ ماں بھی بننے والی ہے۔'' کاشا نے کہا۔

ٹیبل پر اپنی دونوں ٹانگیں رکھتے غنی کا منہ کھلا رہ گیا۔

"ملا تھا تُو اُس سے؟" اُس نے مشکوک نگاہوں سے گھورا۔

"نہیں، اُس کی چال سے اندازہ لگایا۔ یہ بھی کہ وہ پہلی دفعہ ماں نہیں بن رہی
کاشا، غنی کے ساتھ نہ کبھی اتنا سنجیدہ مذاق کرتا تھا نہ ہی جھوٹ بولتا تھا۔

اس کے اندازے حتیٰ کہ قیاس آرائیاں بھی کبھی غلط ثابت نہیں ہوتی تھیں غنی، ت
مسلنا چھوڑ کر اسے سن رہا تھا۔ کاشا کا تجربہ بول رہا تھا اور وہ بے یقین تھا۔ کاشا نے
کی ہتھیلی پکڑ کر اپنی ہتھیلی پر سارا تمباکو اور چرس اُلٹ لی اور اسے انگوٹھے اور انگلی کی
سے باریک مسلنے لگا۔

"اچھی لڑکی تھی۔" غنی نے خالی سگریٹ اسے بھرنے کے لئے پکڑا دیئے۔

"تھی سے کیا مراد؟..... ہوگی بہت جلد۔"

دونوں سگریٹ کو برابر جوڑ کر بڑے ماہرانہ انداز میں ٹھونک ٹھونک کر برابر بھر
ہوئے اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"ہوگی مطلب؟" غنی نے بھنویں اچکائیں۔

"مطلب، عنقریب تیری بھابی اور میری پہلی بیوی۔" اس نے غنی کی محدود سوچ
سماعت کے لئے دھماکا کیا۔

"یار! کھل کے بول نا۔" اُس نے لائٹر جلا کر اس کی طرف بڑھایا۔

"اس کا شوہر بہت موٹی آسامی ہے۔ کروڑوں کا مالک۔ یعنی پانچوں گھی میں۔
میرا فالٹ نہیں بلکہ گڈ لک ہے کہ اس نے بذاتِ خود مجھے کال کی ہے بلکہ ملاقات بھی
ہوگئی ہے، جب سونے کی چڑیا خود ہی پنجرے میں آ رہی ہے تو کیا مجھے اسے دانہ ڈا
تکلیف ہوتی ہے؟" وہ بہت بے حس لگ رہا تھا۔ وہ صوفے کی پشت سے ٹیک لگا
آنکھیں موندے، کش پہ کش لگا رہا تھا۔

"وہ شادی شدہ ہے، کاشا! تُو اُس پر....." غنی بات مکمل نہ کر سکا۔

"غنی.....!" اس نے تنبیہی انداز میں ہاتھ اُٹھا کر تھوڑی سی آنکھیں کھولیں۔ "یہ
بحث کا موڈ ہے، نہ ہی لیکچر کا۔ بہت سکون مل رہا ہے۔ بے سکون نہ کر۔" وہ مزید نا
پسار کر ہلکی ہلکی غنودگی میں جانے لگا۔

غنی نے سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل کر سارا غصہ اُس پر اُتارا تھا۔

☆☆☆

کاشا سے دوبارہ رابطہ کر کے، اتنے عرصے بعد اُس کی آواز سن کر، وہ خود کو بہت



محسوس کر رہی تھی۔ اُسے ایسا لگتا تھا، کئی صدیوں سے اس کے دل و دماغ پہ بوجھ تھا،
صرف کاشا کے ہونے نے بالکل سرکا دیا تھا۔ اس کے جذبات و احساسات، اس کی
ح اب تک کسی زندان میں مقید تھی، جسے اب آزادی نصیب ہوئی تھی۔ کھل کر سانس
کی اجازت مل گئی تھی۔ ساری حدیں، ساری پابندیاں ختم ہوگئی ہوں۔ وہ بہت خوش
نے لگی تھی۔ کاشا سے اُس کی ملاقات بھی طے تھی۔

"منصور! آپ مجھے سیلون تک ڈراپ کر دیں گے؟"

چائے پیتے ہوئے اُس نے منصور سے پوچھا، جو نیوز پیپر میں مگن تھا، ساتھ میں
ئے کے سِپ بھی لے رہا تھا۔ اسے ابھی تھوڑی دیر میں آفس واپس جانا تھا۔

"سیلون؟" منصور نے اخبار چھوڑ کر حیرت سے دیکھا۔

ماہم کو سجنے سنورنے کا خیال منصور ہی دلاتا تھا، ورنہ اس نے کب خود پر توجہ دی تھی۔
معاملہ اُلٹ تھا۔ اب اُس کے سامنے منصور نہیں، کاشا تھا۔ خوب صورت عورت، کاشا
کمزوری تھی، اتنی تو واقف تھی ہی وہ اُس سے

"یا، آف کورس، آئی وانٹ چینج۔ دل اوب گیا ہے میرا اس روٹین لائف سے۔"
نے خالی پلیٹیں اکٹھی کرتے ہوئے کہا۔ اپنا دھیان پلیٹوں میں لگا کر وہ آسانی سے
ور سے نظریں چرا سکتی تھی۔

"آں..... ہاں، تم تیار ہو جاؤ۔ میں ڈراپ کر دوں گا۔ واپسی پہ ڈرائیور تمہیں پِک
لے گا۔" ماہم کی اس تبدیلی کو ہضم کرتا وہ مزید کچھ نہ کہہ سکا۔

منصور کی خاطر اُس نے اپنا سراپا کبھی قابلِ توجہ نہ جانا تھا۔ مگر وہ کاشا کے لئے تبدیلی
تی تھی۔ کاشا کو وہ گلابی رنگ میں اچھی لگتی تھی۔ وہ جب کبھی گلابی رنگ پہنتی تھی، وہ
کھول کر تعریف کرتا تھا۔ پھر وہ اس کی خواہش پر یہ رنگ پہننے لگی۔ اس سے بچھڑنے
بعد اس نے کبھی یہ رنگ زیبِ تن نہیں کیا تھا۔ اس کے کپڑوں کی شاپنگ اور کلر
یکشن بھی منصور ہی کرتا تھا۔ وہ اکثر اکیلا ہی شاپنگ کے لئے چلا جاتا۔ ماہم کو اُس کی
ک پہ بھروسہ تھا۔ منصور دو تین بار اُس کے لئے گلابی رنگ لایا مگر اُس نے یہ کہہ کر منع
دیا کہ مجھے یہ رنگ اچھا نہیں لگتا۔ حالانکہ یہ رنگ، منصور کا بھی فیورٹ تھا۔

آج وہ کاشا سے ملنے جا رہی تھی تو ہر لحاظ سے کاشا کی پسند کے سانچے میں ڈھلنا
تی تھی۔ اس کے اندر ایک عجیب سی ہلچل اور دبی دبی سی خوشی کا احساس ہلکورے لے
تھا۔ "وہ غلط کر رہی ہے۔" یہ اُس کے ضمیر کی آواز تھی، جس پر وہ کان دھرنا بے وقوفی

سمجھ رہی تھی۔ وہ سنور کاشا کے لئے رہی تھی، مگر منصور کی آواز، اُس کے چھوٹے چھوٹے جملے اُس کے کانوں میں گونج رہے تھے

وہ کبھی گھر سے اکیلی باہر نہیں گئی تھی۔ منصور کی طرف سے ایسی کوئی پابندی نہ تھی، اس نے خود ہی اپنی ذات پر بیرونی دنیا کی طرف کھلنے والا ہر دروازہ بند کر رکھا تھا۔ منصور کو کہتی آئی تھی کہ ''مجھے زیادہ سوشلائزڈ ہونا اچھا نہیں لگتا۔ میں گیدرنگ میں ایز فِیل نہیں کرتی۔'' کبھی منصور یا شاہم کا باہر کھانا کھانے کا پروگرام بن جاتا تو ا ڈھیروں منتیں کر کے منانا پڑتا، تب بھی اس کا مزاج اور نخرا عروج پر ہوتا۔ وہ ابھی ٹھیک سے انجوائے بھی نہ کر پاتے، وہ واپسی کا شور مچا دیتی۔

شاہم، منصور کو بتاتی تھی، جب تک بابا جان زندہ تھے، ماہم آپی نے سارے گھر ذمہ داری بڑی خوش اسلوبی سے اٹھائی ہوئی تھی۔ وہ گھر کے اکثر کام خود ہی نمٹاتی تھیں مہینہ بھر کا راشن، بل جمع کروانے، گھر کی خریداری اور شاپنگ میں تو ان کی جان تھی۔ ا کی فرینڈز کے ساتھ اکثر گیٹ ٹو گیدر، ون ڈش پارٹیز بھی چلتی رہتی تھیں۔ بابا نے کبھی نہیں کیا تھا۔

منصور؛ شاہم کی زبانی اُس کی پرانی زندگی کے بہت سے قصے سن چکا تھا، جن میں ایک خوش باش، بے فکری اور ہنستی مسکراتی لڑکی ہوا کرتی تھی۔

آہستہ آہستہ منصور نے اس سے اور اس کی عادات سے بھی سمجھوتہ کر لیا۔ اس کا کرنے کا نرالا ہی انداز تھا، بس محبوب کی ہاں میں ہاں ملایئے جاؤ۔

وہ اپنے لمبے بالوں میں برش پھیر رہی تھی کہ شاہم چلی آئی۔

''ہیلو آپی.....!'' اگلے ہی لمحہ اُس کی حیرت دیدنی تھی۔ وہ ماہم کے کمرے شاذ و نادر ہی آتی تھی۔ جھٹکا اُسے گلابی رنگ کے شلوار قمیض میں ملبوس، نک سک سے ماہم کو دیکھ کر لگا تھا۔

''واؤ.....ویئر آر یُو گوئنگ؟'' (آپ کہاں جا رہی ہیں؟)

اس نے ایک عرصہ سے ماہم کو اس حالت میں نہیں دیکھا تھا۔

''ہاں.....'' اس کی تعریف پہ ہلکا سا جھینپتے ہوئے وہ اُس کا اگلا سوال گول کر گئی

''منصور بھائی تیار ہو رہے ہیں؟'' شاہم نے ڈریسنگ روم کے بند دروازے اندازہ لگایا۔

''نہیں تو۔'' شاہم کو نفی میں جواب دیتے ہوئے ماہم کو احساس ہوا تھا کہ



ت پر آئی ہے۔

''کیوں؟ منصور بھائی کہاں ہیں؟''

ماہم فی الحال منصور کا ذکر سننا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے ماتھے پہ خوامخواہ ہی بل پڑ ئے۔

''میں اکیلی ہی جا رہی ہوں۔ منصور نہیں۔'' وہ آئینے میں اپنا عکس دیکھتی، بالوں کو ڑے میں سمیٹنے لگی۔

''آپ اکیلی کہاں جا.....''

''اسٹاپ اِٹ شاہم! تم اپنی انویسٹی گیشن بند کرو۔ ضروری کام ہے۔ اب ایک ب کو پکڑ کر بتاؤں؟'' اس نے شاہم کو بہت سختی سے ٹوکا۔

وہ بہت کم جھوٹ بولتی تھی۔ جھوٹ اُس کی تربیت کا کبھی حصہ نہیں رہا تھا۔ مگر اب وہ جو نکھ مچولی کا کھیل کھیلنے جا رہی تھی، اس میں قدم قدم پر جھوٹ کے سہارے کی ضرورت تھی۔

''جی..... میں نے تو یونہی پوچھ لیا۔'' شاہم نے سر جھکا کر آنکھوں کو چھلکنے سے کا۔ ماہم کبھی اس سے اتنا اونچا نہیں بولی تھی۔ اس سے مزید وہاں رُکنا دوبھر ہو گیا۔ وہ پسی کے لئے مڑ گئی۔

ماہم نے ترچھی نظر سے اُس کے اُترے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ اُسے دُکھ تو ہوا، مگر س نے دل ہی دل میں شکر بھی ادا کیا۔ شاہم نے یقیناً اب سیدھی اپنے کمرے میں جانا ا اور اس کا گھر سے نکلنا اور آسان ہو گیا۔ اگر وہ اُسے نہ ڈانٹتی تو وہ اس کا بہت وقت ائع کر دیتی۔

''آپی!'' ہینڈل پہ ہاتھ دھرے وہ یک دم پلٹی۔ ''آپ نے گلابی رنگ کافی سال د پہنا ہے۔ شاید.....شادی کے بعد پہلی بار۔''

وہ اتنا کہہ کر جا چکی تھی۔ اُس کے یہ الفاظ، ماہم کے گرد کتنی دیر اودھم مچاتے رہے۔

☆★☆

سلور اسپون میں وہ کاشا کے دیئے گئے وقت سے دس منٹ لیٹ پہنچی تھی۔ گھر میں وئیں گھنٹے ڈرائیور رہتا تھا، مگر اُس نے سمجھ داری سے کام لیتے ہوئے ڈرائیور کو ساتھ لانا ناسب نہ سمجھا۔ اُسے ڈرائیونگ آتی تو تھی مگر بہت عرصے سے گاڑی ڈرائیو نہیں کی تھی، ی لئے وہ بہت آہستہ گاڑی چلا کے آئی تھی۔

کاشا ریزرو ڈ ٹیبل پر موجود تھا۔ اس نے ہال میں داخل ہوتی ماہم کو دیکھا اور پھر رُخ

موڑ کر گلاس وال کے دوسری طرف بنے سوئمنگ پول کو دیکھنے لگا۔

اُس کی طرف بڑھتے ہوئے ماہم کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ اس نے آپ چھپانے کے لئے بڑی سی شال کندھوں کے گرد لپیٹی ہوئی تھی۔ گرم شال میں اس پر ہلکی ہلکی کپکپی طاری ہو گئی۔ کاشا کے سامنے چیئر سنبھالتے اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ کاشا ابھی بھی گلاس وال سے پرے نظریں جمائے تھا۔ وہ بولنے میں کی پہل کی منتظر تھی، سو خاموش رہی۔

''اگر تمہارا حافظہ کمزور نہیں تو تمہیں یاد ہونا چاہئے کہ میں بہت پنکچوئل ہوں۔ کا انتظار مجھے زحمت لگتا ہے اور تم..... پورے دس منٹ تاخیر سے آئی ہو۔'' کاشا کے سے نکلے پہلے الفاظ اور اندازِ تخاطب پر وہ حق دق رہ گئی۔

کاشا چوہدری کو دوغلا پن راس ہی نہیں آتا تھا۔ عورت کے معاملے میں وہ اپنی شخصیت کو خول میں بند کرنے کا قائل نہیں تھا۔ مگر پہلے کی بات اور تھی، تب وہ ایک عمر کی لڑکی تھی، جس کے بہت سے خواب تھے۔ ان خوابوں کا کاشا چوہدری اکلوتا تھا۔ وہ اس سے جو کہتا تھا، وہ مان لیتی تھی۔ وہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے۔ پر اب وہ ایک لڑکی تھی۔ کوئی جذباتی الہڑ دوشیزہ نہیں۔ وہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ زندگی بسر تھی۔ اس گزرے وقت نے اس کے اندر کی نرمی کو بہت سی تبدیلیوں سے گزار کر میں بدل دیا تھا۔ کاشا کو اُس کے سامنے بہت محتاط رہنا تھا۔ اس نے اپنا مقصد کرنے کے لئے نئے سرے سے اسے ''روزی پکچر'' دکھانی تھی۔ اس دوغلے پن کا نبھانا اسے خاصا مشکل لگ رہا تھا۔

''سس..... سوری کاشف! ایکچوئیلی رش اتنا زیادہ تھا کہ میں.....''

''لگتا ہے، تم اس رش سے آج ہی متعارف ہوئی ہو۔'' وہ اسے کاٹ کر بولا۔

''اِٹس او کے۔ نیکسٹ ٹائم بی کیئرفل۔'' اس کے جھکے سر کو گھورتے اُس نے اشارہ کیا۔

یہ سر ہمیشہ کاشا کے سامنے ہی جھکتا آیا تھا۔ اس زبان پر معافی کا لفظ بھی کا لئے ہی ادا ہوتا تھا۔ بہت دفعہ اُسے لگا کرتا تھا کہ سارا قصور کاشا کا ہے۔ اُسے معا چاہئے۔ مگر ایسا کبھی ہوا نہیں تھا۔ وہ تو اپنی گاڑی سے کسی راہ گیر کو ٹکر مار کر بھی سور والا نہیں تھا۔ وہ بے قصور ہو کر بھی اسے منایا کرتی تھی، اس کی منت سماجت کرتی تھ کے پیچھے پھرا کرتی تھی۔



منصور کے معاملے میں وہ بالکل اُلٹ تھی۔ غلطی اور بدتمیزی کر کے شرمندہ ہونے بجائے وہ ڈھٹائی سے منصور سے بول چال بھی بند کر دیتی۔ منصور کو ہی اُس کے ہر ے رویے کے سامنے جھکنا پڑتا۔

''بائی دے وے، یُو آر لکنگ سو پریٹی۔'' (ویسے تم بہت اچھی لگ رہی ہو) وہ کبھی ئی تعریف نہیں کرتا تھا۔

''تھینک یُو۔'' وہ جھینپ سی گئی۔

ویٹر کے کھانا سرو کرنے تک وہ دونوں خاموش رہے۔

''کب شادی ہوئی تمہاری؟'' گلاس میں پانی انڈیلتے اس نے پوچھا۔

''تقریباً پانچ سال ہونے والے ہیں۔'' وہ ذرا سا ہچکچائی تھی۔ کاشا کا انداز اور ل دونوں اُس کے لئے غیر متوقع تھے۔ اس کا خیال تھا، کاشا اُس سے پوچھے گا کہ اس تمہارے ساتھ مرد کون تھا تو میں اُسے ساری رُوداد سناؤں گی۔

''اینڈ کڈز؟'' اس کے پاس تمام تفصیلات موجود تھیں۔

''ٹوئنز بیٹے ہیں۔'' ماہم کو کاشا کا یوں منہ پھاڑ کر بچوں کا پوچھ لینا اچھا نہیں لگا تھا۔

''تم نے شادی کب کی؟'' اس کے مزید کچھ نہ پوچھنے پر ماہم نے اپنا تجسس دُور رنا چاہا۔

''میں نے یہ نہیں کہا کہ میں نے شادی کر لی ہے۔'' روسٹ چکن کا بڑا سا ٹکڑا، انٹے میں پھنسائے منہ کی طرف لے جاتے اُس نے روک لیا۔

''مطلب، شادی نہیں کی؟'' ماہم نے اس کے انداز میں دریافت کیا۔

''نہیں۔ مجھے اپنے بارے میں اندازے لگانے والے لوگ پسند نہیں۔'' ساتھ ہی یک اور تنبیہ..... ماہم کے جائنیز رائس حلق میں ہی اٹک گئے۔

کاشا کے ''نہیں'' پر بے یقینی کا عالم تھا۔

''ابھی تک تنہا کیوں ہو؟ کوئی ملی نہیں؟''

اُس کا دل انجانے میں خوش فہم ہوا تھا۔ ہو نہ ہو، اُس کی اب تک تنہائی کی وجہ ہی ہے۔

''کہہ سکتی ہو۔ ملی بھی نہیں..... ویسے بھی میری زندگی کا صرف ضرورت کا خانہ، عورت کے لئے خالی ہے، سو کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔''

اس کا اپنا مخصوص اندازِ گفتگو تھا، جس پہ قابو پانا اُس کے لئے خاصا مشکل تھا۔

''تم بالکل بھی نہیں بدلے۔'' وہ بڑی دلکشی سے مسکرائی۔

کاشا کی عورت کے معاملے میں ذہنیت سے وہ واقف تھی۔

''کیوں، مجھے بدلنا تھا؟'' وہ اُلٹا اس سے پوچھنے لگا۔

''بالکل نہیں۔ تم ایسے ہی بہت اچھے اور مکمل لگتے ہو۔''

تین گھنٹے گزرنے کی اُنہیں خبر ہی نہیں ہوئی۔ وہ دو دفعہ کریم کافی بھی منگوا چکے تھے۔ اُن کی گزری یادیں، باتیں، چھوٹے چھوٹے قصے، قہقہے، موجودہ اپنی زندگیوں کی روداد بے شمار سوالات، بہت کچھ تھا کہنے سننے کو۔ کاشا کو غنی کی کال موصول ہوئی تو ماہم کو بھی یاد آیا کہ منصور کے گھر لوٹنے میں تھوڑی ہی دیر باقی ہے۔ ایک دوسرے سے فون پر رابطہ رکھنے اور پھر کبھی ملاقات کا عہد کر کے وہ اُٹھے تھے۔

☆☆☆



وہ اکیلی کبھی کہیں نہیں گئی تھی۔ اب وہ خاصی گھبرا رہی تھی۔ ملاقات پہ جانے کے لئے جو ایک جوش سا اُس کے اندر اُٹھا تھا، اب وہ بیٹھ چکا تھا۔ اگر اُسے ایمرجنسی میں کہیں جانا ہوتا تو وہ منصور کو کال کر دیا کرتی، وہ خود آ جاتا یا ڈرائیور کو ہدایات کر دیتا۔ اس کے اور منصور کے تمام رشتے دار مشترکہ تھے۔ کسی رشتے دار کے ہاں جانے کا بہانہ بھی نہیں گھڑا جا سکتا تھا۔ دوست کے ہاں جانا تو دُور اُس نے کبھی اپنی کسی دوست کا ذکر تک نہیں کیا تھا۔ اُس کے پاس واحد حل یہ تھا کہ منصور بے خبر ہی رہے کہ وہ گھر سے باہر گئی تھی۔ اس پہ مستزاد ڈرائیور کی موجودگی میں خود ڈرائیو کر کے۔

ان کے گھر میں کون سا رشتوں کے بکھیڑے اور لڑائی جھگڑے تھے۔ ماہم اور شاہم بہنیں تھیں اور منصور جان چھڑکنے والا شوہر

ملازموں نے بھی کبھی اندر کے معاملات میں دلچسپی نہیں لی تھی، نہ کبھی اِدھر اُدھر کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ کوئی بھی ملازم، منصور سے ذکر نہیں کرے گا۔ اُس نے غسل کر کے کپڑے تبدیل کئے، بالوں کی ڈھیلی سی چوٹی باندھ کر وہ روزمرہ کے حلیے میں آ گئی۔

چھ بجے منصور کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ وہ مزید درست ہو کے بیٹھ گئی۔ جب سے اُس کا پریگنینسی پیریڈ شروع ہوا تھا، منصور نے اُسے زیادہ سیڑھیاں چڑھنے اُترنے سے منع کر دیا تھا۔ اُس کا بیڈروم اوپر تھا۔ اس نے بہت اصرار کیا کہ وقتی طور پر نیچے کسی روم میں شفٹ ہو جائے، مگر وہ نہ مانی۔ اب وہ نیچے منصور کا انتظار نہیں کرتی تھی۔ وہ بچوں سے ڈھیر سارا لاڈ پیار کر کے خود ہی اوپر آ جاتا۔ وہ صرف کھانے پینے کے اوقات میں ہی نیچے جاتی تھی۔

وہ جیسے ہی اپنی گاڑی سے اُترا، اُس کی نگاہ پورچ میں کسی گاڑی کے ٹائر کے نشانات پہ پڑی۔ شاہم کی گاڑی پورچ میں نہیں تھی۔ یعنی وہ گھر پر نہیں تھی۔

''کون آیا تھا؟'' اس نے قریب کھڑے سکیورٹی گارڈ سے پوچھا، جو اسے دیکھ کر

قریب آ گیا تھا۔

''جی، آیا تو کوئی بھی نہیں۔'' اُس نے نفی میں سر ہلاتے کہا۔

''تو یہ کیچڑ بھرے ٹائر کس کی گاڑی کی یادگار ہیں؟'' اُس کی نفاست پسند طبیعت کیچڑ سے کراہت ہو رہی تھی۔

''میڈم باہر گئی تھیں سر!''

''میڈم؟'' اس نے زیرِ لب دہرایا۔

وہ ''میڈم'' ماہم کو پکارتا تھا۔

''اتنے دنوں سے بارش تو ہوئی نہیں، پھر کیا کسی گٹر میں ٹائر پھنس گئے تھے؟ گاڑ اچھی طرح دھو اور پورچ بھی صاف کرواؤ۔ صاف جگہوں پر چلایا کرو۔'' منصور اب ڈرائ کو لتاڑنے لگا تھا۔

''سر! میڈم خود ڈرائیو کر کے گئی تھیں۔'' وہ باادب صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

''میڈم ک.....'' بلا ارادہ ہی اپنی پھسلتی زبان کو اس نے جلد روک لیا۔ ملازمو وہ شک میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ماہم بستر میں گھسی بظاہر میگزین میں مصروف اندر ہی اندر بے چین ہو رہی تھی۔

''السلام علیکم!'' کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس نے حسبِ معمول سلام کیا۔ کو اور بریف کیس صوفے پر دھر کے اپنے ہاتھ میں پکڑا چھوٹا سا براؤن لفافہ ڈریسنگ ٹیب پہ رکھ دیا۔

''وعلیکم السلام!'' اس نے مصنوعی مسکراہٹ کی نمائش کی۔

''آج تم کہیں گئی تھیں؟'' ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتا اس کے قریب کھڑا وہ پوچھ تھا۔

''آں..... ہاں، پر آپ کو..... مم..... میرا مطلب ہے ضروری کام۔'' وہ یک سٹپٹا گئی۔ منصور کو اتنی جلدی کس نے باخبر کر دیا۔ جبکہ شاہم بھی موجود نہیں تھی۔

''کیا ضروری کام آن پڑا تھا؟'' بیڈ پہ بیٹھ کر وہ شوز اُتارنے لگا۔

''بس، ایک پرانی دوست سے ملنے کو جی چاہ رہا تھا، اسی کی طرف گئی تھی۔'' زبان لڑکھڑاہٹ پہ قابو پا کے اُس نے جھوٹ سے یہ معاملہ نمٹایا۔

''کون سی دوست؟'' اُس کی حیرانی بجا تھی۔

''ہے کوئی۔ آپ نہیں جانتے۔''



''تم مجھے آفس فون کر کے بتا تو دیتیں۔'' اُس نے سرسری سا کہا۔

''اگر میں اپنی مرضی سے کہیں چلی گئی ہوں تو آپ نے فوراً گلہ کر دیا ہے۔ بتا تو تیں.... میں اپنی مرضی سے کہیں آ، جا بھی نہیں سکتی۔ آپ کی پرمیشن (اجازت) چاہئے؟'' اشا سے ملاقات کا اثر تھا۔ اب اُس کے رنگ ڈھنگ بدلنے ہی تھے۔ اُلٹا چور کوتوال کو انٹے کے مصداق اُسے پتنگے لگ گئے۔

''سوری ماہی! میں نے یونہی کہہ دیا۔'' اس کا ناراض، پھولا ہوا چہرہ، منصور کو بالکل ٹھنڈا کر گیا۔ وہ ماہم کی طبیعت کے پیشِ نظر کافی محتاط رہنے لگا تھا۔ ابھی بھی وہ ماحول کی کشیدگی کو کم کرنے کے لئے بولا۔

''اچھا چھوڑو۔ میں تمہارے لئے کچھ لایا ہوں۔''

اُس نے ڈریسنگ ٹیبل پہ دھرا پیکٹ کھولا، جس میں موتیا اور گلاب کے گجرے تھے۔ ب بھی اس کی گاڑی سگنل پر رُکتی تو وہ لڑکے سے ماہم کے لئے گجرے خرید لیا کرتا تھا۔

''ہاتھ دو۔''

ماہم نے گود میں دھرا ہاتھ اُس کی طرف نہیں بڑھایا تو اُس نے خود پکڑ لیا اور دونوں لائیوں میں گجرے پہنا دیئے۔

''دیکھو، کتنے خوب صورت لگ رہے ہیں۔'' اس نے ماہم کے دونوں ہاتھوں کو محبت سے تکتے کہا۔

''گجرے خوب صورت ہیں۔'' ماہم نے بے دلی سے اُس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''میں تمہارے ہاتھوں کی تعریف کر رہا ہوں۔'' وہ برجستگی سے بولا۔ وہ مبہم سی مسکرا ی۔ منصور کے لئے اُس کی اتنی سی مسکراہٹ ہی کافی تھی۔

''گڈ! اب اس مسکراتے چہرے اور خوب صورت ہاتھوں سے مجھے ایک اسٹرانگ سا چائے کا کپ بنا دو، پلیز!'' منصور نے بڑے لاڈ سے فرمائش کی۔

''میں بہت تھکی ہوئی ہوں، ماجدہ سے کہہ دیتی ہوں۔'' وہ اتنی تھکی ہوئی نہیں تھی۔ اُسے منصور کا قرب اور دُلار بہت چبھ رہا تھا۔

''تم ریسٹ کرو۔ میں چینج کر کے خود چائے بناؤں گا، جسے پی کر تمہاری ساری تھکن اُتر جائے گی۔'' اُس کی آنکھوں میں شرارت جھلکنے لگی۔

ایسی صورتِ حال میں ماہم کوئی کام نکال لیا کرتی تھی۔

''میں آپ کے کپڑے.....'' وہ ابھی آدھی اُٹھی تھی کہ اُس نے پھر پکڑ کر بٹھا دیا۔

''اوں، ہوں..... میں خود کپڑے نکال لوں گا۔ بلکہ اپنے شوز بھی ریک میں ر
ہوں۔ تم لیٹ جاؤ۔'' اس نے کندھوں سے پکڑ کر اسے لٹا دیا۔ اور اپنی چیزیں سمیٹنے لگ

☆★☆

''میں چلتی ہوں ارسل! بہت دیر ہوگئی ہے۔'' وہ اپنا بیگ اور موبائل پکڑے اُٹھ
''اتنی بھی جلدی نہ کرو۔ تھوڑی دیر بیٹھو، مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔''
نے اُس کا بیگ واپس پکڑ کر اپنی گود میں دھر لیا۔
''پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے جو فضول میں ایویں ہانک رہے تھے۔ اب جانے لگی ہ
تمہیں ضروری بات یاد آ گئی ہے۔ ہاں بولو۔'' وہ اُسے گھورتے ہوئے بادل نخوا
بیٹھ گئی۔
''ہم شادی کب کر رہے ہیں؟'' اس نے کچھ بھی خاص نہیں کہنا تھا۔ وہ شاہم
روکنا چاہتا تھا۔
''ابھی میرا شادی کا موڈ نہیں ہے۔ جب ہوگا تو تمہیں انفارم کر دوں گی۔ بس
کچھ؟''
''کہیں تمہیں یہ خوش فہمی تو نہیں ہے کہ تمہیں ابھی سولہ کا سن لگا ہے؟''
''کہیں تمہیں یہ تو غلط فہمی نہیں ہوگئی کہ تم ایموشنلی ریٹائرڈ ہو گئے ہو؟'' وہ ا
بھی زیادہ برجستگی سے بولی۔
''لسن شامی! میرے دادا ابو کہتے تھے کہ جوان مرد کو تنہا نہیں رہنا چاہئے۔ خ
نصیب کرے، بہت سیانے تھے میرے دادا ابو۔'' اُس نے بونگے پن سے بتایا۔
وہ اپنا بیگ اُس سے کھینچ کر اُٹھ گئی۔
''دِس اِز ناٹ فیئر یار! میرے مرحوم دادا کی پوری بات تو سنتی جاؤ۔'' وہ اُ
پیچھے لپک کر اُس کے سامنے دیوار بن کر کھڑا ہو گیا۔
''اسٹوپڈ انسان! مجھے تمہارے دادا کی گوہر افشانیوں سے کوئی غرض نہیں۔ ا
کے اقوالِ زرّیں کسی اور کو سنانا۔ ہٹو میرے راستے سے۔''
''نیور یار! ایک تو میں سچ بولتا ہوں اور تم غصہ کرتی ہو۔'' وہ ابھی بھی اپنی با
اُسے منوانے پر تُلا ہوا تھا۔
''ارسل کے بچے! تم کب.....''
''ہیں؟ میرے بچے؟..... کہاں ہیں میرے بچے؟'' وہ اُچک اُچک کر ا



پیچھے دیکھنے لگا، جیسے سچ مچ یہاں کوئی موجود ہو۔''
''تم سے کتنی بار کہا ہے کہ بچوں کو میری اجازت کے بغیر خالہ کے گھر نہ بھیجا کرو۔ تم
نتی ہی نہیں ہو۔ پھر کہو گی، میں جھگڑا کرتا ہوں۔ اب انہیں کون واپس لائے گا؟''
وہ اتنی مصنوعی سنجیدگی سے یہ سب کہہ رہا تھا کہ شاہم ہونقوں کی طرح منہ کھولے
سے دیکھتی رہ گئی۔
''میں ایک منٹ بھی اور یہاں نہیں رُکوں گی۔ ہٹو پرے۔'' اُس نے اُسے دھکا دیا
سیڑھیاں اُتر گئی۔
''نہیں سدھرو گی تم۔'' اُسے اپنی پشت پر ارسل کی آواز سنائی دی۔

☆★☆

وہ رات کے دو بجے کاشا کے ساتھ موبائل پہ مصروف تھی۔ وہ سوتے ہوئے منصور کو
موڑ کر باہر کاؤچ پہ آ بیٹھی تھی۔
ماہم میں بہت سی خوشگوار تبدیلیاں آتی جا رہی تھیں، جو یقیناً صرف کاشا کے ہونے
ے تھیں۔ وہ بہت خوش رہنے لگی تھی۔ مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں کا گھیراؤ کئے رکھتی۔ اور
ں کی کھلی کھلی رنگت، منصور کو محصور کئے رکھتی۔ وہ اسے خوش دیکھ کر خوش تھا۔ اُس کے
شتوں کو بھی خبر نہیں تھی، ماہم کی اس قدر اچانک تبدیلی کی وجہ کیا ہے۔
ڈھیروں باتیں، ہنسی مذاق، دنیا جہاں کے تبصرے، لاتعداد واقعات تھے، جو اُن کے
موضوعِ بحث بنے رہتے۔ اس نے ایک بار بھی یہ سوچنے کی زحمت نہیں کی تھی کہ جو وہ
رہی ہے، اس میں غلط کتنا ہے اور درست کس قدر۔
وہ منصور کے ساتھ دھوکا اور اپنے بچوں سے زیادتی کی مرتکب ہو رہی تھی۔ اس نے
پنے اردگرد موجود رشتوں سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اگر ان کا سوچتی تو پھر دل پہ بندھ
نا پڑتا تھا، جو وہ کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ اس نے اپنی خواہشات، دل و دماغ اور
بات کو بالکل بے لگام چھوڑ دیا تھا۔ وہ اپنی حرکات پر شرمندہ نہیں تھی، بلکہ حد سے
تی ہی جا رہی تھی۔ کاشا کے سنگ اُسے کہاں تک چلنا ہے، اس نئے سرے سے شروع
نے والے تعلق کو کس موڑ تک لے جانا ہے، وہ نہیں جانتی تھی۔ وہ منصور سے جھوٹ
تا، غلط بیانیاں کرنے لگی تھی۔
جو آنکھ مچولی کا کھیل اُس نے شروع کر لیا تھا، اس میں جھوٹ کا شمار لازم تھا۔ وہ
ب شریف باپ کی اولاد تھی، جنہوں نے اپنی ساری زندگی پروفیسری اور پارٹ ٹائم میں

بچوں کو پڑھانے میں گزاری تھی۔ جو اپنے طالب علموں کو ہمیشہ سچ اور حق کا سب
کرواتے رہے تھے۔ جن کے اسٹوڈنٹس اُن کا نام بہت عزت و احترام سے لیتے
بہت سے طلبہ و طالبات کا یہ کہنا تھا کہ پروفیسر زوہیب رضا نے اُن کی زندگی کو
رُخ دیا۔

اس پروفیسر نے اپنی دونوں بیٹیوں کی پرورش میں کہیں کوئی کمی نہیں چھوڑی
ماہم اُن کی پہلی اولاد، کئی سال انتظار کروا کے اُن کے آنگن میں رونق بن کے اُتری
شاہم اس سے بھی پانچ برس چھوٹی تھی۔ اس نے پورے پانچ برس اکلوتے پن میں
کے ماں باپ کا بے انتہا پیار و شفقت سمیٹی تھی۔ اس کے باپ ذوہیب نے اپنی
لاڈلی بیٹی، ماہم کو گن گن کر اچھائیوں کا مجسمہ بنایا تھا۔ ان کا کہنا تھا، بیٹی کی تربیت
کسی قسم کی کوتاہی نہیں ہونی چاہئے۔ عورت ایک ترقی یافتہ معاشرے کی بنیاد ہوتی
جب ایک لڑکی اچھی بیٹی ہو، تب ہی وہ دوسرے رشتے نبھانے کے قابل ہوتی ہے
اچھی بہن، سلیقہ مند بیوی، بااخلاق بہو اور اپنی آئندہ نسل کی امین ہوتی ہے۔ اسے
باپ کے اتنے سال لگا کر ذہن نشین کروائے گئے سبق یاد تھے۔ بھولی وہ کچھ بھی نہیں
مگر نظر انداز اُس نے سب کچھ کر دیا تھا۔

اُس کے باپ نے اُس کی ماں کے مرنے کے بعد دوسری عورت کو زندگی
نہیں بنایا تھا اور اس نے ایک غیرت مند شوہر کی بیوی اور بچوں کی ماں ہو کر ایک
اپنی زندگی میں شامل کر لیا۔ جو اب اُس کی دن، رات کی مصروفیت کا حصہ تھا۔

''ماہم! ہمارے اس تعلق کا کلائمکس کیا ہوگا؟'' نئی انگلش مووی کے بیچ اُ
اُس نے اچانک ہی ٹریک بدلا۔

''کاشف!.....آئی ڈونٹ نو۔'' وہ کنفیوزڈ ہو گئی تھی۔

''بٹ وائے؟ یُو آر ناٹ اے چائلڈ۔'' (مگر کیوں؟ تم کوئی بچی نہیں ہو)
بولا۔ ماہم کا جواب اُسے زہر لگا تھا۔

کاشا اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور کسی بھی عورت کو نہ تو اتنا وقت دینے کا قائل
ہی کسی عورت سے اپنے تعلق کو ایک ماہ سے زیادہ برداشت کرتا تھا۔ اس نے
برسوں میں جو ماہم کے ساتھ دو سال گزارے تھے، اس میں بھی ماہم کی خواہش
بڑا ہاتھ تھا۔ کاشا خود کبھی اُس کے دیئے گئے وقت پر نہیں پہنچا تھا مگر ماہم ہمیشہ وقت
تھی۔ وہ کبھی مصروف ہوتا اور بیشتر ماہم کی کال جان بوجھ کر ریسیو نہ کرتا۔ اور اگر



ماہم کے ساتھ مجبوراً بھی ہو جاتا تو وہ اس پر چیختا چلاتا، کئی کئی دن کے لئے بول چال بند
کر دیتا تھا۔ وہ اُس کی منت سماجت کر کے اُسے مناتی۔ مگر اس بار تو اس نے ایسی کوئی
حرکت نہیں کی تھی۔

وہ محتاط رہ کر اُس کے ساتھ چلا تھا۔ کاشا وہ بندہ تھا، جس نے اپنی زندگی کو کبھی احتیاط
سے نہیں برتا تھا۔ احتیاط اُس کی فطرت کا خاصا نہیں تھی۔ وہ بہت بڑے بڑے کام بنا غور
و فکر کئے اور معمولی کاموں پہ غور و خوض کرتا تھا۔ اُسے ماہم کی پہلی فون کال کا انتظار ضرور
رہا تھا، پر اُس نے ماہم کے توسط سے سب حاصل کرنے کے لئے زیادہ تردد نہیں کیا تھا۔
وہ خود ہی سب کچھ کرتی جا رہی تھی۔ کاشا اُسے صرف بہلا رہا تھا۔ اُس نے اپنے تئیں
ماہم کو اتنا رام تو کر لیا ہی تھا کہ جب وہ اُس سے مستقبل کی پلاننگ کرتا تو وہ خاموشی سے
آنکھیں بند کر کے اُس کی ہاں میں ہاں ملاتی۔

''ماہم! تم اس تعلق کو واضح شکل دو یا..... یا پھر مجھے چھوڑ دو۔'' اُس کا صاف گو
انداز تھا۔

وہ گھر آئی سونے کی مرغی سے انڈے لینا چاہتا تھا۔ اگر وہ اُس کا پھینکا گیا دانہ
کھانے پر راضی ہو جاتی اُس کی زندگی میں ایسی کوئی حسرت نہ تھی۔ نہ ہی وہ لالچ میں اپنا
بہت سا وقت برباد کرنا چاہتا تھا۔

''نن.....نہیں کاشف! میں تمہیں چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اور پلیز تم بھی
ایسا کچھ مت سوچو۔'' وہ بہت بے بسی سے بولی۔

''اور منصور؟'' کاشا نے شوہر کے متعلق اُس کی رائے چاہی۔ اپنے لئے تو ماہم کی
بے قراریاں اس سے چھپی ہوئی نہیں تھیں۔

''وہ.....وہ تو شروع دن سے میرے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔ اب تو میرا صبر
بھی تھکنے لگا ہے۔'' منصور کے ذکر پر اُس کے لہجے میں کڑواہٹ سی اُتر آئی۔

''تم مجھ سے ملو، ماہم! ایز سُون ایز پاسیبل۔'' (جتنی جلدی ممکن ہو)
ماہم نے اُسے گرین سگنل دے دیا تھا۔ وہ تاخیر کیوں کرتا۔

''کاشف! میرے لئے ملنے آنا اتنا ایزی نہیں ہے۔'' اس نے مجبوری بتائی۔

''پلیز ماہم! ٹرائی کرو، جسٹ ونس ٹائم۔'' (صرف ایک بار)

''ویل، آئی وِل ٹرائی (میں کوشش کروں گی) پھر تمہیں انفارم کر دوں گی۔'' وہ اپنے
اردگرد سے اتنی بے نیاز تھی کہ اسے اپنی تلاش میں آئے منصور کی بھی خبر نہ ہو سکی۔

''ماہی.....!'' اس نے دھیمے سے پکارا۔

ماہم کے ہاتھ سے موبائل اُچھل کر کارپٹ پر جا گرا۔ اس نے حواس باختہ چہرہ مو

''اس وقت کس سے بات کر رہی تھیں؟'' چند خاموش لمحوں کا توقف کر کے اُس جھک کر گرا موبائل اُٹھا کے اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے سرسری سا پوچھا۔

''وہ..... وہ..... وہ میری فرینڈ تھی۔ اُس کے ہزبینڈ آؤٹ آف سٹی گئے ہ ہیں، اُسے ڈر لگ رہا تھا تو..... اُس نے مجھے کال کر لی۔'' کال ڈس کنکٹ کر کے نے سہمے ہوئے اپنی نامعلوم دوست کی کہانی گھڑی۔

''ہوں..... اب سونے کا موڈ ہے یا مزید.....'' اُس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا

''نہیں، مجھے خود سخت نیند آ رہی ہے۔'' وہ منصور کے ہمراہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ حا اُسے نیند نہیں آ رہی تھی۔

☆☆☆

''بے وقوف ایک لفظ ہے۔ اور اس کے معنی، عورت ہے۔'' کاشا نے آج پھ پٹاری میں سے عورت نامہ کھول لیا تھا۔

''یہ تیرا ذاتی فلسفہ ہے۔'' غنی نے بے زاری سے اُس کی تمہید سنی۔

''بالکل! عورت کے بارے میں میری پرسنل آبزرویشن (ذاتی مشاہدہ) اتنی ہے کہ مجھے کسی سے مستعار لینے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔''

''ہیلو، سوری ٹو سے..... پرسنل ایکسپیری منٹ (ذاتی تجربہ)۔''

غنی نے فوراً اُس کی درستی کی۔ ''مگر مجھے فی الوقت تمہاری ذات سے۔ تمہارے ذاتی فلسفے تک کوئی دلچسپی نہیں۔''

غنی نے حفظِ ماتقدم کے طور پر اس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ ''یار! اس قصے کو ختم کر دے۔''

''اگر یہی بات شیکسپیئر یا خلیل جبران نے کہی ہوتی تو عورت کی اس قدر پذیر بہت ایپری شیٹ (تعریف) کرتا۔'' کاشا کو غنی کی بے زاری بہت کھلی تھی۔

وہ ابھی غنی کو اپنے اس تازہ فلسفے کی وجوہات اور بہت سے دلائل دینا چاہتا تھا۔

''جہاں تک میری انفارمیشن ہے، خلیل جبران کو خود کسی لڑکی سے محبت تھی۔''

اُس کا الزام ذرا پسند نہیں آیا تھا۔

''یعنی وہ بھی بہت گھامڑ انسان تھا۔'' کاشا نے اپنا سارا غصہ، خلیل جبران کے



میں ڈال دیا۔

''ڈونٹ وری۔ تم بھی بہت جلد گھامڑوں کی رینج میں آنے والے ہو۔'' غنی نے اپنی پسندیدہ شخصیت کی بے عزتی کا فوراً بدلہ لے لیا۔

''تُو مجھے ٹیز کرنا چاہ رہا ہے۔'' کاشا نے اُس کی برجستگی پہ اُسے مشکوک نظروں سے گھورا۔

''ٹیز تو بہت دُور، کاشا کو کبھی درد بھی نہیں ہوتا۔ کاشا اور درد، دو متضاد الفاظ ہیں۔''

''جسٹ شٹ اپ غنی! بند کرو یہ اُردو گرائمر۔ یُو نو واٹ، مجھے اسکولنگ لائف میں سب سے زیادہ بورنگ سبجیکٹ اُردو لگتا تھا۔ کیا ہر سبق میں آداب و اخلاق کے رٹے لگوائے جاتے ہیں۔'' کاشا کے لہجے میں واضح اُکتاہٹ تھی۔

''ویسے اگر تم غور سے سبق پڑھ لیتے تو شاید تمہاری حالت میں کسی حد تک افاقہ ہوتا۔''

آداب واخلاق صرف دو جگہوں پہ ملتا ہے۔'' کاشا نے دو انگلیاں کھولیں۔

اسے اپنی ہر مشکل اور آسان بات بیان کرنے کے لئے صرف دو کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ اور وہ اپنا مطلب سامنے والے کو کلیئر کر جاتا۔ نمبر ایک، نمبر دو۔ اس سے آگے وہ کبھی نہیں بڑھتا تھا۔ ہر بحث طلب مسئلے کے متعلق جان دار دلائل اُس کی بائیں ہاتھ کی جیب میں ہمہ وقت موجود رہتے۔

''ایک درویش کے حجرے میں، اس کے پیروں میں بیٹھ کے۔ اور دوسرا کنجریوں کے کوٹھے پہ، اُن کے چرنوں کو چھو کے۔''

اُسے اپنے متعصب نظریات پیش کرنے پر تالیوں کی صورت میں کسی داد کی ضرورت نہیں ہوتی تھی، بے شک کوئی اُس کے نظریات سے اختلاف کرے، نہ مانے، وہ اپنے مؤقف پر ڈٹا رہتا۔

''کاشا جگر! بالکل سچ بتا، تُو نے اپنی زندگی میں کسی عورت کی کبھی عزت کی بھی ہے؟''

''کاشا چوہدری ہمیشہ اُس عورت کی عزت کرتا ہے، جو اپنی عزت کروانے کی متمنی ہو، وہ اپنی حیثیت کو پہچانتی ہو۔ اور اس عورت پر نگاہِ غلط بھی نہیں ڈالتا، جو عزت کی حقدار نہیں ہوتی ہے۔'' کاشا نے بالکل سچ بتا دیا تھا۔

''یار! میں تیرے عورت نامے سے کبھی متفق نہیں ہو سکتا۔ نہ سر کھایا کر میرا۔'' غنی ان قصے کہانیوں سے کافی چڑا ہوا تھا۔

''میں ٹین ایج میں ایک رائٹر کو پڑھا کرتا تھا۔ میرا موسٹ فیورٹ رائٹر تھا۔ بہت

کچھ سیکھا میں نے اُس سے۔ اُسے پڑھ کے میرے اندر ایک چیز کا خوف ختم
موت.....موت کا خوف۔ Suddenly (اچانک) کچھ ہو جائے تو وہ الگ بات
کاشا نے بہت سال پرانی بات یاد آ جانے پر اسے اپنی قابلیت سے آگاہ کیا۔

''اچھا.....کون سا رائٹر ہے؟'' غنی نے کافی اشتیاق سے پوچھا۔ اس کے
کسی دھماکے سے کم نہیں تھی کہ کاشا کو کبھی کتابوں سے شغف رہا ہو گا۔

''ارنسٹ ہمینگوے (Ernest Hemingway)۔''

کاشا نے جیسے ہی نام لیا، غنی کا سارا اشتیاق، غبارے میں سے ہوا کی طرح
ہو گیا۔

''آف کورس! تم اپنی نیچر سے مطابقت رکھنے والے رائٹر کو ہی پڑھو گے
پریکٹیکل بھی کرتے چلے آ رہے ہو۔ اُس کی رائٹنگ سکلز نے تمہیں بھی خوب پا
ہے۔'' غنی بہت سنجیدگی سے اُسے بے عزت کر رہا تھا۔

''مجھے اُس کی Seculor Philosophy (غیر مذہبی فلسفہ) نے اٹریکٹ کیا تھ
نے مجھے دنیا برتنی سکھا دی، آزادی ہی جینے کا اصل رُخ ہے۔ مرنے کے بعد کی
کوئی غرض نہیں رکھو۔ تقدیر کبھی بھی ہم پر مکمل طور پہ مہربان نہیں ہوتی، نہ ہی مجھے ا
نامی شے پہ بلیو (یقین) ہے۔''

''اور تم جانتے ہو، اس نے آخر میں اپنے آپ کو گولی مار کر خودکشی کر لی تھی۔''
آواز سرگوشی سے زیادہ نہیں تھی۔

''یس، ہی واز ریئلی اے بریو مین۔ (ہاں، وہ واقعی ایک بہادر آدمی تھا)'' غنی
کی ذہنی حالت پہ شبہ ہوا، جو خودکشی جیسے بزدلانہ عمل کو بہادری گردان رہا تھا۔

''لیو دِس ٹاپک۔ ماہم والے افیئر کی سناؤ۔'' غنی نے موضوع بدل دیا تھا۔

''اس سے بھی آخری ملاقات ہے، معاملہ آر یا پار کر دوں گا۔ مجھ سے
چونچلے نہیں اُٹھائے جاتے۔'' اس نے برا سا منہ بنا کر بتایا۔

''ہوں.....چائے بناؤں، پیئے گا؟'' غنی نے چائے کے دوران ماہم کی
سننے کا سوچا۔

''بنا لے، اسٹرانگ سی۔'' اُس نے صوفے کی پشت سے سر ٹکا دیا۔

☆☆☆

ماہم، منصور کے اس طرح اوپر آ جانے پر بہت گھبرا گئی تھی۔ اس رات تو
سوتی بن گئی تھی، مگر اگلے چند دن اُس نے منصور کے روّیے کا بہت غور سے مشاہدہ
اسے شک تھا کہ منصور کہیں کچھ سن نہ چکا ہو۔ جو منصور کے نارمل روّیہ سے دُور ہو
ورنہ منصور میں ابھی اتنی غیرت تو تھی کہ کچھ سن کر زیادہ نہیں تو ایک آدھ تھپڑ ضرور مار
بالآخر وہ ایک مرد تھا اور اپنی بیوی سے بے تحاشا محبت کرتا تھا، جو رات کے پچھلے
سی اور سے دل بہلا رہی تھی۔

شام کی چائے پیتے وہ گاہے بگاہے منصور کو بھی دیکھتی جا رہی تھی۔

''ماہی.....!'' کے پکارنے پر وہ یکدم سنبھل کے بیٹھ گئی۔

''جی۔''

''ایک بہت ضروری میٹنگ ہے، جس کے لئے مجھے دو دن کے لئے اسلام آباد جانا
ے گا۔ تم بھی مجھے جوائن کر لو۔ دس دن کا Stay (قیام) کر لیں گے۔''

منصور، شہر سے باہر بہت کم جاتا تھا۔ زیادہ ضروری جانا ہوتا تو ماہم کو بھی ساتھ لے
ا۔ کبھی کبھار شاہم بھی اُن کے ہمراہ چلی جاتی تھی۔

''سوری منصور! میری طبیعت بہت ڈاؤن رہتی ہے۔ اس سچویشن میں تو میرا بی پی
لم بہت بڑھ گیا ہے۔ میں سفر کرنے کا رِسک نہیں لے سکتی۔'' اس نے صاف انکار
دیا۔

''ہم بائی ایئر جائیں گے۔'' اس نے ماہم کے انکار کو نظرانداز کر کے ایک بار پھر کہا۔

''پلیز منصور! مجھے فورس نہ کریں۔ میں گھر میں ایزی فیل کرتی ہوں۔'' منصور کے
بارہ کہنے پر وہ اندر سے تپ گئی تھی، مگر بظاہر تحمل سے بولی۔

اُس کا ذہن بہت تیزی سے چل رہا تھا۔ منصور چلا جائے گا تو وہ بھی آسانی سے کاشا
ے ملنے جا سکے گی۔ منصور کی موجودگی میں جانا مشکل تھا۔ سو بہانے تراشنے پڑتے تھے۔

''ہاں، صرف دو دن کے لئے جانا ہے۔'' منصور نے دل میں سوچ کر خود کو مطمئن
رنا چاہا۔

منصور کو اگلے روز جانا تھا۔ اس نے رات ہی کاشا کو میسج کر دیا تھا کہ وہ کل کا لنچ ایک
اتھ کریں گے۔ وہ منصور کے یوں جانے اور اپنا راستہ اتنی آسانی سے صاف ہو جانے
خوش تھی۔ بظاہر اس نے اپنے اردگرد والوں اور خاص کر منصور کو دکھاوے کے لئے
نجیدگی اور چپ کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ وہ اپنے ہر عمل میں بہت سستی دکھا رہی تھی۔

وہ دس بجے ناشتہ کرنے گھر آیا تھا۔ اس کے بعد پھر اسے آفس جانا تھا اور وہیں سے

اُس کی اسلام آباد کے لئے روانگی تھی۔ ماہم کے لئے وہ ازحد فکرمند تھا۔ شاہم اور
کو اس نے ڈھیروں نصیحتیں کی تھیں۔ اس کا جانا اشد ضروری تھا، ورنہ وہ کبھی بھی
اس حالت میں چھوڑ کر نہ جاتا۔

''شاہم! اب یہ تمہاری ڈیوٹی ہے۔ ماہی کو زبردستی دوائیں اور پھل ضرور دینا۔
کو دودھ بھی یاد سے دینا اور میڈیسن ٹائمنگ میں گڑبڑ نہیں ہونی چاہئے۔ میں نے
تبسم کو بھی کہہ دیا ہے۔ اگر خدانخواستہ کوئی ایمرجنسی ہو جائے تو انہیں کال کر لینا۔''

اس نے کوئی ساتویں بار شاہم کو حکم نامہ جاری کیا تھا۔

''ان کو کھلانے پلانے کی ڈیوٹی بہت ٹف ہے۔ یہ آپ کا ہی حوصلہ ہے۔ مجھ
اسٹیمنا نہیں ہے۔ پھر بھی ایک آدھ بار ٹرائی کر لوں گی۔ آپ کی طرح نہ منت
کروں گی، نہ ہی نوالے بنا بنا کر منہ میں ڈالنے آتے ہیں مجھے۔''

شاہم نے شرارت سے اسے تنگ کرنے کے لئے کہا۔ اسے منصور کا یوں ما
لئے فکرمند ہونا بہت اچھا لگتا تھا۔

''ماجدہ! تم زیادہ تک اوپر ہی رہنا۔ ماہی کچن میں ہرگز نہ جانے پائے۔
دھیان رکھنا۔'' شاہم کو گھور کر اس نے ماجدہ کو بھی اس کا ذمہ دار بنایا۔

''منصور! میں کوئی بچی تھوڑی ہوں؟ خود رکھ لوں گی، اپنا خیال۔'' اسے منصور
شاہم اور ماجدہ کے سامنے اپنے لئے اتنا باؤلا ہونا، شرمندہ کر رہا تھا۔

''بریکنگ نیوز! تم بچی سے بڑی ہو گئی ہو۔''

''منصور!'' ماہم نے اُس کے بازو پہ مُکا مارا۔

''چلو، مجھے گاڑی تک سی آف کرنے آؤ۔'' اس نے ماہم کے گرد بازو لپیٹ
ساتھ لگا لیا۔

''میں بھی گاڑی تک آؤں، سی آف کرنے۔'' شاہم نے جان بوجھ کر ٹانگ
منصور کی حرکات اس کے لئے تفریح کا باعث بنی ہوئی تھیں۔

''نو تھینکس۔ اینڈ اللہ حافظ، مائی لٹل فرینڈ۔'' اس نے نفی میں سر ہلاتے،
ناک کو دبایا۔

''آؤ ماہی!'' انہیں یوں ایک ساتھ باہر نکلتے دیکھ کر شاہم نے تہہ دل
خوشیوں کے لئے دعا کی۔

☆☆☆



منصور کے جاتے ہی شاہم بھی تھوڑی دیر بعد اپنی گاڑی لے کر نکل گئی۔ اب ماہم کا
تہ بالکل صاف تھا۔ شاہم بھی نہیں تھی۔ وہ اس سے ضرور پوچھتی اور وہ اس سے یہ بھی
ں کہہ سکتی تھی۔ ''منصور سے میرے باہر جانے کا ذکر نہ کرنا۔''

شاہم کی واپسی تاخیر سے ہوتی تھی۔ اس نے کمرے میں آ کر تسلی سے کاشا کو فون
ا، اسے اپنے آنے کا بتایا اور جگہ کنفرم کی۔ وہ تیار ہونے لگی۔ اس نے میرون کلر کی
یک شیفون کی ساڑھی پہنی، جس کے بارڈر اور بلاؤز پہ سلور کام کیا گیا تھا۔ یہ ساڑھی،
ور اُس کی برتھ ڈے پر پہننے کے لئے لایا تھا۔ برتھ ڈے پارٹی میں ہر فرد نے اس
ڑھی میں ماہم کی تعریف کی تھی۔ ساتھ میں اُس نے ہم رنگ گرم شال نکال لی، تاکہ اپنا
پ اچھی طرح ڈھانپ سکے۔ لباس زیب تن کر کے اس نے اپنے لمبے سلکی بال، کیچر لگا
ادھ کھلے چھوڑ دیئے۔ اس نے بہت خوشی اور آزادی سے اس نامحرم شخص کے لئے
ٹ سا میک اپ کیا۔ اتنا تردّد وہ کبھی بھی منصور کی خاطر نہیں کرتی تھی۔ منصور کے لئے
سنورنا اُسے ''جھنجٹ'' لگا کرتا تھا۔

وہ مقررہ وقت سے پندرہ منٹ جلد پہنچی تھی۔ کاشا پانچ منٹ لیٹ تھا۔ اُس کی ٹیبل
قریب وہ ذرا سا ٹھٹک کر رک گیا۔

''ہیلو بیوٹی کوئین!'' ستائش سے بھرپور لہجے میں کہتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ اس
طرف بڑھایا۔ ماہم ذرا کی ذرا جھجکی، پھر اُس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔

''ہائے مسٹر کاشف!'' وہ بھی اسی کے انداز میں مخاطب ہوئی۔

''رئیلی، تم کہیں سے بھی میرڈ نہیں لگ رہی ہو۔'' اس کی توصیفی نظریں اُس پر جمی
ئی تھیں۔ ویٹر آ گیا تو وہ مینو کارڈ دیکھتے ہوئے لنچ آرڈر دینے لگے۔ کاشا نے کھانے
ے دوران کوئی بات نہ چھیڑی۔ لنچ کروا کے وہ اُسے شاپنگ کے لئے لے گیا۔ وہ بھی
زاد تھی۔ اُسے کاشا کے ساتھ گھومنا، وقت گزارنا، اس کے چھوٹے چھوٹے جملوں پہ قہقہے
نا اچھا لگ رہا تھا۔ کاشا نے اُس کے لئے کتنے ہی رنگوں کے کپڑے، ساڑھیاں، شوز،
ب خریدے۔ اس نے بھی اپنے کریڈٹ سے کاشا کی شاپنگ دل کھول کر کی۔ کاشا کی
راہی میں مختلف دکانوں پہ خواری کرتے، بار بار کپڑوں کی ٹرائی لیتے، کلر کامبی نیشن
نتخب کرتے، جوتے کا سائز اور اسٹائل تبدیل کراتے ہوئے، کاشا کی ٹائیوں کی سلیکشن،
نٹ کوٹ، اپر، جیکٹس وغیرہ..... چار گھنٹے وہ مسلسل شاپنگ کرنے میں مگن رہے تھے۔

اُسے اب یاد نہیں رہا تھا کہ شاپنگ کرنا اُسے کتنا بورنگ لگتا تھا۔ وہ پانچ سال میں

ایک بار بھی دل سے منصور کے ساتھ بازار نہیں گئی تھی۔ اس نے کبھی منصور کی ٹائی کی وا
تک نہیں خریدی تھی۔ منصور اُس کی برتھ ڈے، ویڈنگ اینی ورسری، ویلنٹائن ڈ
نیو ایئر، عید، حتیٰ کہ شب برات تک کے موقعوں کو یاد رکھ کر گفٹس خریدتا تھا۔ اور وہ منص
کی برتھ ڈے ہی بھول جاتی تھی۔ اُس کا دھیان، منصور کی طرف کبھی تھا ہی نہیں۔ ا
شاپنگ کرتے شام کا اندھیرا، رات میں بدل گیا۔ وہ اب سیدھا گھر جانا چاہتی تھ
شاہم بھی آنے والی تھی۔ وہ اسے گھر پہ نہ پا کر پریشان ہو جاتی۔ کاشا نے اُسے ڈنر
کے لئے روک لیا۔ جس مقصد کے لئے وہ ملے تھے، اس کا تو ذکر ہی نہیں ہوا تھا۔

''ماہم! میں بہت اسٹریٹ فارورڈ بات کروں گا کہ تمہیں میرے اور اپنے ہزبینڈ
سے کسی ایک کو رکھنا ہوگا۔''

کاشا کی اس تلخی پہ اُس کا ذہن ماؤف ہو گیا۔ وہ کتنی ہی دیر پلک نہ جھپک سکی
کاشا کو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اسے کاشا کو چھوڑنے کا تصور ہی لمحۂ موجو
تھا۔ منصور کو چھوڑنا اتنا آگے کا بھی اُس نے نہیں سوچا تھا۔ درحقیقت اُسے کچھ بھی نہیں
تھا، اُسے منصور کو رکھنا ہے، جو اُس کا شوہر، بچوں کا باپ، اس کی عزت کا رکھوالا ہے
اس کاشا کو، اس نامحرم مرد کو۔ جس سے وہ چھپ چھپ کے ملتی ہے اور تعلقات بڑھ
ہوئے ہے۔ اور جو اُس کے گزرے ہوئے کل کا حصہ ہے۔

فیصلہ تو اُسے کرنا ہی تھا۔ کسی ایک کے حق میں۔ شوہر یا عاشق۔

نیا رشتہ استوار کرنے کے لئے پرانے اور اٹوٹ بندھن کو توڑنا لازم تھا۔

''آں..... ہاں.....'' وہ نظریں چرانے لگی۔

''مجھے ابھی جواب چاہئے ماہم!'' اس نے اپنے غصے پر بمشکل کنٹرول کیا تھا۔

''مجھے تھوڑا سا وقت دو، کاشف! میں.....''

''واٹ؟..... ٹائم کیوں چاہئے؟ میں کیا عمرِ نوح لکھوا کے لایا ہوں، جو تمہ
چکروں میں برباد کرتا پھروں؟ دو ماہ کا ٹائم کم تھا، سوچنے اور فیصلہ کرنے کو؟ پرابلم کہ
ایوری تھنگ اِز کلیئر منصور تمہارا شوہر، دو بچوں کا باپ، ایک ویل اسٹیبلش پرسن
بار ہے تمہارا، رشتے ہیں، زندگی سکون سے گزر رہی ہے۔ جبکہ میں..... میں تمہا
ہوں۔ ایک نامحرم اور غیر مرد، جس کے ساتھ تم بازاروں میں عیاشی کرتی پھرتی ہو،
فار دا ٹائم پاس لمبی لمبی کالز کرتی ہو۔ شوہر کو بھی دھوکا دے رہی ہو اور مجھے بھی خوار
آئی ایم ناٹ منصور، جو تمہارے سامنے ہاتھ باندھ کر جی حضوری کرتا کھڑا رہے گ



بہت ٹیڑھا اور کلیئر کٹ بندہ ہوں۔ میری مالی حیثیت کا بھی تمہیں خوب اندازہ ہے۔ اگر
تمہیں میرے ساتھ تعلق جوڑنا ہے تو منصور کو فارغ کرو..... آئی مین ڈائیوورس.....
ور اگر منصور کے ساتھ ہی رہنا چاہتی ہو تو دوبارہ کبھی تمہارا نمبر میرے سیل پہ نہیں آنا
چاہئے۔ ورنہ صحیح معنوں میں تمہاری خواری کروا دوں گا..... آئی ہوپ سو کہ تم اچھی طرح
نور کرو گی۔''

وہ تن فن کرتا، موبائل اور گلاسز اُٹھا کر ڈنر چھوڑ کر چلا گیا۔

☆☆☆

وہ نو بجے واپس آئی تھی۔ سکیورٹی گارڈ نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ اُس نے اُس سے
شاہم کے متعلق استفسار کیا۔ اُس کے نفی میں جواب دینے پر وہ شکر ادا کرتی، شاپنگ بیگز
اُٹھائے اندر بڑھ گئی۔ اپنے کمرے میں صوفے پر تمام بیگز پھینک کر وہ جلدی سے فریش
ہونا چاہتی تھی، تاکہ شاہم آ کر اسے اس حلیے میں نہ دیکھ لے۔ آئینے کے سامنے کھڑی وہ
ابھی میک اپ صاف کرنے ہی والی تھی کہ ماجدہ کا شوہر، جو خانساماں بھی تھا، چلا آیا۔

''یس، کم اِن۔'' دستک پہ اُس نے اندر آنے کی اجازت دی۔

''میڈم! آپ کو سر اسٹڈی روم میں بلا رہے ہیں۔''

اس پیغام پہ اُس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''من..... من..... منصور.....'' منصور کا نام لینے میں اُسے کافی دقت پیش آئی۔

''جی.....'' نظریں جھکائے وہ مؤدب سا جیسا آیا تھا، واپس مڑ گیا۔

ماہم کے اعصاب شل ہو چکے تھے۔ اسے لگ رہا تھا، جیسے کوئی پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے یا
کم از کم کمرے کی چھت اس پر گر گئی ہے۔

اس نے نہ تو کپڑے تبدیل کئے تھے، نہ ہی ذہن میں کوئی نیا جھوٹ گھڑا تھا۔ وہ
اسٹڈی روم تک صرف یہ سوچتی ہوئی آئی تھی کہ منصور اتنی جلدی واپس کیوں آ گیا، یا گیا
ہی نہیں؟ وہ اپنے کمرے کے بجائے اسٹڈی روم میں بیٹھا کیا کر رہا ہے؟ وہ اپنا آپ
گھسیٹتی ہوئی چل رہی تھی۔ وہ ہوٹل سے گھر تک بہت مشکل سے ڈرائیو کر کے آئی تھی۔
کاشا کی باتیں کسی جھکڑ کی طرح اُس کے ذہن میں چل رہی تھیں۔ اب منصور کی مصیبت
اُس پر آن پڑی تھی۔ سب کچھ اُلٹا ہوتا جا رہا تھا۔

اسٹڈی روم میں ہلکی سی روشنی تھی۔ کمرے کی ترتیب اور اس کے وسط میں ایزی چیئر
پہ جھولتا منصور کا وجود نظر آ رہا تھا۔ اس کی موجودگی کو محسوس کر کے ذرا دیر کو کرسی رُکی تھی۔

''من..... منصور! آپ گئے نہیں؟'' اس نے خشک حلق سے سوال کیا۔ اس علاوہ وہ کیا پوچھتی۔

''میں تو نہیں گیا۔ مگر تم بھی نہیں رُکیں۔'' کافی توقف کے بعد اُس کی بہت بھ آواز، خاموش کمرے میں گونجی۔

ماہم نے کسی مجرم کی طرح سر جھکا لیا۔ اس کے اندر کوئی اُسے بتا رہا تھا کہ گڑ چکی ہے۔ وہ کبھی بھی منصور کے سامنے اس طرح سر جھکائے کھڑی نہیں ہوئی تھی۔

''کون ہے وہ؟'' چیئر کی پشت سے سر ٹکائے اس کی آنکھیں سامنے دیوار کی او پہ ساکن تھیں۔

''کک..... کک..... کون؟''

الفاظ اُس کے حلق میں ہی اٹک گئے۔ اسے سینے کے اندر سانس رُکتی محسوس ہو وہ متوحش سی کھڑی تھی۔ اب جھوٹ کا ا رانہیں لیا جا سکتا تھا۔

''تم مجھے chase (تعاقب) کر رہے تھے؟'' وہ اُلٹ بولی تھی۔

منصور کا اسلام آباد جانے کا ڈرامہ اُسے یاد آ گیا۔ ساتھ یہ بھی کہ اُس رات وہ کی ساری باتیں سن چکا تھا۔

''ہماری شادی کو کتنے سال گزر گئے؟''

''آل موسٹ فائیو ایئر۔'' وہ دھیمے سے بولی۔

''لاسٹ فائیو ایئرز سے میں اس ایک لمحے کو تلاش کر رہا تھا، جس کی کھوج اس لگ گئی اور تلاش آج ختم ہوئی۔ شوہر، بیوی کے ریلیشن شپ میں کوئی بھی پارٹنر زیاد اپنی اصلیت نہیں چھپا سکتا۔ اگر تم آج تک یہ سوچتی آ رہی ہو کہ میں بے خبر تھا تو یہ تم بھول ہے۔ میں نے تم سے محبت کی، مجبور محبت۔ اور یہ مجبور محبت ہی مجھے بہت سی با کی چھان پھٹک سے روکتی تھی۔ یہ محبت ہی میرے ہونٹوں پہ قفل لگائے رکھتی۔ کبھ خود کو اذیت دینے سے بہتر دھوکا دینا لگتا ہے۔ میں اس دھوکے میں رہ کے پوری ز بتانے کو تیار تھا اور تم.....''

ماہم دم سادھے اُسے سن رہی تھی۔ اُس کی رگ و جاں میں سرایت کرتا خوف رہا تھا۔ سب کچھ روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکا تھا۔ وہ بھی منصور سے مزید جھوٹ بولنا چاہتی تھی۔ دو کشتیوں کے سوار کو بالآخر ایک کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ اب اس کا ''ا دونوں اطراف سے اسے گھیرے ہوئے تھا۔ اسے اپنی عقل و ہمت کے مطابق ایک ک



تھا۔ بہت سوچ سمجھ کر۔

''آئی ایم سوری منصور! میں بھی اب آنکھ مچولی کا کھیل مزید نہیں کھیل سکتی۔'' اضطرابی کیفیت میں گھرے اُس نے بڑی جرأت سے کہا۔

''تم نے میرے اعتماد کو بڑی زک پہنچائی ہے، ماہم!'' اُس کی مدھم سی سرگوشی اُبھری۔

''مجھے اگر تمہارے اعتماد کی پروا ہوتی تو میں یہ سب نہ کرتی۔ اور دوسری بات یہ کہ میں تمہیں کسی بھی قسم کی Clearification (صفائی) نہیں دے رہی۔''

یہ کاشا سے ملاقات اور اس کے الفاظ کا اثر تھا کہ اُسے اپنا مجازی خدا، تھرڈ پرسن لگ رہا تھا۔ جسے وہ مکھن سے بال کی طرح نکال باہر کرنے والی تھی۔

''جو بھی کہنا ہے، لاؤڈ اینڈ کلیئر کہو۔'' چیئر رک گئی تھی۔

اُس کا ہر عضو، سماعت بن کر متوجہ تھا۔ اس ہونی کا خدشہ بہت عرصہ سے اُس کے اندر جڑ پکڑ چکا تھا۔

''مجھے خلع چاہئے منصور!'' ایک لمبا سانس خارج کر کے وہ بڑے تحمل سے بولی۔

☆☆☆

اُن کی زندگی کی پانچ سالہ رفاقت میں آج کی صبح بہت انوکھی، عجیب، خاموش
لاتعلق سی طلوع ہوئی تھی۔ آج اُن کے رشتے میں بہت کچھ پہلی بار ہونے جا رہا تھا
کا سلسلہ اب چلتے ہی رہنا تھا۔ منصور کی صبح چھ بجے ہی ہوئی تھی۔ حسبِ معمول اُس
بے اختیاری سے اپنے دائیں طرف سوئی ماہم کو دیکھا۔ اس نے اُس کی طرف ہاتھ
تھا، مگر چھوا نہیں تھا۔ روزانہ کی طرح اُس کے سوئے چہرے سے بال ہٹا کر بوسہ نہ
تھا، نہ وہ ایکسرسائز کے لئے گیا تھا، نہ ہی واک کے لئے۔ ڈریسنگ میں اس کی
بہت اچھی ہوتی تھی۔ وہ خود کو نک سک سے تیار رکھتا تھا۔ آج اُس نے ہاتھ میں
والا سوٹ اور ٹائی باہر کھینچ کر نکال لئے تھے۔

وہ ناشتہ تو ماہم کے ہمراہ ہی کرتا تھا، مگر آج پہلی بار جوس یا پانی کا گلاس تک
بغیر آفس چلا گیا تھا۔ آفس میں بھی اس نے سارا دن کچھ نہ کھایا۔ اپنے اسٹاف کے
بہت نرمی اور شائستگی سے پیش آنے والا منصور بلاوجہ ہی تین ایمپلائز پہ چلّایا تھا۔

گیارہ، ساڑھے گیارہ کا وقت، جب وہ اتنے سالوں سے ماہم کو اُٹھانے دوبا
جاتا تھا، بہت مضطرب کرنے والا تھا۔ وہ سوچتا رہا۔ اُس کی خود سے آنکھ کھل گئی
ابھی تک سو رہی ہوگی۔ آج تو اُس پر کوئی روک ٹوک نہیں۔ وہ ناشتے میں اپنی مرض
صرف چائے پیئے گی یا جوس۔ دودھ اور سلائس بھی نہیں کھائے گی، جو وہ اصرار کر
اس کے منہ میں ڈالتا تھا۔ وہ سارا دن اُس کے بارے میں نہ سوچتے ہوئے بھی اُ
کی متضاد سوچوں میں گھرا رہا تھا۔

دوسری طرف وہ، جو رات کو تمام معاملات واضح کر کے خود کو یہ باور کرا چکی
باقی کا وقت وہ یہاں اپنی من مرضی سے منصور کی رکاوٹوں کے بغیر گزارے گی، اُس
قربت جس سے اُسے وحشت ہوتی تھی، اس سے جان چھوٹنے پر اُس نے شکر ادا



دن کے ٹھیک سوا گیارہ بجے اُس نے اس احساس کے زیرِ اثر آنکھیں کھولی تھیں کہ
وئی اُس کے گال کو ہلکا ہلکا تھپک رہا ہے۔ اپنے اِردگرد کسی کو بھی نہ پا کر اُس نے وال
لاک کی طرف دیکھا، جو سوا گیارہ بجا رہا تھا۔

"ابھی تک منصور نہیں آئے۔" وہ یکدم پریشان ہو کر اُٹھ بیٹھی۔ صرف ایک لمحہ کے
لئے اس سے یہ معمول کی حرکت سرزد ہوئی تھی۔ ایسی ہی بے اختیاری صبح منصور بھی کر چکا
ا۔ اگلے لمحے وہ خود کو کوستی، سرزنش کر رہی تھی۔ وہ پھر سے سونے کا ارادہ کر کے لیٹ گئی
ی۔ بیس منٹ گزرنے کے بعد بھی اس کی آنکھ میں ہلکی سی نیند کا شائبہ تک نہیں تھا۔ تکیے
ں منہ چھپائے وہ کروٹ پہ کروٹ بدلتی رہی۔ اس پہ مستزاد اُسے بھوک لگنے لگی۔ وہ خود
حیران ہو رہی تھی کہ اُسے تو ناشتہ کرنے سے چڑ تھی۔

بستر سے اُٹھ کر وہ واش روم میں چلی گئی۔ ماجدہ نے ٹیبل لگوا دی۔ وہ اکیلی ٹیبل پر آ
ئی۔ اُس کو اکیلی چیئر سنبھال کر پانی پیتا دیکھ کر ماجدہ حیران و بے یقین تھی۔ ان کے
ازم تک ان کی عادتوں کے عادی ہو چکے تھے۔ اس نے ماجدہ کی خود پہ گڑی نظریں
سوس کیں اور پھر لاپروائی سے ناشتہ کرنے لگی۔ وہ، جس کا اصرار صرف چائے کے کپ
کا ہوتا تھا، میکانکی انداز میں روٹین کے لوازمات اپنے ہاتھوں سے کھانے لگی۔ اُس نے
پنی اس حرکت پر ہاتھ روکنے کی بہت کوشش کی، مگر اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کئی دن
سے بھوکی ہے۔ ٹیبل سے اُٹھتے ہوئے وہ ماجدہ سے کہنا چاہتی تھی کہ کل سے اتنا انتظام نہ
کیا جائے۔ پر کہنے کی ہمت نہ کر سکی۔

شام کو منصور کے گھر آنے کے ٹائم پر وہ جان بوجھ کر کچن میں چلی گئی۔ جب وہ سب
کچھ صاف صاف کہہ چکی تھی، پھر وہ اس سے کیوں چھپ رہی تھی؟ جب اُس نے کمال
جرأت کا مظاہرہ کر دیا تھا تو اس کی نگاہوں میں چھپے خاموش شکوؤں سے خائف کیوں تھی؟

پریگنینسی کے دوران وہ کبھی بھی کچن میں قدم نہیں دھرتی تھی۔ کچن میں پکتی مختلف
ڈشز، ان سے اُٹھتی بھاپ اور خوشبو سے اُس کا جی متلانے لگتا تھا۔ اُس کی حالت بہت
بگڑ جاتی تھی۔ مگر آج اسے کچن ہی سب سے محفوظ پناہ گاہ لگ رہا تھا۔ منصور بھی کپڑے
تبدیل کر کے سارا وقت باہر لان میں بچوں کے ساتھ کھیلتا اور باتیں کرتا رہا تھا۔

آخر کب تک؟

رات کو بالآخر انہیں ایک ہی بیڈروم میں جانا پڑا تھا۔

منصور نے کمرے میں آتے ہی لیپ ٹاپ سنبھال لیا تھا۔ جبکہ وہ دھیمی آواز میں ٹی وی

دیکھنے لگی۔ پہلی رات ہی ایسا ہوا تھا کہ وہ بیڈ روم میں ساڑھے بارہ بجے تک لیپ ٹا
میں مصروف تھا۔ جبکہ وہ اب اُکتائے ہوئے انداز میں چینل سرچنگ کر رہی تھی۔ ا
نے گھور کر اُس کی پشت کو دیکھا۔

''یہ آخر سو کیوں نہیں جاتے؟''

اُسے منصور کے سونے کے انتظار سے کیا سروکار تھا؟ خود اُسے تو سو جانا چاہئے تو
اُسے تو بہت سی شکایات میں سے منصور سے ایک یہ بھی شکایت تھی کہ وہ دیر تلک اُ
جگاتا ہے، فضول کی باتیں کرتا رہتا ہے۔ اس رات اُسے کوئی ''بلاوجہ'' دیر تلک جگانے
نہیں تھا۔ پھر بھی وہ جاگ رہی تھی۔ مگر پھر ریموٹ کو پٹخ کر سونے کے لئے لیٹ گ
کچھ دیر میں وہ بھی لیپ ٹاپ بند کر کے اُٹھ گیا اور بیڈ پر لیٹنے کے بجائے صوفے کی پ
سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔ اس کے چہرے کا رخ سامنے بیڈ پر بے قراری
کروٹیں بدلتی ماہم کی طرف تھا۔

یہ بھی پانچ سال میں پہلی بار ہو رہا تھا کہ ایک تو اس کے بائیں طرف منصو
موجودگی نہیں تھی۔ دوسری سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ منصور کا بازو اس کے سر کے نیچے
تھا۔ شروع شروع میں اسے اُلجھن ہوئی تھی منصور کے بازو، سر کے نیچے رکھنے سے۔ مگ
ایسا کرنے سے اُسے روک نہیں سکی۔ پھر دھیرے دھیرے وہ اس کی عادی ہو گئی۔ ا
منصور کو بھی اپنا بازو اُس کے سر کے نیچے رکھے بغیر نیند نہیں آتی تھی۔ ابھی تکیے پر سر
اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اُس کا سر کسی گہرے کنوئیں یا پاتال میں گر چکا ہے۔ ا
نیند بھی آ رہی تھی۔ بار بار اُس کی ٹوٹتی نیند اور کروٹیں بدلنے سے اُس کا سر بھاری ہ
تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ پانچ سال کم نہیں ہوتے، عادات کے پختہ ہونے میں۔
اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ دوسری طرف منصور کے ساتھ بھی یہی مسئلہ ہے کہ وہ سوا
بجے صوفے پر بازو پھیلائے اتنی رات گئے کیوں بیٹھا ہے؟

وہ دونوں تنگ آ کر اب ایک ہی زاویے پر سوچ رہے تھے کہ آج رات نیند
آئے گی؟ اور آئے گی بھی یا نہیں؟

ماہم کو نیند کے غوطے آ رہے تھے مگر وہ سو نہیں پا رہی تھی۔ اُس نے بے بسی سے ا
دونوں ہاتھوں سے کنپٹیوں سے اوپر بالوں کو مٹھیوں میں جکڑ لیا تھا۔ منصور جو اُسے
سے نوٹ کر رہا تھا، اُس کے خود پر تشدد کرنے پر تیزی سے اپنی جگہ سے اُٹھ کر اُس
قریب آ گیا۔ اُس کی یہ حرکت بالکل غیر ارادی تھی۔ ایک ہی رات میں وہ ایک دوس



سے اتنے بے نیاز اور اجنبی تو نہیں ہو سکتے تھے کہ ایک دوسرے کی تکلیف جان کر بھی
نجان بنے رہیں۔ وہ اس سے اتنی محبت کرتا تھا کہ وہ بے وفا رہ کر بھی اس کا سینہ چیر کر
ل تک نکال لیتی تو وہ اُف نہ کرتا۔

''جب تک تمہارے پاس میری امانت ہے، میرا فرض بنتا ہے کہ میں تمہارا خیال
کھوں۔'' اُس کے برابر لیٹتے، اُس کے سر کے نیچے سے تکیہ نکال کر اُس نے اپنا بازو رکھ
یا۔ بچہ تو بہانہ تھا۔ وہ اُس کا بھرم رکھنا چاہتا تھا۔

ماہم نے ذرا بھی چوں چرا نہ کی۔ اپنے اندر یک گونہ سکون اُترتا محسوس کر کے منصور
ی طرف سے رُخ پھیر لیا۔ وہ سیدھا لیٹا یک ٹک چھت کو گھورنے لگا۔

وہ ہلکی ہلکی غنودگی میں جا رہی تھی کہ اُسے منصور کی مدھم آواز سنائی دی۔

''جب دو میاں بیوی ایک گھر، ایک کمرے، ایک بستر اور ایک تکیے پر سر رکھ کر
وتے ہیں، سانجھے بچے پیدا کرتے ہیں، اپنا دُکھ سُکھ ایک دوسرے سے شیئر کرتے ہیں تو
ں سب کے باوجود انہیں ایک دوسرے سے محبت کیوں نہیں ہو پاتی؟ کہاں ایسی غلطی ہو
ہاتی ہے کہ انہیں کسی تیسرے کی کمی محسوس ہونے لگتی ہے۔''

اس نے ماہم کو تکلیف دینے کی غرض سے یہ سب نہیں پوچھا تھا۔ بس اُس کے جی
ں آیا اور اس نے کہہ دیا۔

ماہم نے موندی آنکھیں کھول کر اُس کی بات کو توجہ سے سننے کی کوشش کی، پھر
قابلِ غور جان کر آنکھیں بند کر لیں۔

''پتہ نہیں۔'' اس نے مختصراً کہہ کر جان چھڑائی۔

وہ پانچ سال اُس کی بھرپور موجودگی میں بھی خود کو اندر سے تنہا اور اکیلا ہی سمجھتی آ
ہی تھی۔ اب وہ چند سیکنڈز میں وجہ کیسے بتا دیتی، جو اُسے خود بھی معلوم نہیں تھی۔

''ایک بندہ سوال کرے، دوسرے کے پاس اس کا جواب نہ ہو تو غلط کون ہوتا ہے؟
وال کرنے والا یا جواب نہ دینے والا؟'' اُس نے پھر بات برائے بات پوچھ لیا۔

وہ رات دیر تک اس سے باتیں کرتے رہنے کی عادت کو دہرا رہا تھا۔ یہ سوچے بغیر
کہ ماہم اب اس کی پابند نہیں رہی۔

''پلیز فار گاڈ سیک منصور! مجھے نہیں پتہ کچھ بھی۔ سو جاؤ۔''

وہ غنودگی میں اُترتی تھی کہ منصور کی آواز اُسے جگا دیتی۔ اُس کے مدہوش لہجے میں
سخت بیزاری تھی۔

"ماہم! تم مجھ سے خلع نہیں لو گی، میں تمہیں طلاق دوں گا۔ کیونکہ میں نے ہمیشہ تمہاری ہر ضرورت بنا مانگے اور کہے پوری کی ہے۔"

سونے سے قبل اس نے آخری بات کر دی تھی۔

☆☆☆

ماہم، بچوں کے کمرے سے نکلی تھی تو اس نے لاؤنج کے صوفے پہ بیٹھی شاہم کو چپس کھاتے اور موبائل پر گانے سنتے دیکھا۔ وہ اس سے بات کرنا چاہتی تھی۔ اس کے پاس رک گئی۔

"کہاں ہوتی ہو شاہم! نظر ہی نہیں آتیں۔" کُشن درست کرتے ہوئے اُس سے گلہ کیا۔

"ہائے آپی! نظر تو آپ نہیں آتیں۔ سارا دن کمرے میں بند پڑی رہتی ہی۔ میں آپ کو دیکھنے کو ترس گئی ہوں۔" شاہم موبائل بند کر کے اُس کے احترام میں کھڑی ہو گئی۔ "بیٹھیں آپی!"

"نہیں..... مجھے ابھی شاور لینا ہے۔ تم بتاؤ، ارسل سے ملاقات ہوئی تمہاری؟"

شاہم کو اچنبھا سا ہوا۔ ماہم نے کبھی ارسل کا اس طرح ذکر نہیں کیا تھا۔

"جی ملی تھی۔ فون بھی آتا ہے اس کا۔ کیوں..... کیا ہوا؟"

"تم ارسل سے کہو کہ وہ اپنے پیرنٹس کو بھیجے۔ بلکہ مجھے اُس کا نمبر دو، میں خود بات کرتی ہوں۔"

"اُس کے پیرنٹس کیوں آئیں آپی؟" شاہم نے بے وقوفی سے پوچھا۔

"آئی تھنک، تمہارا پروپوزل لے کر اس کے والدین کو ہی آنا چاہئے، فولش گرل۔"

ماہم کو اُس کی بے عقلی کھلی تھی۔

"اوہ....." اپنے رشتے کا سن کر اس کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔

جب سے اس کے اور منصور کے درمیان خاموش معاہدہ ہوا تھا، اُسے شاہم کی فکر ہو گئی تھی۔ وہ بے شک، منصور کی صرف سالی ہی نہیں، چچا زاد کزن بھی تھی۔ مگر جب اُس سے بیوی کا رشتہ توڑ دیتی تو پھر شاہم کا یہاں رہنے کا قطعی جواز نہیں بنتا تھا۔ اُس کی ڈیلیوری میں تھوڑا ہی وقت تھا۔ وہ منصور کو چھوڑنے سے پہلے شاہم کا قصہ نمٹانا چاہتی تھی۔ شاہم آخری رکاوٹ تھی۔

اپنے بیٹوں اور آنے والی بیٹی کے بارے میں اس نے فیصلہ لے لیا تھا کہ وہ



پاس ہی رہیں گے۔

ایسا سوچتے ہوئے نہ تو اُس کا دل کانپا، نہ ہی وجود پہ لرزش طاری ہوئی۔ کاشا اور اس بچوں کے مستقبل کی بات نہیں کی تھی۔ وہ اس سے بچے ساتھ رکھنے کا کہتی تو شاید وہ ہی جاتا۔ آخر وہ جانتا تھا کہ وہ شادی شدہ، دو بچوں کی ماں ہے اور ممتا اپنے بچوں بغیر ادھوری ہوتی ہے۔ اسے ایک بار اس سے بات کرنی چاہئے تھی۔ مگر اس نے ذکر کرنا گوارا نہ کیا تو پھر کاشا کو کیا پڑی تھی کہ وہ پرائی مصیبت اپنے گلے میں ڈالتا۔ چلو، ں کی خیر تھی، مگر بیٹی وہ وجود ہے، جسے وہ ابھی اپنے وجود کا خون دے کر اُس کی آبیاری رہی تھی، جس نے ابھی اس دنیا میں آنا تھا، جسے اس نے دیکھا تک نہ تھا۔ وہ اس ننھی کائنات سے بھی خود کو آزاد رکھنے کا تہیہ کر چکی تھی۔ وہ یہ سب کیوں اور کس کے لئے کر تی تھی؟ کاشا کے لئے..... اُس کی محبت میں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک انسان اتنی ت، اتنی چاہت رکھنے والا دل چاہتا ہو اور اس دل میں صرف کسی ایک کے لئے جگہ

کیا کوئی شخص ایک وقت میں تمام رشتوں کو نہیں نبھا سکتا؟ وہ تمام رشتوں سے مخلص ں ہو سکتا؟ رشتے تھے بھی کون؟ اُس کے اپنے..... پروفیسر ذوہیب رضا کی بڑی اور لی بیٹی، جس پہ انہیں فخر تھا۔ اُس کی قابلیت اور فہم و فراست پر۔ ان کے بچپن سے ان ہونے تک پڑھائے گئے اخلاقیات کے سبب وہ کیوں بھول گئی تھی؟ اُس کا دل پتھر چکا تھا، یا اس نے کر لیا تھا۔ اُس کے باپ نے بیوی کے مرنے کے بعد تیرہ سالہ ماہم ر آٹھ سالہ شاہم کو سنبھالا تھا، اکیلے اُن کی پرورش کی تھی۔ ماں کا پیار بھی دیا تھا۔ ان کے چھوٹے بھائی حطیب رضا (منصور کے والد) نے بھی پانچ سالہ منصور کی ماں کی جگہ بھی کسی اور عورت کو نہ دی۔ مگر وہ ماہم تھی، جو اپنے باپ اور چچا کے اس فیصلے کو غلطی، نتہائی سنگین غلطی شمار کرتی تھی۔

تیرہ سالہ ماہم جوں جوں شعور کی سیڑھیاں طے کر رہی تھی، اُسے ماں کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ مرے ہوئے لوگ واپس نہیں آیا کرتے۔ اس کے ننھیال والوں نے بھی بیٹی کی موت کے بعد آنا جانا کم کر دیا۔ اس کے صرف ایک چچا، منصور کے والد ہی تھے۔ اس کا اپنا کوئی بھائی بھی نہیں تھا۔ ماہم بھی پروفیسر صاحب کی شادی کے کئی سال بعد بڑی منتوں مرادوں سے ہوئی تھی۔ بیٹیوں نے ان کی فیملی مکمل کر دی تھی۔ ان کے اندر کبھی بھی بیٹے کی خواہش پیدا نہ ہوئی۔

خاندان کے کچھ بزرگوں نے اُنہیں شادی کا مشورہ دیا تھا۔ کیونکہ اب اُن کے
مشکل وقت کاٹنے والی بیوی نہیں رہی تھی۔ اگر وہ دوسری شادی کر لیتے تو ہو سکتا تھا
ان کے گھر اولادِ نرینہ بھی ہو جاتی۔ مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ ان کے خیال
اب شادی کی عمر نہیں رہی تھی۔ ماہم ابھی سے ان کے کندھے تک آتی تھی۔ بیوی
جانے سے ان کی زندگی ڈسٹرب ضرور ہوئی تھی، مگر دوسری عورت کو لا کر وہ اپنا اور
بیٹیوں کا جینا حرام نہیں کرنا چاہتے تھے۔

ماہم کو اتنی سی عمر میں پہلی بار اپنے باپ کی سوچ غلط لگی۔ وہ خود کو بہت تنہا محسوس
تھی۔ شاہم چھوٹی تھی، اسے اس کو بھی سنبھالنا پڑتا تھا۔ وہ گھر میں دوسراہٹ چاہتی تھ
کام کرنے والیاں آتیں اور اپنا کام مکمل کر کے چلی جاتیں۔ اسے ایک ایسی عور
چاہئے تھی، جو مستقل ان کے ساتھ رہے۔ ان کے ساتھ کھیلے، انہیں اچھی بری بات سمجھا
روک ٹوک کرے، ان کے کام کرے، کھانا بنائے۔ وہ دونوں اسکول سے آتیں تو
ذوہیب رضا کالج سے نہیں آئے ہوتے تھے۔ ملازمہ ٹی وی دیکھنے یا کچھ اور کرنے
مشغول ہوتی۔ ان کا بھوک سے برا حال ہوتا اور وہ بھوک بھوک چلاتی سارے گھر
اُس کے پیچھے پھرتیں۔ اُن کا یونیفارم کبھی صاف نہ دُھلا ہوتا یا پورا نہ ملتا۔ کبھی کوئی
اپنی جگہ پہ نہ ملتی۔ اس نے باپ سے خود کہہ دیا تھا کہ ہمیں نئی ماما لا کر دیں۔ انہوں
ہنس کر ٹال دیا۔ اس نے اپنی ٹین ایج کا دور بہت مشکل سے جیسے تیسے گزار لیا تھا
بہت سمجھ دار ہو گئی تھی۔ اپنی اسٹڈیز، چھوٹی بہن شاہم کا خیال، باپ اور ساتھ میں گھر
وہ سب سنبھال لیتی۔ یہ سب سیکھنے کے لئے وہ جن دشواریوں سے گزری تھی، وہ بھ
نہیں تھی۔ وہ بڑی ہو گئی تھی، پھر بھی کبھی باتوں باتوں میں بابا سے گلہ کر جاتی کہ "انہو
نے دوسری شادی نہ کر کے ان کے ساتھ زیادتی کی ہے۔

یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے باپ، چچا کی روایت کو خود پر لاگو کر کے اس تاریخ کو دو
دہرانا نہیں چاہتی تھی۔ بچے اُس کے گلے کا طوق اور پاؤں کی زنجیر نہیں بن سکتے
اُس نے بہت تنفر سے سوچا تھا۔

"بیوی کے بغیر بچے پالنا اُن کا خاندانی کام ہے، جسے منصور بہت سلیقے سے
لے گا۔"

جس خاندان کے مردوں نے دوسری شادی نہ کی ہو، بچوں کی خاطر تنہا زندگی گز
دی ہو، وہ اس خاندان کی عزت، عورت اور بیٹی ہو کر یہ قدم اُٹھانے والی تھی۔ وہ بیوہ



تھی، اپنی مرضی اور رضا سے طلاق یافتہ ہونے والی تھی۔ رہ گئے بچے تو اُن کی فکر اُس
کبھی نہیں کی تھی۔ وہ صرف نام کی ماں بنی تھی، ورنہ نہ تو اُس نے اپنے بیٹوں کو دودھ
تھا، نہ ہی ممتا کی محبت سے لبریز انہیں بانہوں میں بھر کے سینے سے لگایا تھا۔ اُس نے
ں کی کبھی نیپی تک تبدیل نہیں کی تھی۔ بچے جاگ رہے ہیں یا سو چکے ہیں، انہوں نے
انا کھایا، کھانے میں ان کے لئے کیا بنا تھا، انہیں کس چیز کی ضرورت ہے، کون سے
بیمار ہے۔ یہ سب معلومات اُسے ماجدہ اوپر ہی پہنچا دیتی تھی۔ یہ سب فکریں منصور
پال رکھی تھیں۔ بچوں میں اُس کی جان تھی۔ صبح آفس جانے سے پہلے وہ بچوں سے
لر جاتا تھا۔ شام کے دو گھنٹے وہ بچوں کے ساتھ ضرور گزارتا۔

وہ منصور سے بچوں کو ساتھ رکھنے کی ضد کرتی بھی تو وہ تب بھی اسے بچوں کا بال تک
یتا۔

وہ تو بے حس ہو چکی تھی۔ مگر وہ جذبات سے خالی نہیں تھا۔ پھر اس نے بچوں کو
ہ لے جانا بھی نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی کہ منصور اس سے زیادہ اچھی طرح ان کی پرورش
ے گا۔

☆☆☆

کوریا سے ڈیلی گیشن آیا تھا۔ ایک بجے اُس کی ضروری میٹنگ تھی۔ میٹنگ نمٹا کر
ے انہیں کاٹن مل کا وزٹ کروانا تھا۔ اُس کے پاس اسکریپ میں کچھ مشینری تھی، جس
ودا طے پانا تھا۔ وہ سارا دن بہت مصروف گزرا تھا۔ پانچ بجے وہ تھکن زدہ فارغ ہوا
وہ چھ، ساڑھے چھ بجے تک گھر جاتا تھا۔ مگر آج وہ اس قدر تھکن کا شکار ہوا کہ اس
سوچا، اب سیدھا گھر چلے جانا چاہئے۔ آفس ٹائمنگ آف ہونے میں محض گھنٹہ ہی
تھا۔ پھر غیر ارادی طور پر ہی اس نے گاڑی، آفس روڈ پہ ڈال دی۔ گھر میں اب
ے سکون نہیں ملتا تھا۔ اس سے بہتر آفس ہی تھا، جہاں وہ مصروف تو رہتا تھا۔ گھر میں
ے مصروفیت ڈھونڈنی پڑتی تھی۔ وہ آفس میں داخل ہونے ہی لگا تھا کہ اُس کی سیکرٹری
کمرے سے اسے دیکھ کر باہر آ گئی۔

"ایکسکیوزمی سر!"

"جی۔" وہ رُک کر اُس کی طرف پلٹا۔

"آپ کے گھر سے کئی بار کال آ چکی ہے سر! آپ کی مسز ہسپتال میں ایڈمٹ ہیں۔"

"کب؟..... آپ نے مجھے انفارم کیوں نہیں کیا؟" اُسے پریشانی نے گھیر لیا۔

''سوری سر! آپ کا سیل فون مستقل آف جا رہا تھا۔ کال دو گھنٹے قبل آئی
سیکرٹری نے وقت اور وجہ بتائی۔

''اوہ.....نو.....'' وہ اُلٹے قدموں واپس مڑ گیا۔

اپنی مصروفیت کے مدِنظر اُس نے موبائل آف کر دیا تھا۔ عام حالات میں
بے احتیاطی کبھی نہیں کرتا تھا۔ اس نے گاڑی کو فل اسپیڈ سے دوڑاتے ہوئے ڈاک
کال کی تھی، اُن کی پرسنل اسسٹنٹ نے بتایا کہ ''وہ لیبر روم میں بزی ہیں۔''

ماہم کی تکلیف کا سوچ کر اُس کے حواس معطل ہو رہے تھے۔

درد سے تڑپتے اُس نے میری راہ دیکھی ہو گی؟.....اُسے ہسپتال کون لایا ہو گ
شاہم تو خود کم فہم اور ڈرپوک سی ہے، اسے کس نے سنبھالا ہو گا؟ متعدد سوالات
وہ ہسپتال پہنچا تھا۔ ریسیپشن سے اُسے پتہ چلا تھا کہ ماہم منصور کو ابھی تھوڑی دیر
میں شفٹ کر دیا گیا ہے۔ پرائیویٹ رُوم نمبر پوچھ کر وہ بھاگتا ہوا پہنچا۔

اماں حاجراں، رُوم کے باہر بینچ پر بیٹھی منہ میں کچھ پڑھ رہی تھیں۔ شاہم
لینے گئی ہوئی تھی۔

''اماں! کیسی ہے ماہی؟'' اُس کا یوں بھاگنے سے سانس پھول چکا تھا۔
بہت عرصہ بعد اسے اس نام سے پکارا تھا۔

''تم کہاں رہ گئے تھے منصور بیٹا! وہ اندر ہے۔ ابھی بے ہوش ہے۔'' اما
اُسے دیکھ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ اس نے مزید کچھ نہ سنا اور اندر چلا گیا۔ وہ جب
اُسے نہ دیکھ لیتا، اُسے چین نہیں آنا تھا۔

بائیں طرف کی دیوار کے ساتھ لگے بیڈ پر وہ بے حس و حرکت پڑی تھی۔
کی تکلیف نے اُس پہ گہرے اثرات چھوڑے تھے۔ رنگت میں زردی گھلی
آنکھوں کے نیچے مدھم سیاہ حلقے نظر آ رہے تھے۔ ہونٹ بالکل خشک ہو چکے تھے
دیر کھڑا اُس کے وجود پہ ساکت نظریں جمائے رہا۔ اُس کی آنکھوں میں
تیرنے لگی۔ اُس کا اس بے وفا کے ساتھ ایک معاہدہ تھا، جو اس وجود کے دنیا
اسے پورا کرنا تھا۔

''کانگریچولیشن سر!''

''آں..... ہاں.....تھ.....تھینک یُو۔'' اُس کا ارتکاز اس درمیانی
نے توڑا۔



''آپ کی بے بی بہت خوب صورت اور صحت مند ہے۔ دیکھیں گے نہیں؟''

''ہاں.....'' بے جان قدموں کو گھسیٹتا وہ کاٹ تک آیا۔

نرس نے بچی کے منہ سے کمبل ہٹا کر اُسے اُٹھا کر منصور کی طرف بڑھا دیا۔

ذرا سا مسکراتے اُس نے بہت شفقت سے بیٹی کو بانہوں میں بھرا۔ گول مٹول سی،
بی گلابی، بڑی بڑی پلکیں، ننھی ننھی بھینچی ہوئی مٹھیاں۔ بے اختیار ہو کر وہ بوسہ دینے
ں کے ماتھے پہ جھک گیا۔ آنکھوں میں رُکی نمی، آنسوؤں کی صورت اُس کی آنکھوں سے
کر لڑھک گئی۔

جب ماہم پہلی بار ماں بننے والی تھی، تب بھی اس نے بے تحاشا دعائیں مانگی تھیں کہ
ب اُسے بیٹی دے۔ اُس کی بیٹی کی خواہش پوری ہو گئی تھی۔ پر کن حالات میں؟ وہ بہت
ں ہونا چاہتا تھا۔ مگر اُس کے اندر تو ویرانی پھیلتی جا رہی تھی۔ اُس کے اندر کچھ ہونے کا
ڑکا لگ گیا تھا۔ جامد خاموشی نے اُس کے سارے وجود کا گھیراؤ کر لیا تھا۔

''سر! بیٹی کا نام کیا رکھیں گے؟'' نرس نے اس کی کیفیت کو پھر توڑا تھا۔

''اوں.....ہوں.....دعا.....میری دعا۔'' وہ اب اُس کے گال چوم رہا تھا۔ رو
ا تھا، ہنس رہا تھا۔

نرس اس عجیب شخص کو اُلجھن سے دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

گیارہ بجے اُس کی آنکھ کھلی تو اُس نے حسبِ عادت موبائل چیک کیا۔ یک دم ہی
س کے سارے سوئے جاگے حواس بیدار ہو گئے۔ موبائل پہ نہ تو ارسل کا کوئی میسج تھا، نہ
ا مس کال۔ ارسل چاہے اس سے آخری بات رات کے تین بجے ہی کرتا، پھر بھی صبح
س کے لاتعداد میسج اُس کے منتظر ہوتے۔ اُس کی صبح اُس کی آواز یا اُسے پڑھ کر ہوتی
تھی۔ اس کی پریشانی بجا تھی۔ بالوں کو کیچر میں جکڑ کر اُس نے ارسل کو کال ملائی۔

''ہیلو ارسل! واٹ ہیپنڈ؟ آر یُو اوکے؟.....کیا ہوا؟'' اُس کے پانچویں بیل پر
فون اُٹھانے پر وہ حواس باختہ سی ہو گئی۔

''آئی ایم اِل یار! (میں بیمار ہوں)'' اُس کی آواز میں نقاہت تھی۔

''کل تک تو بھلے چنگے تھے۔'' اسے اتنی جلدی بیمار ہونے پر یقین نہ آیا۔

'بیماری سمن دے کر تھوڑی آتی ہے کہ تیاری کر لو، میں پہنچ رہی ہوں۔'' وہ خفگی سے
بولا۔

''تیاری نہیں، ڈاکٹر کرلو۔ اچھا، لیو اِٹ، آئی ایم کمنگ۔'' اُس نے فون رکھنا
''سنو! آ جاؤ۔ مگر بریک فاسٹ کر کے، ناشتے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ
صرف خود چائے پی ہے۔ رات بیکری سے کچھ لیا ہی نہیں تھا۔'' اُس نے اُسے اطلا
ضروری سمجھا۔
''کیا میں تمہارے پلّے سے ناشتہ کرتی ہوں؟'' شاہم کا پارہ ہائی ہو گیا۔
''کھا کے مُکر جانے والی! نہ صرف ناشتہ بلکہ ایک عرصہ سے لنچ بھی کر کر کے
جیب ہلکی کراتی چلی آ رہی ہو، جھوٹی۔ جھوٹوں پر خدا کی لعنت ہو۔'' بخار میں بھی
زبان پٹر پٹر چل رہی تھی۔
''کیا..... کیا..... میں جھوٹی؟..... تمہارا گھر کھانے والی، گھر سے نکالی ہو
نا جیسے..... میری نیند کے دشمن! آئی وِل کِل یُو۔'' شاہم اُس کے الزام پر غصے
ہو گئی۔
''یہیں سے اندازہ کرلو، تم سچ سن کر کاٹ کھانے کو دوڑ رہی ہو۔ ہے نا
حرکت۔'' وہ اُس کے تپنے سے حظ اُٹھا رہا تھا۔
''واٹ یُو وانٹ؟..... میں تمہاری تعزیت کے لئے آؤں یا نہیں؟'' گرم
وہ روانی سے بولی۔
''کیا، تعزیت؟..... تعزیت ہو تمہاری، تمہارے ہوتے سوتوں کی۔ مجھ جیتے
ہٹے کٹے کی تم تعزیت کروا رہی ہو۔''
''سس..... سوری! مزاج پرسی۔ شاید حال پرسی، جو بھی بیماروں کے لئے
ہوتا ہے، وہی۔ خدا حافظ!'' اپنی تصحیح کرتے، اُس کی سنے بغیر اس نے فون بند کر د
آدھے گھنٹے کے بعد ہی وہ اس کے پاس موجود تھی۔ وہ کمبل میں اچھی ط
ہوا، تھوڑا سا منہ باہر نکالے دبکا پڑا تھا۔
''واٹ اِز دِس کٹے؟'' اس کا کہا دہراتے اُس نے کمبل کھینچا۔
''ناٹ اونلی کٹے، ہٹے کٹے۔'' وہ مصنوعی دھاڑا۔
''بے عقل، بے وقوف! پہلے ہی ٹھنڈ لگی ہوئی ہے، اوپر سے کمبل بھی اُتار ر
اس نے کمبل واپس کھینچ کر مضبوطی سے دبوچ لیا۔
''گلا تو تم اتنا پھاڑ رہے ہو، جیسے صورِ اسرافیل پھونکنے کا حکم نامہ ملا ہو۔''
''تو تم بھی دعا لینے والے کام کرو۔ پتہ ہے، بیمار کی دعا کتنی لگتی ہے۔'' کمبل



پہ ڈالتے اُس نے برجستگی سے معلومات دیں۔
''جی حاجی جی!'' مسخرے پن سے کہتی اُس کے قریب کرسی کر کے بیٹھ گئی۔
''میں بیمار پڑا ہوں اور تم اتنی تسلی سے بیٹھ رہی ہو۔ جاؤ کوئی ترکیب کرو کہ میرا بخار
چکر ہو جائے۔'' اس نے اس کے بیٹھنے پہ دہائی دی۔
''کیوں، میں حکیم لقمان کی شاگرد ہوں؟ بیمار ہی ہو، کوئی بسترِ مرگ پہ تھوڑی ہو؟''
ے طیش دلانے کے لئے اُس نے بڑی لاپروائی سے کہا۔
''شامی پلیز.....''
''میرے پاس ایسی کوئی جڑی بوٹی نہیں، جسے گھوٹ کر پینے سے تم شفایاب ہو جاؤ
۔ نہ ہی میں کسی پرائیویٹ ہسپتال کی نرس ہوں۔ تم کسی ماہر ڈاکٹر سے رجوع کرو۔''
نداز ہنوز برقرار رکھے اُس نے مشورہ دیا۔
''تم کچھ نہیں کرو گی؟'' اس نے اب کے ذرا سختی سے پوچھا۔
''کچھ .... ہاں، کچھ تو میں کر سکتی ہوں۔ ابھی آتی ہوں۔'' وہ کہتے ہوئے فٹ
کھڑی ہو گئی۔
کچھ دیر میں وہ پانی سے بھرا پیالہ ہاتھ میں پکڑے پلٹی تھی۔
''میں تمہیں ٹھنڈے پانی کی پٹیاں کرتی ہوں۔'' پانی کا پیالہ آگے کر کے اس نے
نے پن سے کہا۔
''واٹ.....؟'' وہ نیم دراز چلّا کر اُٹھ بیٹھا۔ اُسے شاہم سے اتنی بھی کم عقلی کی توقع
ہ تھی۔
''جب بیمار ہوں تو پٹیاں کرنے سے بخار کا زور ٹوٹ جاتا ہے۔'' وہ شروع سے یہی
نا اور سنتی آ رہی تھی۔
''مائی گاڈ..... شامی!'' اس نے سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔
''میں سردیوں کا بیمار ہوں، گرمیوں کا نہیں اتنی سمجھ تو مجھے مرد ہو کے بھی ہے۔
ے برابر، ہیٹر آن اور دروازے بند ہیں۔ بلینکٹ اوڑھا ہونے کے باوجود بھی مجھے
لگ رہی ہے۔ ٹھنڈے پانی سے مجھے دھو کر نمونیہ کرواؤ گی؟ بہت شوق ہے تمہیں
کن سے قبل بیوہ ہو جانے کا۔''
اس نے شاہم کی عقل مندی پہ سر پیٹا۔
''اچھا ارسل! میں سُوپ بنا دیتی ہوں۔ مجھے ریسپی یاد ہے۔'' اس نے مزید

پیشکش کی۔

''بنا لو۔ چکن سُوپ بنا لو۔'' اس نے بظاہر مسکراتے ہوئے مگر اندر سے سہمتے
اجازت دی۔

''یا اللہ! تُو ہی میرا رکھوالا ہے۔ بچا لے مجھے۔'' شاہم کے جاتے ہی اس نے
اُٹھا کر اپنی خیریت مانگی۔

اس نے کبھی ہانڈی میں چمچ تک نہیں ہلایا تھا۔ صرف بدمزہ سی چائے اسے بنا
تھی۔ اس کی پڑھائی ختم ہو چکی تھی۔ گھر سنبھالنے کی اس کی عمر تھی۔ منصور نے اس
بار کہا تھا کہ کچن میں جایا کرو۔ مگر اُسے ارسل سے فرصت ملتی تو کچھ کرتی۔

ارسل بستر سے اُٹھ کر کمرے میں اِدھر سے اُدھر چکراتے لگا۔ وہ اُس کے پیچھے
میں جا کر اُسے تنگ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اچھا ہوتا، وہ تسلی سے اپنا سارا کام سرانجام
لیتی۔ فلور کشن کو سیدھا کر کے وہ تکیہ اور کمبل لے کر وہیں آ بیٹھا۔ کمبل کو ٹانگوں پہ
پرانا سا میگزین دھیان بٹانے کو کھنگال رہا تھا کہ وہ چلی آئی۔ چھوٹی سی ٹرے میں
پیالہ اور چمچ بھی رکھے۔

شاہم کی اس سلیقہ مندی پر اُس نے دل ہی دل میں اُسے سراہا۔

''یہ لو، زیادہ دیر تو نہیں ہوئی؟'' اس کے پاس ہی فلور کشن پہ بیٹھتے اُس
اُسے تھمایا۔

شاہم کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ اس نے پہلی بار کچھ بنایا تھا اور وہ بھی اپنے
ارسل کے لئے۔ اُس کی خوشی دُوگنی تھی۔ اُس نے مسکراتے ہوئے بھنویں اُچکا
پینے کا اشارہ کیا۔ ارسل نے شرارت سے سہمنے کی ایکٹنگ کی، مگر شاہم کے منہ
آنکھیں نکالنے پر وہ مسکرا دیا۔ پہلا چمچ منہ میں ڈالتے ہی اُس کا تالو، حلق اور سینہ
ہو گیا۔ اُسے لگا جیسے اُسے لال مرچوں کی دھونی دے دی گئی ہو۔ اس کی آنکھوں
میں نمکین پانی آ گیا۔ بہت ضبط سے اس نے زہر کو حلق سے اُتارا۔

''تم نہیں لو گی؟ میں تمہارے سامنے بیٹھا اکیلا پیتا اچھا نہیں لگ رہا ہوں
نے اپنے تاثرات نارمل رکھے اور پیالہ اس کی طرف بڑھایا۔

''میں، اپنے لئے لاتی ہوں۔'' ارسل کا بڑھا ہوا ہاتھ روک کر وہ اُٹھ گئی۔
چمچ بھرنے کے بجائے سیدھا پیالے کو منہ لگا لیا۔

وہ اپنے ہونے والے انجام سے بے خبر تھی۔



اگلے ہی لمحے اسے زبردست اچھو لگا تھا۔ سارا سُوپ منہ سے نکل کر ارسل کی شرٹ
داغ چھوڑ گیا۔ ارسل نے اس کے ہاتھ سے پیالہ پکڑا۔ وہ سینے کو مسلتی، کھانستی ہی جا
ہی تھی۔ ارسل کے بھاگ کر پانی کا گلاس لانے تک وہ ادھ موئی ہو گئی۔

''ار.....ارسل! تم بہت چیپ ہو۔'' وہ اُس کی شرارت جان گئی۔

''تو تم مجھ پہ سقراط والا پریکٹیکل کرنے لگی تھیں۔ زہر کا پیالہ تیار کر کے لے آئیں۔''
نی شرٹ کو جھاڑتے ہوئے اس نے کہا۔

حقیقتاً اسے شاہم کی حالت پر افسوس ہوا تھا۔ اس کا ارادہ شاہم کو اتنا تنگ کرنے کا
یں تھا۔

''سوری ارسل! تمہاری شرٹ بھی خراب ہو گئی۔'' وہ شرمندہ سی ہو گئی۔ قصور بھی تو
ں کا تھا۔

''تمہاری شرٹ پہ داغ لگ گیا ہے۔ اُتار دو، میں دھو دیتی ہوں۔'' دو دفعہ ناکام ہو
ے اُس نے تیسری کوشش کرنی چاہی۔

''پہلے نرس، پھر باورچن، اب دھوبن۔ خدا کے واسطے، رحم کھاؤ مجھ پہ۔ میں آل ریڈی
ت نڈھال ہوں۔''

شاہم کی اس نئی آفر پہ اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیئے۔

''ارسل.....!'' ماہم اب رونے کی تیاری پکڑنے لگی۔

''ناٹ فیئر یار! تم نے اپنے پھوہڑ پن کے سارے ایکسپیریمنٹ مجھ غریب پہ کرنے
قسم کھا رکھی ہے۔''

''نہیں۔'' اُس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آ گئے۔ ارسل نے اپنی پینٹ کی
یں ٹشو پیپر کی تلاش میں ٹٹولیں۔

''نہ.....نہ.....رونا بالکل نہیں۔ میرے پاس ٹشو پیپر نہیں ہے۔ ویسے بھی، داغ تو
چھے ہوتے ہیں۔'' وہ کمرشل کی نقل کرتا بچہ ہی لگ رہا تھا۔ وہ بے اختیار ہنس دی۔

''خوش رہا کرو.....گڈ گرل۔ تمہارا رونا مجھے بہت تکلیف دیتا ہے۔''

''ارسل! مجھے ایک دھڑکا سا لگ گیا ہے، کچھ ہو جانے کا۔ کچھ نہ کچھ غلط ضرور ہو
ائے گا۔'' ارسل کے برابر سے اُٹھ کر سامنے بیٹھتی وہ پوری سنجیدگی سے اپنا ڈر بتانے لگی۔

''تمہیں ایسا لگتا ہے؟'' اُس کی آواز کافی دھیمی ہو گئی تھی۔

''ہاں۔''

دعا جب سے ہوئی تھی، وہ زیادہ وقت اس گڑیا کے ساتھ کھیلنے میں گزارتی۔ تب
اُسے ماہم اور منصور کے درمیان عجیب سی لاتعلقی کا احساس ہوا تھا اور کچھ ایسا ہی
ارسل کے لاشعور میں بھی تھا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' اس نے گم صم ارسل کا بازو ہلایا۔

''ہوں.....نہیں تو۔'' وہ اُسے، اپنی کیفیت سے آگاہ نہ کر سکا۔

''میں تمہارے لئے کچھ کھانے کو لے آؤں؟'' وہ اُس کی توجہ ہٹانے کو پوچھنے لگا۔

☆☆☆

منصور نے بیٹی کی پیدائش پہ جشن کا ارادہ کیا ہوا تھا۔ بیٹوں کی پیدائش پر اُس
دونوں بیٹوں اور ماہم کا صدقہ دیا تھا۔ بیٹوں کے عقیقہ کئے تھے۔ فقیروں کو خیرات
تھی، غریبوں اور مسکینوں کو کھانا کھلایا، ضرورت مندوں کو کپڑے اور پیسے دیئے گئے
ان کے گھر بھر مہینہ بھر رونق لگی رہی تھی۔ اب حالات یکسر ہی بدل گئے تھے۔

دعا دو ماہ کی ہو گئی تھی، ابھی اس کا عقیقہ بھی نہیں ہوا تھا۔ صدقہ، خیرات تو اس
باہر ہی کسی کو دے دیا تھا۔ ملازمین میں بھی چہ مگوئیاں ہو رہی تھیں۔ انہیں منصور کا اتا
روّیہ، اُلجھن میں ڈالے ہوئے تھا۔ منصور نے ماہم کا خاص خیال رکھا تھا۔ وہ اسے ٹائم
دوا دیتا۔ بیٹی کے لئے گورنس اور اس کے لئے کل وقتی ملازمہ کا انتظام بھی تھا۔

وہ شام کو اس کے پاس بیٹھتا۔ اس کا حال احوال دریافت کرتا۔ ماہم کا صرف ہو
ہاں میں جواب دینا اسے بہت دُکھی کرتا تھا۔ ابھی بھی وہ کمرے میں تھا۔ وہ دونوں
دوسرے کو دیکھتے، نظریں چراتے، کچھ کہنے کی کوشش میں خاموش اِدھر اُدھر بغلیں جھانکتے
کسی غیر ضروری سرگرمی میں مشغول ہو جاتے۔

ماہم اس سے طلاق کا موضوع زیر بحث لانا چاہتی تھی۔ کاشا کا اُس پہ زور بڑھ
رہا تھا۔ اس نے دوبارہ خلع کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔ یعنی اُسے منصور کی زبان پہ بھروسہ
اب اُسے اپنا کہا نبھانا تھا۔ بیٹی پیدا ہوئے بھی دو ماہ ہو گئے تھے۔

منصور، ماہم کی بڑھتی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ وہ اپنی زبان کا پکا تھا۔ اپنا کہا
بھولا نہیں تھا۔ محبت کرنے والے ہمیشہ خوش فہمی کے سمندر میں ڈبکیاں لگاتے ہیں۔
بھی اس سمندر میں ڈوبتے کسی تنکے کے سہارے کا انتظار تھا، جو سب تو نہیں، تھوڑا
ہی بدل دے۔ اگر وہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر کے اسے بدل دیتی، اس کے لئے، اس
محبت کی خاطر نہیں، اُس کی محبت کی وقعت ہی کیا تھی۔ بیٹوں کے لئے نہیں، بیٹی کی



رک جاتی تو کیا وہ اسے پھر سے چاہ سکے گا؟ ان کے رشتے میں جو بال آ چکا ہے، وہ
ل سکے گا؟

بال، رشتے میں تھا۔ ماہم کے اتنا سب کرنے کے باوجود بھی اس کی محبت میں کسی قسم
کی یا نفرت نہیں آئی تھی۔ اسے اب بھی سو فیصد یقین تھا کہ اگر ماہم رک جائے تو وہ
ت جلد اس کی طرف سے دل صاف کر لے گا، اُس کی غلطی بھلا دے گا۔ اُس کی محبت
ں اتنی وسعت، اتنی گنجائش تھی۔ وہ اسے شک یا تنگ نظری کی بھینٹ نہیں چڑھا سکتا
۔ دوسری طرف ماہم مزید اس ناپسندیدہ بندھن کو نبھا نہیں سکتی تھی۔ اس کے لئے لمحہ لمحہ
دار تھا۔ منصور کی اوڑھی چپ اسے کھلنے لگی تھی۔

''وہ.....گلبرگ والا گھر، اگر واپس لینا چاہو تو..... لے سکتے ہو۔'' اُس نے نقطہ
ونڈ کر آغاز کر دیا۔ حالانکہ کاشا اُسے کہہ چکا تھا کہ اُس کے پاس کوئی رہائش نہیں ہے۔
ں سے شادی کی صورت میں اسے اپنے موجودہ گھر سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے۔
ں نے اُمید دلائی تھی کہ وہ اسی گلبرگ والے گھر میں شفٹ ہو جائیں گے، جو شادی کے
روز بعد منصور نے اس کے نام کیا تھا۔ یہ اُس کی محبت کا نذرانہ تھا۔

وہ صرف اُسے جانچنے کے لئے یہ ذکر چھیڑ رہی تھی۔

منصور نے سانس اروک کر اسے سنا۔ جن گھڑیوں سے وہ بچنا چاہتا تھا، آنکھیں بند
ئے بیٹھا تھا، وہ پل قریب آ گئے تھے۔

''اس طرح اور بھی بہت کچھ تمہاری طرف نکلتا ہے۔ لینے پہ آ جاؤں تو کیا کیا واپس
روگی؟''

ماہم خاموش رہی تھی۔

''کچھ بھی دینے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ مزید جو کچھ چاہے، لے جا سکتی ہو۔'' ماہم کی
رف سے خاموشی پا کر وہ پھر بولا تھا۔

اسے کہیں یہ خوش فہمی تھی کہ وہ کہے گی۔ ''مجھے میرے بیٹے دے دو، نہیں تو پھر بیٹی
رور دے دو۔ میری دو ماہ کی معصوم بیٹی ہے، میں ماں ہوں اس کی، جنم دیا ہے اسے،
ں کیسے اس کے بغیر رہوں گی؟ بیٹی کی رکھوالی صرف ماں ہی کر سکتی ہے۔'' وہ اسی طرح
کے کچھ جذباتی جملے، بچوں کے حوالے سے سننے کا منتظر تھا۔

اور ماہم کے نزدیک اس گھر میں جتنی غیر ضروری اور فضول چیزیں تھیں، ان میں
سب سرفہرست تھے۔

منصور کی فہم و فراست کو مدِنظر رکھتے، بچے اُسے سونپ کر وہ بہت بے فکر تھی۔

''بے بہا دولت، عیش و عشرت، گاڑی، بنگلہ، بیلنس، نوکر چاکر، جسمانی سکون تو د
سکتے ہیں۔ دلی، ذہنی اور روحانی سکون نہیں۔''

ماہم اُسے کن اکھیوں سے دیکھتی، سن رہی تھی۔ وہ لاکھ اس سے بے زار اور بدگما
سہی، اتنا تو اسے جانتی تھی کہ وہ یہ سب اُسے سنانے یا طنز کرنے کو نہیں کہہ رہا ہے۔

''صرف محبت..... محبت سکون دیتی ہے۔ اندر تک شانت کرتی ہے۔ تم کیا کہو گی؟
منصور نے ہاتھوں کو تکتی ماہم سے پوچھا۔ اس نے اس کا نام پکارنا چھوڑ دیا تھا۔

''میں..... میں یک طرفہ محبت کی قائل نہیں ہوں۔'' اس نے جھگڑا ہی سمیٹ ڈالا
یہی یک طرفہ محبت تو فساد کی جڑ تھی۔ منصور کی محبت، ماہم سے۔

''یہ پاسیبل نہیں کہ ہر میاں بیوی میں محبت بھی ہو۔ کئی ایسے کپلز بھی ہوں گے،
صرف کمپرومائز کی بنیاد پر ساری زندگی ساتھ نبھاہ دیتے ہیں۔ اس رشتے میں محبت شرط
نہیں۔ بہت سے لڑکے، لڑکیاں صرف ماں باپ کی رضامندی پہ ایک دوسرے کو دیکھ
بغیر ہامی بھر لیتے ہیں۔ محبت نہ بھی ہو تو رشتے برقرار رہتے ہیں۔''

ماہم کو منصور کی اس ساری گفتگو سے چڑ ہونے لگی۔ وہ اسے کیا بتانا چاہ رہا تھا
محبت کی کوئی اہمیت نہیں، تم خود پر جبر کرو، سمجھوتہ کرو، قربانی دو، اس رشتے، اولاد کے
ساری زندگی میرے ساتھ اس جہنم میں گزار دو۔

''آئی تھنک، ان سب باتوں کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہمارے درمیان سب طے ہو
ہے۔'' اس نے کھوئے ہوئے منصور کو یاد دلایا۔

''تمہیں جانے کی جلدی ہے؟'' اس نے اصل سرا پکڑا۔

ماہم کے موبائل کی بیپ ہونے لگی۔ اسکرین پر ''کاشف کالنگ'' چمک رہا تھا۔
موبائل تھامے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''کاشف کی کال ہے۔ میں آل ریڈی بہت لیٹ ہو چکی ہوں۔ آئی ہوپ، ا
مزید نہیں کرو گے۔ آئی ہیو ٹو گو ناؤ۔''

سپاٹ لہجے میں اپنا آخری فیصلہ سناتی، وہ منصور کو بالکل خالی ہاتھ، خالی دل چھوڑ
کمرے سے باہر چلی گئی۔

بہت دیر وہ یونہی گم صم بیٹھا رہا۔ اسے اپنی سماعتوں اور ماہم کی دلیری بہت بے یقی
لگ رہی تھی۔ اس نے اُٹھ کر کھڑکی کھول دی۔ آسمان پر ٹھہرتا بادلوں سے خوف زدہ



ہوا اور پھر ان ہی بادلوں کی اوٹ میں چھپتا، نکلتا چاند بالکل اپنے جیسا لگا۔

''شاید بارش ہو جائے۔'' آسمان کو تکتے وہ انداز اُبڑبڑایا۔

کھڑکی سے ہٹ کر بیڈ پر آ کر دراز ہو گیا۔ آنکھوں پہ بازو رکھے وہ سونے کی ناکام
سعی کرتا خود کو یہ باور کروا رہا تھا۔ ''یہ سب ہونا ہی تھا۔ اس سے آگے کا لائحہ عمل کیا ہو گا؟
وہ اپنے وکیل سے ملے گا، اسے کیسے ساری بات بتائے گا؟ ماہم چلی جائے گی، بچوں کا
کیا بنے گا، میں کیسے جی پاؤں گا؟''

بہت سے سوالات اُسے بے چین کرنے کو ہمک رہے تھے۔ جبکہ وہ سب کچھ جھٹلا کر
نیند کی آغوش چاہتا تھا۔ نیند اُسے بھلا کیسے آ سکتی تھی؟ اس کے دماغ پہ چند سال قبل ماہم
سے کی گئی ملاقات کی یاد دستک دینے لگی۔

☆☆☆

اُس کا باپ حطیب رضا ایک لائق اسٹوڈنٹ تھا۔ وہ اسکالرشپ کے بل بو۔
انگلینڈ آیا تھا، جہاں جاب کے ساتھ تعلیم مکمل کر کے وہ لندن چلا گیا۔ وہیں اس نے
مسلم گھرانے کی لڑکی سے پسند کی شادی کر لی۔ شادی کے دو سال بعد اللہ نے انہیں
جیسی نعمت سے نوازا، جس کا نام انہوں نے منصور رکھا۔ منصور کی پیدائش کے بعد سے
کی ماں بہت بیمار رہنے لگی تھی۔ اس کے باپ نے بہت علاج کروایا، مگر خدا کو کچھ او
منظور تھا۔ منصور پانچ سال کا تھا کہ اس کی ماں چل بسی۔

حطیب رضا نے بیوی کے بعد خود کو ہر طرح سے منصور میں مصروف کر لیا۔ وہ۔
اپنے نقش قدم پہ چلاتے ایک بہترین اسٹوڈنٹ اور اچھا انسان دیکھنا چاہتے تھے۔
کی تربیت کے لئے انہوں نے ایک بنگالی ادھیڑ عمر کی عورت کا انتظام کر لیا تھا، جو تنہا
شکار تھی۔ بیٹے کی بہترین تعلیم و تربیت نے انہیں کبھی پاکستان شفٹ نہ ہونے دیا۔

دو تین سال کے وقفے سے وہ منصور کے ساتھ، اپنے بھائی ذوہیب رضا سے
ملنے آتے۔ ذوہیب، حطیب سے بڑے تھے۔ وہ گورنمنٹ کالج میں اپنے پیشے سے
پروفیسر تھے۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی کی تعلیم کے
دن رات محنت کی تھی۔ اسے اپنے پیروں پر کھڑا کر دیا۔ حطیب رضا کو اسکالرشپ
انہیں لگا کہ ان کی اتنے سالوں کی اپنے بھائی کے لئے کی گئی تگ و دو اکارت نہیں گئ

حطیب کی وہاں پر شادی، پھر بیوی کی وفات۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ پاکستان شفٹ
جائے مگر وہ نہ مانے۔ اب کہیں جا کر تو وہ مکمل طور پر اسٹیبلش ہوئے تھے۔ واپسی
ناممکن تھا۔ البتہ وہ اپنے بھائی کی محبت اور احسانات کو کبھی نہ بھولے۔ ذوہیب رض
احسانات اُتارنے کے لئے اُنہیں بھاٹی کی تنگ گلیوں سے اُٹھا کر ڈیفنس میں لا
جب اللہ نے انہیں بارہ سال بعد بیٹی کی رحمت سے نوازا، تب تک منصور چار سال



کا تھا۔

منصور آخری دفعہ سترہ سال کی عمر میں پاکستان آیا تھا۔ جب ماہم کی والدہ کی ڈیتھ
ئی تھی۔ ماہم تیرہ اور شاہم آٹھ برس کی تھی۔ ماہم کو اپنی ماما کے لئے ہر وقت روتا دیکھ کر
حیران ہوتا۔ وہ سوچتا، لڑکیاں اتنا زیادہ کیسے رو لیتی ہیں؟

پھر وہ اپنی تعلیم میں اس قدر مصروف ہوا کہ دوبارہ پاکستان نہ آ سکا۔ تعلیم مکمل کر کے
ں نے اپنے بابا کا بزنس سنبھال لیا۔ وہ جاب کا خواہش مند تھا، مگر باپ کی ناسازگار
یت نے اسے یہ کرنے نہ دیا۔ حطیب رضا آخری وقت اپنے بڑے بھائی کی ہمراہی
اپنے وطن کی سرزمین پہ گزار کے وہیں دفن ہونا چاہتے تھے۔ لیکن منصور اس کے لئے
رنہیں تھا۔ وہ ان کے علاج میں کسی قسم کی کوتاہی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا واحد
تہ باپ تھا۔

ان ہی دنوں منصور کو پاکستان سے اپنے تایا ابو کے مرنے کی خبر ملی۔ ماہم کے والد کو
ٹ اٹیک ہوا تھا۔ حطیب رضا کو آج تک اپنے بھائی کی قربانیاں یاد تھیں۔ بھائی کی
ت نے ان کے بوڑھے اعصاب پر برا اثر چھوڑا تھا۔ اُنہیں سانس لینے میں کافی
ٹواری ہونے لگی۔ اسی بات کا منصور کو ڈر تھا۔ وہ چار دن ہاسپٹل میں ایڈمٹ رہے۔

گھر شفٹ ہونے پر انہوں نے رٹ لگا لی تھی کہ انہیں بھتیجیوں کے پاس جانا ہے۔
لڑنے ان کی طبیعت کی ناسازی کے باعث سفر کرنے سے منع کر دیا۔ منصور، باپ کی
ماضد سے بہت اپ سیٹ تھا۔ بالآخر انہوں نے بہت بحث و مباحثے کے بعد یہ طے کیا
منصور چلا جائے۔ وہ بابا کے سامنے مجبور تھا۔ انہوں نے سیٹ بک کروا دی۔ اُس نے
ب ماہ رہنے کا سنا تو حیران رہ گیا۔ حطیب رضا نے اسے سختی سے تاکید کی۔

"جوان بچیاں اکیلی ہیں، انہیں تسلی دلا سا دینا اور ان کی رکھوالی کا کوئی محفوظ بندوبست
ل کرنا۔ جیسے ہی ڈاکٹر پرمیشن دیں گے، میں بھی مستقل پاکستان شفٹ ہو جاؤں گا۔"

آخری رات جب صبح اُس کی فلائٹ تھی، وہ ان سے آدھی رات تک باتیں کرتا رہا۔
ئت کے متعلق چھوٹی چھوٹی نصیحتیں کرتا رہا۔ دوائیں کھلانے کے بعد ان پر کمبل درست
کر کے جانے والا تھا کہ انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پھر سے پاس بٹھا لیا۔ جو بات
ہوں نے کہی، وہ اس کے قطعاً وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔

"دو سال قبل میں پاکستان گیا تو ذوہیب بھائی کی ماہم بڑی ہو گئی تھی۔ بہت خوب
ورت اور اچھی بچی ہے۔ میں اسے تمہارے لئے اپنی بیٹی بنانے کا سوچ رہا ہوں۔ تم

بھی اس کے متعلق سوچنا کوئی زور زبردستی نہیں۔ تمہاری خوشی مجھے ہر چیز سے بڑھ کر ہے۔

وہ خاموشی سے ان کے پاس سے اُٹھ گیا۔ اگر پاپا کو اس کی خوشی ہر چیز سے بڑھ کر تھی تو وہ بھی ان کو مایوس نہیں کر سکتا تھا۔

اپنی ماما کے لئے روتی تیرہ سال کی کمسن سی بچی۔

''کیا وہ اپنے پاپا کے لئے بھی اسی طرح روتی ہو گی؟'' بے اختیار اس نے سوچا۔

لاہور ایئرپورٹ پر اسے کون لینے آتا۔ اسے تقریباً رستے یاد ہی تھے اور مکمل ایڈریس تھا۔ ڈیفنس سوسائٹی میں گھر ڈھونڈنا کون سا مشکل کام ہے؟ وہ کیب سے باآسانی مطلوبہ منزل پہ پہنچ گیا۔

اس نے بیل پہ اُنگلی رکھی۔ بیل شاید خراب تھی۔ اس نے چھوٹے گیٹ پر دستک دینا چاہی تو وہ کھلتا چلا گیا۔ وہ تھوڑا سا حیران ہوتا اندر داخل ہو گیا۔ جوان لڑکیوں کا اکیلے اور گیٹ کا کھلا ملنا، اسے یہ لاپروائی اچھی نہیں لگی تھی۔ پاکستان کے حالات وہ نیوز پیپر اور مختلف چینلز پہ دیکھتا رہتا تھا۔

وسیع و عریض لان کو سنگِ مرمر کی روش دو حصوں میں تقسیم کرتی تھی۔ دائیں طرف پورچ تھا تو بائیں طرف داخلی حصہ شروع ہوتا تھا۔ یہ گھر اس کے باپ کا تھا، ان ہی کے نام تھا۔ مگر اس کے تایا ابو کئی برسوں سے یہیں رہ رہے تھے۔ اس کے علاوہ لاہور میں کئی اور بھی بہت سی جائیداد اور گھر تھے، جن کی رکھوالی ذوہیب رضا ہی کرتے تھے۔

داخلی دروازے کے باہر گول، خوب صورت سا برآمدہ تھا، جس کے چاروں طرف گملے رکھے تھے۔ برآمدے کے پلرز سے بوگن ویلیا کی بیلیں لپٹی ہوئی تھیں۔ برآمدے کی بیرونی چار پانچ سیڑھیوں پر، پلر سے ٹیک لگائے وہ بڑی سوگوار سی حالت میں بیٹھی تھی۔

آنکھیں رگڑنے سے سرخ اور سوجی ہوئی تھیں۔ ناک پونچھ پونچھ کر سرخ ہو رہی تھی۔ گالوں کا رنگ بھی آنکھوں اور ناک کے ہم رنگ ہو رہا تھا۔ کندھے سے تھوڑا سے بالوں کو کئی دن سے برش کرنے کی زحمت نہیں کی گئی تھی۔ کیونکہ بینڈ میں گنتی کے صرف تین چار بال ہی جکڑے تھے۔ باقی کے بال دو اطراف سے بکھرے اور اُلجھے ہوئے تھے۔ اس کے کپڑے بھی ملگجے سے تھے۔ وہ اپنی جگہ پر جما اُس ماتم کناں بُت کو مخاطب کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں گومگو تھا کہ اندر سے ایک سترہ، اٹھارہ سال کی لڑکی اپنے دھیان میں باہر آئی۔

''اُٹھیں نا، آپی! کب تک یونہی بیٹھی رہیں گی؟ آپ نے کل سے کچھ نہیں کھایا۔



مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ میں آپ کے بغیر نہیں کھاؤں گی۔''

وہ بچوں کی طرح منہ بسورتے اسے بازو سے پکڑ کر ہلا رہی تھی اس کے ساکت وجود میں ذرا سی بھی حرکت نہ ہوئی تھی، بلکہ وہ رونے لگی تھی۔

تب ہی اس نے ان بے خبروں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے کافی زور سے پکارا۔ وہ چھوٹی والی فوراً نظریں گھما کر حیرانی اور بے یقینی سے اس نووارد کو دیکھنے لگی تھی۔

''ماہم آپی! دیکھیں، کون آیا ہے؟'' اس نے بمشکل گردن موڑ کر دیکھا۔

جبکہ وہ چھوٹی کے منہ سے نکلے نام، ماہم پر ہی اٹک گیا تھا۔

''آپ.....؟'' اس نے استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

وہ یکدم بول پڑا۔

''میرا نام منصور ہے۔ میں حطیب رضا کا بیٹا ہوں۔ لندن سے آیا ہوں۔''

ماہم کے چہرے پر بے انتہا شرمندگی در آئی۔ اس کے ساتھ کھڑی جو یقیناً شاہم تھی۔ ان کی معذرت پہ ان کے ساتھ اندر جاتے ہوئے اُسے ماہم کے متعلق پاپا کے کہے الفاظ یاد آئے تھے۔

''ماہم بہت خوب صورت اور اچھی بچی ہے۔'' خوب صورتی پہ اُس نے دل ہی دل میں سراہا تھا۔

ایک ماہ کیسے گزرا، پتہ ہی نہیں چلا۔ شروع شروع میں ماہم اس سے کافی جھجکتی تھی۔ البتہ شاہم سے اس کی اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ ہر ممکن کوشش کرتا کہ اپنی اور شاہم کی ہر ایکٹیویٹی میں اسے بھی شامل کرے۔ خود وہ اکلوتا، بچپن سے اکیلا پن سا تھا۔ اکلوتا ہونے کی وجہ سے اکیلا پن، بچپن سے ہی اس کے اندر تھا، جو آہستہ آہستہ اس کی شخصیت کا حصہ بنتا چلا گیا۔ سکول، کالج اور یونیورسٹی میں بھی اس نے کبھی کسی ایکٹیویٹی میں حصہ نہ لیا تھا۔ پاپا نے اسے ایک بار ٹینس کورٹ کی ممبر شپ دلوائی تھی، جو اس نے چند دن بعد ہی چھوڑ دی۔ وہ اپنی پڑھائی اور پوزیشن کو برقرار رکھنے کے لئے بہت کانشس تھا۔ غیر نصابی سرگرمیاں اسے فضول لگتی تھیں۔

اب وہ شاہم کی خوشی کے ساتھ ساتھ ماہم کو بھی بہلانے کے چکروں میں رہتا۔ اس کے چہرے پہ اطمینان اور مسکراہٹ دیکھنے کے لئے وہ کچھ بھی کرنے کو تیار رہتا تھا۔ اس نے آخری رات پاپا کے پاس سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں جا کے سوچا تھا۔ ''ماہم مجھے پسند نہ بھی آئی، تب بھی میں پاپا کی خوشی کی خاطر اس سے شادی کر لوں گا۔''

پاپا کو اپنے بھائی اور ان کی بیٹیوں سے وابستگی وہ اچھی طرح جانتا تھا جوں جو
وقت گزرتا جا رہا تھا، اس کا دل ماہم کی محبت میں گرفتار ہوتا جا رہا تھا۔ مگر اس کے ب
وہ خاص احتیاط برتتا۔ غیر محسوس طور پر وہ ماہم کے بہت قریب ہوتا جا رہا تھا۔ اسے ا
جذبات و احساسات پر بہت اختیار تھا۔ مگر ماہم کے سامنے وہ بے اختیار سا ہو جاتا۔ ا
کی یہ نئی کیفیت اس کے لئے بڑی کیف آگیں تھی۔

اس نے محسوس کیا تھا کہ ماہم کو صرف باپ کا دکھ نہیں، کوئی اور بھی چیز اسے ڈسٹ
رکھتی ہے۔ یونہی بیٹھے بیٹھے وہ کہیں کھو جاتی، کسی کی آواز یا آہٹ پر چونک کر مڑتی۔ ش
کے ساتھ وہ قہقہہ لگاتا تو نظریں جما کر بے خود سی اسے دیکھے جاتی۔ وہ تینوں لان
بیٹھے ہوتے، باتوں کے دوران اس کی نگاہیں بلا ارادہ ہی گیٹ کی طرف بار بار اُٹھ
جیسے وہ کسی کی منتظر ہو، کسی نے آنا ہو۔ اس نے چند بار فون کی بجتی بیل پر ریسیور اٹ
شاہم کو بھی ٹوکا تھا۔ بہت بے تابی، دوسری طرف کے تعارفی جملوں کے بعد مایوسی
بدل جاتی۔

منصور اُس کی پل پل بدلتی حرکات پر پریشانی کے باوجود اسے ہر خوشی سے بڑ
چاہنے لگا تھا۔ ایک ماہ ہونے والا تھا اور اسے لگ رہا تھا کہ محض ایک گھنٹہ گزرا ہے۔
سے اس کی روزانہ فون پر بات چیت ہوتی تھی۔ انہوں نے اس سے ماہم کی رائے
پوچھی تھی۔ وہ اس کے چہکتے لہجے، مسکرا مسکرا کر شاہم اور ماہم کی گردان کرنے سے
گئے تھے کہ وہ ان کے فیصلے سے متفق ہو چکا ہے۔

پاپا کی ہدایت پر اس نے ان کی ایک دُور پرے کی رشتے دار اماں حاجراں، اس
شادی شدہ بیٹے اور بہو ماجدہ کو ان کی نگرانی کے لئے وہیں رکھوا دیا تھا۔ وہ ان کی رکھ
کا قابلِ اعتبار بندوبست تو کر گیا تھا، مگر ملک کے حالات کا اتنے قریب سے مش
کرنے کے بعد کسی پر بھی اعتبار کرنا مشکل ہے۔ شاہم سے اُسے اُنسیت تھی، وہ اُس
بہت اچھی دوست تھی۔ ماہم کو وہ ایک پل کے لئے بھی خود سے دُور نہیں کرنا چاہتا
اس نے واپس جا کر پاپا کو ماہم کی رضامندی کے ساتھ مستقل پاکستان شفٹ ہونے
بھی نوید دی تھی۔ ان کی طبیعت بھی قدرے بہتر تھی۔ پاکستان جانے کا سن کر وہ
رہنے لگے تھے۔ جلدی جلدی کرتے بھی تمام کاروبار وائنڈ اپ کرنے، لندن
اپارٹمنٹس بیچنے میں تقریباً ایک ماہ لگ گیا تھا۔ اس نے ایک اپارٹمنٹ رکھ لیا۔ جو بھی
وہ اسی سرزمین پہ پیدا ہوا تھا۔ اسے ہمیشہ کے لئے نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ کبھی کبھار واپس



ہیں کھلی چھوڑ کر جا رہا تھا۔

طیب رضا کے واپس آ جانے سے ماہم اور شاہم کی بہت ڈھارس ملی تھی۔ شاہم ان
لاڈلی تھی۔ ماہم ان کا خاص طور پر خیال رکھنے لگی۔ وہ ان کا ہر کام اپنی ذمہ داری میں
تی۔ تب ہی ایک دن انہوں نے ماہم کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اس
منصور کے بارے میں رائے چاہی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر سر نہ اُٹھا سکی۔ اس نے سوچنے
مہلت مانگ لی۔ اس کے سامنے طویل سفر تھا۔ چھوٹی معصوم بہن، ماں باپ کا سایہ سر
نہیں۔ جس چھت تلے وہ بچپن سے کھیل کر جوان ہوئی تھی، اس کے اصل حق دار بھی
ے آئے تھے۔

اس نے بہت غور سے تمام حالات کا تجزیہ کیا تھا۔ بظاہر منصور میں کوئی برائی نہیں
ں۔ وہ ویل ایجوکیٹڈ، اچھا انسان، رشتوں کا احترام اور اپنے باپ سے بے تحاشا محبت
نے والا، ان کا خدمت گزار بیٹا تھا۔ جب ماہم ہر زاویے سے رشتے پر غور کر رہی تھی،
ور پاکستان میں بزنس کے داؤ پیچ سے اُلجھ رہا تھا اور شاہم، ایگزام کے بعد چھٹیوں کو
ائے کرنے کے لئے مختلف پروگرام ترتیب دے رہی تھی۔

طیب رضا کی حالت بہت بگڑ گئی۔ منصور کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ماہم نے رو
کر برا حال کر لیا۔ طیب رضا، ایمرجنسی وارڈ میں تھے۔ وہ بھی ان کے ساتھ ہاسپٹل
تھی۔ بہت دعائیں مانگی گئیں۔ صدقے خیرات ہوئے، تب وہ چار دن بعد آکسیجن
بغیر سانس لینے کے قابل ہوئے تو انہوں نے پہلا سوال ماہم سے منصور کے حوالے
سے کیا۔

اس نے آنکھوں کی نمی پیتے ہوئے اقرار میں سر ہلا دیا۔ چند دن میں وہ گھر شفٹ ہو
ئے اور اگلے ہی دن ان کے بے حد اصرار پر ماہم اور منصور کا سادگی سے نکاح پڑھوا دیا
لیا۔ خوب صورت سی دُلہن بنی ماہم اور منصور کو انہوں نے نئی زندگی کی شروعات پہ
یروں دعائیں دیں۔ منصور کو اپنے پاس بلا کر انہوں نے صرف ایک نصیحت کی تھی، جسے
وہ اب تک کسی مقدس شے کی طرح سنبھالتا اور عمل کرتا آ رہا تھا۔ کیونکہ یہ اس کے باپ
کی آخری نصیحت تھی۔ ایک ہفتہ بعد ان کا انتقال ہو گیا تھا۔

"عورت، مرد کے مقابلے میں تھوڑی کم عقل ہوتی ہے۔ مرد اپنی برداشت مضبوط
کرے تو گھر خوش اسلوبی سے چلتا رہتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ بھی تمہاری ہمراہی میں وہ
غلطیاں کرے جو تمہارے لئے ناقابلِ قبول ہوں۔ تم درگزر کرنا اور معاف کر دینا۔ اس

کے باپ یعنی میرے بھائی کے مجھ پر بہت سے احسانات ہیں، میں جو کچھ بھی
میرے توسط سے جو کچھ ہوا، اس سب کی بنیاد بھائی صاحب نے رکھی تھی۔ یہ باتیں
یاد رکھنا اور اس کی آنکھوں میں کبھی آنسو نہ آنے دینا۔

☆★☆

ماضی میں ڈوب کر وہ نیند کی آغوش میں چلا گیا تھا۔ رات کا آخری پہر تھا، جب
سے اُس کی آنکھ کھلی۔ اس نے موندی ہوئی آنکھوں سے اپنے حواس بحال کرتے
اُدھر دیکھا۔ بیڈ کی دوسری طرف ماہم نہیں تھی۔ کھلی کھڑکی سے تیز بارش کی بوچھاڑ
تک آ رہی تھی۔ وہ تیزی سے کھڑکی بند کرنے اُٹھا۔ اسی دم کڑکتی بجلی کی روشنی نے
کو بھی مدھم سا منور کر دیا۔ کھڑکی بند کرنے کی کوشش میں اس کی نظر سامنے نیچے پورچ
آخری سیڑھی پہ بیٹھی، گھٹنوں میں سر دیئے بھیگتی ماہم پہ پڑی۔ ماہم، بجلی کی چمک اور
سے کتنا ڈرتی تھی؟ اب بھی اُس کا خوف سے لرزتا وجود اسے اتنی دُور سے پورچ کی
روشنی میں بھی نظر آ رہا تھا۔

کھڑکی کھلی چھوڑے، چپل پیروں میں اُڑس کے وہ نیچے بھاگا تھا۔ اسے یاد
صرف یہ کہ "ماہم بارش سے بہت ڈرتی ہے۔"

"ماہی!" اس نے کندھے پہ ہاتھ دھرا۔ بارش اسے بھی بھگونے لگی تھی۔ ماہم
ہوئی اُٹھی، اُس کا سارا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ سرخ آنکھیں اور بھاری پپوٹے
کب سے یہاں بیٹھی رو رہی تھی۔

منصور کو اس کے آنسوؤں نے بہت ہی بے اختیار کر دیا تھا۔ اس کی سرخ آنکھ
نے اس کا سینہ چیر دیا تھا۔ اس نے کبھی اسے نہیں رُلایا تھا۔

اس نے سرتا پیر اپنے بھیگے وجود کو بے اختیاری سے بھینچ لیا۔ ماہم کو سینے سے لگا
پرانے گھر کا منظر، جس میں پلر سے ٹیک لگائے اس نے روتی لڑکی کو دیکھا تھا، وہ
اس پر دل ہارا تھا اور شاید اس نے وہیں لاشعوری طور پر خود سے عہد کر لیا تھا کہ وہ
لڑکی کی آنکھوں میں کبھی آنسو نہیں آنے دے گا۔ اس نے خود سے اور اپنے مرحوم
سے کیا عہد پانچ برس نبھایا تھا اور اب بھی وہ نباہنے والا تھا۔ وہ اس کی وجہ کو جڑ
اُکھاڑ پھینکنا چاہتا تھا۔ چاہے وجہ وہ خود ہی کیوں نہ ہو۔

"ما..... ما..... ماہم! میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔"

ماہم کا ہلکا کپکپاتا وجود، منصور کے بازوؤں میں تھم گیا۔



"ماہم! میں تمہیں..... طلاق دیتا ہوں۔"

ماہم کے ٹھٹھرتے ہونٹ جم گئے۔

"ماہم!..... میں..... میں منصور رضا، تمہیں طلاق دیتا ہوں۔"

آخری بار کہتے ہی اس نے اپنے رُندھے گلے پر ضبط کر کے اسے خود سے الگ کر

ماہم کی آنکھوں کے آنسو بھی تھم گئے تھے۔

رونے کی وجہ ختم ہو گئی تھی۔

منصور اُسے بارش میں بھیگتا چھوڑ کر صرف پورچ سے ہی نہیں، اس کی زندگی سے بھی
ا تھا۔

☆★☆

آج ہم دونوں کی آخری رات ہے، کل تم اپنی بیوی کو پیارے ہو جاؤ گے۔" غنی نے
اری سے ٹی وی آف کر کے ریموٹ دوسری طرف اُچھال دیا۔

"کیوں، پہلے میں پیارا نہیں تھا، جواب ہو جاؤں گا؟" کاشا، لیپ ٹاپ پر گلوبل
کی ویب سائٹ کھولے بیٹھا تھا۔ اُس کا سارا دھیان اس طرف تھا۔

"یار! مجھے تو ابھی سے یہ گھر سُونا لگنے لگا ہے۔" غنی اپنی جگہ سے اُٹھ کر کاشا کی کرسی
ریب آ گیا۔

اسے دوپہر میں کاشا نے فون کیا تھا کہ میں کل نکاح کر رہا ہوں، جلدی آ جا۔
ے کام تم نے نمٹانے ہیں۔ غنی فون سن کر دوڑ پڑا تھا۔ کاشا کا کیا تھا، کل کے بجائے
ہی نکاح پڑھوا لیتا۔ غنی اس کی پہلی شادی کو مس نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"کاشا! سب کچھ بہت اچانک نہیں ہو گیا؟" غنی بہت افسردہ تھا۔ اتنے عرصے سے
کے مابین شادی کی باتیں چلتی آ رہی تھیں۔ غنی کو اب سب اچانک لگ رہا تھا۔

ماہم نے رات کو اسے اپنے اور منصور کے رشتے کے ختم ہونے کی خبر دی تھی۔ صبح اس
ماہم کو دوبارہ سے پک کر کے صلاح و مشورے کے بعد اس کے لئے ہوٹل میں ایک
رے کی بکنگ کروا دی تھی۔

گلبرگ والے ماہم کے بنگلے کی صفائی کے لئے نوکر بھیج دیئے تھے۔ کل کورٹ میرج
کے انہیں سیدھا وہیں شفٹ ہونا تھا۔

"اچانک کہاں؟ بہت سال ویٹ کیا ہے، تب کہیں....." کاشا نے اسکرین پر غور

کرتے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''لیو اِٹ کاشا! چل اُٹھ، تیری شادی کی خوشی میں رت جگا کرتے ہیں۔'' لاڈ سے اُسے کرسی سے کھینچا۔

''خوشی تو کل ہے، رت جگا بھی کل ہی ہوگا۔'' اس نے شرارت سے آنکھ دبا

''بڑا ہی ذلیل ہے تُو۔'' غنی نے اُسے زور کا دھموکا جڑا۔

''ویسے شادی کے حساب سے آج رات تیری مہندی کی بنتی ہے۔ اگر تجھے ہو تو میں میز بجا کر دو چار ٹپے، ماہیے گا لوں؟'' وہ پورے زور سے کاشا کے دبانے لگا۔ کاشا کا دھیان بھی اس کی مداخلت سے بٹتا جا رہا تھا۔

''فضول کام کے بجائے شرافت سے میرے کاندھے دباتا جا، ساری تھکن گی۔'' وہ مزید پھیل گیا، جیسے غنی کوئی ماشیا ہو۔

''جس نے تجھے تھکن چڑھائی ہے، اُسی سے اُتروا جا کے۔'' وہ برا مان کے جا بیٹھا۔ کاشا اُس کی صورت پر قہقہے لگاتا اُٹھ کر قریب آ گیا۔

''اچھا ٹھیک ہے، ادھر میرے ہی کمرے میں جائیں گے، باتیں کریں گے

''رائٹ۔ مگر میرا ذہن اُلجھا ہوا ہے، میں نے پوچھنا تھا، میں بھی مذہب کوئی زیادہ انفارمیشن نہیں رکھتا۔ مگر طلاق..... یا بیوگی کے بعد عورت..... جو کیا کہتے ہیں اسے؟ ہاں، عدت پوری کرتی ہے، ماہم نے وہ سب نہیں کرنا؟'' بہت مشکل سے اپنی سوچ مکمل کی۔

''فارگٹ اِٹ یار! آئی ڈونٹ نو آل اباؤٹ دیز فارمیلٹیز۔ آل ریڈی اتنا کر چکا ہوں، ناؤ نو مور۔ مجھے کیا لینا دینا مذہب اور اس کی پیچیدگیوں سے۔''

کاشا جیسے بندے سے اسی لادینیت کی توقع رکھی جا سکتی تھی۔

غنی کا علم بھی محدود تھا، وہ بحث میں نہ پڑا۔

''کاشا! تم ماہم کے ساتھ کیا کرو گے؟''

غنی کو کاشا کے ارادے درست نہیں لگتے تھے۔ اس کے ماں بننے تک علیحدگی ٹل گئی تھی۔ غنی کا ماہم کے متعلق خیال تھا کہ یہ جو بیچ کا وقفہ ہے، اس بچے دار ماہم کو خود ہی عقل آ جائے گی۔ بیٹی کی پیدائش اُس کے سنبھلنے کے گی۔ کاشا اس کا ذکر بار بار کرنے کا عادی نہیں تھا۔ مگر غنی اچھی طرح جانتا ساری دنیا سے جھوٹ بول سکتا ہے، اس سے نہیں۔''



''فی الحال اسے بیوی بنانا ہے۔ اگلے اسٹیپ میں کنگال کروں گا۔ آخر میں وہ قابلِ ت ہوئی تو رہے۔ ورنہ یُو نو، میں خود کو اری ٹیٹ (تنگ) کرنے والی چیزوں کو پھینک دیتا ہوں۔'' کاشا نے سچائی بتا دی تھی۔

اُس کی اکثر صاف گو تلخ سچائیاں سن کر غنی کو سوچنا پڑتا کہ یا تو میں کاشا کو جان نہیں پھر وہ خود کو کسی پہ مکمل آشکار ہونے نہیں دیتا۔ اسے کاشا سے اتنی خطرناک امید نہیں ۔ وہ اس سے عورت کے موضوع پر زیادہ بحث و مباحثے پر نہیں اُترتا تھا۔ کاشا اس ں کا گرو تھا۔ وہ عورت کی ظاہری، باطنی ایسی دھجیاں اُڑاتا تھا کہ اس کے کان تک ا ہو جاتے تھے۔ وہ اپنی نئی زندگی کا آغاز کرنے والا تھا۔ وہ بھی ایسی عورت کے ہمراہ ں کے لئے سب کچھ چھوڑ کر آ رہی تھی۔ اسے ماہم کے اس عمل پر غصہ کے ساتھ ی بھی تھی۔ کاشا کے عزائم نے اسے اندر تک دہلا دیا تھا۔

اس نے کاشا کو سمجھانے کا ارادہ کیا۔ مگر پہلے اس کا موڈ خوشگوار کرنا ضروری تھا۔ اس کاشا کا پسندیدہ مشروب نکال لیا۔

''کاشا! ہر عورت ایک جیسی نہیں ہوتی۔'' اسے شاید مناسب الفاظ کی تمہید نہیں ملی ۔ اصل میں انہیں عادت ہی نہیں تھی ایک دوسرے سے سوچ بچار کر کے مصلحت نے کی، مگر اس وقت وہ جو کہنا چاہتا تھا اور جس سے کہنا چاہتا تھا، بڑا حوصلہ درکار تھا۔

''دنیا کی ہر عورت، معمولی فرق سے ایک جیسی ہی ہوتی ہے۔'' کاشا نے بند آنکھوں جواب دیا۔

غنی گپ چپ سا ہو گیا۔ اس نے سوچتے ہوئے ذرا کی ذرا نظر اُس پر ڈالی اور ایک سا گھونٹ بھر کر اسے منہ میں گھما کے حلق سے نیچے اُتارا۔ ان دونوں کی سائیکی بہت ے مقامات میں انہیں ایک جگہ پر لا کر کھڑا کر دیتی تھی۔ اسی طرح چند مقامات پر وہ دوسرے سے منہ پھیر کر انجان بن جاتے، جیسے ابھی کاشا بند آنکھوں سے غنی کے منہ کچھ انہونا سننے کا منتظر تھا۔ خاموشی کا وقفہ لمبا اور بامعنی تھا۔ کاشا نے اس کی جانچ ل میں مداخلت نہ کی۔

''مجھے لگتا ہے، تُو اپنی محرومیوں کا بدلہ ہر ایک سے لیتا ہے۔ تجھے..... تجھے ہر ت میں اپنی..... اپنی ماں ہی نظر آتی ہے۔''

اس نے سر کو شرمندگی سے جھکا کر کاشا کی سماعتوں کے لئے دھماکا کیا تھا۔

اس نے جھٹ سے سرخ ہوتی آنکھیں کھول دیں۔ ابھی اس نے چند گھونٹ ہی

بھرے تھے، اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہکتی لگ رہی تھیں۔ وہ کتنی دیر تک غ
رہا، یہاں تک کہ کنپٹی کی رگ، چھپکلی کی کٹی دُم کی طرح پھڑکنے لگی۔

آٹھ سال قبل، جب غنی اور کاشا کی دوستی ہوئی تھی، اس نے اس سے والد
متعلق استفسار کیا تھا۔ کاشا نے بتایا تھا کہ میرے سگے باپ کے مرنے کے بعد میر
نے اپنے آفس کے باس سے شادی کر لی اور پھر امریکہ شفٹ ہوگئی۔ میں اپنی نانی
کے پاس رہا۔ اپنی ماں کا یہ مختصر سا تعارف اس نے اپنے مخصوص لب و لہجہ میں کر
تب پہلی بار غنی اس منہ پھٹ، نڈر، بے باک نوجوان سے تھوڑا خوف زدہ بھی
اتنے سال گزر گئے، ان کے مابین ہر موضوع زیر بحث رہا۔ غنی نے دانستہ یا نادا
اس کی ماں کا نہ پوچھا۔ وہ کب فون کرتی ہیں؟ کرتی بھی ہیں یا نہیں؟ ان کا را
طرح ہوتا ہے؟ وہ بالکل بے خبر تھا۔ ایک بات وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ کاشا
عیاشی اور عیش پرستی کا سارا دارومدار اس کی ماں کے اس کے اکاؤنٹ میں بھیجے
والے امریکن ڈالرز بھی ہے۔

''تجھے کیسے پتہ، میری ماں کیسی عورت تھی؟'' اس نے ٹھنڈے ٹھار لہجے میں ا
کیا۔ اس کی ساری ٹھنڈک غنی نے اپنے اندر سرایت کرتی محسوس کی۔

''دنیا کی ہر عورت قابلِ احترام ہے۔ اچھی ہو یا بری، اور پھر..... پھر کاشا
ماں تھی نہیں، ابھی ہے۔'' غنی نے اسے دھیمے سے یاد کروایا۔

''نہیں غنی! میری ماں ہے نہیں، تھی۔ وہ میرے لئے اسی روز مر گئی تھی، جب
باپ مرا تھا یا شاید اس دن جب اس نے میری کفالت کے لئے گھر سے قدم باہر نک
یا جب اس نے ایک امیر آفیسر سے بیاہ کا خواب سجانا شروع کیا یا..... یا تب غنی
وہ مجھے چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے امریکہ چلی گئی۔'' ہونٹ بھینچے وہ کسی بھنور میں پھنسا ہ
رہا تھا۔

غنی کو اُمید نہیں تھی کہ ذرا سا چھیڑنے پر وہ اس قدر کھل جائے گا۔ اس کے ا
تلخ یادوں کے گدلے تالاب کے پانی میں اس نے پتھر پھینکا تھا۔ اس نے دوبارہ
بھرا اور اس کے لبالب بھر کے چھلکنے کا منظر بغور دیکھا۔

''میری ماں اُنیس سال کی ایف۔ اے پاس تھی، جب اُس کی شادی میرے
غلام حسین ہیڈ کلرک سے ہوئی۔ ماں کچی عمر کی لڑکیوں کی طرح خوب صورت اور
اندام تھی۔ باپ میرا قبول صورت، تیس برس کا پکی کھری سوچ رکھنے والا آدمی تھا۔



نے شوہر کی محبت سے فائدہ اٹھا کر اپنے مزید پڑھنے کی خواہش کی تکمیل کرنی چاہی۔ وہ
ر کے اس حصے میں تھا، جہاں مرد یہ حساب کتاب لگاتا ہے کہ اب اولاد پیدا ہوئی تو
ب اس قابل ہو جائے گی کہ ہمیں بٹھا کر کھلا سکے۔ مگر اس نے میری ماں کی بڑھائی کی
واہش کے سامنے اپنی خواہش دبا لی۔ جب انہوں نے بی۔ اے کے پیپرز دیئے تو
رے ہونے کی خوش خبری انہیں ملی۔ میرا باپ بہت خوش تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ بیوی مزید
پڑھے۔ بچہ پیدا ہوا، اس کی دیکھ بھال کرے، گھر سنبھالے۔ اسے کون سا نوکری
کروانی تھی۔

جب میں پیدا ہوا تو ماں کا رزلٹ بہت شان دار نمبروں سے آؤٹ ہو چکا تھا۔ تھوڑا
رصہ وہ خاموش رہی۔ پھر اس نے پڑھائی کی رٹ لگا دی۔ اسے پڑھنے کا شوق تھا۔ اس
ر میرے باپ اور اس میں بڑا بحث و مباحثہ ہوا۔ جھگڑا اس بات پہ سمٹا کہ وہ پرائیویٹ
یم۔ اے کر سکتی ہے۔ میں بھی پلتا رہا اور اس کا شوق بھی پورا ہوتا رہا۔ ماں، ایم۔ اے
کے پیپرز دے کر مجھے اور میرے باپ کو مکمل وقت دے رہی تھی۔ تب ہی ایک دوپہر ہم پر
یامت ٹوٹ پڑی۔ میرا باپ چند لوگوں کے کندھے پہ چارپائی پر واپس آیا۔ ہیڈ کلرک،
لام حسین جس بس میں کھڑا ہو کر سفر کرتا تھا، وہ گدھا گاڑی کو بچانے کے چکر میں فٹ
اتھ پہ چڑھ گئی اور دوسری طرف رواں سڑک کے ٹرک سے ٹکرا گئی۔ میں دو سال کا یتیم
ہو گیا۔ میری ماں، بیوگی کا داغ لئے اکیلی نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ مجھے لئے نانی کے گھر آ گئی۔
یہیں سے شاید میری بربادی کی اصل داستان شروع ہوتی ہے۔ میرے دو ماموں تھے،
جنہوں نے میرے باپ کے گھر کے کاغذات، ماں سے لے کر گھر کو ہڑپ کر لیا۔

میں بڑا ہو رہا تھا۔ میری ضروریات کے لئے ماں کو ہاتھ پھیلانا پڑتا۔ نانی کی منتیں،
واسطے کرنے پڑتے۔ ان ہی مشکل دنوں میں ماں نے میری بہتر کفالت کے لئے نانی کی
اجازت سے نوکری کر لی۔ وہیں میرے اسٹیپ فادر کا آنا جانا ہوا۔ اسے رنڈوا ہوئے
کافی عرصہ ہو گیا تھا، وہ بہت امیر کبیر آدمی تھا۔ بس، ماں پر دل ٹھہر سا گیا، ورنہ اسے
عورتوں کی کمی نہیں تھی۔ تھا وہ بھی ایک سچا، کھرا اور سخت اصول پسند۔ اس نے ماں کو اپنی
ملٹی نیشنل کمپنی میں بطور پرسنل سیکرٹری جاب آفر کی۔ زیادہ پیسہ اور آگے بڑھنے کی دُھن
میں وہ وہاں چلی گئی۔ اندر ہی اندر چکر چلنے لگا۔

میں نرسری کلاس میں محلے ہی کے ایک سکول میں جانے لگا تھا۔ دونوں ماموں، بہن
کے آسرے پر بالکل ہڈ حرام ہو گئے تھے۔ نانی، بیٹوں کی طرف دار تھی۔ نانا بہت ہی

شریف آدمی، ماں کا اکیلا ووٹ اور غمگسار تھا۔ اس اذیت کے عرصہ میں اس شخص نے ما
کو پرپوز کیا۔ ان دنوں وہ بہت خوش تھی۔ رات کو جب میں اس کے ساتھ چمٹ کر لیٹ
وہ مجھ سے ڈھیروں خیالات شیئر کرتی۔

''میرا کاشف بڑے والے اسکول جایا کرے گا، گاڑی میں بیٹھ کے، مہنگے والے
کپڑے بھی دلواؤں گی۔'' وہ پنے خوابوں میں مجھے بھی اس امیر کبیر کے لان میں کھیل
دیکھتی تھی۔

میری بہتر زندگی کی خاطر اُس نے اس تینتالیس سالہ شخص سے شادی کر لی، جس کی
دو جوان بیٹیاں تھیں اور میں اپنی ماں کا اکلوتا، دونوں اطراف سے بچوں کا معاملہ طے نہیں
ہوا تھا۔ ماں تو بس میری اُنگلی تھامے اس بڑے بنگلے کا گیٹ پار کر جانا چاہتی تھی۔ اس کی
آنکھ تو تب کھلی، جب اس کے دو گھنٹے قبل بننے والے امیر سوٹڈ بوٹڈ اصول پسند شوہر نے
مجھے اپنی گاڑی میں بٹھانے سے انکار کر دیا۔ اس نے نہایت بے دردی سے کہا۔

''یہ بچہ ساتھ نہیں جا سکتا۔''

یہ جملہ آج تک میرے کانوں میں گونجتا ہے، بہر حال قصہ مختصر وہ روتی دھوتی اس
کے ساتھ چلی تو گئی، پر اس کا سارا دھیان میرے پیچھے لگا رہتا۔ ماں میرے بغیر نہیں رہ
سکتی تھی اور وہ ماں کے، چار ماہ کی دوری میں ماں نے کوئی چار سو چکر نانی کے گھر کے
لگائے، تب اس کم گوشہ شخص نے بیچ کا راستہ نکال لیا۔ اس نے بکھیڑا ہی سمیٹ ڈالا۔
سارا بزنس وائنڈ اپ کر کے کروڑوں اکٹھے کئے اور امریکہ بسنے کی تیاری کر لی۔ ماں
بہت روئی، تڑپی۔ وہ نہ مانا۔ اس کے پیش نظر اپنی بیٹیوں کا مستقبل تھا، جنہیں وہ کیمبرج
اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں پڑھانے کا خواہاں تھا۔ میں جاتا بھاڑ میں۔

وہ آخری بار مجھ سے ملنے آئی، میں سو رہا تھا۔ وہ مجھے سوتا چھوڑ کر چلی جاتی، مگر اُس
کی ممتا کی کشش نے مجھے جگا دیا۔ ماں نے آخری بار مجھے گلے سے لگایا، میرے چھوٹے
چھوٹے بالوں کو چوما، بالوں میں اُنگلیاں پھیریں، بوسے پہ بوسہ دیتی گئی۔ میں جو اس
کے بغیر رہنے کا عادی ہوتا جا رہا تھا، حیرانی سے..... ٹکر ٹکر ان حرکتوں کو دیکھتا رہا۔ ماں
سال بھر کا وعدہ کر کے چلی گئی۔

''مت جاؤ..... پلیز اسٹاپ اِٹ ماما!'' میں نے روکا تھا۔

اس کے شوہر نے نانی کا بڑا گھر اور میرا ماہانہ خرچ بھی باندھ دیا تھا۔ ماں بھی چند
دنوں بعد آ جاتی، مگر کئی دن گزرے، دن مہینوں اور مہینے سالوں میں بدل گئے، کوئی نہ



نانی بہت خرانٹ عورت تھی۔ ماموں کی موجودگی میں، میں کمرے سے باہر نہ آتا۔
مجھے پیار کرتے تھے۔ میں اپنے کمرے کی کھڑکی جو پچھلی طرف سے باہر کی طرف کھلتی
، اس کے شیشے سے ماتھا، ناک اور منہ لگاتے آتی جاتی گاڑیوں کو گنا کرتا۔ مجھے یقین
کہ ان ہی میں سے ایک گاڑی ہمارے گھر کے سامنے رُکے گی اور ماں اس میں سے
گی۔ میں باہر کے گیٹ میں ایک پاؤں اندر دھرے، دوسرا باہر نکالے، ماں کا رستہ تکا
تا۔ سال بیتتے چلے گئے، مگر اس کی واپسی نہ ہوئی۔ میں تیرہ سال کا ہو گیا تھا، اب بھی
، ماں کو پکارتا۔ تب ایک بار نانی نے چوکر کہا۔

''اچھا ہوا، تیری ماں جا کے نہیں لوٹی، تُو اسے بہت تنگ کرتا تھا۔ اس نے تجھے سزا
ا ہے۔'' نانی کے لفظ، سزا پر میرا ذہن اٹک کر رہ گیا۔ میں پھر کبھی بھی نہ رویا، ماں کے
ے، نہ ہی کسی اور کے لئے۔''

اتنے سالوں کی زبانی مسافت طے کر کے وہ سانس لینے کو رکا اور کافی توقف کر کے
بارہ گویا ہوا۔

''غنی! تم نہیں جانتے..... نہیں غنی! تم کیا جانو، سزائیں کیا ہوتی ہیں؟''

اس کا لہجہ بھاری، درد سے بوجھل اور نم ہو گیا تھا۔ وہ سر جھکا کر انگوٹھے اور انگلی سے
لھوں کی نمی رگڑنے لگا۔

غنی کا اس مضبوط اعصاب کی شخصیت کے بکھرنے کا عمل دیکھنا بہت تکلیف دہ تھا۔
سے سنبھلنے کا موقع دینے کے لئے وہ اس کے پاس سے اٹھ گیا۔

کچن کاؤنٹر پہ دو فل سائزنگ میں کافی پھینٹتے اس کے ہاتھ بھی ڈھیلے پڑ چکے تھے۔
اشا نے اسے کبھی اپنی گزری زندگی کی بھنک نہیں پڑنے دی تھی۔ اس کی شرارت سے
رپور چمکتی آنکھیں، مسکراتے مچلتے ہونٹ زندگی جینے کی تمنا لئے ہوئے تھے۔ ان آنکھوں
کے پرے، در پردہ کتنے آنسو چھپے تھے، اسے دیکھنے کے لئے بڑا حوصلہ درکار تھا۔ کافی تیار
کر کے مگ ٹرے میں رکھنے تک وہ سوچ چکا تھا کہ اسے اب ماہم کی حمایت نہیں کرنی۔
سے ماہم اور اس کی بے وقوفیاں، کاشا سے زیادہ عزیز نہیں تھیں۔

''کاشا! کافی۔''

''تھینکس فار اِٹ۔ ابھی ایک آئٹم باقی ہے۔'' اس نے ٹیبل پر دھری بوتل کی طرف
اشارہ کیا۔

''ابھی رات بھی باقی ہے۔'' اس نے کھڑکی سے جھانکتے اندھیرے کو دیکھا۔

"غنی! خواہش اور شوق دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ شوق بے مول ہوتا ہے
ہو تو بھلا، ورنہ نہ سہی۔ مگر خواہش بے مول نہیں ہوتی، جس نفس یا دل میں یہ جڑ پکڑ
اپنی تکمیل تک اسے کھوکھلا کر کے رکھ دیتی ہے۔" میری ماں غلط نہیں تھی، ہاں غلطی ضر
تھی۔ اس نے اپنی خواہشات کے لئے غلط سیڑھی کا استعمال کیا۔ مجھے نفرت ہے و
ہر عورت سے اپنی ماں سمیت، جو زندگی بھر کبھی پلٹ کر نہیں آئی۔ وہ آتی بھی ک
دوسرے شوہر سے اس کی ایک بیٹی اور بیٹا ہیں، میں اکیلا بہت بھاری تھا۔ اس نے
شروع میں کیا تھا، میرے لئے، مجھے خوشیاں مہیا کرنے کے لئے کیا۔ مگر اس کے
کہ بعد میں جو ہوا، اس میں اس کا نہیں، اس کی قسمت کا قصور تھا، میں معاف نہیں
تھا۔"

"ماہم غلط..... غلط ہے یا بری؟" غنی اپنے ارادے پر زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔

"ماہم بری عورت ہے۔ جو عورت اپنے بے انتہا جان نچھاور کرنے والے شوہ
معصوم بچوں اور دنیا کی ہر آسائش حاصل کر کے بھی اپنے پچھلے یار کو نہ چھوڑے، و
ہی ہوتی ہے۔" اس کا لہجہ مدھم اور تھکا سا تھا۔ آنکھوں کی مخصوص چمک بھی ماند تھی۔

"کاشا! مرد بھی تو برا ہوتا ہے، تُو عورت ذات کو ہی کیوں گھسیٹتا ہے۔"

"ہاں ہوتا ہے۔ مگر میں نے مرد کی سائیکی پہ کبھی دھیان نہیں دیا۔ جب آبز
تجھ ہی سے شیئر کروں گا۔" اس نے مگ گھماتے کہا۔

"کیا مطلب، پچھلے آٹھ سالوں سے تیرا عورت نامہ سن سن کر میرے کان
گئے۔ اگلے آٹھ برس تُو مجھے مرد کا سیاہ سفید سمجھائے گا، یعنی میرا دماغ بھی چاٹ
گا۔" غنی دہائی دیتے چلّایا۔

"لے پھر سن، آخری رات اور گُر کی بات۔" کاشا، کافی کا مگ چھوڑ کر آگے
بیٹھ گیا۔ جیسے وعظ کرنے لگا ہو۔

"عیاش مرد کو ایک شریف عورت سے شادی کرنی چاہئے۔ ایسی عورت، جسے
مرد نے چھوا ہو، نہ ہی اس نے کبھی آنکھ چرا کر مرد کو دیکھا ہو، سیل پیک، مہر بند
نے اپنے دونوں ہاتھ برابر جوڑے۔

"اور بدکردار عورت کو ایک شریف مرد ڈھونڈنا چاہئے۔ کیونکہ بدکردار کو چاہے
میں بٹھا دو، وہ یار جمع کرنے سے باز نہیں آئے گی۔ شریف مرد، کولہو کے بیل
ایک ہی دائرے میں گول گول چکراتے زندگی گزارنے کا قائل ہوتا ہے۔ اس کا



اعلیٰ اور سوچ محدود..... صرف بچوں اور اپنی عورت تک کی ہوتی ہے۔"

غنی نے اپنے دونوں ہاتھ باندھ کر سر پر رکھ لئے۔ سر جھکائے وہ کاشا کی باتوں پر مسلسل مسکراتا جا رہا تھا۔

"آپ کا ہر کہا بجا، گرو جی! مگر پھر آپ یہ سب کیوں کر رہے ہیں؟"

"یہ حساب کتاب کی بات ہے، تیری سمجھ میں نہیں آئے گی۔"

"مطلب؟"

"ایک سے لے کر نو کروڑ کے ہندسوں میں سات زیرو آتے ہیں، مجھے ماہم تک یہ سات زیرو ہی لے جاتے ہیں۔"

اس نے خود کو گھورتے غنی کو زبردستی گلاس پکڑا دیا۔

"ماں، باپ تیرے شریف لوگ تھے، یقیناً یہ ساری بدمعاشیاں اپنے دو مشٹنڈے ماموؤں سے اُدھار لی ہیں۔" غنی بڑے دُور کی کوڑی لایا تھا۔ کاشا کو اعتراف کرنے میں عار نہیں تھا۔

"یہ ہی بات کئی سال ادھر، تھوڑے سے ردّ و بدل سے میرے نانا نے بھی کہی تھی۔"

☆☆☆

صبح وہ یہ گھر اور اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ وہ فرار کی تلاش میں اسلام آباد چلا گیا۔ میٹنگ تو تھی، مگر اتنی ضروری بھی نہیں کہ اسے نمٹانے کے لئے اس کا جانا لازم تھا۔ واپسی پہ شاہم سراپا سوال تھی۔ اسے منصور کے منہ سے نکلی اچانک حقیقت پہ یقین نہیں آیا تھا۔ وہ دیوانہ وار چیخنے چلّانے لگی تھی۔ منصور نے اسے بہت مشکل سے سنبھالا۔ چیختی چلّاتی وہ منصور کی بانہوں میں ہی نڈھال گر گئی۔ اس نے ڈاکٹر کو فون کیا تھا۔ وہ اب اپنے کمرے میں پُرسکون انجکشن کے زیرِ اثر سو رہی تھی۔

وہ بھی آخری پہر پژمردہ خالی کمرے میں لوٹ آئی۔ اگر اسے کبھی جانا پڑ بھی جاتا تو اس کا سارا دھیان ماہم کی طرف لگا رہتا۔ وہ بیسیوں فون اور سینکڑوں ایس ایم ایس کرتا۔ اسے ماہم کے بارے میں عجیب عجیب وہم ستاتے رہتے۔ وہ رات کو اکیلی بستر پہ سوئے گی، شاید اُسے نیند ہی نہ آئے، جاگتی رہے، اسے تنہا کمرے میں ڈر نہ لگے۔ محبت نے اسے وہمی بنا دیا تھا یا اس کے اپنے دل کا چور تھا کہ وہ خود اس سے دور نہیں رہ سکتا تھا۔ ماہم نے کبھی بھی اسے نہیں روکا تھا، نہ ہی کبھی ایسے جذباتی جملے بولے تھے، جیسا وہ سوچتا تھا۔ جب کبھی وہ رات کو دیر سے آتا تو وہ اس کے انتظار کے بجائے خواب خرگوش

کے مزے لے رہی ہوتی۔ وہ اپنے دل میں آئے اُبال کو ٹال جاتا۔

اس عورت کی تکلیف، آنسو اُس کی برداشت سے زیادہ صبر آزما تھے۔ اس کی خو
کے لئے اس نے پانچ برس جدوجہد کی تھی، اس کی ساری محبت، ساری توجہ کا صلہ ا
گہرے گھاؤ کی صورت دیا تھا۔ ایسا ناسور، جس نے آخری سانس تک رِستے ہی رہنا

''جو مرد اپنا سب کچھ کھو کر بھی نہ روئے، وہ بزدل ہوتا ہے۔''

اپنی بے بسی پہ روتے اس نے خود کو دلیل دی تھی۔ بیڈ کا وہ کونا اُسے کسی گرم
صحرا کے مانند لگ رہا تھا۔ بیڈ پہ تکیوں کے آگے رکھے کُشن بھی بالکل ویسے ہی
تھے۔ جب وہ ماہم کو زیادہ زِچ کر دیتا یا بلاوجہ کی چھیڑ چھاڑ کئے جاتا، وہ اسے یہ ہی
اُٹھا کر مارا کرتی۔

ڈریسنگ ٹیبل پہ اُس کا کلون، اسپرے، لوشن، اسکرب، نائٹ مساج، کریمیں
برش، ڈرائیر وغیرہ ویسے ہی دھری تھیں۔

بیڈ کے وسط میں بیٹھا وہ شدت سے ضبط کرتے بھی رو دیا تھا۔ روتے ہوئے
نے ڈریسنگ کے خالی اسٹول کو دیکھا۔ وہ ہمیشہ اسے شیشے میں سے تکا کرتا، تب وہ
کر کھڑی ہو جاتی۔

''واٹس پرابلم منصور! گود میں فائل دھری ہے، لیپ ٹاپ سامنے رکھا ہے، ف
چل رہا ہے، ان چیزوں پہ دھیان دو۔ وائے آر یُو ڈسٹربنگ می؟'' وہ بہت خفا ہوتی

''میں نے کب ڈسٹرب کیا؟ میں تو یہاں بیٹھا ہوں۔''

وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کے بے حد معصومیت سے جواب دیتا۔

''تم نہیں، تمہاری نظریں تو کر رہی ہیں۔''

وہ پھر بھی باز نہ آیا تو وہ زِچ ہو جاتی۔

''واٹ کین آئی ڈو یار! ہاتھ لگاؤں تو تمہیں اعتراض، اب نظروں پہ بھی پا
لگا دو۔''

''واٹ ربش منصور!'' وہ سرخ چہرہ لئے رُخ پھیر جاتی۔

اُس کا قہقہہ کافی دیر کمرے میں گونجتا رہتا۔

اس نے بیڈ پہ ہاتھ پھیر کر غیر محسوس کو محسوس کرنا چاہا تھا۔ جس کی آنکھوں میں آن
کو دیکھ کر اسے محبت ہوئی تھی۔ وہ اسے محبت اور رُسوائی کے کس موڑ پہ تنہا کر گئی تھی۔
یہ رشتوں اور محبت میں جمع حاصل نہیں ہوتا، نہ ہی وہ قائل تھا۔ اگر کر بھی لیتا تو



ے حصے میں صرف خسارہ ہی خسارہ نکلتا۔

لاحاصل محبت پہ بے بسی مرد کو بھی رُلاتی ہے۔

وہ بھی رو رہا تھا۔ لاحاصل، خالی ہاتھ، کرب اور درد کی شدت سے بے تحاشا
رگڑاتے ہوئے۔

☆★☆

ڈیڑھ بجے اُس کی آنکھ کھلی اور سب سے پہلی نگاہ وال کلاک پہ گئی۔ ایک لمحے میں
ری نیند اُڑن چھو ہو گی۔ اس نے اپنے برابر سوئی ماہم کو دیکھا، جو گہری نیند میں محوِ
اب تھی۔ اُس نے جھٹکے سے اُس پر سے کمبل کھینچا۔

''اُٹھو ماہم!..... ماہم!'' اُس کی تیز غصیلی آواز پہ وہ کسمسا کے رہ گئی۔

''ویک اپ!'' اس نے ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچا۔ اس کے حواس یک دم مجتمع ہو گئے۔

''واٹس پرابلم کاشف!'' وہ جمائی لیتے بولی۔

''آئی سیڈ ٹو یو کہ مجھے صبح ساڑھے گیارہ بجے ارجنٹ کہیں جانا ہے، مجھے اُٹھا دینا۔
تم ابھی تک لم لیٹ ہو۔'' اُس نے بری طرح اسے گھورا۔

''رات کتنی دیر ہو گئی تھی، تم الارم لگا کے سوتے۔'' اس نے کاشا کے تیور ابھی نوٹ
ا کئے تھے۔

''مس ماہم! یو آر مائی وائف۔ آئی ایم ناٹ۔ مجھے حکم عدولی کرنے اور مشورہ دینے
لے لوگوں سے سخت نفرت ہے۔ اینڈ لسن ون تھنگ، میں اپنا کہا دہرانے کا عادی نہیں
ا۔'' اُس کے لہجے میں غرّاہٹ اور تنبیہ اتنی واضح تھی کہ ماہم ہکا بکا رہ گئی۔ وہ کاشا کی
اصح کی دُلہن، اس قسم کے رویے کی توقع نہیں رکھتی تھی۔

کل ہی کاشا اور غنی نے اسے ہوٹل سے پک کیا تھا۔ منصور کے گھر سے نکل کر اس
، کاشا کے ساتھ کی گئی پلاننگ کے مطابق ہوٹل میں جانا تھا، جہاں وہ رات ٹھہری تھی۔
ثا نے اس کا گلبرگ والا گھر کھلوا لیا تھا، جو منصور نے اسے بطور تحفہ دیا تھا۔ اس نے
ے گھر کے ملازم وہاں بھجوا کر صفائی ستھرائی کروائی تھی۔ اس نے چند سال قبل بھی ماہم کو
ن گھڑت کہانی سنا کر چھوڑا تھا کہ میرے پیرنٹس، تم سے شادی پر راضی نہیں ہیں اور تم
ے شادی کرنے کی صورت میں مجھے جائیداد سے عاق کر دیا جائے گا۔ میں کنگلا، تمہیں
ی کی بنیادی ضروریات بھی فراہم نہیں کر سکوں گا۔ اب پھر اس نے یہی ڈرامہ کیا تھا۔
ماہم کے ساتھ اُس کے گھر شفٹ ہو گیا تھا۔ ماہم کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا؟ کل شام

اس نے صرف غنی کی موجودگی میں اس سے کورٹ میرج کی تھی۔

''میں باتھ لینے جا رہا ہوں۔ میرا کوئی سا بھی ڈریس نکال دو اور جا کر ناشتہ کرو۔'' شرٹ کے بٹن کھولتا وہ واش روم میں گھس گیا۔

ماہم کے دماغ پہ اس کا یہ نیا حکم کسی ہتھوڑے کے مانند لگا تھا۔ وہ ابھی کاشا کی قربت کے سحر سے آزاد نہیں ہوئی تھی۔ وہ کوئی الہڑ مٹیار، نوخیز کلی تو تھی نہیں، مگر یہی تصور کر رہی تھی۔ اس نے کاشا سے بہت سے نخرے اُٹھوانا تھے، بہت انجوائے تھا، اس کے ساتھ گھومنا پھرنا، ہنی مون پلان، آزادی، محبت اور اتنے سال کی دُوری پھر وصل کو محسوس کرنا تھا۔

اس نے کچن کا کام حسب خواہش اور ڈیلی روٹین کی بوریت کو چینج کرنے کے لئے کیا تھا۔ خاص فرمائش اس نے کبھی اس کی پوری نہیں کی تھی۔ اب وہ پہلی صبح کی ناشتہ بنا رہی تھی، نوکروں کی موجودگی میں کام کرتے اُس کا فشارِ خون بلند سے بلند رہا تھا۔ نئی زندگی کی اوّلین صبح اور کاشا کا سلوک۔

اس نے صرف کاشا کے لئے ناشتہ تیار کیا اور ڈائننگ ٹیبل پہ رکھ دیا۔ وہ ایسا کر کے اس کے برے رویے کا اسے احساس دلانا چاہتی تھی۔

خوشبو کے معطر جھونکے سے اس کی آمد ہوئی۔

''گڈ، کوئیک سروس'' کرسی گھسیٹتے وہ بہت خوشگوار موڈ میں بولا۔

اس نے جگ سے دودھ کا گلاس بھرا اور دو سانس لے کر پی گیا۔ جوس کا گلاس کر وہ سلائس پہ مکھن لگانے لگا۔ ماہم اس کی صرف اپنے آپ پر توجہ کو بے یقینی سے رہی تھی۔

''چائے بناؤ۔ شوگر ون اسپون۔''

سلائس کے ساتھ جوس کے سِپ لیتا وہ بہت منہمک تھا۔

''کاشا کے لئے ناشتہ بنانا یا اس کا اسے کچھ پوچھنا اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔''

اس نے بڑے صبر سے اپنے حلق سے اُتاری اور چائے بنانے لگی۔

اس نے دس منٹ میں بڑی تسلی سے سب پیٹ بھر کر کھایا تھا۔ ماہم کے لئے منٹ بہت اذیت ناک تھے۔ اس کا ذہن بھٹکنے لگا تھا، ماضی میں۔ اس نے بمشکل جھٹلائی۔

''تم بریک فاسٹ نہیں لے رہیں۔'' اسے وہ نظر آ ہی گئی تھی۔



ماہم نے خفگی سے ٹیبل پہ نظریں جما دیں۔

''کچھ ٹیپکل وومن کی نیچر ہوتی ہے، وہ شوہروں کے سامنے نہیں کھاتیں اور ان کے پیچھے ہر شے چٹ کر جاتی ہیں۔'' وہ بہت نارمل کہہ رہا تھا۔

ماہم جو اُس کی منتیں کرنے اور منانے کی امیدوار تھی، ناسمجھی سے اُلجھ کے رہ گئی۔

''پلیز کاشف! آپ.....''

''دوپہر کا کھانا تیار کر لینا۔ رات کے ڈنر پہ ہم غنی کی طرف انوائیٹڈ ہیں۔''

اس کی سنے بغیر اس نے اپنی کہی۔

''میں کوکنگ کروں گی؟'' اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''میں نے کوئی موکل نہیں چھوڑے اس کام کے لئے، تم اس گھر کی واحد عورت ہو اور رسپونسبلٹی بھی تمہاری ہی ہے۔''

''یہ نوکر جو ہیں۔''

''یہ میں نے ستھرائی کے لئے بلوائے تھے۔ ابھی بھجواتا ہوں، غنی کو واپس۔''

''یہاں یہ سب کون کرے گا؟'' وہ رو دینے کو تھی۔

''ظاہر ہے، تم خود۔'' بے اعتنائی سے کہتے اس نے چائے کا آخری بڑا سا گھونٹ لیا۔

''لیکن میں یہ سب نہیں کر سکتی۔''

''کیوں؟..... پانچ سال میرڈ لائف کے گزارے ہیں، گھر داری کی پریکٹس ہی نہیں ہوئی؟'' ٹیبل پہ بازو جماتے اس نے ماہم کی کھلی آنکھوں میں جھانکا۔

ماہم کو لگا جیسے اس کے منہ پر کھینچ کے طمانچہ مارا گیا ہو۔ ماضی کا آئینہ صرف ایک رات میں اس کے چہرے کے سامنے کر دیا گیا تھا۔

''سکیورٹی گارڈ اور صفائی کے لئے فل ٹائم ملازمہ کا ارینج ہو جائے گا، مگر شیف اور لانڈری کے چونچلے نہیں ہوں گے۔ اچھا ہے، تم بزی رہو گی۔''

وہ اپنی مرضی سے سب ترتیب دے کے اُٹھ گیا۔

ماہم گنگ تھی۔ وہ اُسے روکنا چاہتی تھی۔ بہت کچھ اُس کے ذہن میں گڈمڈ ہو رہا تھا۔ اس کی زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ وہ اس کی حالت سے بے خبر جا چکا تھا۔ وہ خالی نظروں سے خالی برتنوں کو تکتی رہ گئی۔

☆☆☆

شاہم تین دن تیز بخار میں جلتی رہی تھی۔ منصور نے اپنا دکھ بھول کر پوری طرح اس

کا خیال رکھا تھا۔ اس نے اسے عدم تحفظ کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔ ماہم کے علاوہ
ان دونوں کا ایک رشتہ تھا اور وہ اس رشتے کی حیثیت سے اس گھر میں رہ سکتی تھی۔
نے بچوں کی پروا نہیں کی تھی، پھر اس کا شمار کس گنتی میں ہوتا تھا۔ اس کی اذیت اپنی
مگر وہ ایک بار اپنی بڑی بہن کا گریبان پکڑ کر اس سے یہ ضرور پوچھنا چاہتی تھی کہ
رُسوائی اس نے کس کی خاطر کمائی؟ منصور کے انمول جذبوں کا سودا کس بھاؤ کیا!
سب کچھ گنوا کر وہ اس کا حاصل وصول پوچھنا چاہتی تھی۔ اسے منصور کا سامنا کرتے
شرم آنے لگی تھی۔ وہ کتنی نرمی اور اپنائیت سے اس کا حال احوال دریافت کرتا اس کا
رکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پہ ٹوٹنے کے آثار اور آنکھوں میں شکست خوردگی تو تھی، مگر
خود کو جوڑے رکھنے پہ آمادہ بھی لگتا تھا۔

اس نے خود کو صرف کمرے تک محدود کر لیا۔ ہنسنا بولنا بالکل چھوڑ دیا۔ وہ نوکروں
سامنا کرنے سے بھی ڈرتی۔ اسے لگتا کہ ابھی کوئی اس سے سوال کر دے گا، لوگوں
تضحیک آمیز رویے میں اس کے کردار کی وضاحت کا سوال بھی اُٹھے گا۔ وہ ارسل کو
کہے گی، اس کا سامنا کیونکر کر سکے گی۔

اس آخری رات ارسل تین دن کے لئے کراچی گیا تھا۔ اس نے وہاں پہنچتے ہی ا
کال کی، اپنی خیریت بتانے اور اس کی دریافت کرنے کے لئے۔ شاہم نے موبائل
سوئچ آف کر دیا۔ اس نے لینڈ لائن نمبر پہ بھی بارہا کوشش کی، لاتعداد میسج چھوڑے۔
اسے بابا جانی کے حکم پر وہاں رُکنا پڑا تھا، ورنہ وہ اگلے ہی دن ریٹرن ٹکٹ سے لوٹ آ
اس سے رابطے کی ہر ممکن کوشش کر کے ناکام ہو گیا تھا۔

رات نو بجے کی فلائٹ سے اس کی واپسی ہوئی تھی۔ کھانے کی طلب اس کی تین
سے مٹ چکی تھی۔ ایئرپورٹ سے گھر تک کے سارے راستے اُس کا نمبر بارہا ڈائل
رہا تھا۔ اب لاؤنج کے صوفے پہ نیم دراز تھکن زدہ ارسل کو ساڑھے دس بجے سے ہی
کا انتظار لگ گیا تھا۔ اسے باہر گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ یہ سائرہ رحمان کی گاڑی تھی
اسے ماں کا سامنا کئے کافی دن بیت گئے تھے۔ وہ انہیں سلام کرنے کی غرض سے بیٹھا
"کہاں ہوتے ہو؟ نظر ہی نہیں آتے۔"

ماں کے قدموں ہی آہٹ پہ اس نے موندی آنکھیں کھول دی تھیں مگر ان کا پو
اسے جز بز کر گیا۔ وہ تین دن باہر رہا تھا۔ وہ بے خبر تھیں یا بھول چکی تھیں۔
"جی، آپ کو کوئی کام تھا؟" اس نے بھی بتانا مناسب نہ سمجھا۔



"مجھے تم سے صرف ایک ہی کام ہے۔ بائی دے وے، تمہیں کمرے میں نیند نہیں
تی جو یہاں سو رہے ہو؟" سائرہ رحمان نے طنزیہ گفتگو کا آغاز کر دیا۔
"میں سو نہیں رہا تھا۔" اس نے بہت آہستگی سے تصحیح کی۔
"پھر یقیناً تم سوچ رہے ہو گے۔ کیونکہ اب تم سوچنے کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتے
؟" ارسل کو ان کا لہجہ تو سمجھ میں آ رہا تھا، مگر الفاظ نہیں۔
"سوری ماما! میں آل ریڈی بہت ڈسٹرب ہوں۔" وہ بڑے تحمل سے کہتا اپنی جان
رانے کے لئے اُٹھ گیا۔
"آف کورس مائی سن! تمہاری ماما کو تم سے پوری ہمدردی ہے۔ بٹ آئی وِش کہ تم اتنا
ب نہ مناؤ۔ فار گیٹ اِٹ۔ اچھا ہے، اس لڑکی کو اپنا فیملی ممبر بنانے سے قبل ہی اس
، جیپ فیملی بیک گراؤنڈ کی اصلیت پتہ چل گئی۔"
سائرہ رحمان کو اپنے ذرائع سے ماہم کی خبر مل چکی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ ارسل بھی
اہ ہو چکا ہو گا۔
"آئی کانٹ انڈر اسٹینڈ، آپ کس لڑکی کا کہہ رہی ہیں۔" ماں کی ساری گفتگو اُس کی
ں سے بالاتر تھی۔
"لو..... اب ہمیں اتنا انجام نہ سمجھو، اس ماہم کے کرتوت کون نہیں جانتا۔"
"ماہم!..... ماہم آپی!..... آپ کیسے جانتی ہیں انہیں؟" وہ جو جانے کے لئے
ر گیا تھا، پورا کا پورا اُن کی طرف گھوم گیا۔
"آپی..... ماہم؟ وہ اس قابل ہے کہ اسے اتنے احترام سے پکارا جائے؟ سارے
نے میں اُس کی بے حیائی کے چرچے ہو رہے ہیں، ہر ایک تھو تھو کر رہا ہے۔ اور تم
ے آپی جیسے القابات سے پکار رہے ہو، اسے تو....."
"پلیز اسٹریٹ وے بتائیں، کیا ہے؟" ماں کی اس گوہر افشانی پہ اُس کا دل اتھاہ
رائی میں ڈوب گیا۔
"یو رئیلی ڈونٹ نو ارسل؟ اتنی محبت کرتے ہو اس لڑکی سے کہ اس کی خاطر ماں کے
منے کھڑے ہو گئے۔ اور اس کے گھر کی تمہیں خبر نہیں۔ ظاہر ہے، وہ اپنی بہن کا کردار
چھپانے لگی تھوڑی، اس پہ بھی بہن کا رنگ....."
"پلیز فار گاڈ سیک ماما!" وہ دبے لہجے میں چیخ پڑا۔
"اس شاہم کی بڑی آپی، اپنے کسی پرانے عاشق کے ساتھ بھاگ گئی۔" سائرہ رحمان

نے تمسخرانہ مسکراتے ہوئے بریکنگ نیوز دی۔

''نن.....نہیں.....'' وہ رُکتی سانسوں سے اپنی جگہ پر جم گیا۔ اسے یقین تھا سائرہ رحمان جھوٹ نہیں بول سکتیں۔

''اب میری بات کان کھول کے سن لو ارسل! تمہاری شادی صرف اور صرف ا سے ہوگی۔ میں نیکسٹ ویک تمہارا نکاح کر رہی ہوں، دیٹس اِٹ۔''

انہوں نے بہت غلط وقت پر غلط بات بول دی تھی۔ ارسل نے چونک کر ما دیکھا۔ وہ تو ابھی بے یقینی کی ناہموار مسافت پہ کھڑا تھا۔

''دِس اِز ٹو مچ ماما! آپ صرف ماں ہونے کے ناتے میری زندگی کا فیصلہ نہیں سکتیں۔ میں آپ کو بہت دفعہ ریفوز کر چکا ہوں۔''

''اتنی گری ہوئی حرکت جان کر بھی تم اس کے فیور میں ہو؟ میں بھی دیکھتی ہو کیسے اپنی مرضی کرتے ہو، کیسے وہ ڈائن اس گھر میں آتی ہے۔''

''میں بھی آج آخری بار بتا رہا ہوں، ماما! میری زندگی کی ہم سفر صرف اور شاہم ہوگی، صرف شاہم۔ ورنہ زندگی کو بے معنی میں خود کر دوں گا، بی کازشی لائف اینڈ آلسو کمٹ منٹ۔''

وہ نپے تلے قدم اُٹھا کر ماں کے قریب آ کر بہت دھیمے سے چبا چبا کے بولا تھا۔

''جسٹ شٹ اپ ارسل!'' وہ بیٹے کی اتنی دیدہ دلیری پہ اپنی آواز پست نہیں سکتی تھیں۔

وہ انہیں شاک میں چھوڑ کر چلا گیا۔ شاہم کی نظر اندازی، وہ اس کا فون ریسیو نہیں رہی تھی۔ لینڈ لائن پر آنے سے اس نے انکار کر دیا تھا۔ اس نے کتنے پیغام چھوڑے۔ جواب ندارد۔ اس سب کی وجہ اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ اس نے کمرے میں آ کے سیل فون پہ کال کی۔ بیل جاتی رہی، فون نہیں اٹھایا۔ اُس نے میسج لکھا۔

''شامی! اگر تم نے میری کال ریسیو نہ کی تو میں اسی وقت تمہارے گھر پہنچ گا۔'' میسج کر کے وہ اضطراری کیفیت میں چکر لگانے لگا۔

شاہم نے میسج پڑھا۔ ارسل واپس آ چکا تھا۔ اب وہ اسے مزید نظر انداز نہیں تھی۔ وہ بیمار رہی تھی۔ ابھی بھی اس کی ذہنی حالت سنبھلی نہیں تھی۔ وہ لوگوں سے بدکنے لگی تھی۔ سب سے زیادہ خوف اس کے حواسوں پر ارسل کا طاری تھا۔ اس اس کے لئے راضی نہیں تھیں۔ بابا اس نے کتنی شفقت سے ملے تھے، ان لوگوں



وہ ایک اچھی فیملی سے تعلق رکھتی تھی۔ اب ماہم کی اس حرکت کا کیا ردِعمل ہوگا، ارسل چھوڑ دے گا؟ اسے بھی موردِ الزام ٹھہرائے گا؟ اس پہ بھی شک کیا جائے گا؟ ارسل بچنا بھی تو محال تھا۔ وہ اپنے کہنے کے مطابق آ بھی سکتا تھا۔ اس نے دل کی دھڑکن سارے جسم میں دھڑکتے محسوس کر کے اس کا نمبر ڈائل کیا تھا۔ دوسری طرف پہلی ہی پہ فون اٹھایا آیا۔

''آر یو فائن شامی! تم ایسا کیوں کر رہی ہو؟ تمہیں.....تمہیں ذرا سا بھی احساس میرا؟ تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے، مجھے بتاؤ۔ کیوں بھاگ رہی ہو تم؟ ایسا کیا ہو گیا چار دن میں شامی!''

وہ اُس کی ہیلو سنے بغیر سخت جھنجلا گیا تھا۔ وہ رونے لگی تھی۔ اس کے پاس بولنے کے ایک لفظ بھی نہیں تھا۔

''شامی! میں تمہاری وجہ سے کتنا پریشان ہو رہا ہوں کہ اب اگر تم روئیں تو بلیومی، ی رو دوں گا۔ پلیز شامی!.....پلیز۔'' وہ اتنی بے بسی سے بولا تھا کہ وہ چپ کر گئی۔ اس نے فون پہ اس سے ماہم کے متعلق استفسار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ماہم کا قصہ کے نزدیک اتنی اہمیت کا حامل بھی نہیں تھا کہ وہ شاہم کو کریدتا۔

''تم صبح نو بجے آ رہی ہو، میں انتظار کروں گا شامی! اللہ حافظ۔'' موبائل بیڈ پہ ب کر اس نے آنکھوں ٹھہری نمی کو دونوں ہتھیلیوں میں جذب کیا تھا۔

☆☆☆

کاشا کے معمول میں ماہم کے آ جانے سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ اپنی
سے جاگتا، کھاتا، پیتا اور اسے بتائے بغیر گھر سے نکلا رات کے کس پہر آتا، اسے
نہ ہوتی۔ شروع کے چند دن اس نے کاشا کی راہ دیکھی، پھر اس نے انتظار کرنا چھوڑ
گھر میں صرف ایک کل وقتی ملازمہ تھی، وہ اس سے کب تک جی بہلاتی۔

اسے کاشا سے بہت سی شکایات تھیں۔ وہ اسے وقت نہیں دے رہا تھا۔ وہ ا
بیوی بن کر بھی اس کے والدین، بزنس اور فرینڈز کو نہیں جان پائی تھی۔ وہ اسے ایک
بھی باہر گھمانے نہیں لے کر گیا تھا۔ اگر وہ بوریت سے اُکتا کر اسے کال کرتی تو
مسلسل بزی جاتا یا پھر وہ کال ریسیو نہ کرتا۔ وہ شاک میں تھی۔ کاشا کے اس روپ
پہلے والے کا موازنہ کرتی رہتی۔ شادی کے بعد اسے وہ کاشا کہیں نہ ملا تھا۔ وہ ملاقا
لیٹ نائٹ باتیں، محبت سے بھرپور سرگوشیاں، قہقہے، ہنسی مذاق، بے قراریاں....
سب کیا تھا؟ کیا کاشا نے اس کے ساتھ فراڈ کیا تھا؟ وہ تو بہت منہ پھٹ اور بدتمیز
دل و دماغ میں، وہی منہ پر دے مارتا۔ دوغلا پن اس میں نہیں تھا۔ وہ کبھی کسی سے
نہیں تھی۔ اب اسے کاشا سے خوف آنے لگا تھا۔

اس نے اپنی زندگی کا یہ فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا، جو اُس کے لئے
عذاب ثابت ہو رہا تھا۔

واحد ملازمہ کے ساتھ اسے خود بھی گھر کے بہت سے کام نمٹانے ہوتے تھے۔
سالوں سے اسے کام کرنے کی عادت نہیں رہی تھی۔ وہ بہت تھک جاتی، بستر پر
اسے نیند آنے لگتی۔ وہ گہری نیند میں تھی کہ اسے کسی نے جھنجوڑ کے اُٹھا دیا۔ وہ ہڑبڑا
اُٹھ بیٹھی۔ غصے سے بھرا، کاشا اُس کے سر پر کھڑا تھا۔

''بہت نیند آتی ہے تمہیں۔'' اس کی غصیلی آواز بہت اونچی تھی۔

سہمتے ہوئے اس نے وال کلاک دیکھا، جہاں رات کے دو بج رہے تھے۔



''دو بجے ہیں، زیادہ ٹائم نہیں۔ روز تمہارا سونا نوٹ کرتا ہوں۔ کون سے پہاڑ توڑتی
اپنی رسپانسبلٹی بھی بھول جاتی ہو؟ گھر لوٹے شوہر سے چائے، کھانے کا پوچھنے کے
جاہل عورتوں کی طرح سر جھاڑ منہ پہاڑ سرِ شام ہی خراٹے لینے لگتی ہو۔''

وہ یک ٹک اسے دیکھے گئی۔

''اب دیدے مٹکانا بند کرو اور کھانا لاؤ۔ اور ہاں، دوبارہ جگانا نہ پڑے۔'' وہ ماتھے
ڈالے کہہ رہا تھا اور ماہم اُس کے الفاظ کی سنگینی برداشت کر رہی تھی۔ خمار آلود
اس پر سے ہٹ نہ پائی تھیں۔

''اسٹاپ اٹ۔'' وہ پلٹی۔ کاشا واش روم کے دروازے میں کھڑا تھا۔ ''نائٹ سوٹ
ہیں کیا، میرے کام کے معاملے میں اپنے دماغ کو ذرا ٹھکانے پہ رکھا کرو، ورنہ مجھے
چ کنے بھی آتے ہیں۔''

وہ کپڑے ہینگ کرنا صرف آج بھولی تھی۔

کاشا نے اس کے ہاتھ سے کپڑے تقریباً چھین کر دروازہ پورے زور سے بند کیا۔
وہ مضمحل وجود کو گھسیٹتی کچن میں آ گئی۔ کھانا گرم ہونے تک کاشا کی بے عزتی اس
نوں میں گونجتی رہی تھی۔ کاشا اتنی جلدی پینترا بدلے گا، یہ اس کے وہم و گمان میں
ں تھا۔

وہ کھانا لائی تو وہ شاور لے کر بیڈ پہ لیٹا کوئی فائل اسٹڈی کر رہا تھا۔

''کاشف! کھانا۔'' اس نے دھیرے سے متوجہ کیا۔

''ہوں..... کھانا.....'' کچھ توقف کر کے اس نے سوچا۔ ''ایسا کرو، واپس لے
مجھے بھوک نہیں۔''

ماہم کو بے عزتی پہ غصہ تھا وہ چپ نہ رہ سکی۔

''کاشف! آپ کو بھوک لگی تھی، شاید اسی لئے آپ نے مجھے جگایا تھا۔''

تمسخرانہ اسے دیکھتے رہنے کے بعد کاشا نے فائل بند کر دی۔

''تم بہت معصوم ہو..... لائیک ایکٹریس۔''

سرخ چہرہ لئے اپنے ہاتھ مروڑتی ماہم کا جی چاہا، چیخ چیخ کر رونے لگے۔

''تم میری جائز اور قانونی بیوی ہو۔ کوئی بھی شوہر رات کے اس پہر بیوی کو صرف
منگوانے کے لئے نہیں جگاتا..... یا تمہیں ابھی تک میرے بارے میں کوئی غلط فہمی
'' اس کا لہجہ واضح مذاق اُڑاتا ہوا تھا۔

''جی ہاں، بہت غلط فہمیاں تھیں، جنہیں آپ ایک ایک کر کے دُور کرتے جا
ہیں۔'' وہ تنک کر بولی۔

''جاؤ اور اچھے بچوں کی طرح ٹرے رکھ کر جلدی سے واپس آ جاؤ۔'' اس نے پ

''آپ بہت بدل گئے ہیں کاشف!'' پلکوں کو جھپکاتے، آنسو روکتے اس
سے گلہ نکل گیا۔

''چینج مجھ میں نہیں، تمہارے لائف اسٹائل اور سوچ میں آیا ہے۔ تم جانتی ہو، تم
ساتھ مسئلہ کیا ہے۔ تم ابھی بھی اپنی پچھلی زندگی میں جیتی ہو..... جس میں تمہار
نخرے، چونچلے اٹھائے جاتے تھے۔ تم اپنا ماضی جس شخص کے ساتھ گزار چکی ہو، وہ
اُلّو تھا، جس پر رشتوں اور محبت کا بھوت سوار تھا۔ میرے ساتھ ایسا کوئی سائیکو پرا
ہے۔ اور یاد کرو، تمہیں تو مرد کے پوجنے سے..... اس کی..... اس کی زن مرید
چوٹھی نا۔ ایکچوئیلی تمہاری فطرت ان دوغلی عورتوں سے مطابقت رکھتی ہے، جن کی ا
مرد کے معاملے میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ تمہاری توقعات مجھ سے کیا ہیں؟ آئی
کیئر، میں اپنی لائف اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق جیتا ہوں۔ اس میں کسی کے
یا کمی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اب..... اب شکایت کی ہے، پھر نہ کرنا۔ شروع میں
ہو گی، لیکن امید ہے بہت جلد عادی ہو جاؤ گی۔ اینڈ سنو، مجھے ٹسوے بہاتی عور
سے بھی زیادہ بری لگتی ہیں۔ میں ان اوچھے ہتھکنڈوں سے متاثر ہونے والا نہیں۔
منٹ میں تم بیڈ پہ ہو۔ ورنہ میں تمہارا کیا حشر کر سکتا ہوں، تم سوچ سکتی ہو۔ اب جا

فائل بیڈ کراؤن پر رکھ کر، سر کے نیچے ڈبل تکیہ درست کرتے اس نے پُرسکو
آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

منصور کی دیکھ بھال اور پہلے جیسی اپنائیت کی برقراری سے شاہم بہت جلد
تھی۔ ان دونوں کے بیچ ماہم کا ذکر پھر دوبارہ نہیں ہوا تھا۔ منصور بہت کم گو ہو
شاہم بہت سنجیدہ۔ گھر میں چار سُو خاموشی کی دبیز تہہ سی بچھ گئی تھی۔ شاہم نے
بہت کم کر دیا تھا۔ وہ منصور کو اپنی طرف سے کوئی شکایت کا موقع نہیں دینا چاہتی
ارسل سے بھی صرف ایک بار ملنے گئی تھی۔ ارسل نے بالکل نہ پوچھا کہ اس نے
اس کے ساتھ اتنا برا رویہ کیوں اختیار کئے رکھا۔ وہ اسے اپنے بزنس ٹور اور اِد
باتیں بتاتا رہا۔ شاہم نے شاید پہلی بار اسے اتنی خاموشی سے سنا تھا، بنا ٹوکے



ں بول کے تھک گیا تو شاہم نے بڑا حوصلہ کیا۔

''ارسل! ان چار دنوں میں ہم برباد ہو گئے، سب کچھ اُجڑ گیا، ختم ہو گیا..... ماہم.....
م آپی ہمیں چھوڑ.....''

''پلیز، میں اس بارے میں کچھ جاننا نہیں چاہتا۔ بھول جاؤ ماہم آپی کو۔ تم گلٹی فیل
کرو۔ مجھے نہ تم سے کچھ پوچھنا ہے، نہ ہی سننا ہے۔ صرف اپنی کہو یا میری۔'' اس نے
اہم کے دونوں کندھے تھام کے بڑی محبت سے اس کے جھکے سر کو دیکھا۔

یہ سر وہ ہمیشہ فخر سے بلند دیکھنے کا متمنی تھا۔ کٹھن مرحلے سے وہ گزر رہی تھی، تکلیف
ں کی ذات کو تھی، وہ اس سے صرف محبت کا دعوے دار نہیں، محبت کرتا بھی تھا۔ وہ کیوں
ان بوجھ کر مزید کریدتا، دکھ سے دوچار کرتا۔ وہ ماہم کے اس فعل کا اسے قصوروار نہیں
ٹھہراتا تھا۔ ماہم کے کردار اور اس کی حرکت کا موازنہ شاہم کی ذات سے نہیں کرتا تھا۔
ے شاہم سے کسی بھی قسم کی وضاحت نہیں مانگنی تھی۔

''یو..... یو آر گریٹ ارسل!..... آئی..... آئی ایکسٹریملی تھینک فل ٹو یو، رئیلی۔''
جھکے سر کو اٹھایا تو آنسو آنکھوں سے گالوں پہ بہہ گئے۔

''تھینکس فار واٹ؟'' اس نے آنسوؤں کو اپنی انگلیوں سے چن لیا۔

''اے، روؤ مت۔ میرا دل رک جائے گا۔ نو..... نیور۔ اب مسکرا دو۔'' وہ مسکرا رہا
تھا۔ وہ بھی روتے میں زبردستی مسکرانے لگی۔

اس نے ارسل سے کہہ دیا تھا کہ وہ اب روز روز اس سے ملنے نہیں آ سکتی، وہ منصور
کی وجہ سے بہت احتیاط برتنے لگی تھی۔ ارسل سے کال پہ اس کا رابطہ تھا۔ باہر وہ صرف
ضروری کام سے منصور کو بتا کر وہ اجازت لے کر جانے لگی تھی۔

☆☆☆

''میری بلیک شرٹ نہیں مل رہی۔'' کاشا کچن میں کاؤنٹر کے پاس آ کے کھڑا ہوا۔ وہ
سخت جھنجلایا ہوا تھا۔

''کون سی بلیک والی؟'' پریشر ککر میں کالی مرچ ڈالتے اس نے رک کر پوچھا۔

''کتنی بلیک شرٹس ہیں میری؟ تمہارا دھیان کام کی طرف ہو تو۔'' اسے غصہ آنے
لگا تھا۔

ماہم نے اندازاً یاد کیا تو کتنی ہی بلیک شرٹس اس کے ذہن میں گھوم گئیں۔ اب وہ
کیسے قیاس کرتی۔

''جو غالباً میں نے پرسوں اُتاری تھی۔'' اس نے خود ہی یاد کر کے بتا دیا۔

''وہ..... وہ واشنگ مشین میں ہے۔ میں نے دُھلائی نہیں کی۔ آپ کوئی اور لیں۔ ایک بوتیک ہے پورا، آپ کی شرٹس کا۔'' ماہم نے اس کا غصہ ٹالنے کے لئے مسکرا کے کہا۔

''میں نے تم سے مشورہ نہیں مانگا۔ صرف دو کام تمہارے ذمے ہیں۔ کھانا بنا کپڑے دھونا، وہ بھی تم ڈھنگ سے انجام نہیں دیتیں۔ کس قسم کی کام چور اور گنوار ہو۔'' اس نے وہیں کھڑے کھڑے بے عزتی کر دی۔

''پلیز کاشف! میں.....''

''چھوڑو یہ سب اور بیڈروم میں میری شرٹ لے کے آؤ۔'' وہ پیر پٹختا واپس مڑا

وہ اس کے لئے سُوپ تیار کر رہی تھی۔ کُکر میں گوشت ڈال کر، بند کر کے چولہے چڑھا دیا۔ شرٹ کے چکر میں اُلجھ کر وہ اس کے کھانے سے غفلت نہیں برت سکتی تھی، ایک اور فساد برپا ہو جاتا۔

وہ شرمندہ سی ہاتھ میں میلی شرٹ پکڑے کھڑی تھی۔

''اس کی بدبو سونگھنے کے بجائے جاؤ اور اچھی طرح دُھلائی کرو۔'' اس نے سے حکم صادر کیا۔

سرف، ٹب میں بھگوتے اُسے رونا آ رہا تھا۔ کبھی کوئی ان آنکھوں میں آنسو دیکھ روادار نہیں تھا، جو اب روز ہی اپنی بے بسی اور بے عزتی پہ خود کے آنسو روتی تھیں۔ کی وارڈروب میں لاتعداد شرٹیں تھیں۔ ایک بار کے پہنے کپڑے کی باری ہفتوں بعد اور کبھی بالکل ہی نہ، بالکل نئے سوٹ اٹھا کر وہ نوکروں کو تھما دیتا۔

پندرہ منٹ لگا کے اُس نے رگڑ رگڑ کے دُھلائی کی۔ اسے کہاں اتنے کام کرنے پریکٹس رہی تھی۔ اس کی انگلیاں دکھنے لگیں۔ شرٹ سوکھنے ڈال کر ملازمہ کو کچن میں کر کے وہ دوبارہ اندر آ گئی۔ کاشا گھر میں ہوتا تو اسے آس پاس رہنے کا حکم تھا، تا اسے آوازیں دے کر بلانا نہ پڑے۔ وہ صرف ایک آواز دیتا، دوسری بار چلّاتا تھا۔ جوں جوں اُس کی مزاج شناسی ہوتی جا رہی تھی، اس سے ڈرنے اور بچنے لگی تھی۔

''جی.....'' وہ ایک لفظ بولی۔

''ایسا کرو، میرا چاکلیٹی کلر کا نیا سوٹ ہے، اسے نکالو اور جما کے پریس کرو۔'' کے نئے آرڈر پر ماہم کی آنکھیں پھیل گئیں۔ جو ابھی شرٹ کا رونا ڈالا تھا، ختم۔ اُس کا



کاشا کو کھری کھری سنائے۔

''اب یوں بت بنی مجھ پہ کیا منتر پڑھ کے پھونک رہی ہو؟ جاؤ، جو کہا ہے کرو۔'' کے ٹوکنے پر وہ ہٹ گئی۔

کاشا بہت بڑی مصیبت کا نام تھا۔ وہ جو شروع میں اس کے سارا دن باہر رہنے اور آنے پر خفا ہوتی تھی، اب دُعائیں مانگتی تھی کہ کاشا صبح منہ اندھیرے کا نکلا، رات آخری پہر ہی لوٹے۔ اپنا بیڑا غرق کرانے والی وہ خود تھی۔ اس کے پاس تھا ہی کیا، پہ وہ اُس سے اکڑتی یا جھگڑا کرتی۔

اس کا شوہر کے اصل روپ سے اب واسطہ پڑا تھا، جو بہت ہولناک تھا۔ جسے برداشت کرنے کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

اگلے دو گھنٹے کاشا نے اُس کی خوب پریڈ کروائی۔ خوش قسمتی سے سُوپ اچھا بن گیا جسے اُس نے چپ چاپ پی لیا۔ وہ یوں ہی کسی کام میں کیڑے نہیں نکالتا تھا۔ بس اسا بھی غلط ہو جاتا تو اس کی شامت آ جاتی۔ اس کی تیاری آخری مراحل میں تھی اور دل میں خدا کا شکر ادا کر رہی تھی۔

''جوتے۔'' آئینہ کے سامنے کھڑے، اسپرے کرتے اس نے کہا۔

''سب پالش ہیں، کون سے لیں گے؟''

شو ریک میں ترتیب سے رکھے سب جوتے پالشڈ تھے۔

''قمیض کے ساتھ جوگرز نہیں پہنے جاتے۔ کوئی بھی چپل نکال دو۔'' ماہم نے اس پیروں کے آگے چپل رکھ دی۔

''اس پہ برش پھیرو۔'' چپل پہن کر وہ کہہ رہا تھا۔

صاف ستھری چپل پہ برش پھیرتے ماہم کا جی چاہا، اس کے پیروں پہ کوئی وزنی سی مارے۔

☆★☆

منصور، بچوں کے بہت قریب اور محتاط ہو گیا تھا۔ شاید یہ بچے ہی تھے، جن میں وہ خود ن کر کے سب کچھ بھُلا سکتا تھا۔ بچوں کی گورنس تھی، نوکر چاکر، ماجدہ، اماں حاجراں ما، مگر وہ کسی پہ اعتبار نہیں کرتا تھا۔ صبح بچوں کو ناشتہ خود کروا کے آفس جاتا۔ شاہم کو وقت ر آ جاتا۔ چھٹی کے روز وہ سارا دن ان کے کام میں مصروف رہتا۔ ان کو نہلانا دُھلانا، لانا اور کچھ اوپری کام۔ بیٹی میں تو اس کی جان تھی۔ وہ رات کو خود اس کے لئے فیڈر

بناتا۔ اماں حاجراں نے کہاں بھی تھا کہ بچی، گورنس کے پاس رہنے دو۔ مگر وہ نہ مانا۔
شاہم کوشش کرتی تھی کہ منصور کی موجودگی میں وہ کم سے کم باہر آئے۔ زیادہ
اپنے کمرے میں مقید رہتی۔ وہ جب منصور کو بچوں کے کام کرتے، ان کی چیزیں
ان کے لئے فکرمند ہوتے دیکھتی تو اسے شرمندگی ہوتی۔ اس کا دل کہیں چھپ جا
کرتا۔ منصور کا روّیہ اُس کے ساتھ رتی برابر بھی نہیں بدلا تھا۔ وہ رات کو اسے کھا
ٹیبل پہ ضرور بلواتا۔ اس سے روزمرہ روٹین اور اِدھر اُدھر کی گپ شپ بھی کرتا
لگتا تھا، جیسے سب کو بہلانے کے چکر میں وہ خود کو بہلا رہا ہے۔ کسی شام وہ بالکل
چاپ سا اسٹڈی روم میں بیٹھا رہتا یا لان میں دھری کرسیوں پہ یک ٹک گھاس کو
گھنٹے بتا دیتا۔

منصور کی حالت پہ شاہم کا دل کُڑھتا۔ اُسے منصور سے ہمدردی اور ماہم سے
سی ہوتی جا رہی تھی، جو اس سب کئے دھرے کی اکیلی ذمہ دار تھی۔

وہ سو رہی تھی، جب دعا کے مسلسل رونے سے اس کی آنکھ کھلی۔ رات کے
سناٹے میں اس کے بلکنے کی آواز بہت اونچی تھی۔ منصور دعا، عمیر اور حمزہ کو اپنے سا
سلاتا تھا۔ شاہم نے بے چینی سے تین چار کروٹیں بدلیں، کانوں پہ تکیہ بھی رکھا۔ ا
نیند اُڑ چکی تھی اور دعا کے رونے کی رفتار تیز سے تیز ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اُٹھ بیٹھی۔

ڈریسنگ گاؤن کی ڈوریاں باندھتے، بال سمیٹ کر وہ باہر آ گئی۔ منصور کے کمر
دروازہ ادھ کھلا تھا۔ ماجدہ اور گورنس کے بولنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔

''دعا کیوں رو رہی ہے؟'' ذرا جھانکتے ہوئے وہ اندر داخل ہو گئی۔

''اس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ میڈیسن دی ہے، مگر سو نہیں پا رہی۔'' منصور نے
کندھے سے لگائے، تھپکیاں دیتے، جھنجلاتے ہوئے اسے بتایا۔

''سر! آپ مجھے دے دیں، میں اسے سنبھال لوں گی۔'' گھبرائی ہوئی گورنس
ہاتھ آگے بڑھا کر دُعا کو لینا چاہا۔

''نہیں، مجھے اس کے بغیر نیند نہیں آتی۔ پھر اس کی طبیعت بھی خراب ہے۔ ر
تم۔'' منصور نے صاف انکار کر دیا۔

''صاحب جی! اگر کہیں تو کوئی دیسی ٹوٹکا آزما لیں۔'' ماجدہ نے نیا مشورہ دیا۔

''فار گاڈ سیک! ایک تو بچی رو رہی ہے، اوپر سے تم دونوں میرا دماغ چاٹ رہ
جاؤ آپ لوگ یہاں سے۔ میں خود ہی سب ہینڈل کر لوں گا۔'' وہ دونوں بغلیں جھا



کل گئیں۔

''بس، بس..... میری بیٹی، ابھی آرام آ جائے گا۔ کیا ہوا پاپا کی جان کو.....'' وہ
سے بڑے پیار سے پچکار رہا تھا۔

اس کے رونے میں ذرا بھی کمی نہیں آئی تھی۔

''پلیز منصور بھائی! آپ اسے مجھے دے دیں۔ میں چپ کرا دوں گی اسے۔'' منصور
نے بہت بے بسی سے اسے دیکھا۔ وہ خود بھی اسے سنبھالتے بہت نڈھال ہو چکا تھا۔

''پلیز، اسے کوشش کر کے یہیں سلا دو۔'' اس نے دعا کو شاہم کی پھیلی بانہوں میں
ال دیا۔

شاہم نے اسے اپنے سینے سے لگا کر بازوؤں کو دائیں سے بائیں جھلانا شروع کر
یا۔ منصور کچھ دیر کھڑا رہا، پھر صوفے پر ہی لیٹ گیا۔

دعا، شاہم کی گود میں جا کر چپ ہو گئی تھی۔ شاہم نے اسے فیڈر دے دیا۔ وہ سو گئی تو
شاہم نے منصور کو پکارنا چاہا، مگر وہ بھی صوفے پہ ہی سو چکا تھا۔ اس نے احتیاط سے دعا کو
ستر پہ لٹا دیا۔ جیسے ہی اس نے اس پہ کمبل ڈالا، وہ پھر سے کسمسانے لگی۔ شاہم اس کے
ٹھ جانے کے خیال سے اس کے ساتھ ہی نیم دراز ہو گئی اور اس کے اوپر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

دعا کے سونے پر وہ وہاں سے اُٹھ جاتی، مگر اس کی آنکھ صبح ساڑھے سات بجے کھلی
تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ منصور ابھی بھی صوفے پر گہری نیند میں تھا۔ وہ ساری رات
اس کمرے میں رہی ہے۔ اس پہ بری طرح گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ وہ جلدی جلدی
احتیاط سے چپل پہن کر جانے کے لئے اُٹھ گئی۔ منصور کے قریب سے گزرتے بالکل
اچانک ہی وہ رُک گئی۔ اس بے خبر سوئے ہوئے وجود کو وہ یوں ہی دیکھتی رہی۔

منصور کی آنکھوں کی چمکتی روشنی، ہونٹوں پہ کھیلنے والی مسکراہٹ، ماہم سے چھوٹی
چھوٹی شرارتیں کتنا ہی کچھ اُس کے ذہن میں گھوم گیا۔ ماہم کی موجودگی میں وہ اس
کمرے میں آتے ہوئے جھجکتی تھی اور اب ایک رات یہاں بیت گئی تھی۔ اس نے مڑ کر
بیڈ کی طرف دیکھا۔ بیڈ پہ پڑا اس کا کمبل اُٹھا کر احتیاط سے اس کے اوپر ڈال دیا اور باہر
نکل آئی۔

ملازم ابھی تک سو رہے تھے۔ اور پھر ملازموں کے کمرے نیچے ہی تھے۔ کسی نے
اسے نہیں دیکھا تھا۔ دبے قدموں چلتے وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

☆☆☆

اس رات کے معمولی سے واقعہ نے شاہم میں بہت بڑی تبدیلی پیدا کر دی
اپنے آپ ہی منصور کے آفس جانے کے بعد بچوں کا دھیان رکھنے لگی۔ گھر سے با
یوں بھی اس نے ترک کر دیا تھا۔ ان کی چیزوں، کپڑوں، کھانے پینے کا خیال سب
کر رہی تھی۔ وہ تو کبھی ان کے قریب بھی نہیں گئی تھی، اب بہت گھل مل گئی تھی۔ اگر
کچھ کرنے میں دُشواری ہوتی تو وہ ماجدہ اور گورنس کی مدد لے لیتی۔ زیادہ کوشش کر
وہ ان کے سارے کام خود سے کر لے۔ اسے اب احساس ہوتا تھا کہ اسے یہ ذمہ
بہت پہلے اٹھا لینی چاہئے تھی۔ چھٹی کے روز وہ بچوں کے کسی کام میں مداخلت نہ کر
سب کچھ منصور ہی کرتا۔ اسے تو شاید پتہ بھی نہیں تھا کہ شاہم نے اس کا کتنا بوجھ با
ہے۔

اس کی اپنے بھانجوں، عمیر اور حمزہ سے بہت اچھی دوستی ہو گئی تھی، جو دونوں
سال کے تھے۔ وہ بھی سارا وقت اس کے پیچھے پیچھے پھرتے، اس کے ساتھ
کودتے۔ شاہم کو زندگی کا یہ نیا رُخ اصل معنوں میں سمجھ آ رہا تھا۔ اس کی جوں جوں
سے محبت بڑھتی جا رہی تھی، اس کے دل میں ماہم کے حوالے سے تنگی بھی بڑھ رہی تھی
اسے یاد نہیں تھا کہ ماہم نے کبھی اپنی اولاد سے لاڈ کیا ہو، ان کا منہ چوم کر سینے
لگایا ہو، انہیں لے کر کہیں گھومنے پھرنے گئی ہو۔ وہ عمیر اور حمزہ کے لئے بہت سے
نئے کھلونے اور اسکیچ بک لائی تھی۔ پوسٹر کلرز سے پری میں رنگ بھرتے انہوں نے
انگلیاں اور ہاتھ بھی بھر لئے تھے۔ شاہم نے شرارت سے اس کے گالوں پہ بھی برش
پینٹ پھیر دیا۔ اب ان دونوں بھائیوں کی باری تھی۔ انہوں نے رنگ شاہم کے نہ
منہ اور ہاتھوں پہ بلکہ کپڑوں پہ بھی گرا دیا۔ شاہم گرین کلر کی شیشی اور برش پکڑے لا
میں ان کو پکڑ رہی تھی۔ وہ دونوں قہقہے لگاتے، تالیاں بجاتے، چیختے ہوئے اس سے
کے لئے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ سارے لاؤنج میں شور تھا۔

اسی پل منصور اندر داخل ہوا۔

"کیا ہو رہا ہے یہ سب؟" لاؤنج کی صورتِ حال پہ وہ ہکا بکا کھڑا تھا۔

"پاپا جی! آنٹی (آنٹی)" وہ دونوں، باپ کی ٹانگوں سے چمٹ گئے۔ شاہم
رُک گئی تھی۔

"یہ کیا حلیہ بنایا ہے شاہم!" منصور کا اشارہ اس کے کپڑوں اور چہرے پہ ملے
پینٹ کی طرف تھا۔



تقریباً یہی حال بچوں کا بھی تھا۔

"یہ حلیہ میں نے نہیں، آپ کے ان چہیتوں نے میرا بنایا ہے۔ اب میں بھی ان پہ
اؤں گی۔" اس نے ان دونوں کو کھینچنا چاہا۔

وہ مزید باپ سے چمٹ گئے۔

"نو پاپا!.....نو....."

"ایک سیکنڈ.....ایک سیکنڈ۔" منصور نے تھوڑا جھک کر بچوں کے گرد بازو لپیٹ لیا۔
"دیکھو پلیز، میرے معصوم بیٹوں سے بدلہ تو مت لو۔ ویسے تم لگ بہت خوف صورت
ہو۔"

منصور نے مصنوعی بے چارگی سے مسکراہٹ دباتے کہا۔

اتنے عرصہ بعد گھر میں بچوں کی ہنسی، آواز اور شور سن کر اسے بہت اچھا لگا تھا۔ اب
سمجھ میں آیا تھا کہ عمیر اور حمزہ اس سے زیادہ شاہم کی طرف کیوں لپکتے تھے۔ جبکہ
اس کے سامنے آنے سے یا بچوں سے گھلنے ملنے سے ذرا کتراتی ہی تھی۔

"نو پرابلم، آپ کے بیٹوں کا بدلہ آپ سے تو لیا جا سکتا ہے نا، بڑے آئے حمایتی۔"
نے برش کو پینٹ میں ڈبو کر منصور کے چہرے پر پھیر دیا۔ یہ سب اس نے اتنا اچانک
منصور اپنا بچاؤ بھی نہ کر سکا۔

"واٹ نان سینس شاہم!" وہ ہونقوں کی طرح چلایا۔

"اوہ، رئیلی....." وہ کھلکھلائی۔

یر اور حمزہ بھی اس کی ٹانگیں چھوڑے ہنسی میں آنٹی کے ساتھ تھے۔

یو آر لکنگ سو گڈ، منصور بھائی!" اس نے لوٹ پوٹ ہوتے اس کی تعریف کی۔
کی ان کے ساتھ خود پر ہی ہنسنے لگا۔ بہت عرصہ کے بعد دل کھول کر بے تحاشا۔

اوکے یار! آج رات کا ڈنر، بچوں کے ساتھ باہر کریں؟" منصور نے خوشی کے
شاہم سے پوچھا۔

ہاں، ایکچوئیلی ان دونوں کی اور دعا کی کچھ شاپنگ بھی کرنی ہے۔ آپ چینج کر لیں،
کا منہ ہاتھ دُھلوا دوں اور اپنا بھی۔ ہم بھی چینج کر کے آتے ہیں۔" وہ ان دونوں
لئے چلی گئی۔

منصور کے لئے وہ شام بہت حیرت انگیز تھی، جو اس نے شاہم کے ساتھ گزاری
کل نے گھر سے چلتے ہوئے کہا کہ ماجدہ کو دُعا کو اُٹھانے کے لئے ساتھ لے

جاتے ہیں۔ مگر اس نے دُعا کو گود میں اُٹھا کر صاف انکار کر دیا۔

عمیر، حمزہ کے لئے کپڑے خریدے تھے۔ ان کے کھلونے، رنگین بکس، کڑ
بلاکس اور خوب صورت سی بے بی سائیکل۔ وہ دونوں جس چیز پہ اُنگلی دھرتے
کرتے، وہ خرید لی جاتی۔

دعا چھ مہینے کی ہو گئی تھی۔ اس کے دودھ کا ڈبہ تبدیل کرنا تھا۔ منصور کا دھیا
تھا۔ اس نے ڈاکٹر سے فون کر کے کب پوچھا تھا، منصور یہ بھی نہیں جانتا تھا۔

دودھ کے ڈبے، سیریلیک، اس کا ایک فیڈر گم ہو گیا تھا، اس کے پیمپرز بھی
گئے تھے۔ کچھ ضروری میڈیسن کھانسی، نزلہ، زکام کے لئے۔ ساتھ ہی اس نے
بھی یاد دلایا تھا کہ اس نے کافی عرصہ سے اپنے لئے شاپنگ نہیں کی۔ اس نے
شاپنگ میں اس کی مدد بھی کی۔ ڈنر کے بعد انہوں نے آئس کریم کھائی۔ عمیر اور
شرارتیں، دکانوں کی چیزوں سے چھیڑ چھاڑ، مارکیٹ میں ایک دوسرے کے پیچھے
بلاوجہ ہی کسی شاپ میں جا گھسنا، ہر بیس منٹ بعد ان کا گم ہو جانا۔

منصور کے لئے جہاں یہ شام حیرت انگیز تھی، وہیں یادگار بھی بن گئی تھی۔

وہ پہلی بار کسی عورت اور اپنے تینوں بچوں سمیت اتنے خوشگوار اور دوستانہ ما
باہر وقت گزار رہا تھا۔

واپسی پہ عمیر پچھلی سیٹ پہ سو گیا۔ دعا بھی اس کی گود میں سو چکی تھی۔ حمزہ اگ
کی بیک تھامے، بیچ میں پھنسا کھڑا تھا۔ جیسے ہی گاڑی سگنل پہ رُکی، ایک بچہ
گلاب کے گجرے اور بالے پکڑے گاڑی کے قریب آ گیا۔ وہی بچہ تھا، جس
منصور ماہم کے لئے گجرے لیا کرتا تھا۔ اب عرصہ ہوا، اس نے بچے سے کچھ نہ
تھا۔ پھر بھی وہ جب بھی اسے دیکھتا تو ضرور اُس کی گاڑی کے پاس آ رُکتا۔

''گجرے یا بالے، لے لو صاب!'' اس نے کھڑکی سے ہاتھ آگے بڑھایا۔

''نہیں یار! کچھ نہیں چاہئے۔'' اس نے ذرا کی ذرا سب دیکھ کر نفی میں سر ہلا

''ایسا مت بولو صاب! صبح سے زیادہ نہیں بِکا، سویرے تک مرجھا جائیں گے
اس کے کہنے میں بے چارگی تھی۔

''ایک بار بول دیا نا، نہیں چاہئے مجھے۔'' منصور نے اب کوفت سے کہا۔
والا اس کے لئے ایک اور اذیت تھا۔ اس کے پھولوں سے بھی اس کی بہت
وابستہ تھیں۔ مگر اس وقت وہ کچھ بھی یاد کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔



''بیگم صاحبہ کے واسطے خرید لو۔ مولا آپ کی جوڑی سلامت رکھے۔ ان کی کلائیوں
میں بڑے جچیں گے، صاحب''

اس نے خاموشی سے سب سنتی شاہم کے متعلق اندازہ لگایا۔

شاہم نے گھبراہٹ سے باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔ منصور بھی بوکھلا گیا تھا۔

''یہ لو، پیسے رکھو۔ مگر کچھ خریدنا نہیں ہے۔'' منصور نے جان چھڑانے کے لئے جلدی
سے والٹ سے سو کا نوٹ نکال کر اسے تھما دیا۔

اسی لمحے سگنل کھل گیا تھا۔ زیادہ رش نہیں تھا۔ پیچھے سے ایک دو گاڑیوں نے ہارن دیا
اور دوسری سائیڈ سے ہو کر نکل گئیں۔

''ایک منٹ، چلنا نہیں صاب!''

وہ پیسے پکڑ کر اسے اُنگلی سے رُکنے کا اشارہ کرتے شاہم کی طرف آ گیا۔

''اب کیا ہے؟'' منصور نے اسے گھورا۔

''میں جان گیا جی، بیگم صاحبہ آپ سے ناراض ہیں۔ آپ اپنے ہاتھ سے انہیں
گجرے پہنا دو، مان جائیں گی جی۔''

وہ دونوں اس بچے کی اس بات پر ہکا بکا رہ گئے۔

گھر پہنچنے تک ان کے بیچ خاموشی چھائی رہی۔

☆☆☆

کاشا نے رات کو آتے ہی اُسے چائے کا آرڈر دے دیا۔ وہ چائے بنانے چلی گئی۔
واپس لوٹی تو کمرے کی حالت زار دیکھ کر جز بز ہو گئی۔ موزے اُتار کر بیڈ پر پھینکے گئے
تھے۔ بوٹ کی مٹی سے سارا کارپٹ گندا ہو گیا تھا۔ شرٹ صوفے سے نیچے لٹک رہی تھی۔
موبائل، گلاسز اور کی چین، ڈریسنگ ٹیبل پہ اُچھلنے سے اس پہ رکھی دو تین بوتلیں نیچے گر گئی
تھیں۔ چرس کے سگریٹ کی بُو سارے کمرے کو آلودہ کئے ہوئے تھی۔ اُسے کاشا کے اس
طرح کے کاموں سے بہت نفرت تھی۔ وہ اکثر رات کو بھی پی کر آتا تھا۔

''کاشف! چائے۔'' اس نے چبا کر ذرا اُونچا کہتے ہوئے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

''رکھ دو۔ سر میں اُنڈیلو گی کیا؟'' ڈرنک مکس کرتے، دیکھے بغیر اس نے لتاڑا۔

''کاشف! تم اس طرح کے کام گھر سے باہر کیا کرو، پلیز!'' چائے اس نے ٹیبل پہ
اتنے زور سے پٹخی کہ وہ کناروں سے چھلک گئی۔

''اور اگر میں تمہیں ہی گھر سے باہر کر دوں تو؟'' کاشا نے سرخ ہوتی آنکھوں سے

اسے گھورا۔ اسے شاید یاد نہیں تھا کہ یہ گھر، ماہم کا ہے۔ وہ اس کے ساتھ رہ رہا ہے۔

وہ تمتماتا چہرہ لئے خاموش کھڑی رہی۔ جی تو چاہا، اُسے یاد دہانی کروائے کہ مالکن ہوں۔

"مجھے گھن آتی ہے۔" اس نے کراہیت سے کہا۔

"تمہیں..... تمہیں مجھ سے گھن آتی ہے؟" وحشیانہ تیور لئے وہ اُس کی طرف بڑھا۔

ماہم خوف سے پیچھے ہٹی۔ وہ اسے پیٹنے میں چھیڑ چکی تھی۔ اب وہ اسے چھوڑنے نہیں تھا۔ اس نے آج تک کسی کو اتنی اجازت نہیں دی تھی کہ کوئی اس کی سرگرمیوں میں مداخلت کرتا، خاص طور پر ایک عورت۔

"تمہیں اپنے پہلے یار کی قربت سے بھی نفرت تھی، اب مجھ سے بھی گھن آنے لگی۔ کل کسی تیسرے کو کر لینا۔ یہی کرتوت ہیں تمہارے۔ میں سمجھاتا ہوں تمہیں کہ اگر شوہر میرے جیسا فارغ دماغ ہو تو اس سے کیسے بی ہیو کرتے ہیں۔ اتنے مہینوں سے پیار زبان سے سمجھاتا آ رہا ہوں، مگر تمہارے دماغ میں بھوسہ بھرا ہوا ہے، کوئی بات سمجھ نہیں آئی۔" اس نے پورے زور کا تھپڑ اُس کے گال پہ مارا۔

"آج کی مار تمہیں پوری لائف کے لئے کیئر فل بنا دے گی۔ تمہیں مینرز سکھاتا ہوں۔" اس نے بازو سے پکڑ کر گری ہوئی ماہم کو اُٹھایا اور دوسرا تھپڑ مار کر پھر گرا دیا۔

وہ رو رہی تھی، گر رہی تھی۔ وہ اس سے اپنا بچاؤ نہیں کر سکتی تھی، جو وحشی بن گیا تھا۔

"تم میری ایکٹوٹیز میں مداخلت کرو گی؟ مجھے سکھاؤ گی؟..... اچھے اور برے ڈیفرنس بتاؤ گی؟" وہ اسے مارنے کے ساتھ چلا بھی رہا تھا۔

"گیٹ لاسٹ فرام ہیئر۔ اور وائز، آئی وِل کل یُو، رئیلی۔ (چلی جاؤ یہاں سے ورنہ تمہیں جان سے مار ڈالوں گا۔)"

اسے بالوں سے پکڑ کر اس نے باہر دھکا دیا۔ خود بیڈ کراؤن کی درازیں باہر کھینچ کر کھنگالنے لگا۔ وہ شاید ریوالور ڈھونڈ رہا تھا۔

ماہم بکھرے بال، روتے ہوئے، درد، درد وجود کو گھسیٹتی خوف سے باہر بھاگ گئی۔

☆★☆

شاہم نے آہستہ آہستہ تقریباً ساری ذمہ داری سنبھال لی۔ گھر، جو ایک عرصہ سے پریشانی اور بے ترتیبی کا مرکز بنا ہوا تھا، سب کچھ بہتر ہونے لگا۔ چہروں پہ مسکراہٹیں بکھرنے لگیں۔ چپ کے قفل ٹوٹ کے آوازوں اور شور میں بدل گئے۔ اس سب میں



ہم کا ہاتھ تھا۔ اسے منصور کی محبت خود پر قرض لگنے لگی، جسے اُسے چکانا تھا۔ عمیر اور حمزہ اس نے اسکول میں پلے گروپ میں داخل کروا دیا تھا۔ دعا کی دیکھ بھال وہ خود کرتی ں۔ اب وہ بھی خالہ کی اتنی عادی ہو گئی تھی کہ رات کو بھی اس کے ساتھ سوتی۔

منصور اس کی تعریف کرنے کے ساتھ حیران بھی ہوتا۔ ابھی سال بھر پہلے تک وہ شوخ و چنچل سی، لاپروا، اپنے آپ میں مست و مگن رہنے والی، اب ایک بازو میں دعا اُٹھائے، دوسرے ہاتھ سے عمیر اور حمزہ کی ریں، ریں اور اس کی دھمکیاں دعا کی ننھی ناریاں..... سب بہت مکمل اور خوشگوار لگتا۔

اس نے ارسل سے ملنا بہت کم کر دیا تھا۔ کبھی کبھار ہی جاتی، فون پر رابطہ رہتا۔ اب ل سے وہ اپنی باتیں اور لڑنے کے بجائے عمیر اور حمزہ کو ڈسکس کرتی رہتی۔

"شامی! تم بچوں سے بہت اٹیچ ہو گئی ہو۔"

وہ ارسل سے ملنے آئی تھی اور کب سے اسے اُن ہی کے قصے سنا رہی تھی۔ وہ راتے ہوئے سب سن رہا تھا۔

"یار! بچے ہوتے ہی بہت سویٹ ہیں۔" اس نے اپنی رو میں کہا۔

"ہاں..... مگر اپنے ہوں تو۔"

"یہ بھی اپنے ہی ہیں۔" اس نے ارسل کی شرارت پہ مسکراتے اسے چپت لگائی۔

"شامی!..... آئی تھنک، ہمیں اب شادی کر لینی چاہئے۔" وہ کافی دنوں سے ایسا سوچ رہا تھا۔

"کیوں، اتنی جلدی بھی کیا ہے؟" اس نے اچنبھے سے پوچھا۔

"واٹ، جلدی!..... جب بالوں میں سفیدی آ جائے گی، وہ وقت مناسب رہے ا؟ لڑکیاں پارلر میں میک اپ کروانے جاتی ہیں، تم بالوں کو کلر کروانے جانا۔ کر لو لدی۔" وہ خفا ہو گیا تھا۔

"ڈونٹ بی سلی، ارسل! ابھی اتنی مشکلوں سے تو ہم سب سنبھلے ہیں۔"

"سنبھل تو گئے ہو نا۔ تمہارے جانے سے بھی انہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اِن دا اسٹ، انہیں اپنی لائف تمہارے بغیر ہی سیٹ کرنی ہے۔"

اس نے شاہم کو بتایا نہیں تھا، وہ سائرہ رحمان سے جھگڑ کر اسی اپارٹمنٹ میں شفٹ ہو گیا تھا۔ مطیع الرحمان نے اسے بہت سمجھایا، مگر وہ نہ مانا۔ وہ اب تک اسی لئے شادی کو ملتوی کر رہا تھا کہ ماں کو ایک دن راضی کر لے گا۔ مگر اب اس نے ماں کا خیال ہی دل

سے نکال دیا تھا۔ اسے صرف بابا جانی کی ہاں اور موجودگی کی ضرورت تھی، جو ا
ساتھ ہی تھے۔

''نیور، ارسل! میں اتنی سیلفش نہیں ہو سکتی۔ اس..... اس بروکن فیملی ک
ضرورت ہے، جو انہیں سہارے کا آسرا دے سکے۔ میں نے انکار کب کیا ہے؟ ا
وقت دو..... پلیز ارسل!''

اُس کا لہجہ گلوگیر ہو گیا۔

''میں تمہیں ساری زندگی بھی دے سکتا ہوں، مگر میرے..... میرے اندر کہی
دُور خطرے کا ایک الارم سا بجنے لگتا ہے، کچھ ہو نہ جائے، کچھ.....''

شاہم نے اُس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا تھا۔

''ایسا نہ کہو، ارسل! مجھ میں اب ہمت نہیں، مزید کچھ برداشت کرنے کی۔
بہت مشکلوں سے خود کو جوڑ رکھا ہے، ذرا سی بھی ضرب مجھے چُور، چُور کر دے گ
بولو ارسل!'' وہ رونے لگی تھی۔

اسے یاد تھا کہ پہلے بھی جب ان دونوں کو ایسا محسوس ہوتا تھا، اور پھر
ٹریجڈی ہو گئی تھی۔

''شامی! چپ ہو جاؤ..... سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

☆☆☆



''میں نے ارسل کو انکار کیوں کیا؟''

رات کو بستر پہ لیٹی وہ سوچ رہی تھی۔

''بچے اور منصور بھائی کوئی اتنا بڑا مسئلہ تو نہیں کہ میری شادی میں رکاوٹ بن
یں۔ اور پھر ارسل..... کیا میں، اُس کی نیچر سے آگاہ نہیں؟ اُس نے میری مجبوری کو
بشہ انڈر اسٹینڈ کیا ہے۔ میں بزی ہوں، کال اٹینڈ نہیں کرتی، مہینے بعد ملنے جاتی ہوں،
ں کے پچاس ایس ایم ایس پر ایک جواب دیتی ہوں، اس نے کبھی شکوہ تک نہیں کیا،
ر وہ کیوں شادی کے بعد روک ٹوک لگائے گا؟ میں خود سے ہی ہر بات سپوز (فرض)
لئے ہوں۔''

وہ دیر تک سوچتی اور جاگتی رہی۔ اُس نے ارادہ کیا تھا کہ میں صبح ارسل کو فون کر کے
'ہاں'' کہہ دوں گی۔ تب بھی وہ ایسا نہ کر سکی۔ کوئی ان دیکھی چیز یا خدشہ اُس کی راہ
روک لیتا۔

اس رات وہ منصور کو اُس کے بیڈ روم میں کھانے کے بعد کافی دینے گئی تو اس نے
روک لیا۔

''وہ لڑکا، جس کا نام..... مے بی، ارسل تھا۔ ایک دفعہ آیا بھی تھا۔ اُسے دوبارہ
بلاؤ۔ مجھے اُس سے ضروری بات کرنی ہے۔'' کافی کا کپ اُس نے سائیڈ پہ رکھتے ہوئے
کہا۔

''وہ..... وہ منصور بھائی! میں فی الحال شادی نہیں کرنا چاہتی..... بچوں کو نہیں چھوڑ
سکتی۔''

وہ جان گئی تھی کہ وہ ارسل سے کیا بات کرے گا۔ اُس نے انکار اور وجہ بتا دی۔

''بہت کچھ کھو کے میں نے زندگی سے سیکھا ہے کہ کسی کے جانے سے رُکنا تو درکنار،

زندگی بھر کے لئے ٹھہرتی بھی نہیں۔ تلخیاں اور خوشیاں رواں دواں رہتی ہیں۔ شاید
شاید ہم ٹھہر جاتے ہیں، اپنے دکھ سے لپٹے۔ اور جب ہمیں احساس ہوتا ہے تو ہم
کے پیچھے سرپٹ دوڑتے ہیں، تاکہ اس کو جا لیں۔ بہت..... بہت خوش قسمت ہو
ہیں وہ لوگ، جو پھر سے اس کی برابری کر لیتے ہیں۔ بدنصیبی ہوتی ہے ان کی، جو ہا
کانپتے ساتھ نہیں دے پاتے۔" وہ کہیں کھو سا گیا تھا۔

"مگر شاہم! تم..... تم بدنصیبی کو اپنا مقدر مت بناؤ۔ ہم میں سے کسی کو تو منزل
کوئی تو کنارے پر لگے، کسی کی جھولی میں تو خوشیوں کی سوغات ہو۔" وہ رُک رُک
بول رہا تھا۔

وہ خاموشی سے سنتی رہی اور پلٹ گئی۔

یہ ہی خاموشی اُس کے لبوں پہ ٹھہر گئی۔

اب منصور نے بھی کہہ دیا تھا، اسے ارسل کو منصور کے کہنے پر ہی ایک بار تو
چاہئے تھا۔

اس نے ارسل سے بالکل ذکر نہ کیا۔ اس کی حالت بہت عجیب تھی۔ بچوں سے ا
ہونے کا تصور اُس کے لئے سوہانِ روح تھا۔ وہ کسی خودساختہ احساس تلے دبی ہوئی تھ

وہ کچن میں کھانے کی تیاری چیک کرنے آئی تو اندر سے آتی اماں حاجراں اور
کی باتیں سن کر باہر ہی رُک گئی۔

"دیکھو، اب کیا ہوتا ہے؟ شاہم تو منصور کی شادی جلدی کرنا چاہتا ہے۔"
حاجراں بہت دھیمے اور تھکے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

"وہ ایک بار گھر بھی آیا تھا۔ بہت خوب صورت ہے۔ شاہم کی جوڑی اچھی گ
اس کے ساتھ۔" ماجدہ، شادی کے تذکرے پر بڑی خوش تھی۔

"پر اگر..... شاہم کے ساتھ منصور اپنے بارے میں بھی کچھ سوچ لیتا تو بہتر
اب اس بچی نے کتنی مشکلوں سے سب جوڑا ہے۔ یہ چلی گئی تو سب پھر بکھر جائے گا۔"

اماں حاجراں بہت فکرمند ہو رہی تھیں۔ انہیں منصور سے بہت محبت تھی۔ وہ بھ
کی بہت عزت کرتا تھا۔

"اماں! آپ منصور صاحب سے بات کر کے دیکھیں، دوسری شادی کی۔ ہ
گورنس کی نہیں، ماں کی ضرورت ہے۔"

"بہت بار کی ہے بات، پر وہ نہیں مانتا اور مانے گا بھی نہیں۔ اس خاندان



ں کی ریت ہے، بیوی کے بغیر تنہا، بچوں کی پرورش کر لیتے ہیں۔ پرائی عورت کا سایہ
بچوں پر نہیں پڑنے دیتے۔"

"یہ بھی تو دیکھو، تین معصوم بچوں کو سنبھالنا آسان کام نہیں۔"

شاہم مزید دیوار کے ساتھ لگ گئی۔

"ایک حل ہے اس مسئلے کا.... اگر.... اگر شاہم، منصور سے شادی پر راضی ہو جائے۔"

شاہم نے ایک دم، دل پہ ہاتھ رکھ لیا۔

"بالکل اماں!..... صرف شاہم بی بی ہی اُن کی ماں بن سکتی ہیں، کوئی پرائی عورت
۔" ماجدہ نے بھی اماں کی بات پہ اتفاق کیا۔

شاہم منہ پر ہاتھ دھرے واپس چلی گئی۔

شام کو وہ لان میں بیٹھی، خالی آنکھوں سے عمیر اور حمزہ کو کھیلتے اور لڑتے جھگڑتے
رہی۔ وہ ہر پانچ منٹ بعد منہ بسورتے، ایک دوسرے کی شکایت لئے اُس کے
جاتے تو اُس کا ارتکاز ٹوٹ جاتا۔

رات کو مدھم روشنی میں کھڑکی میں کھڑے، ایک ہی آواز اُس کے کانوں میں گونج
ی۔

"اگر شاہم، منصور سے شادی پہ راضی ہو جائے۔"

"دیکھو ماہی! اگر تم نے ڈنر نہ کیا تو میں تین دن بھوک ہڑتال کروں گا۔"

شادی لاؤنج میں ماہی کے پیچھے بھاگتا، آفس جاتے وقت اُس کے گرد بازو لپیٹ کر
ے ماتھے پہ بوسہ دیتا، پل پل اُس کا دھیان رکھتا۔

ب اُس کے ذہن میں دوسرا منظر، ارسل کا جھلک رہا تھا۔ اُس کے ساتھ لڑتا جھگڑتا،
ی باتیں بڑھاتا۔ اُسے اپارٹمنٹ میں پہلی بار جانا بھی یاد آیا۔

"یہ سب تمہارے لئے۔" ارسل کی آواز اُس کے کانوں میں گونجی تھی۔

ارسل نے اُس کو انگوٹھی بھی پہنائی تھی۔ وہ کھڑکی سے ہٹ کر سیف کی طرف آ گئی۔
ے اندر دراز میں اس نے انگوٹھی رکھی تھی۔ دراز کھول کر اس نے انگوٹھی نکالی اور اسے
دیر تکنے کے بعد اُنگلی میں ڈال لی، اپنے ہاتھ کو سینے سے لگائے وہ رو رہی تھی۔

"آئی لو یو سو مچ ارسل!" وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"تم ٹھیک کہتے ہو، اب ہمیں شادی کر لینی چاہئے۔"

وہ ارسل سے مل کر اس سے یہ سب کہنا چاہتی تھی۔ اسے وقت نہیں مل رہا تھا۔ وہ

عمیر اور حمزہ کو پڑھانے بیٹھی تو اُن کی ڈائری میں نوٹس لکھا دیکھا۔ اسکول میں پیر
ڈے تھا۔ اُنہیں بلایا گیا تھا۔

اُس نے رات کو منصور کو بتا دیا۔

''ان کے اسکول میں فرائی ڈے کو پیرنٹس ڈے ہے۔''

''فرائی ڈے کو۔'' اس نے ذہن میں اپنی مصروفیات کا حساب لگایا۔ ''اُس روز
بہت بزی ہوں۔ آ..... ایسا کرنا، تم چلی جانا۔ ویسے بھی وہاں زیادہ تر خواتین ہی
گی۔'' اس نے یہ ذمہ داری بھی شاہم پہ ڈال دی۔

''جی بہتر۔'' وہ سر ہلا کے اُٹھ گئی۔

اس نے سوچا، وہ ان کے اسکول سے فارغ ہو کر ارسل کی طرف بھی چلی جائے
اُسے شادی کے لئے ''ہاں'' کر کے سرپرائز دے گی۔

مگر سرپرائز تو اسے عمیر اور حمزہ نے دے دیا تھا۔ ایسا سرپرائز، جس نے بہت
سب کچھ بدل دیا۔

''ٹیچر! میٹ مائی مدر!'' حمزہ نے اپنی ٹیچر سے اُس کا انٹروڈکشن کروایا۔ وہ
پل، حمزہ کے چہرے سے نظریں ہٹا نہ پائی۔ جبکہ وہ چار سال کا بچہ نادم سا لگ رہا تھا
''نائس ٹو میٹ یو میم! بریلینٹ بٹ ویری نائی بوائز۔'' اسی وقت اسے کسی
ٹیچر نے آواز دے لی۔

''ایکسکیوز می میم!'' وہ اس طرف چلی گئی۔

شاہم گومگو کی کیفیت میں بیٹھ گئی اور حمزہ کے ہاتھ کو پیار سے تھام لیا۔

''آنٹی! حمزہ نے جھوٹ بولا۔ آپ کو برا تو نہیں لگا؟'' عمیر ڈرتے ڈرتے بولا

''نن..... نہیں، آنٹی کی جان!..... آنٹی بھی تو ماں جیسی ہی ہوتی ہے۔'' ا
اس کو سینے سے بھینچ لیا۔

واپسی پہ وہ ارسل کی طرف نہیں جا سکی۔

اس لمحے نے اس کو بدل دیا۔ وہ جو فیصلہ ایک عرصہ سے نہیں کر پا رہی تھی،
بچوں نے کر دیا تھا۔ وہ جو بات سوچنے سے بھی ڈرتی تھی، وہ ان بچوں نے اپنے
ادا کر دی تھی۔

ان دونوں کا ندامت سے جھکا سر اور حمزہ کی آنکھوں کے آنسو، اُس کے ذہن
منظر اٹک کر رہ گیا۔ شاہم سے اجازت مل جانے پر انہوں نے اپنے سب فریڈ



سے ماما کہہ کر متعارف کروایا۔ شاہم کے آگے پیچھے اُڑتے پھرتے وہ بہت خوش تھے۔
وہ گم صم سی ہو گئی تھی۔

اب وہ اکثر راتوں کو روتے گزارتی تھی۔ روتے ہوئے اس نے بائیں ہاتھ کی
بری انگلی میں پہنی انگوٹھی اُتار دی۔ ہتھیلی سے آنسو پونچھتی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ سیف کے
نل لاکر میں اُس نے انگوٹھی رکھ دی۔ آئینے کے سامنے کھڑی ہو کے اس نے چہرہ
اف کیا، پھر بالوں کو پیچھے ہٹاتی وہ باہر نکل آئی۔ منصور کے دروازے پر دستک دیتی، وہ
احساس سے عاری تھی۔

''تم..... اس وقت؟'' آنکھ مسلتے اُس کی حیرت بجا تھی۔

''میں شادی کرنا چاہتی ہوں۔''

''ہاں، تو..... میں نے تو کہا تھا کہ ارسل کو.....''

''میں ارسل سے نہیں، آپ سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔'' اُس نے اُس کی سوئی
کھوں میں جھانک کر کہا۔

☆☆☆

آٹھ بج گئے تھے۔

وہ آویزے پہن کر جلدی جلدی چوڑیوں سے بازو بھرنے لگی۔ میرون اور سلور
تاروں کا کام والا بھاری سوٹ، کاشا اُس کے لئے لایا تھا۔ اپنے لئے شاپنگ کرتے
سے پسند آ گیا اور اُس نے خرید لیا۔ وہ ڈنر پہ غنی کی طرف انوائٹ تھے۔ غنی نے صبح
صبح فون کر کے کہہ دیا تھا۔ کاشا تقریباً روز ہی اُس کی طرف جاتا تھا۔ وہ شادی کے
بعد ایک بار ہی گئی تھی۔ کاشا نے اس سے کہا تھا کہ تیار رہنا، آٹھ بجے پک کرنے
آؤں گا۔

لیٹ ہو جانے کے پیشِ نظر اُس نے جلدی تیاری مکمل کر لی تھی۔ خود کو آئینے میں ہر
زاویے سے جانچ کر اُس نے کلون اُٹھا کر اسپرے کیا، لمبے بال پشت پر کھلے چھوڑ دیئے
تھے۔ چہرے پہ آئے بالوں کو ہٹا کر وہ آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔

بیڈ پہ پڑا بھاری میرون دوپٹہ اُس نے کندھے پہ ڈال لیا۔ اب وہ مکمل تیار تھی۔ کاشا
کا انتظار تھا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ اس نے رات کا کھانا نہیں بنایا تھا۔ بے چینی سے ٹہلتے
اُس نے موبائل کے بجائے لینڈ لائن نمبر سے اُسے کال ملائی۔ بیل جا رہی تھی، مگر کوئی

ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ اُس کے بار بار کال کرنے پر بھی جواب موصول نہیں ہوا۔ جیسے
گھڑی نے نو کا وقت بتایا، فون کی گھنٹی بجی۔

''بھابی! آپ اور کاشا پہنچے نہیں ابھی تک؟'' غنی کے انداز میں انتظار کی کوفت تھی

''میں بالکل ریڈی ہوں۔ کاشف کا پتہ نہیں، وہ کہاں رہ گئے ہیں۔ انہوں نے
تھا، آٹھ بجے آجائیں گے۔ میں بھی ان ہی کا ویٹ (انتظار) کر رہی ہوں۔''

''اسے کال کرلیں۔'' غنی بہت جھنجلایا ہوا تھا۔

''کال کی تھی، وہ ریسیو نہیں کر رہے۔'' اس نے اپنی بے بسی بتائی۔

''اچھا، میں ٹرائی کرتا ہوں۔'' اس نے نفی میں سر ہلاتے فون بند کر دیا۔

اپنی بڑھتی ہوئی بے چینی کو کم کرنے اور اپنا دھیان بٹانے کے لئے فیشن میگزین
لیا۔ صفحے پہ صفحے اُلٹتے اُس کا ذہن باہر سے آتی کسی مانوس آواز کا منتظر تھا۔ میگزین
اُکتا کر اُس نے ٹی وی آن کر لیا۔ بے ہنگم سے میوزک کا فُل والیوم کر کے وہ خو
زبردستی ٹی وی دیکھنے پر مجبور کرنے لگی۔

رات کے گیارہ بج گئے تھے، نہ غنی کی کال دوبارہ آئی تھی، نہ ہی کاشا کی۔

وہ بے بسی، مایوسی اور لاچاری سے ٹی وی آف کر کے ریموٹ دُور اُچھال کر
گئی۔ کمرے کا دروازہ زور سے بند کر کے آئینے کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

اس نے غور سے اپنی آنکھوں میں دیکھا، جن میں شکست خوردگی کی تحریر صاف پ
جا سکتی تھی۔ کاشا کی بے حسی پر اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ ہر چیز تہس نہس کر ڈالے، اپنا
حشر نشر کر لے۔ مگر وہ ایسا صرف سوچ سکتی تھی، کچھ بھی کرنا اُس کے بس میں نہیں
بے اختیار ہی اس کی آنکھوں سے آنسو، گالوں پر بہہ گئے۔ پھر وہ نیچے کارپٹ پہ بیٹ
زور زور سے رونے لگی۔ جب سے کاشا سے جڑی تھی، تب سے ہی ان آنسوؤں کو
کرتی چلی آ رہی تھی، جو آج بہت ضبط کے باوجود بھی نہیں رُکے تھے۔

''میں ان آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔''

بہت دُور سے آتی آواز کی مدھم سی سرگوشی اُس کے کان کے قریب ہوئی۔

اُس نے یک دم سر اُٹھایا۔ دائیں، بائیں ہر طرف۔ مگر یہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔
آواز کو بھلا وہ کیسے پہچاننے میں غلطی کر سکتی تھی۔

وہ کون تھا، جو اُس کی آنکھوں میں آنسو دیکھنے کا متمنی نہیں تھا؟

یہ کون ہے، جو پل پل اسے رُلاتا ہے؟



جو اُس نے کھویا تھا، اس میں بھی اس کی رضا تھی۔

''ان آنکھوں میں اپنے لئے روشنی چاہئے، بہت محبت ہے ان سے۔''

سرگوشی اب اونچی آواز میں بدل گئی تھی۔

''نن..... نہیں..... میں رو نہیں رہی، کچھ نہیں ہوا مجھے۔ کاشف کو کوئی..... کوئی
ضروری کام ہوگا، وہ ایسا نہیں ہے۔''

اُلٹے ہاتھ کی پشت سے گال رگڑتی وہ اس آواز کی گونج سے زیادہ اونچا بول رہی
تھی۔ وہاں کون تھا، جسے وہ یقین دلا رہی تھی؟..... شاید خود کو۔

اُس نے ایک ایک کر کے تمام ہار سنگھار اُتار دیا۔ واش بیسن میں کافی دیر منہ پر پانی
کے چھپاکے مارتی رہی۔ تولیہ صوفے پہ پھینک کر یوں ہی کھڑی خالی بیڈ کو تکنے لگی۔

کاشا کا رویہ اوّل روز سے ایسا تھا، مگر اس حرکت سے اُسے بے انتہا دکھ پہنچا تھا۔
اُس کے اندر بے چینی پھیل گئی تھی۔ نیند اُسے کہاں آنا تھی؟

وہ باہر آ گئی۔ بیرونی برآمدے کی سیڑھیوں پہ پلر سے ٹیک لگا کر بیٹھی وہ کاشا کی منتظر
تھی۔ بہت سی یادیں اُس کے ذہن میں چل رہی تھیں، جو سارا کا سارا ماضی تھا۔ وہ اپنے
ماضی کو یاد کر کے حال کو مزید تکلیف دہ نہیں بنا سکتی تھی۔ وہ یہ قبول نہیں کرنا چاہتی تھی کہ
کاشف سے شادی کا فیصلہ غلط ہے اور اب وہ پچھتا رہی تھی۔ جب حقیقت ایسی ہو کہ جسے
جان کر ہمارا بھرم ہم سے چھن جائے تو اپنی پوری کوشش کرنی چاہئے، جہاں تک ممکن ہوا،
اس حقیقت سے نظریں چرائیں۔ وہ بھی ایسا ہی کرنے لگی۔ ماضی بار بار کبھی یاد اور کبھی
سوالی بن کر سامنے آ کر تن جاتا۔

کاشا کی گاڑی نے پونے دو بجے مین گیٹ کراس کیا تھا۔ یہ اُس کا معمول تھا۔ اُس
نے گھٹنوں میں دیا سر اُٹھا کے اُسے گاڑی کو لاک کرتے دیکھا۔

وہ میڈونا کی دُھن کی وسلنگ کرتا آ رہا تھا۔ اس نے ابھی ماہم کو نہیں دیکھا تھا۔ جیسے
ہی اُس پر نظر پڑی، اُس کا موڈ آف ہو گیا۔

''آج یہاں بستر لگا لیا ہے؟'' وہ روزانہ کی طرح نارمل تھا۔

''کہاں سے آ رہے ہو؟'' اس نے بہت ہمت اور سنجیدگی سے پوچھا۔ کاشا کی مار اور
تمسخر وہ بھولی نہیں تھی۔

''وائے؟'' اُس کی مسکراہٹ یک دم غائب ہو گئی۔ چہرے سے سختی جھلکنے لگی۔

''ہم غنی کی طرف انوائیٹڈ تھے، کاشف!'' اس نے بہت ضبط سے خود کو چیخنے سے

روکا۔ ورنہ کاشا کی اس بے خبری پر اُس کا جی چاہا تھا کہ اس کا وجود ملیا میٹ کر دے۔

''اوہ، فار گیٹ اِٹ یار!..... غنی کی کال آئی تھی، میں نے ایکسکیوز کر لیا تھا۔ ایکچوئلی مجھے لیلیٰ مل گئی تھی۔ اب وہ اتنے عرصہ بعد ملی تھی۔ غنی کا کیا ہے، کل چلے جائیں گے۔''

وہ کسی کا وقت کسی اور کو دے کر آ رہا تھا اور اس نے یہ چھپانے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔

''لیٹ گو اِن سائیڈ یار!'' اپر کو نیچے لٹکا کر ماہم کی حیرت کا نوٹس لئے بغیر وہ اندر کی طرف بڑھ گیا۔

''ہُو اِز لیلیٰ؟'' لاؤنج سے گزرتے اس نے پوچھا۔

''شی اِز مائی گرل فرینڈ۔ شادی کی خواہش مند تھی، لیکن اُس کے فادر نہیں مانے۔ اپنے ٹھگنے سے کزن سے شادی کر کے امریکہ سیٹل ہو گئی۔ اب ڈائیوورس لے کر پھر سے پاکستان شفٹ ہو گئی ہے۔'' وہ تفصیل بتاتے ہوئے کمرے میں آ گیا۔

''ڈائیوورس ہو گئی ہے تو اب کن چکروں میں ہے؟'' اُس نے دانت کچکچا کر استفسار کیا۔ کہنا تو یہ چاہتی تھی کہ تم کن چکروں میں ہو۔ مگر اُسے کاشا کے بھڑک جانے کا خدشہ تھا۔

''جن چکروں میں کبھی تم تھیں۔'' اس کی برجستگی قابلِ توصیف تھی۔

''کیا مطلب.....؟'' اُس نے اُلجھن سے اسے پرکھا۔

''کچھ نہیں یار!..... ڈنر تو تم نے کر لیا ہو گا۔ میں بھی کر کے آ رہا ہوں۔ بس ایک کپ اچھی سی چائے پلا دو، بٹ ود آؤٹ شوگر۔ میں شاور لوں گا۔'' اس نے سستی سے انگڑائی لی، جیسے بہت تھکا ہارا ہو۔

ماہم کو علم تھا، وہ بات ٹال گیا ہے، اب سیدھی طرح نہیں بتائے گا۔

وہ خود کو برداشت سکھاتی مڑی۔

''اسٹاپ ماہم!'' اگلے ہی قدم پہ کاشا نے اسے روک لیا۔

''واٹ اِز دِس؟'' اس کے کھلے بالوں کو ہاتھوں میں پکڑنے وہ استفسار کر رہا تھا۔

''بال ہیں، اور کیا؟''

''تمہارے بال اتنے لمبے ہیں۔'' اب اس کی آنکھوں اور لہجے میں ناگواری تھی۔ ماہم سمجھی تھی کہ اب تعریف کرے گا، کیونکہ اس نے ہمیشہ ہر کسی کے منہ سے اپنے بالوں کے لئے توصیف ہی سمیٹی تھی۔ مگر یہ کاشف حسین عرف کاشا تھا۔ جسے یہ بھی ابھی



ہوا تھا کہ اُس کی بیوی کے بال لمبے ہیں۔

''تمہارا شارٹ کٹ نہیں تھا؟'' بہت پرانی بات کی تھی اُس نے۔

''کئی سال ادھر کی بات ہے۔'' اس نے بے دلی سے اپنے بال اس کے ہاتھ سے چھڑا لئے۔

''مجھے عورتوں کے لمبے بال پسند نہیں۔ پہلی فرصت میں سیلون سے خوب صورت سا ہیئر کٹ لو، میں دوبارہ تمہارے سر پہ یہ چھانگا مانگا نہ دیکھوں، انڈر اسٹینڈ؟..... جاؤ، چائے بناؤ انہیں سمیٹ کر۔ ارٹیٹیشن ہونے لگی ہے مجھے۔''

وہ بول رہا تھا اور ماہم، دم سادھے اسے سن رہی تھی۔ وہ در پردہ اُس کی بے عزتی کر رہا تھا یا اپنی پسند کے سانچے میں ڈھلتے اُسے دیکھنا چاہتا تھا۔ کبھی وہ کاشا کی اس طرح کی باتوں کو ہضم کر کے آسانی سے نظر انداز کر دیا کرتی تھی، اب اسے چبھتی تھیں۔ اُس کی نیندیں حرام کرتی تھیں۔ وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

''گھور کیوں رہی ہو؟'' صوفے پہ بیٹھے، بوٹ اُتارتے ہوئے بھی اسے خبر تھی کہ وہ کھڑی اسے گھور رہی ہے۔

''نہیں، سوچ رہی ہوں، آپ سچے ہیں یا بے حس ہیں۔''

''رئیلی سچ بتاؤں یار!..... میرے حلقۂ احباب میں بہت سے لوگ ایسے ہیں، جو صرف مجھے سوچ سوچ کر کُڑھتے رہتے ہیں۔'' وہ بوٹ اُتار کر اس کے بالکل سامنے آ کھڑا ہوا۔

''کیونکہ..... وہ میرا کچھ بگاڑ تو سکتے نہیں..... تم ہو تو میری بیوی، مگر ان ہی میں سے ایک۔''

''پلیز کاشف! میں آپ کی ہر برائی پہ خاموش رہی مگر..... مگر یہ لیلیٰ نہیں۔'' اس نے آنکھوں میں آنسو لئے نفی میں سر ہلایا۔ وہ جیسا بھی تھا، اُس کا شوہر تھا۔

''برائی.....'' وہ مصنوعی حیرت سے طنزیہ مسکرایا۔ ''سیمز دوز (اُن کی طرح) تم مجھے ابھی اچھی طرح سے جان نہیں پائیں۔ میں تمہیں اپنی بڑی بڑی اچھائیاں بتاتا ہوں۔'' اس نے ماہم کی کمر میں اپنا بازو ڈال کے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ ''میں نے پندرہ برس کی عمر میں سوسائیڈ (خودکشی) کی، بدقسمتی کہ بچ گیا۔ ساڑھے سولہ سال کی عمر میں، میں نے اپنی گرل فرینڈ کے چوکیدار پر قاتلانہ حملہ کیا، کیونکہ اس نے ہمیں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا، بٹ بدقسمتی کہ وہ بچ گیا۔ سترہ سال میں لگتے ہی میں نے فل پلاننگ سے لاکھوں کا کیش

پہلی اور آخری بار چرایا۔ اب تم بتاؤ، کس اچھائی پہ خاموش رہ سکتی ہو، کس پہ نہیں؟"
اس کے کان کے قریب بول رہا تھا۔

"کسی پہ بھی نہیں۔" غصے سے اُس کی سانس پھول گئی۔

"میں پہلی بار زبان سے سمجھاتا ہوں، دوسری بار ہاتھ استعمال کرتا ہوں اور آخر
چانس ریوالور کو دیتا ہوں۔ دو نسخے آزما لئے ہیں تم پہ، آف کورس تم تیسرے کی زحمہ
نہیں دو گی۔"

"تم مجھے مار ہی دو کاشف! جہاں بہت کچھ معاف کیا ہے، وہاں اپنا خون بھی معاف
کرتی ہوں۔" وہ رونے لگی۔

کاشا نے اسے غور سے سنا اور پھر مسکراتے ہوئے اس کا سر اپنے کاندھے سے لگا لیا۔

"نہیں میری جان! روتی کیوں ہو؟ بس اب تم نے مجھے پرمیشن (اجازت) د
دی ہے، میں جلد تمہارا کام کر دوں گا۔"

ماہم کے آنسو رُک گئے۔ بلکہ اس کا سارا جسم ہی کاشا کی بانہوں میں ساکت ہو گیا

☆☆☆

"تم اس قدر جذباتی اور بے وقوف ہو؟ میں نہیں جانتا تھا۔" منصور نے شاہم
رات کہی گئی بات پر بازپرس کے لئے اپنے کمرے میں بلوایا تھا۔

"یہ جذباتیت نہیں، سمجھ داری اور وقت کی ضرورت ہے۔" وہ بے خوفی سے بولی۔

"مجھے، میرے بچوں اور اس گھر کو تمہاری اور تمہاری ہمدردی کی قطعاً ضرور
نہیں۔" منصور نے سختی سے کام لیا۔

اسے رات نیند نہیں آئی تھی۔ اسے شاہم سے یہ سب کلیئر کرنا تھا۔ وہ آفس
نہیں گیا۔

"I cannot imagine (میں تصور بھی نہیں کر سکتا) تم اس حد تک جا
ہو، سو اسٹوپڈ۔" وہ ابھی بھی استعجاب کے عالم میں تھا۔ شاہم کی اتنی دلیری ہ
پریشان کن تھی۔

"کیا اس گھر میں بسنے والوں کو ایک عورت کی ضرورت نہیں؟" وہ وہیں اٹکی تھی۔

"ہے، بالکل ہے۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ وہ عورت تم ہی ہو۔" منصور کو اُس کی ہ
دھرمی پہ غصہ آنے لگا۔



"کیوں؟..... وہ عورت میں کیوں نہیں ہو سکتی؟ میں عمیر، حمزہ اور دعا کے بغیر نہیں
سکتی۔" اس نے خفت سے سر جھکا لیا۔

"میرے معصوم بچوں کو مہرہ مت بناؤ۔ جب ان کی ماں ان کے بغیر جی سکتی ہے تو تم
یوں نہیں؟ اتنا بے وقوف سمجھ رکھا ہے مجھے کہ ایک ہی جگہ سے دوسری بار ڈسوا لوں؟
ب بہن دھوکا دے کر گئی، اب دوسری کو بھی موقع دوں۔ ایک بار گھر ٹوٹ کے جڑا، اسے
ر توڑ دوں؟"

وہ تلخی سے اُونچا بول رہا تھا۔

"آپ کا گھر آپ کی بیوی اور میری بہن نے توڑا تھا، جو تین بچوں کی ماں تھی۔
ر جوڑا میں نے..... آپ کو بکھیرا اُس نے، جسے آپ نے پل پل محبت کا مان بخشا،
ر سمیٹا میں نے۔ بچوں کو جنم اس نے دیا، ممتا میں نے..... ماں کہلوانے کا حق وہ
تی تھی، مگر انہوں نے ماں پکارا مجھے۔ کیوں؟..... اس سب کا جواب ہے آپ کے
ں؟"

منصور نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا، اس نے ہاتھ اُٹھا کر روک دیا۔

"یہ ہی کہیں گے کہ عنقریب شادی کر لوں گا۔ میں یقین نہیں کرتی، آپ کی عنقریب
گی نہیں آئے گی۔ کیونکہ نہ تو پاپا، نہ ہی چاچو کی عنقریب، کبھی آئی۔ آپ سب مرد اچھی
رح سے آگاہ ہیں کہ ایک عورت اپنے شوہر کی دوسری بیوی تو بن سکتی ہے، اپنی سوکن
ے بچوں کی ماں کبھی نہیں۔ وہ شوہر سنبھالے گی، بچے ہرگز نہیں۔ آپ جھوٹ بولتے ہیں
سے، خود سے۔ آپ کبھی شادی نہیں کریں گے۔ لیکن اس حقیقت کو بھی تسلیم کر لیجئے کہ
پ تنہا تین بچوں کی پرورش نہیں کر پائیں گے۔ آپ نہیں جانتے، حمزہ کو بوٹ کے تسمے
ں نہیں باندھنے آتے۔ عمیر کو سوتے میں ڈر لگتا ہے، وہ رات کو کئی بار اُٹھ کے مجھے جگاتا
ہے، یہ تسلی کرنے کے لئے کہ میں اسے چھوڑ کر تو نہیں جاؤں گی۔ دعا رو رہی ہو، میں
سے سینے سے لگا لوں، چپ کر جاتی ہے۔ کسی غلط فہمی میں مت رہیے گا۔ مجھے آپ کی اور
پ کو میری قطعاً ضرورت نہیں، مگر ان بچوں کو صرف ہم چاہئیں۔" اس نے اپنے ہاتھ
ور کے آگے جوڑ دیئے۔

"آئی ریکویسٹ یو، آپ میرا کیریکٹر، آپی سے کمپیئر نہ کریں۔ نہ ہی میرے ماضی کو
کی طور مدِنظر رکھیں۔ ماضی سے انکار نہیں، یہ بھولتا کب ہے؟ ہمیشہ ستاتا رہتا ہے۔ جینا
حال میں پڑتا ہے۔ میں نے بھی ذہنی طور پر آپ لوگوں کے ساتھ رہنے کے لئے خود کو

تیار کر لیا ہے۔ اسی میں ہم سب کی بھلائی ہے۔ صرف لمحہ بھر کے لئے ہم دونوں کو ذاتی فائدے اور خوشیوں سے ہٹ کر ان معصوم سوالوں کو پرکھنا ہے، ان آنکھوں آنسوؤں کو پونچھنا ہے۔ ان چھوٹے چھوٹے بڑھتے ہوئے ہاتھوں کو اپنے مضبوط ہاتھ میں تھامنا ہے، تب ہمیں اپنی ذات اور اس سے وابستہ دکھ بہت چھوٹے اور بے سود گے۔ ہمارا درد صرف ہمارا ہے، مگر ہم نے کسی اپنے کو جان بوجھ کر درد نہیں دینا کسی کی سے وابستہ اُمیدوں کو نہیں توڑنا..... ان سے دوبارہ ماں چھیننے سے پہلے ایک بار ان بھی ضرور پوچھ لیجئے گا۔ پھر وہ جو فیصلہ کریں، مجھے منظور ہوگا۔"

وہ ہاتھوں میں چہرہ گرا کے رونے لگی۔

منصور کی آنکھوں میں بھی نمی تیر رہی تھی۔ وہ جذباتی، بے وقوف لڑکی بہت عقل نکلی تھی۔ وہ شوخ و چنچل، ٹراؤزر شرٹ پہنے، پونی ٹیل جھلانے والی خود غرض اور بے نہیں تھی۔ اس نے جو کچھ بھی کہا تھا، وہ صرف ایموشنل بلیک میلنگ یا میلو ڈرا ڈائیلاگز ہرگز نہیں، ایک سچائی تھی۔ جس کا عملاً ثبوت وہ گزرے کتنے ماہ سے دیتی آ تھی۔ وہ لفظ بہ لفظ سچ بول رہی تھی۔ صرف حمزہ اور عمیر ہی نہیں، دعا بھی اسے ماما کہ پکارتی تھی۔

شیر خوار معصوم بچوں میں قدرتی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ نرم ہاتھوں، محبت و شفق سے لبریز نگاہوں، گرم بانہوں کی پہچان کر لیتے ہیں۔

منصور کیا کہہ سکتا تھا، سب کچھ تو اس نے کہہ دیا تھا۔

☆☆☆

منصور کو یہ سب کہہ دینے کے بعد اگلا سب سے مشکل اور تکلیف دہ مرحلہ، ارسل سامنا کرنا تھا۔ پہلے اس نے سوچا، وہ مر کر بھی ارسل کا سامنا نہیں کر سکتی۔ پھر اُسے خ آیا کہ وہ اس کے علم میں لائے بغیر منصور سے شادی کر لے۔ مگر اتنا وہ جانتی تھی کہ منص ایسا کبھی نہیں چاہے گا، پھر ابھی منصور نے ہاں کب کی تھی؟

ارسل کیا کہے گا؟ اُس کا ری ایکشن کیا ہوگا؟ وہ ٹوٹ پھوٹ جائے گا، اسے سمجھے گا؟ ان تمام سوالوں کو سوچتی تو اعصابی دباؤ بڑھنے لگتا۔ جب وہ قربانی دینے کا فیص کر ہی چکی تھی تو پھر ہر مرحلے پر سوچنا کیا؟

وہ ارسل کے اپارٹمنٹ میں آ گئی۔ بغیر فون کال کئے، صبح کے دس بجے۔ دروازہ



نے ہی کھولا تھا۔

اس سے ارسل کا پوچھ کر وہ لاؤنج میں ہی بیٹھ گئی۔ وہ پہلی دفعہ اس گھر میں اتنا تکلف اور جھجک محسوس کر رہی تھی۔ گھبراہٹ سے اپنی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ بالوں میں انگلیاں پھیرتا وہ اسے دیکھ کر دروازے میں ہی رک گیا۔

"آئی کانٹ بلیو اِٹ، یار!..... ناصر نے بتایا، مجھے یقین ہی نہیں ہوا۔" خمار آلود آنکھوں میں بہت خوب صورت سی چمک آ گئی تھی، جو صرف اس کے لئے تھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح اس کے پاس نیچے کارپٹ پہ بیٹھ گیا۔

"ٹھیک ہو؟" بہت دھیمے سے اس نے دریافت کیا۔

"ٹھیک نہیں، بہت خوش ہوں۔ یُو نو، تم پورے اُنیس دن تیرہ گھنٹے اور..... اوں..... اٹھائیس منٹ اور تیئس سیکنڈ بعد میری آنکھوں میں ٹھنڈک بن کر اُتری ہو۔"

کھڑے کھڑے، گھٹنے پہ بازو جما کے اُس نے رِسٹ واچ سے اسے حساب لگا کر بتایا۔ اس نے حیرت سے اُس کا حساب سنا۔

"اتنا کیلکولیٹ کرتے ہو۔"

"حساب دُوریوں کا رکھا جاتا ہے۔ ملن کی گھڑیوں کو کون گنتا ہے؟"

"سر! ناشتہ بناؤں؟" ناصر نے اسے بیچ میں ہی ٹوک دیا۔

"نہیں، تم رہنے دو۔" اس نے منع کر دیا۔

"پھر تمہارا ناشتہ کون بنائے گا؟" شاہم نے بھنویں اچکا کر پوچھا۔

"تم۔ اور کون؟ جب بھی فون کروں، میں کچن میں تھی، حمزہ کے لئے فلاں چیز بنا رہی تھی، کبھی فلاں کے لئے۔ میں بھی تو ٹیسٹ کروں، کتنی بڑی شیف بن گئی ہو۔"

"اچھا، تم ہاتھ منہ دھو لو، میں کچن میں جاتی ہوں۔"

اسے ارسل کے سامنے بیٹھنا دُشوار لگ رہا تھا۔ اس نے فریج کھولا، ناشتے کا سارا سامان موجود تھا۔ تھوڑا سا گوندھا ہوا آٹا بریانی اور دہی بھی تھا۔ اُس نے آٹا دہی اور آملیٹ کے لئے انڈا نکال لیا۔

پراٹھا ہلکی آنچ پہ تھا، وہ آملیٹ کا آمیزہ پھینٹ رہی تھی کہ وہ بھی آ گیا۔

"اوہ..... مائی گاڈ، شامی!" وہ خوشی سے چلایا۔ سچ اے گریٹ ایفی شینسی یار! میں برملا اعتراف کرتا ہوں، تمہارے سگھڑاپے کا۔ روٹی بنانی بھی سیکھ لی۔" ارسل اسے دیکھ کر اتنا خوش تھا کہ اس کی خاموشی کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ وہ خود ہی چیزیں ٹیبل تک منتقل

کہنے لگا۔

''جہاں اتنا کیا ہے، وہاں تھوڑی سی زحمت اور۔'' اس نے انگوٹھے اور انگلی سے تھ
سا فاصلہ پیدا کیا۔

''کیا کروں؟'' اس نے آملیٹ اس کے آگے رکھا۔

''چائے اور ایپل شیک بھی بنا دو، پلیز۔''

وہ فریج کی طرف پلٹ گئی۔ وہ کرسی کا رخ تھوڑا سا پیچھے شیلف کی طرف موڑ
بیٹھا تھا۔

''تم ناشتہ نہیں کر رہے؟'' قہوہ بناتے وہ ذرا مڑی۔

''تمہاری موجودگی میں، میں اکیلا کھاؤں گا..... امپاسبل۔ محنت تم نے کی۔
ہڑپ میں کر جاؤں؟'' اس نے توجہ دی۔

''میں..... میں ناشتہ کر کے آئی تھی، ارسل!''

وہ کچھ لمحے اُسے تکتا رہا، پھر بے دلی سے لقمہ توڑا۔

''کیا ڈسکس کرنے آئی ہو؟''

بلینڈر میں دودھ ڈالتے ہاتھ تھم گئے۔ وہ اُس کی خاموشی کی وجہ جان گیا تھا۔

''میں شادی کر رہی ہوں۔'' بلینڈر کی تیز آواز میں وہ اتنا اونچا ضرور بولی تھی کہ ا
نے سن لیا تھا۔ اُس کا نوالہ، منہ کی طرف لے جاتا ہاتھ وہیں رک گیا۔

وہ شاہم کی رگ رگ سے واقف تھا۔ اُس کی ان کہی بہت سی پوشیدہ باتوں کا امین
وہ جگ میں سے شیک، گلاس میں انڈیل رہی تھی کہ اس نے کلائی پکڑ لی۔

''کس سے شادی کرو گی؟'' اس کا لہجہ برفیلا ہو گیا تھا۔

شاہم کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی تھی۔ جس حقیقت کے لئے وہ اتنی ہمت
مجتمع کر رہی تھی، وہ پل بھر میں اس تک پہنچ گیا تھا۔

جگ اس کے ہاتھ سے لے کر ٹیبل پہ دھر کے اس کی کلائی چھوڑ کے وہ کھڑا ہو گیا۔

''من..... مص..... منصور سے۔'' اتھل پتھل سانسوں کے بیچ اُس نے نام لیا۔
اُس نے کبھی زندگی میں اس وقت کا تصور نہیں کیا تھا۔

ارسل نے غیر ارادی طور پر ہاتھ اٹھایا اور پوری طاقت سے شاہم کے گال پر
دیا۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ بہت برداشت کے باوجود آنکھوں میں نمی تیر
گئی۔



''اب بولو..... کس سے شادی کرو گی؟'' دھیمے لہجے میں اژدھے کی پھنکار تھی۔

''منصور سے۔'' ذرا بھی کراہے بغیر وہ بولی۔

''منصور سے.....؟''

اس نے شیک سے بھرے جگ کو غصّے سے ہاتھ مارا۔ گلاس، پراٹھے کی پلیٹ سب
جا گرے۔ گلاس اور جگ چکنا چور ہو گئے۔

''پلیز ارسل!..... مم..... میں یہ سب اپنی خوشی سے نہیں کر رہی۔ مجھے منصور
اور انہیں مجھ میں کوئی دلچسپی نہیں۔ ہم دونوں کی صرف عمر میں ہی نہیں، سوچ اور
نے میں بھی بہت فرق ہے۔ میں نے اپنے مفاد اور خوشیوں سے ہٹ کر سوچا ہے۔
اپنے اس فعل اور بدلتی سوچ پر تم سے یا منصور سے شرمندہ نہیں ہوں۔ میں صرف
ل.....''

''میں نے تمہارے اس فیصلے کی تم سے وضاحت نہیں مانگی۔ کیونکہ تم لاکھ وضاحت
ایک بھی مجھے مطمئن نہیں کرے گی۔ میرے وجود کے ریزے نہیں سمیٹے گی۔ کبھی نہیں۔''

اس نے آنکھیں میچ لیں۔ اُس کا چہرہ ضبط کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس کے
ات اور اندر بالکل سنسان ہو گئے تھے۔ اسے اپنے وجود کا سارا وزن، ہاتھوں کے
یے ٹیبل پر منتقل کرنا پڑا۔ کرسی کا سہارا لئے وہ بڑی دقتوں سے کھڑا تھا۔

''کب کر رہی ہو؟''

شادی کا لفظ ادا کرنا آسان نہیں تھا۔

''تم ایسا کیسے کر سکتی ہو؟'' وہ زیر لب بڑبڑایا۔

''بہت جلد۔'' وہ رو رہی تھی۔

کیونکہ وہ صرف اس کے سامنے رو سکتی تھی۔ یہ دنیا کا واحد شخص تھا، جس کے سامنے
وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتی تھی۔ وہ اپنی سگی بہن کے سامنے بھی نہیں روئی تھی۔ وہ
بھی اُداس یا تنہا ہوتی، اُس کا کندھا تلاش کرتی۔ وہ بچھڑ رہی تھی، یہی رونا اُسے آ رہا
وہ بغیر نادم ہوئے یا جھجکے اُس کے پاس کھڑی سر جھکائے روتی جا رہی تھی۔ یہ آنسو
اس نے ہی صاف کئے تھے، جو ضبط کی آخری حدوں پہ کھڑا تھا۔ وہ اپنے آنسو روک
رہا تھا۔ ابھی بھی اس نے ہی آنسو پونچھنے تھے۔ اس نے کف سے اپنے آنسو صاف
کرتے میں اٹکے آنسوؤں کو حلق سے اُتارا۔

''اب..... اب روتی کیوں ہو؟'' کتنا احمقانہ سوال تھا۔

"میں تمہیں چھوڑ رہی ہوں۔ مگر..... مگر بھولوں گی کیسے؟"

یہ بھی اسے بتانا تھا، کیونکہ وہ اپنے ہر مسئلے کا حل اس سے پوچھا کرتی تھی۔

"میں تمہیں خود کو بھولنے ہی نہیں دوں گا۔" اس کی مضبوط دعوے دار سرگوشی ا

اس نے شاہم کا چہرہ اوپر کر کے آخری بار اس کے آنسو پونچھے۔

"جاؤ شامی!..... جتنی جلدی ہو سکے، چلی جاؤ۔ یہ نہ ہو کہ میں تمہیں روک ل
کبھی نہ جانے دوں۔" اس نے شاہم کے چہرے سے نگاہیں چرائیں۔

"بہت سی محبتوں کے قرض ہیں مجھ پہ۔ ان قرضوں کے بوجھ تلے دب گئی
ارسل کی ویرانی اُس کا دل چیر رہی تھی۔ وہ اسے دلاسا دینا چاہتی تھی، جو کسی بھ
بہلنے والا نہیں تھا۔ وہ رو نہیں رہا تھا، پھر بھی روتا معلوم ہو رہا تھا۔

"میں جا رہی ہوں۔" اس نے آخری ہچکی لی۔

"ہاں..... جاؤ۔" اس کی آنکھیں ساکت تھیں۔ وہ آخری بار بھی اسے نہیں
تھا۔

"Unforgivable blunder (ناقابل تلافی نقصان)"

اُس نے اپنے پیچھے اُس کی بڑبڑاہٹ سنی۔ وہ نفی میں سر ہلاتا جا رہا تھا۔ آ
لاک، دروازے کو زور سے بند کرنے پر اس کا سکتہ ٹوٹا۔

وہ مدہوش سا، ٹیبل کی دوسری طرف جہاں گلاس اور جگ کی کرچیاں تھیں، ز
بیٹھ گیا۔

"جب تمہاری ماں کو تم پہ اپنی مرضی مسلط کرنے کا کوئی حق نہیں تو تمہیں بھی
نہیں کہ تم شامی کو روکتے۔"

اس کے اندر سے آواز آ رہی تھی۔ اس کا چہرہ، کانوں تک تپش سے تپ رہا تھ
نے شیشے کی بڑی سی کرچی دائیں ہاتھ میں پکڑ لی جس سے شاہم کو تھپڑ مارا تھا۔

"مجھے کوئی حق نہیں تھا کہ اسے مارتا۔" اُس نے مٹھی زور سے بند کر لی۔

"unforgivable blunder (ناقابل تلافی نقصان)..... نہیں....."

اُس کی ہتھیلی سے خون، اُنگلیوں سے بہہ کر نیچے گر رہا تھا اور وہ مضبوطی
جکڑے جا رہا تھا۔

☆☆☆



رات کے تین بجے کا وقت تھا۔ کمرے میں زیرو پاور کے بلب کی غیر واضح سی
روشنی اور سرد سی خاموشی تھی۔ ساری کائنات، ہُو کے عالم میں ڈوبی ہوئی لگ رہی
تھی۔ رات کے اگلے پہر جب فرشتے بھی سو جاتے ہوں گے، وہ گم صم، شعور سے
بے گانہ جاگنے کی تیسری رات بِتا رہا تھا۔ نیند بہت بے کل سی اس کی کھلی آنکھوں کو
بند کرنے کے لئے کروٹیں بدل رہی تھی، مگر اس کے ماتم کناں وجود کا نیند سے رابطہ
ٹوٹ چکا تھا۔

اس کے کئے گئے پختہ ارادے، سجائے گئے خواب، لاحاصل دکھ اُس کے اندر بین
ڈال رہے تھے۔ متضاد اور متفکر سوچوں کی آماجگاہ بنا بوجھل اور بھاری سر اُس نے بمشکل
اٹھایا۔ خالی خالی آنکھوں سے خود اپنے ہاتھوں سے اُجاڑے ہوئے کمرے کا حلیہ اجنبیت
سے دیکھا۔ بیڈ کی چادر دہری تہری ہو کر آدھی کارپٹ پہ رُل رہی تھی۔ بیڈ اور نیچے
کارپٹ پہ بے بسی اور مایوسی سے پھاڑے گئے تکیوں کی رُوئی، مدھم روشنی میں برف باری
کے نرم گداز گولوں کے رقص کرنے کا منظر پیش کر رہی تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل پہ دھری پرفیومز،
کٹ، اسپرے، کلون، ہیئر برش، لوشن وغیرہ کی سب بوتلیں زمین پر زور سے پٹخنے سے
ٹوٹ چکی تھیں یا یوں ہی اِدھر اُدھر لڑھک گئی تھیں۔ ٹشو پیپر کے بے دردی سے نوچے گئے
ٹکڑے، صوفے اور فلور کشن پر سفیدی جمائے ہوئے تھے۔ اس نے ان دنوں میں بے تحاشا
سموکنگ کی تھی۔ حالانکہ وہ سگریٹ پینے کا عادی نہیں تھا۔ ایش ٹرے، سگریٹ کے ٹکڑوں
سے بھر گیا تھا۔ گلاس ٹیبل، جا بجا راکھ سے اٹا تھا۔

کمرے کا جائزہ لے کر اس نے سر کو دائیں سے بائیں جھٹکا، اپنے پژمردہ اور
تھکن سے بھرے وجود میں بہت سی ہمت مجتمع کرتا، وہ اپنے گھٹنے پر ہاتھ کا بوجھ ڈالتا
اٹھ کھڑا ہوا۔ تین دن بیٹھے رہنے کی وجہ سے اُس کا جوڑ جوڑ دُکھ رہا تھا۔ ملگجی روشنی میں
بکھری چیزوں کو مزید قدموں تلے روندتا وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ کافی
دیر بے یقینی سے آئینے میں اپنے عکس کو تکتا رہا، پھر بلا ارادہ ہی وہ اپنی دونوں کھلی
ہتھیلیوں سے گالوں کو رگڑنے لگا۔ غیر محسوس انداز میں وہ کسی ذہنی مریض کی طرح یہ
عمل بار بار دہرا رہا تھا۔ جیسے اسے کسی اور چہرے کا گمان ہو۔ ایسا کرتے ہوئے اسے
اپنے ہاتھ کے زخم کا بھی احساس نہیں تھا، جس پہ اس نے بینڈیج کی ہوئی تھی۔ اس کی
دونوں ہتھیلیاں چکنی سی ہو گئیں۔ اس نے اپنے چہرے کو آئینے کے مزید قریب لے جا کر
غور سے دیکھا، بھاری گھنیرے بال خاصے اُلجھے تھے۔ اُس کا ہلکا سانولا رنگ، سیاہی مائل

لگ رہا تھا۔ آنکھوں کے پپوٹے رت جگے اور زیادہ اسموکنگ کی وجہ سے سوجے ہو
تھے۔ آنکھیں بے تحاشا سرخ اور ہونٹ سیاہ ہو چکے تھے۔ اس کے جسم پر تین دن
کپڑے چڑھے تھے۔

اُسے یاد آیا کہ وہ تین دن سے بھوکا ہے۔ کئی بار کھانا سامنے لا کر رکھا اور اٹھ
گیا۔ خود کا ہر زاویے سے بے تاثر سا جائزہ لینے کے بعد وہ میکانکی انداز میں وارڈ
کی طرف بڑھ گیا۔ اس کا شعور متحرک سا ہو گیا تھا۔ ہینگر میں لٹکتے کپڑوں کو تنقیدی نظ
سے اُلٹتے پلٹتے اُس نے سیاہ شلوار قمیض منتخب کر لی۔ شاور پوری رفتار سے کھولے
ٹھنڈے پانی کے نیچے پندرہ منٹ کھڑا رہا۔ برفیلا پانی اس کے تازہ گرم زخموں کو ا
نہیں دے رہا تھا۔ ایک طویل غسل لے کر وہ بالوں سے پانی انگلیوں سے جھٹکتا با
باتھ لینے سے اس کا شعور حواس قائم کر چکا تھا۔ کیونکہ اسے بھوکے پیٹ کا احساس
سے جاگا تھا۔ کچن فریج میں رات کا بنایا گیا کھانا پڑا تھا۔ کھانے کے ڈونگے دیکھتے ہی
کا جی پھر سے اُچاٹ ہو گیا۔ ہاتھ میں پکڑا ڈونگا واپس رکھ کے اس نے دودھ کا ڈ
لیا اور چائے بنانے لگا۔ اس دوران اس کے ذہن میں کتنی ہی یادیں اُبھرنے لگی
کسی کا وجود، باتیں، قہقہے، چھیڑ چھاڑ اُسے خود سے بے گانہ کرنے لگے۔ ان تکلی
سوچوں سے فرار پانے کے لئے برنر کی آنچ تیز کر دی۔ دھیان بٹانے کے لئے وہ با
ہی کیبنٹ کھول کھول کر بند کرنے لگا۔ اسے کسی چیز کی تلاش نہیں تھی۔ ایک کیبنٹ
بسکٹ کا پیکٹ نظر آنے پر اس نے اٹھا لیا۔ کھولتی چائے کو مگ میں چھان کر ہاتھ
پکڑے وہ واپس کمرے میں آ گیا۔ کشن درست کر کے وہ اس پر بیٹھ گیا۔ خالی
پیٹ چائے، تیزاب کے مانند لگ رہی تھی۔ اس اذیت کو برداشت کرنے کے لئے
لمحے آنکھیں سختی سے میچ گیا۔ چائے کے سِپ بھرتے اُس کا سامنے دھری بسکٹ کی
پر یا تو دھیان نہیں گیا تھا، یا پھر وہ کھانا نہیں چاہ رہا تھا۔

خالی دل
خالی دماغ
خالی جسم
اور خالی روح

چائے کے آخری گھونٹ تک ان الفاظ کی گردان اس کے ذہن میں چلتی
اچانک کسی کی یاد اُس کے اندر اُبھری تھی۔ وہ جلدی سے مگ رکھ کر بکھری چیزوں



بکھیرتا، اپنا موبائل ڈھونڈنے لگا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد موبائل اسے مل گیا اس
شخصیت سے بات کرنے کے لئے شاید بڑا حوصلہ درکار تھا۔ اس نے اپنے اندر کی گھٹن کو
باہر پھینکنے کے لئے کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیئے اور نمبر ڈائل کرنے لگا۔

"ارسل.....!" دوسری ہی بیل پر کال ریسیو کر لی گئی تھی۔

مطیع الرحمان کی بے تابانہ آواز نے اُس کے اندر کی گھٹن کو خاصا کم کیا تھا۔ رات
کے گزرتے اس آخری پہر میں بھی انہوں نے دوسری بیل پر فون اٹھایا تھا۔ وہ یقیناً
پریشانی میں گھرے، رات بھر سو نہیں سکے تھے۔

جہاں اس کے اندر یہ سکون اُترا تھا کہ ابھی بھی کوئی تو ایسا ہے، جو اس سے محبت کرتا
ہے۔ اس کے انتظار میں رات بھر سے جاگ رہا ہے، وہیں ان کی پریشانی کے خیال نے
سے پشیمانی میں گھیر لیا۔

"بابا..... جانی....." وہ بہت ٹوٹ گیا تھا۔

"ارسل! میری جان..... میرے بیٹے!..... کہاں ہو تم؟ تین دن سے تمہاری شکل
نہیں دیکھی۔" ان کی آواز میں بے چینیاں ہمک رہی تھیں۔

"میں آؤٹ آف سٹی تھا، بابا جانی!" اس نے وہی سابقہ جھوٹ دہرایا، جو ملازم ناصر
بار مطیع الرحمان کی کال آنے پر ان سے بولتا رہا تھا۔ اسے ایسا کہنے کو ارسل نے ہی کہا
ا۔

"اتنا بڑا ہو گیا ہے، مجھے تجھے اپنے بابا سے جھوٹ بھی نہیں بولنا آیا، بے وقوف۔"
کی ڈانٹ میں بھی محبت کی شیرینی تھی۔

"آپ کیسے ہیں؟" کھڑکی کے کھلے ہوئے پٹ سے تھکے ہوئے انداز میں پشت
ٹکا کر اس نے بات ہی بدل دی تھی۔

"جس باپ کا جوان بیٹا تین روز سے بغیر بتائے غائب ہو، اس باپ کی حالت نہ
ہو۔"

"ماما کیسی ہیں؟..... میرا پوچھا تھا؟" اسے یک دم ماں کی یاد بھی آ گئی تھی۔

مطیع الرحمان نے بیڈ پہ خواب خرگوش کے مزے لیتی بیوی کو تاسف سے دیکھا۔ مطیع
رحمان، بیٹے کے لئے اتنے پریشان تھے، انہوں نے سائرہ سے بھی تذکرہ کیا تھا کہ ارسل
بتائے کہیں غائب ہو گیا ہے مگر انہوں نے ارسل کے ہونے یا نہ ہونے کو قطعاً اہمیت
نہ دی تھی۔

"ہاں.....وہ.....تمہاری ماں بھی بہت پریشان ہے تمہارے لئے۔ ابھی تو سو
ہے۔" انہوں نے بہت ٹھہر ٹھہر کر اسے جواب دیا۔ وہ ارسل کا ماں کے حوالے سے دل
نہیں کرنا چاہتے تھے۔ دوسری طرف ارسل کافی دیر پھیکی سی ہنسی ہنستا رہا۔

"آپ بھی اتنے بوڑھے ہو گئے ہیں بابا جانی! مگر آپ کو بھی اب تک جھوٹ
نہیں آیا۔" لہجے میں ہلکی سی شگفتگی لاتا وہ اُن کا جواب اُن ہی کو لوٹا گیا۔ وہ ہمیشہ سے
کو، ماما کو ایسی چھوٹی بڑی فیور دیتے دیکھتا آیا تھا۔

"فیکٹ اِز دِس میری جان! کہ ہم دونوں باپ بیٹا، ایک دوسرے سے جھوٹ
بول سکتے۔" انہوں نے اپنی غلط بیانی کا اعتراف کرتے ہوئے اسے جتایا۔

"ہاں.....شاید۔" اس کی کھوئی کھوئی سی آواز اُبھری۔

"ارسل! تم ٹھیک تو ہو نا۔ کیا پرابلم ہے؟" مطیع الرحمان نے پوچھا تھا۔ جبکہ
کچھ دیر قبل وہ باپ، بیٹا یہ تسلیم کر چکے تھے کہ وہ ایک دوسرے سے کچھ چھپا نہیں سکے
غلط بیانی یا جھوٹ کو جان بوجھ کر نظر انداز کر جائیں، وہ الگ بات ہے۔

وہ باپ کے اس سوال سے بچنا چاہتا تھا۔

"بابا! میں صبح آؤں گا گھر، آپ سے اور ماما سے ملنے۔" اس نے بہت ہوشیا
سے موضوع ان کے من کی مراد کی طرف موڑ دیا۔

"جم جم آؤ۔ تمہارا اپنا گھر ہے میری جان!" اس کے آنے کا سن کر وہ کھل اُٹھے

"بابا! آپ میرا ایک کام کریں گے؟" پتہ نہیں، کیا سوچ کر وہ پوچھنے لگا۔

"تمہیں بھلا پوچھنے کی ضرورت ہے؟ بولو تو سہی۔" انہوں نے بڑے دلار سے کہا

"آپ.....آپ نے مجھے ماما سے معافی دلوانی ہے۔ میں بہت برا ہوں بابا!
نے ماما کا بہت دل توڑا ہے، انہیں ناراض کیا، انکار کیا، اپنی ضد پہ اڑ کر، ان سے دُو
کر بڑی تکلیف پہنچائی ہے میں نے انہیں۔ ماں کے پیروں کے نیچے جنت ہوتی ہے
میں کتنا بدبخت بیٹا ہوں، میں ان کے پیروں میں ہی بیٹھ کر معافی مانگوں گا۔ وہ معا
نہیں کریں گی، ڈانٹیں گی۔ آپ ان سے میری سفارش کریں گے تو ضرور مان جائیں گ
وہ صرف ایک بار میرے تمام قصور معاف کر دیں، میں آئندہ کبھی بھی ان کا کہا
ٹالوں گا، ان کی کسی بات پر انکار بھی نہیں کروں گا۔ وہ مجھے معاف کر دیں گی نا؟
بتائیں بابا!"

مطیع الرحمان بہت خاموشی اور بے یقینی سے ارسل کی بات بغور سن رہے تھے۔



کے چپ ہونے پر انہوں نے سوئی ہوئی بیوی کو دیکھا، جو جتنی دنیا مافیہا سے بے خبر تھی،
اتنی ہی بیٹے سے بھی۔

انہیں یہ سب سنتے اس کے لہجے کی نمی کا بھی بخوبی اندازہ ہو رہا تھا۔ انہیں ارسل کو
کن الفاظ میں تسلی دینی ہے، کیا جواب میں کہیں، وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ بالکل خاموش
تھے۔

"پلیز بابا! بتائیں نا.....چپ کیوں کر گئے؟" وہ تھوڑی دیر ان کے بولنے کا انتظار
کر کے۔ بے قرار ہوا تھا۔

ارسل کی ساری بے قراریاں ان کے اندر سرایت کر گئیں۔

"بس تم آنا ضرور۔ میں تمہیں معافی دلوا دوں گا۔" بمشکل وہ کہنے کے قابل ہوئے
تھے۔ وہ ارسل سے اس کے نم لہجے کا استفسار کرنا چاہتے تھے۔ مگر اسے اچھی طرح
جانتے تھے کہ ٹال جائے گا۔ انہوں نے کل اس کی آمد پر پوچھنے کے خیال سے مزید کوئی
سوال نہ کیا۔

"میں ضرور آؤں گا۔" اس نے اپنی آنکھوں کو رگڑتے کہا۔ "اچھا بابا جان! فون رکھتا
ہوں۔ اب سو جائیے۔ ڈونٹ وری اینڈ آئی لو یُو سو مچ۔"

"سنو، ارسل!" وہ اللہ حافظ کہنے ہی والا تھا کہ وہ بول پڑے۔

"مرد.....مرد رویا نہیں کرتے.....نہیں رویا کرتے میری جان!" یہ کہتے وہ خود رو
پڑے تھے۔

فون بند کر کے وہ یوں ہی، کھڑکی کے پار اندھیرے میں کسی غیر مرئی نقطے کو تلاشتا
رہا۔ ہوا کے دوش پہ سرسراتی آواز اُس کے قریب آ کر رک گئی۔

"اے لڑکی! ایک تو میں تمہیں اس مشکل گھڑی میں رہنے کو اپنی چھت مہیا کر رہا
ہوں، اوپر سے تم مجھے گالیاں دے رہی ہو۔ اب ایک لفظ بھی بولیں تو کھڑکی سے اُٹھا کر
ڈائریکٹ نیچے پھینک دوں گا۔"

یہ وہی کھڑکی تھی۔

اس نے لمبا سا سانس خارج کر کے اس کے دونوں پٹ بند کر دیئے۔ بیڈ کراؤن کی
دراز میں سے اس نے سیاہ رنگ، کی خالی ڈائری، پین نکال لیا۔ وہ اپنے دل میں واویلا
کرتے شور اور جسم میں ماتم کناں بین کا کتھارسس لکھ رہا تھا۔ بنا سوچے سمجھے وہ قلم چلاتا
جا رہا تھا۔

اس طرح لکھنے سے اس کے اندر ہلکی سی طمانیت بھری لہر دوڑ رہی تھی۔ اس نے
ڈائری نہیں دیکھی تھی۔ یہ بھی یوں ہی لا کر رکھی تھی۔

"تم کیا جانو، سزائیں کیا ہوتی ہیں؟
"تمہارے لئے تو یہ اِک فقط لفظ ہے"
تم کیا جانو، سزائیں کیا ہوتی ہیں
دل کو چٹکیوں سے کوئی مسلتا ہو جیسے
روح کو تمہاری، اپنے قدموں تلے روندتا ہو جیسے
خوابوں کو ریزہ ریزہ کرتا ہو جیسے
تم کیا جانو، سزائیں کیا ہوتی ہیں؟
کوئی شرارتی بچہ، تمہارا کھلونا توڑ دے جیسے
کوئی اجنبی، تمہارا ریت کا گھروندا توڑ دے جیسے
"کوئی مہربان یک دم نامہربان ہو جائے جیسے"
کوئی چھت بھی تمہارے سر پر نہ رہے جیسے
کوئی خواب بھی تمہاری نیند میں نہ اُبھرے جیسے
کوئی جذبہ بھی دل میں نہ جگہ پا سکے
تم کیا جانو، سزائیں کیا ہوتی ہیں؟
قید میں کوئی پرندہ سر ٹکراتا ہو جیسے
بلبل کوئی اندھیرے سے گھبراتا ہو جیسے
بچہ کوئی اپنی ماں سے بچھڑ جاتا ہو جیسے
دودھ کا بھرا فیڈر، گر کر ٹوٹ جاتا ہو جیسے
تم کیا جانو، سزائیں کیا ہوتی ہیں؟
روح کو خشک پتوں کے مانند اُڑا دیں
وہ سرد ہوائیں کیا ہوتی ہیں؟
تم کیا جانو، سزائیں کیا ہوتی ہیں؟"

وہ نیچے کارپٹ پر، بیڈ سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ ڈائری لکھنا بھی کتنا عجیب مشغلہ
تھا۔ وہ آخری سطریں بار بار لکھ رہا تھا۔

روح کو خشک پتوں کے مانند اُڑا دیں



وہ سرد ہوائیں کیا ہوتی ہیں؟

ڈائری نیچے رکھ کے اس پہ پین بھی رکھ دیا۔ دونوں گھٹنے کھڑے کر کے کہنیاں ان پہ
ٹکا کے اپنی ہتھیلیاں آنکھوں پہ رکھ لیں۔ وہ رو رہا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا۔

"مرد بھی رویا کرتے ہیں۔"

☆★☆

وہ کافی کے مگ کو پورے ہاتھ کی ہتھیلی میں جکڑے، صوفے پر نیم دراز تھا۔ اُس
قسمت بری تھی کہ آفس سے واپسی پر اس نے کاشا کو کال کی۔ نمبر بزی جا رہا تھ
فراغت سے چھٹکارا پانے کے لئے وہ ریس کورس چلا گیا چھ کا ہندسہ ہمیشہ اس کا لکی
تھا۔ اس کو لے کر وہ زی ٹی وی پہ بیٹھا رہا۔ جب یہاں بات نہ بنی تو غصے اور مایوسی
کنگ کارڈ پہ طبع آزمائی کرنے لگا۔ بارہ بجے تک وہ پچھتر ہزار کا کباڑہ کر چکا تھا۔

گھر آ کر واش روم میں فل شاور کے نیچے آدھا گھنٹہ کھڑا ہو کر اس نے اپنا
دماغ ٹھنڈا کرنے کی اپنی سی کوشش کی۔ سلیپنگ گاؤن لپیٹ کر اسے پینے کا اچا
خیال آ گیا تھا۔ اسکاچ کے دو جام چڑھا کر، کافی پیتے ہی وہ سو جانا چاہتا تھا۔ کافی
آخری گھونٹ تھے کہ سیل فون کی بیل ہونے لگی۔ اسکرین پہ کاشا کے نام نے جلتی پہ
کا کام کیا۔

''کیا تکلیف ہے تجھے، نیند نہیں آتی؟'' وہ غصے میں یہ بھی بھول گیا تھا کہ ابھی م
ڈیڑھ بجا ہے اور کاشا، مرغ کی پہلی بانگ سن کر بستر پہ لیٹتا ہے۔

''اچھا، بات سن! ماہم کے پاس چلا جا۔ وہیں رات ٹھہر۔ سکیورٹی گارڈ چھٹی پہ
اسے ڈر لگ رہا ہے۔ بار بار مجھے ڈسٹرب کر رہی ہے۔'' کاشا نے اپنا مدعا بیان کیا۔

''تم کہاں ہو؟'' غنی کے لئے یہ نئی مصیبت تھی۔

''میں کسی اور کے ساتھ بزی ہوں۔ صبح آ کر ڈیٹیل (تفصیل) بتاؤں گا، ابھی نہیں
کاشا نے کہا۔

''تجھے معلوم ہے کاشا! مجھے اپنے بیڈ کے علاوہ کہیں نیند نہیں آتی۔''

''اسی لئے کہتا ہوں، عادت ڈال۔ کبھی کبھی کہیں اور سو جانے میں ہرج نہیں
اپنی وے، صبح ہونے میں ٹائم ہی کتنا رہ گیا ہے۔ آئی پرامس، سیون او کلاک، آ



''، کاشا نے اپنی کہہ کر جلدی سے فون بند کر دیا۔
غنی، موبائل کو گھور کے رہ گیا۔

''تُو نہیں سدھرے گا، خبیث!''

موبائل، گاڑی کی چابی اور سگریٹ کا پیکٹ اُٹھا کر وہ جانے کے لئے اُٹھ گیا۔ غنی کی
پہ ماہم نے اس کے لئے کمرہ کھول دیا اور خود جا کے آرام سے سو گئی۔

اسے نیند کہاں آنی تھی۔ وہ ساری رات ٹی وی لاؤنج میں بیٹھا چینل بدلتا رہا۔ پونے
ات بجے وہ ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ کاشا اس کے ساتھ وعدے کا پکا تھا۔ ٹھیک دس
ٹ بعد اس کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ غنی نے سلائیڈ ہٹا کر اسے باہر دیکھا۔

''اُٹھ اور ایک چھمی ڈال دے۔'' کاشا نے ڈرائنگ روم کے دروازے میں ایستادہ
زو پھیلائے کہا۔

''نہ، نہ..... مجھے تیری نیت خراب لگ رہی ہے۔'' غنی نے قہقہہ لگاتے اسے چھیڑا۔

''بک نہ۔'' کاشا نے اسے گلے سے لگا لیا۔

غنی نے چند لمحوں میں ایکٹنگ کرتے اسے پھرتی سے خود سے الگ کر دیا۔

''تُو صاف پاک ہے نا۔'' اس نے قریب ہو کر کاشا کو سونگھا۔

''ہٹ ذلیل، خود تو دودھ سے نہاتا ہے۔'' اس نے اسے زور کی دھپ ماری۔

''میری نیند غارت کرنے والے! تیرا آوارہ پن ختم کیوں نہیں ہوتا؟''

''اس گزری رات کی آوارہ گردی نے میرے خوابوں کی تعبیر مجھے دے دی۔''

اتنے میں ملازم ٹرالی گھسیٹتے اندر آ گیا۔ جس میں بوتلیں تھیں۔

''کتنی بار منع کیا ہے یار! نہار پیٹ اس منحوس کو منہ مت لگایا کر۔'' غنی کو اس کے صبح
سویرے پینے سے بہت چڑ تھی۔

''رات لیلیٰ کے ساتھ تھا، سرپرائزنگ نیوز از دِس کہ اس نے مجھے پرپوز کیا ہے۔''
اس نے غنی کو بتایا۔ لیلیٰ کی واپسی کا ذکر اس نے غنی سے بھی کیا تھا۔

''پھر.....؟'' غنی نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

''پھر..... پھر یہ کہ امریکہ جانا میرا خواب ہے۔ اور لیلیٰ کے پاس..... گرین کارڈ ہے،
نیشنلٹی ہولڈر..... پرو پوزل جانے دینے والا تو نہیں۔'' کاشا گھونٹ پہ گھونٹ بھر رہا تھا۔

''اوئے، مت بھول، تُو شادی شدہ ہے اور تیری بیوی زندہ ہے۔'' غنی بے ساختہ
بولا۔

"لیلیٰ سے شادی کر کے امریکہ جانے کا چانس پکا ہے۔"

"لیلیٰ کی مدد کے بغیر بھی امریکہ جایا جا سکتا ہے۔" غنی خاصا سنجیدہ ہو گیا۔

"صرف جایا جا سکتا ہے، مگر سیٹل نہیں ہوا جا سکتا۔ میں اپنے لائف اسٹائل او
اسٹیٹس کو کیسے ریجیکٹ کر دوں؟ نیشنلٹی کے لئے دھکے کھاؤں، محنت مزدوری کروں،
کیوں؟ جب میری لک مجھے گولڈن چانس دے رہی ہے تو میں اسے avail (حاصل
کیوں نہ کروں؟ لیلیٰ لاکھوں ڈالرز کی اونر ہے، وہ سب اپنی مرضی سے میری جھولی میں
ڈال رہی ہے۔ میں ناشکری کیوں کروں؟ اسے لات کیوں ماروں؟"

اس نے کون سا غنی کی ماننی تھی۔ اُس کی اپنی وضاحتیں تھیں۔

"پر کاشا! پیسہ ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔"

"یا، نہیں ہوتا ہو گا سب کچھ۔ کبھی جائزہ لینا غنی! کتے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک
وہ جنہیں لوگ اپنے گھروں میں اپنی حفاظت کے لئے پالتے ہیں۔ وہ مالک کے ٹکڑے کھا
کے اس کی رکھوالی میں لڑتے ہیں۔ دوسری قسم گلی کے کتوں کی ہوتی ہے، ان کے گلے میں
کوئی پٹہ نہیں ہوتا، نہ ان کا کوئی مالک، نہ یہ کسی کے رکھوالے۔ یہ کتے صرف اور صرف
اپنی ہڈی کے لئے لڑتے ہیں۔ میرا شمار ان دوسری قسم کے کتوں میں ہوتا ہے، مجھے اپنی
ہڈی کے لئے لڑنا اور جدوجہد کرنا ہے۔"

وہ بہت تلخ ہو گیا تھا۔ اس کا کہا لفظ لفظ سچ تھا۔

"تُو ناشکرا ہی ہے کاشا!..... کس چیز کی کمی ہے تیرے پاس؟ کیا....."

"کیا ہے میرے پاس؟ وہ ڈالرز کی بھیک، جو میری ماں اپنے شوہر کے چرا کے، اس
سے چھپا کے میرے اکاؤنٹ میں بھیجتی ہے۔ اپنا گھر نہیں ہے میرے پاس۔ وہ گھر، جس
میں اب تُو رہ رہا ہے، وہ بھی اس شخص کا ہے، ابھی..... یہ جو ہائی سوسائٹی کی لڑکیاں
میرے آگے پیچھے منڈلاتی ہیں، سب کچھ مجھ سے چھن گیا تو ایک بھی دُور دُور تک نظر نہیں
آئے گی۔ اس سے پہلے کہ میں اپنی اصلی اوقات میں آ جاؤں، پائی پائی کا محتاج ہو
جاؤں، میں اپنا کوئی بندوبست کرنا چاہتا ہوں۔ ساری زندگی ڈالرز تو نازل نہیں ہوں
گے، آخر اس سلسلے کو کبھی تو بند ہونا ہی ہے۔ میں جو کر رہا ہوں، کرنے دو مجھے۔"

اس کا اپنا موقف بہت مضبوط تھا۔ ایسے معاملات میں وہ کبھی کچھ نہیں سنتا تھا۔ ابھی
بھی غنی کو کچھ کہنا بیکار لگ رہا تھا۔

☆☆☆



گھر واپسی کے لئے وہ ڈرائیو کر رہا تھا۔ بہت سی یادیں، اُلجھنیں، باتیں، قصے اُس
کے ذہن کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔ چوتھا دن تھا وہ ابھی بھی بے یقین ہو رہا تھا کہ
واپسی کا سفر وہ تنہا کاٹ رہا ہے۔ سب کچھ کتنا اچانک ہو گزرا تھا، اسے شک بھی نہ ہوا تھا
کہ اس کی قسمت، منزل کے اتنا قریب لا کر اسے دھوکا دے گی، زندگی اتنی محبت سے اپنا
بنا کر واپس کھینچ لے گی۔ اسے کس سے گلہ کرنا تھا، شاہم سے؟ جسے ابھی بھی وہ درست اور
اپنے ارادے پر صحیح گردانتا تھا؟ قسمت سے یا اس کے لکھاری سے؟ اس کی محبت یا نیت
میں کبھی بھی کھوٹ نہیں رہی تھی۔ اس نے کبھی اپنے رشتے میں جھوٹ کا سہارا نہیں لیا تھا۔
اپنی ذات سے ذرہ برابر بھی زک نہیں پہنچائی تھی۔ پھر ایسا کیوں؟ ان دونوں کے
عمل کی سزا تھی یہ سب؟ جاتے ہوئے وہ بھی رو رہی تھی، یہ بھی رو رہا تھا۔ اس نے یہ
سکھی ہو کر نہیں کیا تھا۔ اس کی اذیت کا اندازہ بھی ارسل کو تھا۔ اس جیسی حساس لڑکی کو
یہی کرنا چاہئے تھا۔ اگر وہ اس کی جگہ ہوتا تو وہ بھی یہی کرتا۔ ان دونوں لاپروا اور
نڈرے نظر آنے والوں کی سوچ اتنی سطحی نہیں تھی۔

شاہم کے کردار پر شک تو اس نے ماہم کی حرکت پر بھی نہیں کیا تھا، اب کیونکر کرتا؟
اس نے کہا تھا کہ وہ یہ سب، بچوں کی خاطر کر رہی ہے تو سچ کہہ رہی ہو گی۔ ان کی
کی کا سبب یہ بچے ہی ہوں گے۔ خواب جب ٹوٹیں تو نیند کیوں نہیں آتی؟ اس نے
سوچا تھا۔ زندگی کو کہاں سے شروع کرنا ہے، کیسے جینا ہے، اسے کیسے بھولنا ہے؟
لاتعداد سوالات تھے اور جواب ندارد۔

اسے شاہم سے کی گئی پہلی ملاقات یاد آنے لگی۔

وہ یونیورسٹی کسی کام سے آیا تھا۔ کھانے کا وقفہ تھا۔ آفس میں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ
گزاری کے لئے درختوں کے جھنڈ میں بنچ پر آ بیٹھا تھا۔ تب نظر اس لڑکی پر پڑی تھی،
پریشانی کے عالم میں اِدھر اُدھر گھوم کر کچھ تلاش کر رہی تھی۔ کبھی بیگ کھول کر دیکھتی،
اِدھر اُدھر دیکھنے لگتی۔ اس سے رہا نہ گیا۔

"ہیلو..... ہیلو..... ایکسکیوز می میم! اینی پرابلم وِد یُو؟" اس کے بار بار پکارنے پر
نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ چند ساعتوں کے لئے وہ مبہوت رہ گیا تھا۔ سفید مرمریں
، آنکھوں میں ہلکی سی نمی، کھلے بالوں نے آدھا چہرہ چھپایا ہوا تھا۔

"کیا ہے؟" وہ جتنی خوب صورت تھی، بولی اتنا ہی برا تھی۔

"آپ کو کوئی پریشانی لاحق ہے؟" وہ ذرا سہم سا گیا۔

''آپ کو کیا تکلیف ہے؟'' وہ کافی درشتی سے بولی۔

''مجھے تو تکلیف نہیں ہے۔ میں تو آپ کی تکلیف رفع کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ جانے کیوں اتنی تسلی سے تھا۔ وہ اس یونیورسٹی کا اولڈ اسٹوڈنٹ تھا۔ اپنی تعلیم مکمل کر چکا تھا۔ یونیورسٹی کسی کام سے آیا تھا۔

''دیکھیں، آپ اپنے کام سے کام رکھیں۔ میں آل ریڈی ڈسٹرب ہوں۔''

''کیوں ڈسٹرب ہیں؟ یہ ہی تو جاننا چاہتا ہوں۔''

اس نے آنکھوں میں آتی نمی کو ہاتھ سے رگڑا۔

''یہ ٹشو پیپر لے لیں۔'' اس نے جیب سے ٹشو نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے خفیف سا ہوتے بڑھا ہوا ٹشو پیپر پکڑ لیا۔

''اب بتائیں، مسئلہ کیا ہے؟'' اس نے دوبارہ اتنی نرمی اور توجہ سے پوچھا کہ اس نے بتانا شروع کر دیا۔

''صبح منصور بھائی نے ایک ہزار دیئے تھے، کورس کی دو بکس کے لئے۔ پیسے کہیں گر ہو گئے ہیں یا پھر کسی نے نکال لئے ہیں۔''

''پھر کیا ہوا؟ بھائی کو بتا دینا۔'' اتنی سی بات پر اتنی پریشانی کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی تھی

''نہیں، وہ کیا سوچیں گے کہ میں اتنی غیر ذمہ دار اور لاپرواہوں۔'' اس نے اپنا بتایا۔

''آپ کو پتہ ہے، میں صبح ناشتہ نہیں کرتی۔ یونیورسٹی سے کچھ کھا لیتی ہوں۔ میں سے بھوکی ہوں۔'' اچانک اپنی بھوک کا بھی احساس ہوا تھا۔

''وہی بھائی، بھابی کا مسئلہ..... ظالم بھابی، بھائی بیوی کا غلام، زن مرید۔ مظ بے چاری بہن۔''

''یہ..... یہ آپ کیا کہتے جا رہے ہیں؟'' اس نے اس کی غلط فہمی کو رد کر دیا۔

''آپ کی امی بے چاری تو پھنس کے رہ گئی ہوں گی، بہو اور بیٹی کے بیچ۔ آپ ابو زندہ ہیں؟'' وہ بلا تکان ہانکتا جا رہا تھا۔

''پلیز چپ کریں۔'' اس نے ہونٹوں پہ انگلی رکھ کے اسے چپ کروایا۔

''میرا کوئی بھائی نہیں ہے، ہم صرف دو بہنیں ہیں، منصور بھائی میری سسٹر کے ہز اور میرے چچا زاد ہیں۔ میرے پیرنٹس کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔'' اس کے بولنے کے نظر اس نے ایک ہی سانس میں اپنی بات پوری کی۔



''اوہ..... ایم سو سوری۔'' اسے حقیقتاً افسوس ہوا۔

وہ یوں پہلی بار کسی لڑکی کے اتنا قریب بیٹھا تھا۔ شاید اس کے اندر کچھ بدلا تھا۔

''منصور بھائی بہت اچھے ہیں، پھر بھی مجھے دوبارہ مانگتے شرم آئے گی۔ وہ واپسی پر س کا ضرور پوچھیں گے۔'' اسے پھر سے کتابوں کی پریشانی ستانے لگی۔

''ماہم باجی تو مجھے پہلے ہی لاپرواہ کہتی ہیں۔''

''آپ ایسا کریں، مجھ سے لے لیں۔ جب پاکٹ منی ملے گی، لوٹا دیجئے گا۔'' اس نے سارے مسئلے کا آسان سا حل بتایا۔

''اچھا.....؟'' وہ سوچ میں پڑ گئی۔

شکل سے وہ کافی معقول اور شریف سا ہی لگ رہا تھا۔

''میں آپ کو اُدھار دے رہا ہوں، واپس کر دیجئے گا۔''

''مجھے پانچ دن بعد پاکٹ منی ملنا ہے، میں لوٹا دوں گی۔''

''بالکل ٹھیک ہے۔'' اس نے کہتے ہوئے والٹ میں سے ہزار کا نوٹ نکال کر اس طرف بڑھا دیا اور نظریں اس کے صبیح چہرے پہ ٹکی رہنے دیں۔

''کافی ہیں۔'' شاہم نے جھجکتے ہوئے ہزار کا نوٹ پکڑ لیا۔

''کافی نہیں، بہت کافی ہیں۔'' وہ پھر سے بڑبڑایا۔

''میں..... جاؤں؟'' وہ بالوں کو چہرے سے ہٹاتی، کتابیں سمیٹ کر نہ جانے اس سے پوچھ رہی تھی یا بتا رہی تھی۔

''اتنی جلدی تو فرار مت ہو..... مم، میرا مطلب ہے، جاؤ۔'' پھسلتی زبان پر قابو پا کر اس نے بے دلی سے کہا۔

''پانچ دن بعد۔'' چلتے چلتے اس نے یاد دہانی کروائی۔

''ٹھیک اسی جگہ..... پانچ دن بعد، بھولنا نہیں۔'' اسے اپنی گہری نظروں میں قید کرتے وہ ٹھہر ٹھہر کر بولا تھا۔

اس کی حالت کبھی ایسی نہیں ہوئی تھی۔ لڑکیوں کے معاملے میں وہ بہت محتاط تھا۔

اگلے دو دن اس نے پوری سچائی سے، خود سے اعتراف کر لیا تھا کہ وہ بے نام لڑکی اس کے لئے بہت خاص ہے۔ تیسرے دن اس نے اسے لائبریری کے کوریڈور میں جا لیا۔

''رُکو..... ایک سیکنڈ، میری بات سنو۔'' وہ بھاگتا ہوا اس کے سامنے راستہ روکے آ کھڑا ہوا۔

''جج.....جی۔'' شاہم گھبرا گئی۔

''دو دن نظر نہیں آئیں۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کے پاگل ہو گیا۔ اب صبح سے تعاقب کر
ہوں، رُکتی نہیں ہو۔ ٹانگیں ہیں یا سپرنگ، چلتی جاتی ہو، چلتی جاتی ہو۔'' اپنے پھو
سانس کو بحال کرنے کے ساتھ وہ بولتا بھی جا رہا تھا۔

جب کہ وہ اور اُس کی دوستیں بے حد حیرانی سے اس کے اندازِ تخاطب کو ملاحظ
رہی تھیں۔

''یہ کون ہے شام؟'' اس کی ساتھی دوست نے کندھا مار کر پوچھا۔

''یہ.....یہ.....'' شاہم کی سوئی اٹک گئی۔

اس کے ہوائیاں اُڑے چہرے کو دیکھ کر وہ پھر سے اسٹارٹ ہو گیا۔

''میں ان کا کزن ہوں۔ بتاؤ نا شامی!'' اس نے اپنے جھوٹ میں شاہم کو بھی گھسیٹا

شاہم اُس کے اس رویے پہ بے ہوش ہونے کے قریب تھی۔ وہ کس طرح بات۔
بات نکالتا جا رہا تھا اور کتنے مزے سے اسے شاہم سے شامی بنا ڈالا تھا۔

''تم نے اپنے اس کزن کا ذکر کبھی نہیں کیا۔'' ایک دوسری لڑکی نے دلچسپی سے ار
کو دیکھا۔

''کیوں، میں کیا امریکی صدر کا مشیر ہوں، جس کا ہر کسی سے تعارف کروانا ضرور
ہے؟''

''ہاں بولو، کیا بات ہے؟'' شاہم نے اسے اپنی دوست سے اُلجھتا پا کر بات سنبھا
چاہی۔ شاہم اس پہلی ملاقات اور اب اس موجودہ صورتِ حال سے جان گئی تھی کہ ا
بے جا، لمبی بات بڑھانے کی عادت ہے۔

''بات تو بہت ضروری ہے، سب کے بیچ نہیں، الگ آؤ نا۔'' اس نے ہاتھ ا
آنکھوں سے پرے جانے کا اشارہ دیا۔

شاہم خود پر ضبط کرتی، فرینڈز سے معذرت کر کے اس کے ساتھ آ گئی۔

''میں نے پانچ روز کا پرامس کیا تھا، تم تین دن بعد ہی کیوں ٹپک پڑے ہو؟'' تنہا
ملتے ہی وہ اس پر برس پڑی۔

''میں نے تم سے پیسے مانگے ہیں؟'' وہ اُلٹا اس سے پوچھ رہا تھا۔

''تو پھر کیا پرابلم ہے؟''

''پرابلم۔'' اس نے سر کھجاتے لفظ دہرایا۔



''ہاں۔'' یاد آنے پر اس نے اُلٹی ہتھیلی کی سیدھے ہاتھ پر تالی بجائی۔

''جب سے تم سے ملا ہوں، ٹھیک سے نیند نہیں آتی۔ دل کی دھک، دھک، دھک
ں سے ہٹ کر تیز ہو گئی ہے اور.....اور جسم بے جان رہنے لگا ہے۔''

اس نے اپنی کیفیت اتنے بھونڈے انداز میں بیان کی تھی کہ شاہم کا جی چاہا کہ اس
کے بال نوچ ڈالے۔

''جسم بے جان ہونا، بی پی شوٹ کر جانے کی علامت ہے۔ تم بلڈ پریشر کے مریض
ہو۔''

''اور.....اور میرا دل دھک، دھک.....دھک، دھک۔'' اُس نے اپنے دل پر
ں انداز میں رکھا، جیسے ہارٹ اٹیک ہو گیا ہو۔

''کسی ہارٹ اسپیشلسٹ سے کنسلٹ کرو، دل کا والو بند ہو گیا ہو گا۔'' اس نے مزید
ورہ دیا۔ ''پیسے تمہیں دو دن بعد ملیں گے۔ کچھ خاص کہنا ہے تو کہو، ورنہ میں جا رہی
'' وہ سچ مچ مڑ گئی۔

''ہاں، خاص ہی کہنا ہے۔ بلکہ بہت خاص.....وہ کیا ہے نا، مجھے.....مجھے تم سے،
ہو، یار! بس.....اتنی سی تو بات تھی۔ تھوڑی سی جرأت چاہئے تھی۔ یوں ہی تو باؤلا
نا۔ کچھ بھی نہیں ہوا۔''

نی بات کہہ کر وہ فرضی کالر جھاڑتا، خود ہی اپنا کندھا تھپتھپا کر خود کو داد دے رہا تھا۔
برت سے ہونقوں کی طرح منہ کھولے اس سرپھرے کو تکتی رہ گئی۔

''کیا کہا تم نے؟'' اس نے غصے سے اس کی طرف اُنگلی سے اشارہ کیا۔

''کیا پھر سے کہوں؟.....دوبارہ سننا چاہتی ہو؟'' وہ بڑی تسلی سے مسکراتے ہوئے
ا تھا۔

''جسٹ شٹ اپ۔ میں تمہیں مار دوں گی، فضول انسان!'' وہ غصے میں اس کے
چھے کو لپکی۔

سامنے سے آتی گاڑی سے اُس کی ٹکر ہوتے ہوتے بچی۔ وہ اپنے خیالات سے
ور ہا آیا۔

''مار ہی تو دیا ہے تم نے مجھے۔'' نم آنکھوں سے وہ بڑبڑایا۔

سے دکھ تھا کہ شاہم نے اسے سمجھنے میں بہت غلطی کی ہے۔ وہ اتنا آگے کا سوچنے
ہلے اسے ایک بار کہتی تو سہی، اسے کب بچوں سے انکار تھا۔ وہ اپنی کمٹ منٹ کا پکا

تھا۔ اس نے اپنی ماں، گھر کو چھوڑ دیا تھا، شاہم سے کیے کیے وعدے نہیں توڑے
اب شاہم کو کوئی عہدہ دے کر، کیونکر وہ نہ نبھاتا۔

شاہم کی بے بسی، مجبوری اور دکھ اس نے تب بھی اپنا ہی دکھ جانا تھا، جب و
کے سامنے آنے سے کتراتی تھی۔ جب اسے زمانے کی رسوائیوں کا اندیشہ تھا۔ وہ گھ
ایک کمرے تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ لوگوں سے ملنے سے کتراتی تھی۔ تب
واحد شخص تھا، جس نے اسے دلاسا دیا تھا۔ اس سے کسی بھی قسم کی وضاحت نہ مانگی
لفظ تک سننے کا روادار نہیں تھا۔ اس روتے، نڈھال وجود کو سمیٹا۔ اگر تب یہ ہی شخص
کے بارے میں مشکوک ہو جاتا تو وہ کیا کرتی؟ شاید مر ہی جاتی۔ اس ایک کا شک
نفرت ساری دنیا پہ بھاری تھی۔

جیسے اب ارسل سے اس کے شک کا بھار برداشت نہیں ہو پا رہا تھا۔ ارسل
کیا کیا تھا کہ اسے لگا کہ وہ مستقبل میں اسے اپنا ہم سفر منتخب کر کے بہت سی رکاو
باعث بنائے گا۔ وہ کیوں اسے بچوں اور اپنے بیچ دیوار لگنے لگا تھا۔

وہ اس سے ہفتوں ملنے نہیں آتی تھی، اس نے بھی کبھی اصرار نہیں کیا۔ و
اوقات مصروف ہوتی، اس کی کال ریسیو نہ کر پاتی۔ وہ لاتعداد بار ٹکرائی کرتا، شکوہ ت
اس کی نوکِ زبان پہ نہ آتا۔ اس گفتگو کا زیادہ حصہ صرف بچوں کے نام ہو جاتا، وہ
اور مسکراہٹ سے سب سنتا۔

"شاہم کتنی بدل گئی ہے۔" اس نے بہت بار یہ سوچا تھا۔ اسے پہلے والی
ڈھونڈنے سے بھی نہ ملتی۔ کبھی کبھی اسے شاہم کی یہ تبدیلی اچھی لگتی تھی۔ بہت ذ
مستقل مزاج، گرہستن سی شاہم۔ اس حادثے نے اسے کیا سے کیا کر دیا تھا۔ ورنہ
تو سوچتا تھا کہ شادی کے بعد مجھے، اسے انگلی پکڑ کر سب سکھانا پڑے گا۔ مگر اس ا
نٹ کھٹ، رونے دھونے والی لڑکی نے اپنی سوچ اور مرضی سے کیا کیا کچھ سیکھ لیا
منصور جان پایا، نہ ہی ارسل۔ اس نے زندگی کی تلخیوں کو اس رُخ سے کب محسو
شروع کیا، ارسل کو خبر کیوں نہ ہو سکی؟ وہ تو اپنی ہر بات، ہر سوچ، ہر خواہش تک ا
شیئر کیا کرتی تھی۔ ان تینوں میں سے بے خبر کون تھا؟

شاہم غیر محسوس انداز میں بچوں کے قریب ہوتی چلی گئی۔ ان پہ محبتیں نچھاور
اسے بہت سے قرض اور قرض دار یاد آ گئے۔ منصور نے شاہم کی اس قدر توجہ
دھیان بٹا لیا۔ وہ غفلت برتنے لگا تھا اور ارسل.... شاہم کے منتظر ارسل کا کہاں، کیا



ا تھا؟ شاہم کی محبت کا وہ بھی حق دار تھا۔ اس نے اپنے قرض داروں کی فہرست میں
ے اس کا نام کیوں خارج کر دیا؟ یا وہ سمجھتی تھی کہ میں نے بھی ارسل سے محبت کر کے حق
کر دیا۔ اس سارے قصے میں گھاٹا کس کے کھاتے میں آیا؟ گھاٹے میں کوئی بھی رہا
خالی ہاتھ، خالی دل تو ارسل رہ گیا تھا۔

اس نے اپنی ہتھیلی سے آنکھ کی نمی رگڑی تھی اور یہ ہی وہ پل تھا، جب سامنے سے
ے ٹرالر نے اس بے خبر مدہوش کو کچل ڈالا تھا.....!

☆☆☆

مطیع الرحمان اور سائرہ رحمان، ارسل کا انتظار کر رہے تھے۔ مطیع الرحمان نے سائرہ
رات، ارسل سے ہونے والی ٹیلی فونک گفتگو کا بتایا تھا۔ وہ تب سے اندر ہی اندر بہت
ں تھیں۔

ارسل کتنے عرصہ سے گھر سے نکلا، ان سے ناراض تھا۔ انہوں نے بھی اسے منانے
کوشش نہیں کی تھی۔ اب مطیع الرحمان کے منہ سے معافی کا ذکر سن کر انہیں یقین تھا کہ
ہ انہونا ہو گیا ہے۔ ورنہ وہ ارسل کو اچھی طرح جانتی تھیں۔ وہ باپ کا لاڈلا، راج
را۔ اُسے بھلا ماں کی یاد کیسے آ گئی۔ سائرہ رحمان نے اپنی آج کی تمام مصروفیات
سل کر دی تھیں۔ وہ پہلی بار اتنی بے تابی سے ارسل کے انتظار میں مطیع الرحمان کی
رکی شریک تھیں۔

"سائرہ! میں پھر بتائے دیتا ہوں، ارسل کی طبیعت مجھے کچھ بہتر محسوس نہیں ہو رہی
ا۔ تم کچھ بھی اس کے مزاج کے خلاف نہیں کہو گی اور..... اور اگر وہ معافی مانگے تو
ف کر دینا۔ آخر وہ بھی بیٹا ہے ہمارا۔"

مطیع الرحمان نے کوئی ساتویں بار سائرہ رحمان سے یہ سب کہا۔

"آپ بھی حد کرتے ہیں مطیع! اتنی سمجھ تو مجھے بھی ہے۔ میں بھلا اسے کیوں معاف
ں کروں گی؟ غلطیاں بچوں سے ہو جاتی ہیں۔ والدین کو اپنا دل اور ظرف وسیع کرنا
ا ہے۔ وہ میری اولاد ہے۔" انہوں نے نہایت سنجیدگی سے انہیں رام کیا۔

ارسل سے مطیع الرحمان جتنا تو نہیں مگر پیار تو وہ بھی کرتی تھیں۔

"ابھی تک پہنچا نہیں۔ آ جانا چاہئے۔" مطیع الرحمان کو یک دم بے چینی نے گھیر لیا۔
موبائل پہ اس کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

"کیا ہوا؟..... پک نہیں کر رہا؟" سائرہ نے اُٹھ کر، اُن کے قریب آ کر پوچھا۔

''موبائل آف کیوں ہے؟ عجیب لڑکا ہے یہ بھی۔ کہیں پھر سے غائب نہ ہو جائے
انہوں نے موبائل بند کر کے جیب میں ڈال لیا۔

''مطیع! آپ معاذ کو کال کریں، وہ آ جائے۔ پتہ نہیں کیوں، میرا دل بہت گھبرا
ہے۔'' وہ بھی ہاتھ مسلنے لگی تھیں۔

انہیں اپنی اس عجیب ہوتی حالت میں بڑے بیٹے کا خیال آیا۔

''ڈونٹ وری، آتا ہی ہو.....''

اُن کی بات منہ میں ہی رہ گئی۔ باہر کسی انجان گاڑی کا ہارن بجا۔ چوکیدار نے با
کر دیکھا۔ چند لمحوں بعد گیٹ وا کر دیا۔

سائرہ اور مطیع الرحمان اتنے میں باہر آ گئے تھے۔ گیٹ سے ایمبولینس داخل ہو
تھی۔ ان دونوں نے حواس اُڑے چہروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ چوکیدار، دوسکیو
گارڈ اور مالی سب ایمبولینس سے سفید چادر کے نیچے وجود کو تھامے ان کی طرف
رہے تھے۔ ان سب کے سر کسی بوجھ تلے جھک گئے تھے۔ سفید چادر سے ڈھکا وجود
مطیع الرحمان کے سامنے رکھ دیا گیا تھا۔

''کک..... کک..... کیا ہے یہ؟'' انہوں نے انگلی سے ایمبولینس کی طرف اشارہ
''یہ..... یہ کیا ہے؟ کک..... کون ہے یہ؟'' ان سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

وہاں موجود کوئی بھی کچھ بھی نہیں بولا۔

''مم..... مطیع! آپ معاذ کو کال کیوں نہیں کرتے؟ وہ.....'' سائرہ ابھی بول
رہی تھیں کہ کھلے گیٹ سے معاذ کی گاڑی انٹر ہوئی۔ وہ بہت تیزی سے گاڑی سے
اس کے حواسوں سے بھی لگ رہا تھا کہ اسے یہ خبر مل چکی ہے۔

''معاذ!..... میرے بیٹے!'' سائرہ اُس کی بانہوں میں سما کر رونے لگیں۔

''مم..... معاذ! یہ.....'' مطیع الرحمان کی آنکھوں اور آواز میں نمی تھی۔

''پلیز ماما جان!'' معاذ، ماں کو نرمی سے خود سے الگ کر کے باپ کی طرف بڑھا
''پاپا.....!'' اس نے باپ کو ساتھ لگاتے، تھوڑا سا جھک کر سفید چادر کو چہرے
ہٹا دیا۔

''نہیں۔'' انہوں نے بڑے بیٹے کے سینے میں منہ چھپا لیا۔

''مطیع! آ..... آپ نے کہا تھا کہ ارسل آ رہا ہے، مجھ سے ملنے..... معافی مانگ
آپ..... آپ نے مجھ سے کبھی جھوٹ نہیں بولا، پھر اب کیوں؟..... میرا ارسل کہا



؟ وہ کیوں نہیں آیا؟..... ارسل! اُٹھ میرے لعل! تیری ماں تڑپ ہی ہے، تجھے سینے
لگانے کے لئے۔ اتنی بھی ناراضگی کیا بیٹا! ماں سے بولے بغیر ہی چلا جائے گا؟''

سائرہ نیچے گر کر بہت بے دردی سے رو رہی تھیں۔ وہ اسے جھنجوڑنے لگی تھیں۔

''ماما جان! سنبھالیں خود۔ پلیز ایسا مت کریں۔''

معاذ، باپ کو چھوڑ کر اب پھر ماں کو سنبھالنے لگا تھا۔ اس نے سائرہ کے دونوں بازو
بوطی سے پکڑ لئے۔ مطیع الرحمان دو تین قدم لڑکھڑائے اور زمین پر ڈھے کر دھاڑیں مار
کر رونے لگے۔

☆☆☆

آج صبح سے ہی اس کے پورے جسم میں یک گونہ خاموشی کا بسیرا تھا۔ ایسے، جیسے
رتک صحرا میں ڈیرے ڈال لئے ہوں۔ تا حدِ نگاہ دُھندلا سا غبار ہی غبار ہو۔ عمیر اور حمزہ
اسکول بھیجا۔ انہوں نے اس سے کیا باتیں کیں، کس چیز پہ بے جا ضد کی، ان کے لنچ
ا کیا تھا..... اُسے کچھ خبر نہ ہوئی۔ دعا کو نرم غذا کھلا کے ماجدہ کے حوالے کر کے وہ
پنے کمرے میں آ گئی۔ کمرے میں چکر لگاتے اس کی سوچ اور ہاتھ ہلکے ہلکے کپکپا رہے
ے۔ اس کا سر بھی بھاری ہو رہا تھا۔ اس نے پین کلر لینے اور چائے کا کپ پینے کا ارادہ
ا تاکہ اس سر درد سے جان چھڑائی جا سکے۔ اس نے دروازے کے ہینڈل پہ ہاتھ رکھا
تھا کہ اس کا موبائل بجنے لگا۔

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اسے موبائل کی بیپ کبھی اتنی منحوس نہیں لگی تھی، جتنی ابھی
ا رہی تھی۔ گومگو کی کیفیت میں گھرے اس نے دھیرے دھیرے قدم واپس بڑھائے۔

''ہیلو!'' کافی توقف کر کے اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

اور جو کچھ اس کی سماعت سے گزرا، وہ اس کی ہمت سے بہت زیادہ تھا۔ زندگی کی
ل ناہموار مسافت پہ وہ بہت بری طرح لٹ گئی تھی۔ قربانی کی نیت اس نے باندھی تھی،
کیوں خود کو قربان کر گیا تھا۔ زندگی سے اس نے نظریں چرائی تھیں، اور وہ منہ ہی پھیر
لیا تھا۔

وہ فون پھینک کر تیزی سے بھاگی۔

ارسل کے گھر کا پتہ اسے معلوم تھا، مگر اندر جانے کا حوصلہ وہ کہاں سے لاتی؟
مطیع الرحمان نے اسے خود کال کی تھی۔ انہوں نے اسے ارسل کے آخری دیدار کے
لئے بلوایا تھا۔ وہ ارسل کی میت کو شاہم کی روتی نگاہوں سے محروم نہیں رکھنا چاہتے تھے۔

شاہم کی محبت کا اتنا حق تو بنتا تھا۔

گھر سے تھوڑی دُور اس نے گاڑی روک دی۔ باہر لاتعداد گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ابھی بھی بہت سے رشتے دار آ رہے تھے۔ مرد زیادہ تر باہر ہی حزن و ملال میں گم کھڑے تھے۔ بہت رش تھا۔

اس کے موبائل کی بیپ پھر سے ہونے لگی۔ مطیع الرحمان کا نمبر تھا، وہ اسے اندر چاہتے تھے۔ اس نے فون کاٹ دیا۔ وہ اندر نہیں جا سکتی۔ وہ بہت دفعہ ٹوٹی تھی اور بکھر گئی تھی۔ اس بار بکھری تو اسے سنبھالنے والا، دلاسا دے کر چپ کروانے والا بھی نہیں تھا۔ اس کندھے کو، جس پر وہ سر رکھ کر پُرسکون ہو جایا کرتی تھی، اسے آج خود کندھوں کی ضرورت تھی۔

اس کی گاڑی کے قریب سے دو عورتیں باتیں کرتی گزر رہی تھیں۔ وہ شاید جنازے والے گھر سے ہی آ رہی تھی۔

اس کے باپ کی حالت نیم دیوانوں جیسی ہو گئی ہے۔ خدا کسی کو جوان اولاد کا غم نہ دے۔ بڑے ہی بدنصیب ہوتے ہیں وہ ماں باپ، جو اس عمر میں اپنی اولاد کو دفن کرتے ہیں۔'' بولنے والی کے لہجے میں بہت درد پھوٹ رہا تھا۔

''بس جی۔ ہم انسانوں کی کیا اوقات۔ مغرب کے بعد جنازہ ہے۔ تمہارے جان کو کہوں گی، شرکت کریں۔''

آوازیں دُور ہوتی چلی گئیں۔ وہ وہیں رہ گئی۔

''میں نے تمہیں خود کو چھوڑنے کو کہا تھا ارسل! تم نے دنیا ہی چھوڑ دی۔'' اسٹیئرنگ پر سر رکھے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

''تم نے ہمیشہ میرا ہر کہا مانا، اس بار ٹال دیتے..... کوئی اس طرح سے جاتا بھلا؟..... مجھے ایک بار ہاتھ پکڑ کر روکا تو ہوتا ارسل! میں کب اتنی دُور جا رہی تھی۔ دُور تم چلے گئے ہو۔ میری بے وفائی کی اتنی بڑی سزا۔ پلیز ارسل!..... لوٹ آؤ۔ میں کبھی بھی، کہیں نہیں جاؤں گی۔''

اس کے سارے حوصلے ڈھے چکے تھے۔ وہ آنسوؤں کے ریلے میں بہتی جا رہی تھی۔ اپنی آنکھوں میں محبت اور لہجے میں نرمی سموئے اپنی اُنگلیوں کی پوروں سے اس کے آنسو صاف کرنے والا اب کہیں نہیں تھا۔ وہ جا چکا تھا، وہاں، جہاں جا کر کوئی بھی نہیں لوٹتا۔ مگر اسے تو لوٹنا ہی تھا۔ وہ بھی خالی خالی گھر لوٹ آئی تھی۔ یہی اس کا ٹھکانہ تھا۔



گھر کی بہتری کے لئے اس نے اپنا سب کچھ کھو دیا تھا۔ سب کچھ!

☆☆☆

''ماجدہ! اوپر آؤ۔'' اس نے انٹرکام پر ماجدہ کو بلوایا۔

تھوڑی دیر میں وہ حاضر تھی۔ ''جی شاہم بی بی!''

''منصور کو آفس کال کرو۔ کہو، جلدی گھر آئیں، میری طبیعت ٹھیک نہیں۔'' بے تاثر بیٹھے، غیر مرئی نقطے کو گھورتے اس نے ماجدہ کو حکم دیا۔

ماجدہ نے عجیب سی نظروں سے اس کے تحکم بھرے انداز کو دیکھا اور سر ہلاتی چلی گئی۔

منصور پہلے ہی شاہم کی اس نئی حرکت سے نالاں تھا۔ اب اس نئی اُفتاد پہ اُسے کوفت ہونے لگی۔ وہ اس سے بہت کٹنے لگا تھا۔ شاہم کا نقطہ نظر اپنی جگہ سو فیصد درست سہی، مگر وہ اپنے دل کا کیا کرتا، جو اس بے وفا کو بھولتا ہی نہیں تھا۔ وہ کسی نئی وفا کی راہیں کیسے ہموار کرتا؟ پھر بھی وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آ گیا تھا۔

''کدھر ہے شاہم؟'' اس نے نیچے صفائی کرتی ماجدہ سے پوچھا۔

''اوپر، اپنے کمرے میں۔'' اس نے رک کر جواب دیا اور پھر کام کرنے لگی۔

وہ کارپٹ پہ اُجڑی، بکھری بیٹھی تھی۔ منصور بھی اس کے پاس نیچے بیٹھ گیا۔

''آر یُو اوکے؟'' جانے کیوں، اسے اپنا یہ سوال بہت احمقانہ سا لگا۔

شاہم کے چہرے کے تاثرات اور پتھریلی آنکھوں نے اسے اندر سے سہما دیا تھا۔

''مجھ سے شادی کب کریں گے؟''

وہ امیچور سی شاہم کہاں کھو گئی ہے؟ یہ اجنبی سی، اتنی دُور اندیش کون ہے؟'' منصور نے اس پر نظریں گاڑے سوچا۔

''اور ارسل.....؟'' منصور نے ٹریک بدلا۔

''Sacrifice (ایثار) کے لئے ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھ میں ابھی سکت نہیں ہے۔'' وہ بہت شکست خوردہ سہی مگر ہارنے کو قطعاً تیار نہیں تھی۔

''ہمت ٹوٹ جائے تو سب سے پہلا احساس، غلطی کا ہوتا ہے، پھر واپس پلٹنے کے سوا کوئی چارہ نہیں بچتا، اپنی طاقت سے زیادہ خود کو مت آزماؤ۔''

منصور کی سوچ بہت دُور کی تھی۔

''واپس تب مڑا جاتا ہے۔ جب پیچھے رہ جانے والے منتظر ہوں۔ میں نے اپنے ماضی کی راہوں میں کسی کو منتظر نہیں چھوڑا۔ جو تھا، وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچ گیا ہے۔'' دھیما

لہجہ کھوسا گیا تھا۔

"کیا مطلب.....؟" منصور جان نہ پایا۔

"ارسل.....ارسل مر گیا ہے۔"

اُس کے اس جملے نے منصور کو ہلا کر رکھ دیا۔ اسے شاہم کی ذہنی حالت پہ شبہ ہو
اس نے غور سے اسے پرکھا۔ وہ صبح اسے بھلی چنگی چھوڑ کر گیا تھا۔ اب اس کی آنکھ
روئی روئی، سرخ سی اور چہرہ صدیوں کا تھکن زدہ تھا۔ اس کی بربادی کے آثار بہ
واضح تھے۔

"قسم کھا کر کہتی ہوں، میرے پاس بھی جینے کا کوئی جواز نہیں، سوائے آپ کے
مغرب کے بعد نکاح پڑھوائیں مجھ سے، ورنہ میرے ..... میرے کفن دفن کا انتظام
لیں۔ آپ کو نہیں، مگر جانے والے کو وہاں بھی میری ہی ضرورت ہے۔"

اس کے کہنے میں، اس کے روّیے میں ایسا کچھ ضرور تھا کہ منصور ڈگمگا گیا۔ ارسل
موت نے اسے اس قدر دہلایا تھا کہ وہ کسی نئی مصیبت کا متحمل نہیں ہونا چاہتا تھا۔
شاہم کے کہے پر شک وشبے میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ اس نے بچوں کی خاطر منصور
شادی کا فیصلہ کرلیا۔ اور اب اس کے پاس کچھ بھی نہیں بچا تھا اور اب اگر وہ بھی.....

شام کے ملگجے سے اندھیرے میں وہ کمرے میں دونوں ہاتھ گود میں دھرے بے حس
ساکت وصامت سی بیٹھی تھی۔ مغرب کی اذان ابھی ہوئی تھی۔ نماز کی ادائیگی کا فر
مساجد میں بڑے خشوع وخضوع سے ادا کیا جا رہا تھا۔

نماز کے بعد دو مولویوں نے دو مختلف جگہوں پر دو مختلف کام سرانجام دینے
ایک نے دو اجنبیوں کو نکاح کے بندھن میں باندھ کر شاید نئی زندگی کی نوید دینا تھی
دوسرے نے کسی کی لحد سے سپردگی سے پہلے نمازِ جنازہ پڑھانا تھی۔

وہ نکاح کے لئے مولوی کا انتظار کر رہی تھی۔ اُس کے جذبات اتنے سرد ہو چکے
جیسے مردہ۔ اس کے کپڑے ہلکے ملگجے تھے، بالوں کو یونہی سمیٹا گیا تھا، لٹیں نکلی ہوئی تھ
ہونٹ ایک دوسرے میں سختی سے پیوست، چہرے پہ درد اور خوف کی وحشت تھی۔

اس کے اندر کی گھٹن آنسوؤں کے رستے نکاس کا راستہ پا سکتی تھی، مگر اپنی زند
اتنا مکمل حصہ کھو کر وہ رو بھی نہیں پا رہی تھی۔

منصور، شیف، ڈرائیور، سکیورٹی گارڈ اور مولوی کے ساتھ اندر داخل ہوا وہ کمال
سے خود کو سنبھالے ہوئے تھا۔



نمازِ جنازہ کے لئے امام آگے کھڑا ہو گیا۔ پیچھے لوگ صفیں درست کر رہے تھے۔

"منصور رضا ولد حطیب رضا بہ عوض....."

امام نے نیت باندھ کر پہلی تکبیر بلند کی۔

"منصور رضا ولد حطیب رضا بہ عوض....."

امام نے بڑی رقت سے ثناء پڑھ کر دوسری تکبیر لگائی۔

تیسرے اقرار اور تیسری تکبیر کے ساتھ ہی کتنا کچھ الگ ہو گیا تھا۔

وہاں اُدھر ایک نئے بندھن کے اٹوٹ ہونے کے لئے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے
ادھر کسی کی دعائے مغفرت کے لئے ہاتھ اُٹھائے گئے۔

اِدھر ارسل کو اپنی منزل تک رسائی مل گئی تھی اور اُدھر شاہم نے ناہموار کٹھن راستوں
سفر کا آغاز کر دیا تھا۔

☆★☆

وہ رات کو دس بجے ضروری میٹنگ نمٹا کر لوٹا تھا۔ پورچ میں کاشا کی لگژری مرسڈیز
ڑی دیکھی۔ اس کی گاڑی ہمیشہ کی طرح پورچ کے وسط میں کافی سے زیادہ جگہ گھیرے
ئے تھی۔ کاشا کے آنے کی خوشی میں وہ اپنی گاڑی پچھلی سائیڈ پہ لگا کے بغیر جھنجلائے
ے خوشگوار موڈ میں اندر آیا۔ اس نے رات کاشا کو یہیں ٹھہرانے کا ارادہ کیا۔

چارسُو خاموشی کا راج تھا۔ کاشا کی موجودگی میں در و دیوار خاموشی کو ترستے تھے۔
ے پہ بریف کیس رکھ کر وہ ڈائننگ ہال میں آ گیا۔ ڈائننگ ٹیبل پہ دھرے جگ میں
ے پانی کا گلاس پیا۔ چاروں طرف نگاہیں دوڑاتے وہ کاشا کے کمرے کی طرف آ گیا
ہ شاید وہ شاور لے رہا ہو۔ کاشا کا کمرہ، استعمال کی سب چیزیں حتیٰ کہ کپڑے بھی
ہاں موجود تھے۔ اس کی ضرورت کا سارا سامان ویسے ہی دھرا تھا، جیسے اس کی رہائش
ے قبل تھا۔

ہینڈل گھمانے پہ دروازہ کھلتا چلا گیا۔ کاشا نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ صرف لمحہ بھر کے
لئے اس کی اور غنی کی نظریں ملی تھیں۔ اگلے پل غنی نے زوردار آواز سے دروازہ بند کر
یا۔ اس سے ٹیک لگا کر وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ جو منظر وہ دیکھ چکا تھا، اسے پاگل
کرنے کو کافی تھا۔ اسے سانس لینے میں دُشواری سی ہونے لگی۔

کوٹ کا بٹن کھول کے اس نے انگلی یا اور انگوٹھے کی مدد سے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی۔
ٹس کے بحال ہوتے ہی غصہ اس کے دماغ کو چڑھنے لگا۔ اس نے خود ہی باہر آ جانا

تھا۔ دس منٹ اس نے کھولتے ہوئے، وال کلاک کی گھڑیاں گنتے گزارے۔

''تُو ہمیشہ ہی غلط وقت پر انٹری مارتا ہے۔'' وہ بدن پہ بنیان چڑھاتے ہوئے
تھا۔

''جسٹ شٹ اپ، کاشا! ہاؤ ڈیئر یُو؟ اس گناہ کی پوٹلی کو گھر کی حدود میں لے آ
دھیمی آواز میں وہ چیخ پڑا۔ اس کی ہر بری حرکت باہر تک ہی محدود رہی تھی۔

''تیرا میٹر کیوں گھوم رہا ہے؟'' وہ رتی بھر بھی خفیف نہیں ہوا تھا۔

دروازے کو اچھی طرح بند کر کے وہ سابقہ مطمئن انداز میں اُلٹا اسی سے پو
تھا۔ وہ جان بوجھ کر انجان بن رہا تھا۔

''کون ہے یہ عورت؟'' اس نے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ ''کیوں لایا ہے
یہاں؟ اور کیا کر رہا تھا؟'' غنی نے اپنے دماغ کو کھولاتے سارے سوال ایک ہی
میں کر ڈالے۔

''فرسٹ۔'' اس نے ایک انگلی اُٹھائی۔ ''شی اِز مائی سیکنڈ وائف لیلیٰ۔ اینڈ سیکنڈ
اس نے دوسری انگلی اٹھالی۔ ''اس کا کہیں اور ٹھکانہ نہیں تھا۔ اینڈ لاسٹ اِز ناٹ
اب تم اتنے بچے چوچے نہیں ہو۔''

کاشا نے آخری جواب دیتے، خباثت سے مسکرا کر اس کے گال کو چھیڑا۔

وہ، جو اس کی اس بم بلاسٹ سچائی کو اپنی سماعتوں میں اُتار رہا تھا، زور سے
جھٹک دیا۔

''ڈونٹ ٹچ می..... ڈونٹ ٹچ می اگین کاشا!..... تم نے دوسری شادی.....
میں سر ہلاتے اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''میں نے بس شادی کی ہے، پہلی اور دوسری کی گھمن گھیری میں نہیں پڑتا۔
ہائپر نہ ہوا کر۔'' کاشا کو اُس کا یوں ہاتھ جھٹکنا سخت برا لگا تھا۔

''تبو اس قدر کول ڈاؤن کیسے ہے؟ ایک عورت تیری بیوی، تیری واپسی کا انت
رہی ہو گی اور تُو دوسری کو پھنسا کر اس کے ساتھ جڑا ہے۔ وہ..... وہ جو تیری خاط
اولاد، شوہر، بسا بسایا گھر چھوڑ کر آئی ہے، اس کی..... قربانی کا یہ صلہ دے رہا ہے تُو
غنی تیز تیز بولتے ماہم کی حمایت کرتا، اُسے شرمندہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''اپنا والیوم کم کر۔ وہ سن لے گی۔'' اس نے بپھرے ہوئے غنی کا بازو کھینچ کر د
کچکچا کر کہا۔



''آئی ڈونٹ کیئر، بھلے سن لے، تُو نے اپنے اس اقدام کا مجھ سے تذکرہ تک نہیں
ا۔''

''ایمرجنسی میں نکاح کرنا پڑ گیا یار! موبائل آف مل رہا تھا۔ آفس کال کی تو میٹنگ
لئے نکل چکا تھا۔ پھر میں نے تجھے بتایا نہیں۔''

اس نے اپنی جلد بازی کی وضاحت دی تا کہ وہ نرم پڑ جائے۔

''اپنی وے، جو بھی ہوا، اب اس عورت کو فوراً یہاں سے نو دو گیارہ کر۔'' اس نے
یت غصہ میں کہا۔

''صرف..... ایک رات برداشت کر لے۔'' اس نے بڑے رسان سے کہا۔

''ٹھیک ہے، تُو اسے رکھ اور خود بھی رہ۔ میں جا رہا ہوں۔ جب یہ دفع ہو جائے گی،
ں واپس لوٹ آؤں گا۔''

قطعیت سے کہتا، لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہ بیرونی دروازے کی طرف چلا گیا۔

''غنی!..... غنی!..... سن غنی!..... پلیز، رک تو سہی۔'' وہ ٹی وی لاؤنج تک سست
ی سے چلتا اسے آوازیں دیتا آیا تھا۔

اس کے گاڑی اسٹارٹ کر لینے پہ وہ کافی دیر تک یونہی ٹکا کھڑا رہا۔ پھر نجانے اسے
ا ہوا کہ لیلیٰ کو جلد سے جلد یہاں سے جانے کو کہہ دیا۔ وہ کاشا کے اتنی جلدی بدلتے
پ پہ ہکا بکا رہ گئی۔ اس کا احتجاج کاشا کے مضطرب چہرے میں دب سا گیا۔ لیلیٰ کو
اپ کر کے اس نے ماہم کو بھی اطلاع کر دی کہ وہ غنی کی طرف ہے، لیٹ آئے گا۔

غنی اور اس کا اتنے سالوں کا ساتھ تھا۔ ان کے بیچ کبھی خفگی بھی نہیں ہوئی تھی۔ پھر
ا کب اس کی کسی بات کا برا مانتا تھا۔ کاشا، جس نے کبھی کسی کی نصیحت نہ سنی، مشورہ نہ
یا، غنی کو وہ ہر طرح کا اختیار دیتا تھا۔ چاہے وہ عمل کرے نہ کرے، خاموشی سے سن
ر لیتا تھا۔ غنی اُس کی سرگرمیوں میں مداخلت کرتا، وہ ہنستے ہوئے نظر انداز کرتا جاتا۔
تقریباً ہر رات ہی اس سے تفتیشی پوچھ گچھ کرتا اور وہ بڑے تحمل سے وضاحت دیتا
تا۔ حالانکہ جواب میں ردوبدل بھی نہیں ہوتا تھا۔ اسے غنی کی روک ٹوک کبھی بری نہ
ل۔ بس اسے کاشا کی ایسی نازیبا حرکات، گھر کی حدود میں کرنا سخت ناپسند تھا۔

کاشا نے کبھی اختلاف نہ کیا، حالانکہ یہ گھر بھی اس کے سوتیلے باپ کی ملکیت تھا۔
نی اس کے ساتھ رہ رہا تھا۔ وہ بڑی آسانی سے یہاں سب کچھ کر سکتا تھا۔ کوئی پوچھنے
الا یا انگلی اُٹھانے والا بھی نہیں تھا۔ مگر وہ غنی کو ناراض نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی

میں خود سے وابستہ لوگوں اور رشتوں، حتیٰ کہ اپنی ماں تک کی پروا نہیں کی تھی۔ مگر وہ
کے لئے پریشان تھا۔

رات کے ڈھائی بجے لان میں چکراتا پھر رہا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے
بہت اہم تھے۔ محبت بھی بہت تھی۔ یہ بھی وہ جانتا تھا مگر وہ اس قدر اندر سے اس سے
تھا، اس کا احساس اسے اس کا انتظار کرتے ہوا۔ سحر طلوع ہوئی جا رہی تھی، مگر وہ نہ آیا
کاشا آٹھ بجے تک اس کی راہ دیکھتے لوٹ آیا۔ سارا دن وہ وقفے وقفے سے اسے کا
ملاتا رہا، بیل جاتی رہی مگر اس نے کال ریسیو نہ کی۔ کاشا نے بھی دوبارہ اس سے رابطہ
کیا، نہ وہ گھر گیا۔ ان دونوں کے مابین ان دیکھی سرد سی خاموشی چھا گئی۔

☆☆☆



حالات میں کتنا اُتار چڑھاؤ آ گیا تھا۔

موسم بدل رہا تھا۔ سردیوں کی شامیں طویل ہونے لگی تھیں۔ سردیوں کی شام کی خنکی اب مست ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے لبریز ہوتی۔ خزاں رسیدہ درختوں کی اُجڑی ہوئی شاخوں پہ ننھی ننھی کونپلیں پھوٹنے لگی تھیں۔ سورج کی حدت، حرارت بخش تھی۔" اس بدلتی رُت میں کتنے چہرے، کتنے لوگ، رشتے بدل گئے۔ کون کہاں چپکے سے بچھڑ گیا، کہیں کوئی مجبوراً، بے بسی کی حالت میں کسی کا ہم سفر بن گیا۔ زندگی کبھی کبھی کسی من چلے کی طرح کتنی غیر مستقل مزاج ہو جاتی ہے، کسی نقطہ پہ رُکتی ہی نہیں۔ آوارہ گرد، بے پروا، من موجی سی، اپنی ہی مستی میں گنگناتی ہوئی، یونہی چلتے چلتے کبھی کسی کا سب کچھ چرا لیا، کبھی کسی کی جھولی دِن مانگے بھر دی۔"

زندگی سے موت تک کا سفر کوئی کس طرح طے کرتا ہے۔ ارسل مر کر پل پل کے عذاب سے چھٹکارا پا گیا۔ اس سے وابستہ محبت کی لڑیوں میں پروئے رشتے، والدین، دوست، عزیز و اقارب روئے دھوئے، صفِ ماتم بچھی، دکھ، تسلی، تاسف کے لفظوں سے دلاسا دیا گیا۔ مگر اس کے پیچھے رہ جانے والوں میں سے کوئی خاموشی سے مر گیا، خبر بھی نہ ہوئی۔ نہ کسی نے سینے سے لگایا، نہ ہی اپنے کندھوں پہ بار اُٹھایا۔

ان دونوں اموات میں بظاہر بہت فرق ہے مگر.....

منصور جیسا سمجھ دار، زیرک بندہ بھی خود اپنے آپ کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ جانے کیوں اس کے اندر سے آواز سی اُٹھتی۔ شاہم روتی کیوں نہیں؟ شاہم اتنی مضبوط کس طرح لگتی ہے؟ اس نے نکاح والی رات، شاہم کو آخری بار روتے پایا تھا، پھر کبھی نہیں۔ اس کے چہرے پہ، آنکھوں میں اِک ٹھہراؤ سا تو تھا۔ جیسے کچھ بھی بڑا اور برا نہیں ہو۔ وہ ان دونوں کے چہروں سے چھلکتی محبت کا آنکھوں دیکھا گواہ تھا۔ شاہم کا نارمل رہنا اسے

ابنارمل کر دیتا تھا۔ نہ تھکن کی کوئی جھلک، نہ ہی مایوسی کی کوئی رمق۔

اپنے ہی طور پہ اس کے اندر شاہم کے لئے کھنچاؤ سا پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ شاہم نے اس کے ساتھ زبردستی کی تھی۔ اب یہی زبردستی اسے کھلنے لگی تھی۔

یہ تو صرف شاہم ہی جانتی تھی کہ اس کی روح تک میں کتنا گمبھیر، جامد اور خوف ناک سناٹا اُتر گیا ہے۔ قربانی کے حقیقی معنوں سے آشنائی تو ارسل کی موت کے بعد ہوئی تھی۔ جن بچوں کی خاطر اپنا سب سے قیمتی اثاثہ، موت کی آغوش میں سلا دیا، اب اس جانے والے پہ ہلکان ہو کر وہ اس قربانی کو رائیگاں نہیں کر سکتی تھی۔

ارسل اور اُس کی جدائی کا بہانہ یہ بچے بنے تھے تو اب ان سے محبت اور پرورش کے عہد کی پاس داری اُسے کرنا تھی، تاکہ روزِ قیامت اُسے اس وفا پر قربان ہونے والے کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ وہ اس کی روح اور اپنے ضمیر کے آگے جھوٹی نہ پڑے۔ وہ خشک آنکھوں، بے تاثر چہرے اور نیم مسکراہٹ کے ساتھ اپنی ذمہ داری نبھا رہی تھی۔ حالانکہ جن کڑے لمحوں سے وہ گزری تھی، اسے بہت وقت چاہئے تھا، خود کو سنبھالنے کے لئے، سمجھنے کے لئے۔ مگر اس نے خود کو ذرا سی بھی رعایت نہ دی۔ وہ منصور کے سامنے اس لئے نہیں روتی تھی کہ کہیں وہ اس کے کردار کا موازنہ، ماہم سے نہ کرنے لگے۔ اس زبردستی کے رشتے میں شک کی دراڑ نہ پڑ جائے، وہ اس کی طرف شکوک بھری نگاہ نہ ڈالے۔ وہ ڈرتی تھی اور.....

اور پھر شاید اس نے جہاں اور بہت کچھ سیکھا تھا، وہیں اپنے آنسوؤں کے سیلاب کے آگے بند باندھنے کا ہنر بھی سیکھ لیا تھا۔ پھر وہ کندھا تھا، نہ نرم پوریں اور نہ ہی ٹشو پیپر۔

اب اس کی ذمہ داریوں میں منصور کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ جبکہ منصور نے "اپنی" ذمہ داری ابھی تک قبول نہیں کی تھی۔

☆☆☆

صبح بہت بھاگم بھاگ ہوئی تھی۔

عمیر کی ٹائی نہیں مل رہی، حمزہ بیڈ کے نیچے گھسا پنسل باکس ڈھونڈ رہا ہے۔ افراتفری میں چیزیں پوری ہوئیں تو کھانے میں شور ہنگامہ، دعا کی اپنی الگ سے چیخ و پکار۔ ان سب سے بمشکل فراغت پاتے ہی منصور کی تیاری۔

منصور کے کھنچاؤ کو بہت تسلی سے برداشت کرتی وہ اس کے ہر کام، ہر فرض کو اوّلین فرض میں شمار رکھتی۔ پہلے وہ صرف بچوں تک محدود تھی، منصور کے کسی کام میں مداخلت نہ



رتی تھی، مگر اب وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ وہ منصور، اپنے شوہر سے بے اعتنائی کیوں ں۔ بچوں سے فارغ ہو کر وہ منصور کی طرف آ گئی تھی۔

وہ شاور لے رہا تھا۔ ہر روز کی طرح منصور نے شاہم کے نکالے ہوئے کپڑے ڈروب میں رکھ کر اپنی مرضی سے نکال لئے تھے۔ بیڈ پر پڑے لباس کو پھیکی مسکراہٹ ، اٹھاتے ہوئے اس نے دیکھا، تیسرا بٹن غائب تھا۔ ماجدہ پہ جھنجلانے کا فائدہ نہیں ۔ وہ سوئی دھاگے والا ڈبہ لے کر بٹن ٹانکنے بیٹھ گئی۔ اتنے میں وہ بھی واش روم سے آ گیا۔

"چلے گئے بچے؟" بالوں میں تولیہ رگڑتے وہ باہر نکلا۔

"جی، تھوڑا لیٹ ہو گئے، کمرے میں آئے تھے۔ آپ شاید باتھ روم میں تھے۔" ت سے دھاگا توڑ کر اس نے بتایا۔

"یہ کام ماجدہ کے کرنے کے ہیں۔ تم خوامخواہ تکلیف کرتی ہو۔" اس کے ہاتھ سے ٹ پکڑتے وہ کہہ رہا تھا۔

"آپ کے کام کرنے میں تکلیف کیسی؟" وہ ہولے سے مسکرا دی۔

"بہتر ہے، خود کو بچوں تک محدود رکھو۔ ملازم ٹہلنے کے لئے نہیں ہیں۔" کپڑے ے وہ ڈریسنگ روم میں چلا گیا۔

اس نے تکیے درست کر کے، بیڈ شیٹ کی شکنیں نکالیں۔ چارج پر لگا ہوا موبائل اُتار ڈریسنگ ٹیبل پہ رکھا۔ گھڑی، والٹ، گلاسز اور کی چین سب ڈریسنگ ٹیبل پہ منتقل کر دیا ہ کوئی چیز بھول نہ جائے یا ڈھونڈنی نہ پڑے۔

کف لنکس بند کرتا وہ مکمل تیار ہو چکا تھا۔

"آپ بتائیں، ناشتے میں کیا بناؤں؟ اس روٹین کے ناشتے سے تو میرا دل اوب گیا ۔" ہیئر برش اس کی طرف بڑھاتے وہ پوچھ رہی تھی۔ منصور کی اب سے کچھ دیر پہلے گئی تنبیہ کا اس پر قطعاً اثر نہیں ہوا تھا۔

"جو کھانے کو جی چاہے، بنا لو۔ مرضی ہے تمہاری۔" اس کی ساری توجہ بال سنوارنے ں۔

آپ کے دل کی بھی تو کوئی مرضی ہو گی۔" اسے بغور دیکھتے اس نے کہا

منصور کے ہاتھ رک گئے۔ برش رکھ کر وہ اپنا ضروری سامان سمیٹنے لگا۔

"میرے دل تک رسائی ممکن نہیں۔" گھڑی کلائی میں ڈالتے اس نے کہا، پھر

بریف کیس اُٹھایا تو شاہم چونک کر بولی۔

"بریک فاسٹ۔" شاہم خفیف سی ہوگئی تھی۔

"آئی ایم گیٹ انگ لیٹ۔ (مجھے دیر ہو رہی ہے)" جاتے ہوئے اس نے حافظ بھی نہیں کہا۔

ایسے میں ماضی کے بہت سے دریچے کھلنے لگتے، مگر اس نے بھی ماضی کے سا کواڑ اپنے ہاتھوں سختی سے بند کئے تھے۔ وہ ہر ہمکنے والی یاد کو کسی اچھے مستقبل کی امی خود کو ڈانٹ کر یا کسی کام میں مصروفیت ڈھونڈ کر جھٹک دیتی۔ مگر بہت سی یادیں ڈھٹائی سے وارد ہوتیں۔ ان ہی سے جان چھڑانے کی کوشش اس نے اپنے طور پر کی شاہم کو اپنے کمرے سے منصور کے بیڈ روم میں شفٹ ہونا ہی تھا، حالانکہ اس کا دل نہیں مانتا تھا کہ وہ اس کمرے میں اس قدر استحقاق سے جائے۔ منصور نے اس بھی تھا، وہ اپنی زندگی سے وابستہ رہنے والی کی چھوڑی ہوئی جگہ آج بھی کسی کو تیار نہیں تھا۔ وہ شاہم کے کمرے میں سیٹنگ کا سوچتا تھا۔ پھر شاہم کے پاس بھی کمرے میں نقش چند قیمتی لمحات تھے، جو اُس کا زندگی بھر کا اثاثہ تھے۔ وہ بھی اپنا رو سے شیئر نہیں کر سکتی تھی۔

بالآخر وہ دونوں نچلے پورشن کے ماسٹر روم میں سیٹ ہو گئے۔ کیونکہ بچوں کا بھی نیچے ہی تھا اور اب انہیں شاہم کے ساتھ سونے کی عادت بھی پڑ چکی تھی۔ وہ کے ساتھ ہی سوتی تھی۔ اس بڑے سے کمرے میں حمزہ اور عمیر کے لئے سنگل بیڈ گیا تھا۔

☆★☆

دوپہر میں اس نے چاکلیٹ کیک بنایا۔ اس نے ٹی وی چینل سے متعدد بار کی ترکیب نوٹ کی تھی۔

شیف کی مدد سے اس نے کیک تیار کر ہی لیا۔ اسے فریج میں رکھ کے کچن کا سمیٹا۔

شام کو جب منصور، آفس سے لوٹا، اس نے چائے کے لوازمات کے ساتھ اپنی کا بھی اضافہ کر دیا۔

"یُو نو پاپا! ماما نے بنایا ہے، یہ چاکلیٹ کیک۔"

حمزہ نے جب سے سنا تھا، شاہم نے کیک بنایا ہے، تب سے اس کی رال ٹپک



ی۔ وہ ماں کے ہاتھ کا بنا چکھنا چاہتا تھا۔ شاہم نے ہی بنا کر دیا کہ پاپا آ جائیں گے تو ٹھے کھائیں گے۔

"ہوں۔" حمزہ کی بات پہ ہنکارا بھرتا وہ دعا کو چھوڑ کر سیدھا ہو گیا۔

اس نے پہلا پیس کاٹ کر پلیٹ میں رکھ کے منصور کے آگے رکھا اور پھر عمیر، حمزہ کو منصور کے لئے چائے کا کپ بنا کر وہ دعا کے لئے پلیٹ لے کر دوسرے صوفے پر بیٹھی۔

"مام! رئیلی ویری ٹیسٹی..... اسی لئے چھپا کر رکھا گیا تھا۔" حمزہ مزے سے کھاتے ئے بولا۔

"ماما! میرا برتھ ڈے کیک آپ کو بنانا ہے۔ ابھی سے آرڈر ہے۔"

"اور میرا بھی۔" حمزہ نے فوراً عمیر کی بات اچکی۔

"اوکے بابا! اوکے۔ آپ دونوں کے لئے بناؤں گی، ماں کی جان! آپ کی ماں بیس گھنٹے آپ کے لئے حاضر ہے۔ سب کر دوں گی۔" اس نے فوراً حامی بھر لی۔ مبادا ی مار کٹائی نہ شروع ہو جائے۔

"آپ نہیں لے رہے پاپا!" عمیر کا دھیان منصور کی پلیٹ پہ چلا گیا۔

"ہاں..... ہاں، میں لے رہا ہوں، آپ کھاؤ۔" عمیر کے گال پہ پیار سے ہاتھ یرتے بولا۔ مگر وہ چائے کے سپ لیتا رہا۔ وہ دونوں بھائی کیک کھا کر باہر لان میں ھیلنے چلے گئے۔

شاہم نے بے دلی سے برتن سمیٹ لئے۔

☆★☆

غنی بڑے مست موڈ میں سست رفتار میں ڈرائیو کر رہا تھا۔ سگنل پہ گاڑی روک کر اُس نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو دوسری سڑک پر ہسپتال کی پارکنگ میں اسے کاشا نظر آیا۔ اس نے ذرا غور سے دیکھا، وہ پچھلی سیٹ پہ کچھ پھینک کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گرین سگنل پہ غنی نے اپنی گاڑی آگے بڑھا دی۔ کاشا کو پانچ ہفتوں بعد یوں دیکھ کر اس کا دل بہت برا ہوا تھا۔ تین گھنٹے بعد گھر واپسی پہ اس کا تھکن سے برا حال تھا۔ گھر کے اندرونی حصے میں آتے ہی اسے عجیب سے احساس نے یکدم گھیرا۔ اس نے تعجب سے چاروں طرف دیکھا۔

"رحیم..... رحیم خان!" اس نے ملازم کو پکارا۔

"جی صاب!" وہ مؤدب حاضر تھا۔

"کاشا کہاں ہے؟"

اس نے یہ نہیں پوچھا تھا کہ کاشا آیا ہے؟ بلکہ یہ کہا تھا کہ وہ کہاں ہے؟ اس کی چھ
جس نے آگاہ کر دیا تھا۔

"وہ جی، تھوڑی دیر ہوئی، چلے گئے۔"

"آیا کب تھا؟" اس کی بے قراری قابل دید تھی۔

"وہ تقریباً ڈھائی گھنٹے پہلے آئے تھے۔ چپ چاپ اپنے کمرے میں چلے گئے
میں نے کھانے کا پوچھا، انکار کر دیا۔ بولے، اکیلا چھوڑ دو۔ ڈیڑھ گھنٹہ اندر بند رہے
پھر اُٹھ کے چلے گئے۔" رحیم خان نے ساری تفصیل بتا دی۔ اس نے اثبات میں سر ہلا
اور کمرے کی طرف مڑ گیا۔

"آپ کے لئے کچھ لاؤں صاب؟"

اس نے اثبات میں سر ہلا کے جاتے ہوئے غنی کو پکارا۔

"نہیں، تم جاؤ بس۔"

وہ انکار کرتا اپنے کمرے کے بجائے کاشا کے کمرے میں آ گیا۔ جب سے وہ
تھا، وہ یہاں نہیں آیا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی اسے اپنائیت کا شدت سے احساس
جیسے وہ کاشا کے گلے لگ گیا ہو۔ شاید یہ اس کی یہاں موجودگی کی وجہ سے تھا۔ کاشا
اس کی تصویریں اور اس کی اکیلے کی تصویریں، اس کے ہونے کا احساس دلا رہی تھیں۔
اس کی قد آدم تصویر کے پاس آ رُکا۔

"سنتا تو ہے میری، پر مانتا کیوں نہیں؟..... آئے گا نہیں میرے پاس؟..... میرے
گلے لگنے؟..... اپنا فلسفہ سنانے؟..... پلیز کم بیک کاشا!..... پلیز!"

اُس کا گلا رندھ گیا تھا۔ آنکھوں میں ٹھہری نمی کو انگلیوں سے مسل کر اس نے بغور
طرف کا جائزہ لیا۔ مرکزی ٹیبل پہ جام کے خالی گلاس نہیں تھے، نہ ہی ایش ٹرے
سگریٹ کا کوئی ٹوٹا۔ گیلا تولیہ بھی دوہرا تہرا کر کے بیڈ پہ نہیں اچھالا گیا تھا۔ کارپٹ
جوتے کی مٹی سے نہیں اٹا تھا۔ کاشا کب سے اتنا مہذب ہو گیا تھا۔

کاشا اور اُس کی فوٹو تھی، جس میں کاشا نے وکٹری کا نشان بنایا تھا۔ اس فوٹو
نیچے غنی نے کاشا کے لئے ایک عبارت لکھ دی تھی۔

"You are always winner"



کاشا اس عبارت کو پڑھ کر نچلا ہونٹ دانتوں تلے دابے دھیما دھیما مسکراتا رہا تھا۔
ں کا ابھی یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ صوفے پہ ڈھیلے ڈھالے انداز میں
ہ گیا۔ کارپٹ پہ نظریں جمائے اسے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔

"اسی لئے خبیث! میں تیرے کمرے میں نہیں آتا۔ ہر چیز پہ تیرا حق....."

غنی کا موڈ خراب ہونے لگا تھا۔ وہ دونوں فلور کشن پہ لیٹے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ غنی
ں سے ریموٹ کا مطالبہ کر رہا تھا۔

"چل جھوٹے، بکواسی! پھر پوری ڈھٹائی سے یہیں آ جاتا ہے۔ تیرا ہر چیز پہ حق ہے،
ائے اس کے۔" اس نے ریموٹ کی طرف اشارہ کر کے غنی کو چڑایا۔

"ذلیل نہ بن یار! بس پانچ منٹ دیکھ لینے دے، اتنی کمینگی اچھی نہیں ہوتی۔" غنی
ہلنگ دیکھنے کی فرمائش کر رہا تھا۔

"اسے چھوڑ، یہ دیکھ۔" اس نے ایک بے ہودہ سی انگلش فلم کی طرف اس کی توجہ
ائی۔ "دیکھ، کیا لچک ہے اس کے جسم میں۔" غنی کی بات پہ اس نے ذرا بھی توجہ نہ دی۔

"تو کر اپنی مرضی۔ میں جا رہا ہوں۔" وہ ناراض ہو کے اُٹھ ہی گیا۔

"اچھا ناں! بیٹھ جا۔" کاشا نے اس کے ٹراؤزر کا پائنچہ اپنی مٹھی میں جکڑ کر اسے روکا
ر وہ ریموٹ نہیں چھوڑا۔

"ایسا کر، بیٹھ مت، لیٹ جا۔ میں نے تیرے ایموشنز چیک کرنے ہیں۔" اس نے
تے ہوئے غنی کی پیچھے سے شرٹ کھینچی۔

"کیوں، کون سے ایموشنز چیک کرنے ہیں؟" غنی نے جھنجلا کر اپنی شرٹ اس سے
ڑائی کاشا اسے دو گھڑی سکون سے دیکھنے نہیں دے رہا تھا۔

"تجھے عورت ذات سے اس قدر الرجی ہے کہ..... اب مجھے شک ہوتا ہے کہ تیرے
Sexual emotion (جنسی جذبات) میں کوئی گڑبڑ....."

"آج میں تجھے ضائع کر کے رہوں گا..... بچے گا نہیں۔" غنی اس کی ہچکچاہٹ کے
ہی اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ اس نے کاشا پہ فوراً مکوں سے حملہ کر دیا۔

"اسٹاپ اٹ غنی!..... لگ جائے گی۔"

کاشا یونہی شور مچا رہا تھا۔ نہ اسے لگنی تھی، نہ ہی غنی نے اسے لگانا تھی۔ ان دونوں
کے قہقہے بلند ہوتے گئے۔

انہی قہقہوں نے غنی کو حقیقی دنیا میں واپس کھینچا۔

☆☆☆

عمیر اور حمزہ شام میں منصور کے ہمراہ ٹینس کورٹ جانے لگے تھے۔ منصور کی بہ
خواہش تھی کہ اس کے بیٹے قومی کھلاڑی بنیں۔ خود اسے بھی اپنی اسٹوڈنٹ لائف م
ایسے بہت سے مواقع ملے جنہیں اس نے پڑھائی کے جنون میں گنوا دیا۔ جب وہ ا
پاپا سے اس کی زبانی سنتا تھا کہ کیسے وہ محنت کر کے اس اسکالرشپ اور اسکالرشپ
انگلینڈ تک پہنچے، تو اس کا جنون اور بڑھ جاتا۔ مگر اب وہ سوچتا تھا کہ کاش میں اتنی
معمولی ذہانت کو کسی غیر نصابی سرگرمی میں بھی بروئے کار لایا ہوتا۔ اس کا وقت تو اب نہ
رہا تھا، مگر وہ اپنے بیٹوں کے ذریعے اپنی خواہش کی تکمیل کر سکتا تھا۔ وہ انہیں روزانہ ا
گھنٹہ کورٹ لے جاتا تھا۔ حالانکہ ابھی وہ ریکٹ سنبھالنے کے لائق بھی نہیں ہوئے تھے

''ہری اپ حمزہ! عمیر کٹ لئے گاڑی میں بیٹھ بھی گیا ہے۔''

شاہم، شام کے کھانے کی تیاری کے ساتھ حمزہ کو بھی ڈانٹ رہی تھی، جو فریج
سے ساتھ لے جانے کے لئے فروٹس وغیرہ اپنے بیگ میں ڈال رہا تھا۔

''بس دو منٹ مام!'' وہ کب سے یہی راگ الاپ رہا تھا۔

شاہم نفی میں سر ہلاتے اس کی مدد کرنے کو مڑی۔ شاہم سے چھپا کے تیسرا
بیگ میں ڈالتا حمزہ پکڑے جانے پہ بہت گھبرا گیا تھا۔

اس نے کمر پہ ہاتھ رکھ کے بھنویں اچکانے پر اکتفا کیا۔

''سوری ماما! وہ..... میرا فرینڈ ہے عادل..... یہ اس کے لئے۔'' اس نے کین
نکال لیا۔

''یادیں اچھی ہوں یا بری، ہم لاکھ مصروفیت میں مشغول رہیں، یہ اپنی جگہ بنا ہی
ہیں۔'' یونہی یادوں کا ایک دریچہ، شاہم کی طرف بھی کھل گیا تھا۔

''او کے، میں جا رہی ہوں۔'' شاہم نے فریج میں سے دو سیب اور تین کیلے نکا
بیگ میں ڈالے تھے۔

''ایویں فضول میں، کہیں نہیں جانا، ابھی تو آئی ہو۔'' وہ چاہے پانچ گھنٹے ہی کیو
ارسل کے پاس بیٹھی رہتی، وہ ہمیشہ اس کی واپسی پہ رُکنے کی تکرار ضرور کرتا۔ شاہم
معاملے میں اسے وقت سے گلہ ہی رہتا۔

''ابھی نہیں، تین گھنٹے قبل آئی تھی، مائنڈ اِٹ۔''

''جو بھی ہے، تم.....''



آپی کے ساتھ ڈنر پر جانا ہے، لازمی۔ اگر میں وقت پر نہ پہنچی تو وہ پروگرام ملتوی
ں گی اور پھر منصور بھائی سے ہو جائے گی، میری پٹائی۔'' شاہم نے محبت سے اسے
ا۔

ں کو ارسل کا یوں روکنا بہت اچھا لگا کرتا تھا۔

''اچھا..... چلو ٹھیک ہے۔'' نل بند کر کے وہ اُس کے مقابل آ کھڑا ہوا تھا۔

''کل.....'' ہونٹ کا کونا دانت میں دبا کر وہ سر ہلاتی ہنسنے لگی تھی۔ وہ روز ہی ملتے
ر بھی وہ اس سے یہ سوال ضرور کرتا تھا۔

''گڈ بائے اینڈ ٹیک کیئر۔'' اس نے جاتے جاتے ٹیبل پر رکھی پلیٹ سے چکن پیٹیز
لیا۔

''رکو..... رکو شامی!'' اس نے تین قدم دور کھڑی شاہم کے شولڈر بیگ کو دبوچا۔

''کیا ڈھونڈ رہے ہو؟ کچھ نہیں ہے۔'' وہ اس کے بیگ کی زپ کھول رہا تھا۔

ے کوفت ہو رہی تھی۔ اس کے کندھوں کا سارا وزن ارسل پہ تھا۔

''ہاں! تم کہہ سکتی ہو، یہ کچھ نہیں ہے..... یہ کچھ بھی نہیں ہے، بھوکی، ندیدی، یہ
کرنا تمہاری ایکسٹرا کوالٹی ہے۔ میں اتنی دُور سے تازہ اور مہنگا فروٹ لاتا ہوں اور
پنے لئے اس بکسے میں ٹھونس کر چلتی بنتی ہو۔ جم سے واپسی پہ مجھے خالی فریج منہ
ہے۔''

ارسل نے سارے پھل واپس نکال لئے۔

''تمہاری زبان بہت چالو ہو گئی ہے ارسل! اتنے بلیم..... صرف اس چونگے کے
کے لئے..... کتنے کمینے ہو تم..... میں نے تمہیں اپنا اتنا قیمتی دل دیا اور تم.....'' وہ
کی مصنوعی ایکٹنگ کر رہی تھی۔

''نو مائی ڈیئر لیڈی!..... میں جھوٹا، بکواسی، گھونچو، چوروں کا چور، کرمنل اور تم.....''
نے بھی مصنوعی گھبراہٹ سے جواب دیا۔

''بہت برے ہو۔'' وہ اسے دھکا دے کر آگے بڑھی۔

''مگر صرف تمہارا ہوں۔'' اس نے کچن کے دروازے سے ٹیک لگا کر بازو، سینے پر
ہوئے جاتی ہوئی شاہم کو دیکھ کر زور سے آواز لگائی۔

''جھوٹے.....'' ناک چڑھا کر بڑی دلکشی سے مسکراتی وہ بولی۔ سیب اس نے پھر
کچن کر لے لیا تھا۔

"ماما!" حمزہ نے اس کا ہاتھ ہلا کر اسے ہوش دلایا۔

"آں..... ہاں، ہاں۔" وہ بری طرح چونکی۔ اس کی آنکھوں میں نمی سی بھر
حمزہ کے قریب ہی منصور کھڑا تھا۔

"نکلو حمزہ!" اس نے حمزہ کو کندھوں سے پکڑ کر کہا جو بہت حیرت سے ماں کی آ
کو دیکھ رہا تھا۔ شاہم نے کین دوبارہ اس کے بیگ میں ڈالا اور زبردستی مسکرا کر بیگ
کے کندھوں میں چڑھا دیا۔ وہ باہر بھاگ گیا۔

منصور کے دو قدم اور قریب ہونے پر اس نے سر جھکا لیا۔

"جانے والے بھولتے نہیں ہیں۔ خود پہ اتنا سخت پہرہ مت بٹھاؤ کہ انہیں بھ
بھلاتے خود کو ہی فراموش کر دو۔"

اُس کے قدم نصیحت کر کے مڑ گئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں اٹکے آنسو، گال
لڑھک گئے۔

☆☆☆

ماہم اندر آ کے ٹھٹک گئی تھی۔ کاؤچ پہ بڑے ہی ڈھیلے ڈھالے انداز میں کا
سر ٹکائے، آنکھیں موندے، نیم دراز تھا۔ سرِ شام وہ کیسے آ گیا تھا؟ وہ بھی خاموشی
بیرونی گیٹ پار کرتے وہ چوکیدار یا سکیورٹی گارڈ میں سے کسی کی ماں، بہن ایک ض
تھا۔ اس کی گاڑی کا میوزک والیوم اتنا ہوتا تھا کہ ساتھ میں چار چھ گھروں کے
ہوئے، بیدار ہو جاتے تھے، پھر ماہم کی شامت آتی تھی۔ ابھی وہ کب آیا، اسے
نہیں چلا۔

"کاشف! آر یو فائن؟" اُس نے اُس کے کندھوں پہ ہاتھ دھر دیئے۔

"ہوں..... یا، آف کورس۔" اس نے یکدم آنکھیں کھول کر جواب دیا اور
آنکھیں بند کر لیں۔

"باہر دل نہیں لگا۔" وہ آہستہ آہستہ اس کے کندھوں پر ہاتھ پھیرنے لگی، ج
بلی کی بڑی نرمی سے پشت سہلائی جاتی ہے۔

"دل کو کبھی اتنی چھوٹ نہیں دی کہ اپنی مرضی سے لگتا پھرے۔"

"تھک گئے ہو، دبا دوں؟" وہ اپنے ہاتھوں سے ہلکا دباؤ ڈالنے لگی۔

"رہنے دو، انرجی فل ہو گئی تو تمہیں تھکا دوں گا۔" وہ پھیکا سا مسکرایا۔

"تمہارا یہ غمگین چہرہ کھل رہا ہے مجھے۔" اس کے چہرے کی اداسی پڑھنا مشکل



ہونکہ وہ بناوٹی انسان نہیں تھا۔

"قریب بیٹھو۔"

اس نے تھوڑا سیدھا ہو کر اسے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے پاس بٹھایا۔

"کیا اس نے اشارتاً پوچھا۔

کاشا کا یوں جم کے تکنا اُسے ہچکچاہٹ میں مبتلا کر رہا تھا۔

"بہت برا ہوں میں؟"

خود پسندی یا خود اذیتی۔

"نہیں..... زیادہ نہیں۔ ابھی بہت اچھے لگ رہے ہو۔ بہت عرصہ بعد، پہلے والے
ف۔" ماہم نے اس کی تبدیلی کو جھٹ پکڑ لیا۔

"پہلے اور اب میں کیا فرق ہے؟"

"میں صرف کاشف سے واقف تھی۔ شادی ہوئی تو معلوم ہوا، کاشف کا نام و نشان
ا۔ اس جسم میں صرف کاشا کا روپ ہے، جس کی....."

"جس کی....." اس نے بیچ میں اسے اچک لیا۔

"جس کی برائیاں اس کے لئے صفات ہیں۔ وہ محبت کا نہیں، نفرت کا پُتلا ہے۔
ا اس کے ساتھ ٹائم تو پاس کر سکتے ہیں، مگر لائف نہیں۔ اس کی ہمراہی میں آپ کو
خواہش، آرزو، آزادی حتیٰ کہ آواز تک کا بھی گلا گھوٹنا پڑے گا۔ جس کے الفاظ حرفِ
ہیں۔"

اُس کی حوصلہ افزائی سے فائدہ اُٹھا کر ماہم نے اپنے اندر کی ساری بھڑاس نکال
۔ وہ یونہی مسکراتا رہا۔ پھر جیب سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکال لیا۔

"اور تم محبت کی دیوی، اس نفرت کے پتلے کی پجارن ہو..... تمہارا وہ محبت کا
گن (نعرہ) زندہ باد ہے ابھی بھی یا مُردہ باد ہو گیا؟" سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر اس
سلگایا۔

"میں بدبخت کیا جانوں، محبت کیا ہوتی ہے؟ میں سلوگن لگاتی ہوں اور تم۔" ماہم کو
ت دکھ ہوا تھا۔

"میں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ مجھے تم سے محبت ہے اور یہ ذہن میں رکھو تم، نہ کوئی
ت۔" وہ سچ ہی کہہ رہا تھا۔

"تم یہ نہ بھی بتاؤ، میں تب بھی جان چکی ہوں۔ کاشف! ہم شادی شدہ ہیں۔ میں

تمہاری بیوی ہوں، تمہاری توجہ..... تمہاری محبت پہ میرا حق ہے۔ بالکل اسی طرح، جس طرح تم میری ذمہ داری ہو، ہمارا رشتہ ویسا نہیں ہے، جیسا ہونا چاہئے۔ ابھی تم نے خود ہی اعتراف کیا کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں۔'' یہاں رک کر اس نے توقف کیا۔

کاشا کی نظریں بہت سنجیدگی سے اس پر جمی ہوئی تھیں۔

''میں یہ سوچنے اور کہنے سے بھی ڈرتی ہوں کاشف! کہ تم میرے لئے ایک پچھتاوا بنتے جا رہے ہو۔ مجھے اس قدر مجبور مت کرو۔ عمر بھر کا رونا میرا نصیب نہ کرو۔ میں نے اپنا سب کچھ تم پر قربان کر دیا، اس کے عوض وفا کی نہیں، تھوڑی سی محبت کی التجا ہے۔ بہت دیالو ہو..... مجھے پجارن نہیں، بھکارن سمجھ کر اپنی محبت کی صرف تھوڑی سی بھیک دے دو، پلیز۔''

ماہم نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ کاشا، کیش لینا بھول کر اس کی گیلی آنکھوں کو بے خود حیرانی سے تکے گیا۔

وہ سوالی سے محبت کرتا تھا، مگر سوال سے نفرت۔ اس نے کبھی کوئی بھکاری، خالی جھولی نہیں لوٹایا تھا۔ مگر اس سوالی نے اسے جھنجوڑ کے رکھ دیا۔ اس کی تڑپ نے اس کی بے نیازی سے ہلکا سا پردہ سرکا دیا۔

''آئی ہیو نو ٹائم، تم نے غلط جگہ سوال کیا ہے۔''

اس کے وجود کی ریتیلی چٹان کے ذرّے بکھرنے لگے تھے۔ پژمردہ، سنسان بدا ساکت نگاہیں، بے جان ہلتے ہونٹ۔

''مطلب.....'' وہ رو رہی تھی۔

''مطلب.....'' اس نے غائب دماغی سے لفظ دہرایا۔

''کیوں؟ کیا؟ کیسے اور مطلب؟ کا جواب اس نے غنی کے سوا کبھی کسی کو نہیں دیا تھا۔

''مطلب یہ کہ..... میں دل دیتا ہوں، مگر دل میں جگہ کسی کو نہیں۔'' تھوڑے توقف کے بعد وہ بلاوجہ ہی ہنسنے لگا۔ کھوکھلی، بے جان ہنسی۔

''اِٹس مائی اسٹائل نا۔'' راکھ جھاڑ کر اس نے لمبا سا کش کھینچا۔

''سچ کہو ماہم! بچے یاد آتے ہیں؟''

اس نے کتنی غیر مناسب اور بے موقع بات کی تھی۔

ماہم نے جھکا سر اثبات میں ہلایا۔

''اور..... منصور۔''



ماہم نے سر اٹھا کر تھوک نگلا۔ کاشا کی ہنسی اور سوالات: وہ اسے کوئی نفسیاتی مریض لگ رہا تھا۔ اس نے کبھی بھی یوں منہ پھاڑ کے کسی کی ذاتیات میں دخل اندازی نہیں کی تھی۔ دوسروں کی سن گن رکھنا اس کی فطرت نہیں تھی۔

''میں اپنی غلطیوں سے سیکھتی ہوں، انہیں سدھارتی ہوں مگر دوہراتی نہیں۔'' اس کا لہجہ کم تھا۔

''منصور! تمہاری غلطی تھی۔'' اس نے اندازاً کہا۔

ماہم چند لمحے اسے ٹٹولتی نظروں سے دیکھتی رہی، پھر بولی۔

''غلطی وہ نہیں، تم ہو..... مگر اسے یاد کر کے میں دوسری غلطی نہیں کرنا چاہتی۔ پہلے ماضی کو یاد رکھ کے حال تباہ کر لیا..... بٹ ناٹ اگین۔''

آخر میں اُس کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔

کاشا سچ بول سکتا تھا۔ یقیناً سچ سننے کی ہمت بھی تھی۔

''اسٹرانگ سی چائے لاؤ۔''

وہ پھر غیر متوقع بولا تھا۔ ماہم کی اتنی تلخی پہ اس کے چہرے پر کوئی تاثرات نہیں ابھرے تھے۔ ماتھے پہ ایک شکن بھی نہیں تھی، جیسے وہ ماہم کی اس اندرونی خلش سے آگاہ ہو۔

''ہاں.....'' وہ پریشانی سے اسے مڑ مڑ کر دیکھ رہی تھی، جو موبائل پہ نمبر ڈائل کرنے لگا۔

''ہاں لیلیٰ! کتنی بھاگ دوڑ باقی ہے..... کل میڈیکل کے لئے جانا ہے..... پھر دو دن بعد ملتا ہوں۔ اوکے، سی یو۔''

فون بند کر کے اس نے پھر سے سر ٹیک کر آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

اسٹاک مارکیٹ ایک ہفتے سے مندی کا شکار تھی۔ اس اتار چڑھاؤ کی زد میں منصور بھی آ گیا تھا۔ اسے لاکھوں کا نقصان ہو رہا تھا۔ اس کا پراجیکٹ بھی کینسل ہو گیا تھا۔ مارکیٹ میں روپے کی گرتی ہوئی ساکھ سب تاجروں کے لئے تشویش کا باعث تھی۔ منصور، جو بہت ٹھنڈے مزاج کا تھا، اب ماتحتوں پہ چلّانے لگا تھا۔ گھر میں بھی اس نے ایک بار شاہم اور پھر بچوں کو اپنے غصے کا نشانہ بنایا۔ شاہم چپ چاپ برداشت کر گئی۔ ابھی اس نے آفس سے آ کر کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ دعا کو بخار تھا۔ شاہم نے منصور سے ڈاکٹر کے پاس چلنے کو کہا بھی تھا، مگر اس نے اسے اکیلے جانے کا مشورہ دے دیا۔ دو دن سے دعا کو سنبھال سنبھال کر وہ خود اتنی نڈھال ہو چکی تھی کہ شام سے اسے بھی بخار محسوس ہو رہا تھا۔ ابھی بھی وہ مسلسل رو رہی تھی۔

''یہ کیوں روئے جا رہی ہے؟..... پلیز اسے چپ کرواؤ۔'' منصور نے لیپ ٹاپ سے نظریں ہٹا کر کوئی تیسری بار یہ الفاظ دہرائے تھے۔ اب کی بار لہجے میں واضح جھنجلاہٹ تھی۔

''دعا بیٹا! کیا ہو گیا ہے؟..... چپ کر جاؤ میری جان! ابھی دوائی دی ہے نا، درد ختم ہو جائے گا۔ شاباش!''

منصور کی پشت پہ ایک غصیلی نگاہ ڈال کر اس نے بیڈ سے جوکر اُٹھا کر اُسے دیا۔ اس نے روتے ہوئے بڑھے ہوئے جوکر کو پرے کر دیا اور اپنا سر، شاہم کے کندھوں پہ ٹکا کے ہچکیوں سے رونے لگی۔

''اس کا رونا بند کیوں نہیں ہو رہا؟ فار گاڈ سیک، چپ کرواؤ اسے۔'' وہ خاصی برہمی سے کرسی دھکیل کے اس کے سر پر آ کھڑا ہوا۔ عمیر اور حمزہ، جو کارٹون دیکھ رہے تھے، انہوں نے والیوم کم کر دیا۔



''کل سے کہہ رہی ہوں کہ بخار ہے اسے، مگر آپ کو کیا؟ آپ کو اپنی جمع، تفریق سے فرصت ملے تو دھیان دیں۔ آپ کے اس روّیے اور روز روز کی چخ چخ سے گھر کا سکون تباہ ہو رہا ہے۔ بہتر ہے کہ آپ اپنا غصہ اپنے اسٹاف اور ورکرز پہ نکال کر آیا کریں۔ میں ملازمہ نہیں ہوں، جو جلی کٹی برداشت کروں۔ اینڈ کائنڈلی، آئندہ مجھ پر چیخنے کا مت۔'' رندھے ہوئے لہجے میں بولتے اس کی آواز خاصی تیز ہو گئی تھی۔

تینوں بچے سہم کر چپ ہو گئے۔ وہ دو دن سے دعا کو بہلا بہلا کر اس کی خوشامدیں کر رہی تھی۔ وہ دونوں بھائی واش روم تک اس کے بغیر نہیں جاتے تھے۔ منصور کا آف موڈ اُسے الگ بھگتنا پڑتا تھا۔

''بی ہیو یور سیلف، شاہم!''

شاہم کو اس روپ میں دیکھ کے اس کی حیرت سوا تھی۔ وہ ساکن ہی ہو گیا تھا۔

''اپنے بی ہیویئر کے بارے میں کیا رائے ہے آپ کی؟ اگر اتنی ہی نفرت ہے مجھ سے تو گھر سے باہر نکال دیں نا۔'' آنسوؤں کا پھندا گلے میں اٹک گیا تھا۔ بات کرنا دُشوار ہو رہا تھا۔

''کریں اپنا کام۔ میں باہر چلی جاتی ہوں۔ بہت بری لگتی ہوں۔'' وہ آگے بڑھنے لگی۔ منصور نے سختی سے بازو پکڑ لیا۔

''چھوڑیے میرا بازو۔'' اس نے رُکھائی سے کہا۔

''چھڑوا لو۔'' اس کی آنکھوں اور چہرے پہ بھی خفگی تھی۔

''جب بھی چھوڑنا ہے، آپ ہی چھوڑیں گے۔ میں اپنا آپ نہیں چھڑواؤں گی۔'' وہ منصور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے تھی۔

''اتنی مضبوطی سے پیر مت جماؤ کہ جب گرو تو سنبھل نہ سکو۔'' وہ کہہ کر رکا نہیں تھا۔

دعا کافی رو دھو کر اس کی گود میں ہی سو گئی تھی۔ عمیر اور حمزہ بھی سو گئے۔ منصور واپس نہیں آیا تھا۔ اس کی باہر جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ ہوش و حواس قائم ہوتے ہی اسے اپنی بدتمیزی کا احساس ہوا۔ وہ منصور سے ناراض ہو کر کیسے چین کی نیند سو سکتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی وہ باہر آ گئی۔ وہ لاؤنج میں صوفے پر نیم دراز تھا۔

''منصور.....!'' اس نے بہت آہستگی سے پکارا۔

''ہوں۔'' اس نے یکدم آنکھیں کھول دیں۔ وہ اس کے کافی قریب کھڑی تھی۔

''بہت رات ہو گئی ہے، اُٹھیں۔'' اس نے پونے دو بجاتی وال کلاک کی طرف دیکھا۔

اس کے جسم میں ذرا بھی حرکت نہ ہوئی۔

وہ نیچے قالین پہ اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

''ایم سوری منصور! بہت زیادہ فضول بول گئی میں۔ بہت اسٹوپڈ ہوں۔ جانتی ہوں کہ آپ کی آفیشل پرابلمز ہیں، آل ریڈی بہت ڈسٹرب ہیں۔ میں دعا کو لے کر بہت تھک چکی تھی۔ مینٹلی ایگزاسٹ ہو گئی ہوں۔ میں آپ سے اونچا بولنے کا تصور نہیں کر سکتی۔ پتہ نہیں، میں نے کیا کیا کہہ دیا۔'' وہ رونے لگی تھی۔ وہ بے چینی سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''پلیز پہلی اور آخری بار معاف کر دیں۔ میں..... پلیز۔''

''اُٹھو اور رونا بند کرو۔'' اس نے اسے اپنے برابر بٹھا لیا۔

''سارا قصور تمہارا بھی نہیں، میرا بھی ہے۔ میں بھی بہت ہائپر رہنے لگا ہوں۔ گھر سکون بہت بڑی نعمت ہوتا ہے۔ جس میں، میں خلل ڈالتا جا رہا ہوں۔ میری آفیشل پرابلمز کا تم سے کوئی تعلق نہیں۔ تم نے جو کیا، وہ صرف ری ایکشن تھا۔ دعا بیمار تھی، تمہارے ساتھ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہئے تھا..... خیر، میاں بیوی میں ایسی چھوٹی موٹی لڑائی ہو جاتی ہے۔ اتنا سیریس مت لو۔ معافی تو مجھے بھی تم سے مانگنا چاہئے۔''

منصور کے چہرے پہ اُلجھن کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے پوری سچائی سے اپنی غلطی کا اعتراف کر کے اسے بری الذمہ کر دیا تھا۔

منصور کو اس کا یوں معافی مانگنا بہت اچھا لگا تھا۔ اس سے بھلا کب کسی نے معافی مانگی تھی۔ اپنی غلطی کے باوجود۔

''تو پھر آپ یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟'' شاہم نے اس سے شکوہ کیا۔

''چلو۔'' وہ فوراً اُٹھ کھڑا ہوا۔

''اِدھر نہیں، اُدھر۔'' اس نے بیڈروم کی طرف جاتے منصور کا بازو پکڑ کر کچن کی طرف اشارہ کیا۔

''آپ نے کھانا نہیں کھایا، میں نے بھی نہیں کھایا۔ صرف رات کا کھانا ہی تو ساتھ کھاتے ہیں۔ آپ ٹیبل پہ نہیں تھے، میرا بھی دل نہیں چاہا۔'' وہ نروٹھے پن سے اسے بتاتی، کچن میں لے آئی۔

منصور کو ایک عجیب سی انہونی خوشی ہو رہی تھی۔ اس کے اندر کئی دنوں کا پلتا غصہ آہستہ آہستہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے منصور سے معافی مانگی تھی، اس کے ناراض ہو



ئی تھی، اس کی غیر موجودگی میں کھانا نہیں کھایا تھا۔

''کسی بھی انسان کو جب تک یہ احساس ہے کہ کوئی ہے جو میری پروا کرتا ہے تو وہ کبھی کمزور نہیں پڑتا۔''

☆☆☆

دستی گھڑی پہ سوا دس بجاتی سوئیوں کو ذرا غور سے دیکھ کر اپنے استقبال کے لئے ے اسٹاف کو سر کے مبہم اشارے سے گڈ مارننگ کہتے وہ اپنے آفس میں داخل ہو ۔ آج اس کا کام معمول سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ دو اہم میٹنگز تھیں۔ اسے ٹیکس کے سلسلے انکم ٹیکس آفیسر سے ملنا تھا۔ گودام کا چکر بھی لگانا تھا۔ اس حساب سے وہ کافی لیٹ ہو ا۔ بریف کیس ٹیبل پہ دھر کے، کوٹ کا اوپری بٹن کھولتے، لمبا سانس خارج کر کے ی پہ بیٹھا تھا، جیسے شکر ادا کر رہا ہو، چلو یہاں تک تو پہنچا۔ انٹرکام پہ سیکرٹری سے آج ن کی تفصیلات پوچھیں۔

''ایکسکیوزمی سر! صبح سے آپ کے لئے تین بار کسی شخص کی کال آ چکی ہے۔'' وہ اپنی ہ معلومات لے کر ریسیور رکھنے ہی والا تھا کہ دوسری طرف سے بھی تیزی دکھائی گئی۔

''کون تھا؟'' اس نے سرسری سا پوچھا۔

''نام نہیں بتایا۔ کافی insist (اصرار) کیا ہے۔ بہت رعب دار بلکہ غصیلی آواز تھی۔ وہ.....''

''ٹھیک ہے، اب کال آئے تو مجھے ٹرانسفر کر دیں۔'' غنی نے فضول نقش بیانی سے چھڑائی۔

لمحہ بھر کو اس نے سوچا۔ ''کون ہو سکتا ہے؟'' کاشا کے علاوہ اور کسی کا نام ذہن میں آ رہا تھا۔ کاشا کو یہاں کا چپڑاسی تک جانتا تھا، پھر وہ نام نہ بتانے والی حرکت نہیں کرتا تھا۔ ابھی وہ اندازہ لگا ہی رہا تھا کہ اسی گمنام شخص کی کال موصول ہو گئی۔

''یس، غنی اسپیکنگ۔''

''کاشا کہاں ہے؟ آج کل، اپنی مخصوص جگہوں پر بڑا کم کم نظر آتا ہے۔'' اس شخص نے غنی کو اپنا نام پوچھنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

''تم نے کاشا کا پوچھنے کے لئے مجھے فون کیا ہے؟ وہ کوئی گیدڑ یا چوہا ہے، جو چھپ کر کہیں بیٹھ جائے گا؟'' کاشا کا ذکر سن کر وہ تپا ضرور تھا، مگر اسے زیادہ غصہ اس شخص کے لہجے پہ آ رہا تھا، جو کسی گڑبڑ کی طرف اشارہ کرتا تھا۔

''شیر کو چوہا کیسے بنایا جاتا ہے، اس کا نسخہ جانی باؤ کو اپنے پُرکھوں سے ملا ہے
کہنے والی کی مکروہ ہنسی میں صاف دھمکی تھی۔

''واٹ ربش، سیدھی طرح بکو۔''

جانی باؤ کے نام سے اسے تھوڑی بہت واقفیت تھی، مگر وہ ذرا نہیں ڈرا تھا۔

''دیکھ شہزادے! ہم صرف نرمی سے بات کرتے ہیں اور سمجھاتے ہیں، بکنے وا
کیٹگری سے نہیں ہیں۔ ہمیں گلا پھاڑنے سے زیادہ آسان، اُنگلی دبانا لگتا ہے۔'' بہ
نڈر اور لاپروا لہجہ تھا۔

''کام کی بات کر رہے ہو یا فون رکھ دوں؟'' اس نے سختی سے کہا۔

''آج ساڑھے دس بجے آ جانا، تجھ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ پھر تُو ا
زبان میں کاشا کو سمجھا دینا۔ سنا ہے، تیری وہ مانتا ہے۔''

''مجھے کاشا کی کسی ایکٹیویٹی میں کوئی انٹرسٹ نہیں اور تم.....''

''مانا کہ تیری ناراضی ہے، مگر ہے تو تیرا جگر نا۔ کل کلاں کچھ ہو جاتا ہے تو سا
زندگی کا پچھتاوا ہے تیرے لئے۔''

غنی ساکت سا ہو گیا تھا۔ وہ شخص ان دونوں سے اچھی طرح آگاہ تھا۔

''کہاں آنا ہے؟'' اس کی آواز کافی دھیمی تھی۔

غنی نے مطلوبہ جگہ کا ایڈریس سن کر اس کی مزید بکواس سنے بغیر فون بند کر دیا۔

ٹھیک دس بج کر پچیس منٹ پر اس کی کار، پارکنگ ایریا میں جا رُکی تھی۔ وہ وقت
پابند تھا۔ مگر یہاں وہ جان بوجھ کر صرف پانچ منٹ قبل آیا تھا۔ وجہ کوئی خاص نہیں تھی۔
اس فون کال کو سوچ سوچ کر، اچھے برے اندازے لگا لگا کے اس کا ذہن اتنا اُلجھ گیا
کہ اس کی طبیعت بوجھل اور بدن دُکھنے لگا تھا۔ اپنی تمام مصروفیت ملتوی کر کے وہ آ
سے اُٹھ گیا۔ کئی بار اس نے سوچا، کاشا سے لاکھ ناراض سہی، مگر اسے یہ معاملہ اسی
معلوم کرنا چاہئے۔ اس شخص کی دھمکی بھری آواز نے اسے ایسا کرنے سے باز رکھا۔

وہ ابھی وسیع ہال کے بیچوں بیچ کھڑا اِدھر اُدھر متلاشی نظریں دوڑا رہا تھا کہ ویٹر اُ
کی طرف بڑھا۔

''سر! ٹیبل آپ کے لئے ریزرو ہے۔'' ویٹر اُسے مخصوص میز تک لے آیا، جہا
کرسی پر اس کی طرف پشت کئے کوئی موجود تھا۔ وہ اس کے بالکل سامنے والی کرسی
براجمان ہوا۔



''مجھے پتہ تھا، تم ضرور آؤ گے۔ کیونکہ.....''

''پلیز، کم ٹو دی پوائنٹ۔ آئی ہیو نو ٹائم۔'' وہ اس کا چھچھورا پن سننے کے لئے نہیں
آیا تھا۔

سفید کلف لگے سوٹ میں ملبوس گردن اکڑائے، چہرے پہ خباثت کی کرختگی، سیاہ گھنی
داڑھی مونچھیں، سوا چھ فٹ قد، بھرے ہوئے جسم والے اس بدمعاش صفت کو یہ بالشت بھر
کا چھوکرا بڑا کھلا تھا۔ اس کا بس چلتا تو اس کا تیا پانچا کر دیتا۔

''جانی باؤ کا آدمی ہوں۔ کاشا نے ان سے گلبرگ کی ایک کوٹھی کا سودا کیا تھا۔
کاغذات اس کے نام نہیں ہیں۔ بلیک میں قبضہ دے گا۔ تم جانتے ہو گے، اس طرح کی
ڈنبری میں دام کا کوئی مول نہیں ہوتا، طاقت کا ہوتا ہے۔ بس سودے بازی میں
تھوڑی سی اونچ نیچ ہو گئی ہے۔ کاشا اپنی بولی سے ایک روپیہ کم وصولنے پر تیار نہیں۔ جبکہ
جانی باؤ کی نظر اُس کی کوٹھی پہ ایسی ٹکی ہے کہ وہ چھوڑنے کو تیار نہیں۔ تم کاشا کو سمجھاؤ.....
میں ملا تھا اس سے۔ بڑی ہی اُلٹی کھوپڑی کا ہے۔ کیوں بھری جوانی کو کندھوں پر
اُٹھوانا.....''

''بس.....'' غنی نے ہاتھ اُٹھا کر اُسے منحوس بولنے سے روکا۔

غنی کے لئے یہ نئی خبر دھماکا تھی۔ وہ اپنے تاثرات پہ قابو پا کے خاموشی سے اُٹھ گیا۔
اُس کا اگلا کام، کاشا کو سارے شہر میں ڈھونڈنا تھا۔ اس کے تھکے ماندے اعصاب کو
لمبی نیند اور آرام کی اشد ضرورت تھی۔ کاشا کا یہ کارنامہ جان کر اس کا دماغ پھٹا جا رہا
تھا۔ پہلا نمبر اس نے جم کا ڈائل کیا، وہ وہاں نہیں تھا۔ الماس بائی نے کاشا کا نام سنتے ہی
وہ گوہر افشانیاں شروع کیں کہ غنی نے فون بند کر دیا۔ یقیناً کاشا نے اُس کا ناطقہ بند کر
رکھا ہو گا۔ کاشا سے واسطہ پڑنے والوں کی اس کی پیٹھ پیچھے زبان یوں ہی فراٹے بھرتی
تھی۔ آخری تلاش، ریس کورس کی تھی، وہاں بھی لاعلمی کا اظہار ہوا۔ جوں جوں وہ انکار
سنتا جا رہا تھا، اس کا خون مزید کھولتا جا رہا تھا۔

آخر کار وہ مڈ نائٹ کلب آیا تھا۔ یہاں کاشا کی عیاشی کا سب سامان موجود تھا۔ اس
کلب کی ممبر شپ، غنی کے پاس بھی تھی۔ یہ بھی کاشا کی مہربانی تھی۔ جو وہ اپنے لئے پسند
کرتا تھا، وہی غنی کے لئے بھی ماسوائے عورت کے۔ غنی اُس کی ہر برائی میں برابر چلتا، مگر
جہاں عورت کا معاملہ آتا، وہ بدک جاتا۔

گاڑی پارک کرنے میں اسے کافی وقت ہوئی تھی۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ کلب کی

روشنیاں اپنے جوبن پر تھیں۔ تیز انگلش میوزک کے ساتھ تالیوں اور چیخنے چلانے کا
بھی عروج پر تھا۔ فینسی لائٹس کی مدھم روشنی جل بجھ رہی تھی۔

اس نے مجمع کے اندر گھس کے چہروں کو جانچا۔ کتنے ہی نازک بدن اُس کے
مس ہوئے تھے۔ جھومتے ہوئے کسی کے سلکی بال اُس کے خدوخال سے ٹکرائے
یہاں بھی نہیں تھا۔ وہ راستہ بناتا اسی کلب کے فرسٹ فلور پہ آ گیا، جہاں گندی
بکتے جواری اور عادی شرابی، حال سے بے حال تھے۔ شراب پینے والوں میں عورتیں
شامل تھیں، جو اور کسی میدان میں تو نہیں، البتہ یہاں مرد کے کندھے سے کندھا ملا
کوشش کرتی تھیں۔ کاؤنٹر پہ کھڑے وکی نے اس کی طرف دیکھتے آشنا سی مسکر
اُچھالی۔ اس کلب کا ایک فلور باقی تھا، جہاں کوئی یوں منہ اُٹھا کر نہیں جا سکتا
کاؤنٹر پہ آ گیا۔

''کاشا آیا تھا؟''

وہ جواب دینے کے بجائے آخری فلور کی طرف سر اُٹھا کر ریلنگ کو دیکھ کر ہنسنے لگا

''بہت پیئے ہوئے تھے۔ وہاں ریلنگ پہ کسی حسینہ.....''

''جسٹ شٹ اپ وِکی! اُس کی بکنگ چیک کرو۔'' وہ بھنا گیا۔ وہ مسکرا
بریک لگا کے کی بورڈ پہ اُنگلیاں چلانے لگا۔

کسی کی بکنگ کا پول کھولنا یہاں کے قاعدے قانون کے خلاف تھا۔ یہی وجہ تھ
یہ شہر کا سب سے مہنگا اور محفوظ ترین کلب سمجھا جاتا تھا، جہاں پر آپ کو نقاب پوش
ضرورت نہیں۔

''روم نمبر زیرو زیرو نائن میں کاشا موجود ہے۔''

غنی کو اپنی کنپٹیاں تپتی محسوس ہوئیں۔ اس کا سارا جسم دہک رہا تھا۔ وہ لمبے
بھرتا، سیڑھیاں چڑھ گیا۔ وکی نے بے بسی سے اسے جاتے دیکھا۔ وہ اسے روک نہیں
تھا۔ مگر سکیورٹی گارڈ اس کے راستے میں آ گیا تھا۔

''رُکو..... کدھر جاتے ہو؟ سارے کمرے بُک ہیں۔''

اُس کے تاثرات، گارڈ کو ٹھیک نہیں لگے تھے۔ وہ تیز تیز چلتا اُس کے سا
گیا۔ غنی نے اسے دائیں بازو سے پرے دھکا دیا۔

اسے لگ رہا تھا، وہ کاشا کو مار دے گا یا خود کو کچھ کر لے گا۔ گارڈ اپنا فرض
کے چکر میں اب کی بار بھاگتا ہوا اُس کے سامنے ڈٹ گیا تھا۔



بولا نہیں، بکنگ فل ہے۔ گارڈ دکھاؤ۔'' پھولتی سانسیں ہموار کرتے اس نے
ے ڈھلکتی بندوق سیدھی کی۔ غنی نے اپنا سارا غصہ اُس پہ نکالنے کا سوچا۔ ڈھلکتی
کو جھٹکے سے کھینچ کر بٹ کو سیدھا کیا۔ اس اچانک افتاد پہ گارڈ سنبھل نہ سکا۔ پانچ
داروں نے اسے زمین پر لٹا دیا۔ غنی نے اسے دفاع کا موقع ہی نہیں دیا۔ بندوق
پھینک کر وہ لمبی راہداری میں آ گیا۔

روم نمبر زیرو زیرو نائن کو دھڑ دھڑاتے اُسے پسینہ آ چکا تھا۔

کاشا کے کمرے کی اندرونی صورتِ حال سے آگاہ ہونے کے باوجود دستک دینے
رات بھلا غنی کے سوا اور کون کر سکتا تھا؟ یہ دوسرا موقع تھا۔ پہلی بار بھی کاشا جان گیا
باہر کون ہے۔ اب بھی اس نے کافی تسلی و اطمینان کا مظاہرہ کیا۔ باہر کھڑے اپنا
کھولاتے غنی نے ساتویں منٹ میں چوتھی بار دروازہ پیٹ ڈالا تھا۔ کاشا بدن پر بنیان
تا نکلا تھا۔ غنی کے اتنے سخت تاثرات نے اسے ٹھٹکا دیا۔

''جانی باؤ سے کیا جھگڑا ہے تیرا؟''

غصے کو ضبط کرتا وہ آخری حد پہ کھڑا تھا۔ وہ اتنے عرصہ بعد ملے تھے، وہ بھی اس انداز
۔ وہ دو دن کی دُوری پہ ایک دوسرے کو کتنی دیر بانہوں میں لپٹائے رکھتے تھے۔

''تُو شہر بھر میں خجل خوار صرف یہ پوچھنے کے لئے ہو رہا تھا؟ گھر آ جاتا یا.....''

''میری بات گول مت کرو۔'' وہ چبا چبا کر بولا۔

''میں گلبرگ والی کوٹھی، جس میں رہتا ہوں، وہ سیل کر رہا ہوں۔'' کاشا نے اس کی
موں میں جھانک کر بتایا۔ وہ بھلا کیوں خائف ہوتا۔

''کیوں؟..... وہ ماہم کی ملکیت ہے۔ تمہارے نام منتقل ہو گئی ہے؟''

''جانی باؤ، انڈر ورلڈ کا بندہ ہے، قبضہ گروپ۔''

''ایکسکیوز می سر! یہ کیا بدتمیزی ہے؟ آپ نے ہمارے گارڈ پہ قاتلانہ حملہ کیا ہے،
سے زخمی کر دیا ہے۔'' کلب کا منیجر دو تین لوگوں کے ساتھ پہنچ گیا تھا۔

غنی یوں بیگانہ بنا کہ جیسے یہ سب کسی اور سے کہا جا رہا ہو۔

کاشا نے باری باری دونوں کو دیکھا اور معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا۔

''ایسا کرو۔'' وہ ہپ پاکٹ سے والٹ نکالنے لگا۔ ''یہ رکھو۔'' اس کے ہزار ہزار
کے نوٹ نکال کر اس منیجر کی طرف بڑھائے۔ ''اسے ہسپتال لے جاؤ۔ پٹیاں وغیرہ
کراؤ، گلوکوز چڑھاؤ، جو پیسے باقی بچیں، اس کی عیادت کے لئے جاتے ہوئے بکے خرید

لینا۔ کیونکہ مرا نہیں۔ نبض چل رہی ہے۔"

"مگر سر! یہ سراسر زیادتی....."

"اے منیجر! زیادہ بڑھ بڑھ کے طرف داری نہ کر۔ جس طرح غنی نے اس کا
اوقات یاد دلائی، یہ نہ ہو، میں تجھے تیری اوقات یاد دلا دوں۔ اس پہ تو ترس کھا کے
نے رقم دے دی ہے، تجھے کون دے گا؟ چل جا یہاں سے۔ کہیں میرا بھیجہ نہ
جائے۔"

اس نے سر نفی میں ہلا کے اسے ہاتھ سے بھی دفع ہونے کا اشارہ کیا۔ منیجر منہ
کڑوے گھونٹ پی کے مڑ گیا۔

"یو آر گونگ گڈ کاشا!" غنی نے اس کے ہاتھ سے والٹ چھین لیا۔ "اسی
دُھن پہ تُو اپنی عاقبت کو آگ میں جھونک رہا ہے۔ تُو کتنا ذلیل انسان ہے، کسی نے
محبت میں اپنا بسا بسایا گھر اُجاڑ دیا اور تُو بدلے میں اُسے اور برباد کرے گا۔ جس پہ
عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہا ہے، کبھی اس عورت سے بھی پوچھ، جو تیری ماں
کہاں سے بھیجتی ہے تجھے۔ ایک جوان بیٹے کا بوڑھی بے بس ماں خرچہ پورا کرنے
لئے کتنے پاپڑ بیلتی ہے۔ اس کا جرم صرف تجھ جیسے سنپولیے کو جنم دینے کا ہے۔ کبھی
مجھے لگتا ہے، تُو لالچی نہیں، صرف بدلہ لے رہا ہے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے تیرے
سکون اُترتا ہے۔ لاشعوری طور پر ہر عورت کو اپنی فرسٹریشن کا شکار بنا چکا ہے۔ تیرا
نے تیرے ساتھ اچھا کیا یا برا، اس کی سزا تُو ہر عورت کو دیتا ہے۔ اگر ماں سے نفرت
تو اس کا دیا کیوں کھاتا ہے؟ دوسروں کو خالی کرتے کرتے تُو خود کھوکھلا ہو چکا ہے۔
تُو کرتا پھر رہا ہے، جس دن مرا، تیرے جنازے کو کندھا دینے چار لوگ بھی نہیں
گے۔ پھر تم....."

"تم تو آؤ گے نا۔ مجھ جیسے گنہگار کو چار کی نہیں، صرف تیرے کندھے کی ضرور
گی۔" وہ جذباتیت میں تلخ بولتے غنی کو ٹوک کر استفسار کر رہا تھا۔

"جسٹ.....شٹ اپ۔"

غنی بکتا جھکتا، سلگتے جذبات لئے واپس مڑ گیا۔

☆★☆

اماں حاجراں کا بڑا داماد وفات پا گیا تھا۔ ماجدہ، اماں حاجراں اور ان کا بیٹا، جو
تھا، سب چھٹی لے کر گاؤں چلے گئے تھے۔ منصور چاہتا تھا کہ ماجدہ رک جائے



م کیسے سنبھالے گی۔ کام بہت زیادہ تھا۔ انہیں تین دن بعد لوٹنا تھا۔ مگر شاہم نے
بھی جانے کی اجازت دے دی۔

دن کی شروعات اس نے معمول کے مطابق ناشتہ بنانے سے کی۔ حمزہ اور عمیر کے
لنچ باکس تیار کئے۔ انہیں روانہ کر کے دعا کو ناشتہ کروایا۔ منصور بھی اُٹھ کے کمرے
چلا گیا۔ دعا کھیلنے لگی تو وہ برتن دھونے لگی۔ ابھی وہ برتن دھو رہی تھی کہ منصور چلا آیا۔

"آپ تیار نہیں ہوئے؟" اس کے خیال میں منصور، آفس کی تیاری کر رہا تھا۔

"نہیں۔ میرا آفس جانے کا موڈ نہیں۔" وہ اس کے پاس ہی کھڑا ہو گیا۔

"موڈ کو بھلا کیا ہوا؟" مسکراتے ہوئے وہ جلدی جلدی ہاتھ چلانے لگی۔

"اس لئے کہ مجھے لگ رہا ہے کہ تم تنہا کام نہیں کر سکو گی۔ میں تمہاری ہیلپ کراؤں
" وہ دھوئے ہوئے کپ اُٹھا کر خشک کرنے لگا۔

"کیا کر رہے ہیں منصور! میں سب کر لوں گی۔" منصور کے اس احساس نے اس
اندر خوشی کی لہر دوڑا دی۔

"یس.....آئی ایگری..... یو کین۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو پھر؟" اس نے پلیٹ پکڑنا چاہی، مگر منصور نے چھوڑی نہیں۔

"تو پھر یہ کہ تین روز کا پرابلم ہے۔ ہم مل بانٹ کے کریں گے، ہنسی خوشی۔" اس نے
ے کئے برتن اٹھا کے اسٹینڈ میں دھرے۔"

"آپ آفس سے ڈیلی آف کریں گے؟"

منصور کبھی بھی چھٹی نہیں کرتا تھا۔

"آج چھٹی، باقی کے دو ہاف ڈے۔" اس نے اپنی پلاننگ بتائی۔

"کچن دھونا ہے، وہ میں خود کر لوں گی۔" برتن دھو کر اس نے نل بند کر دیا۔

"میں کمرے کا بکھیڑا سمیٹ لوں۔ بچے ہر چیز اُلٹ پلٹ کر گئے۔ باقی صفائی مل کر
ریں گے۔" اس نے سارے لاؤنج کی چیزیں سمیٹی تھیں۔ تھوڑے سے کپڑے تھے۔
نے مشین بھی لگا لی۔ وہ کپڑے نتھارتی جاتی اور وہ نچوڑ کر پھیلاتا جاتا۔ جینز اور آستین
ڑھ گئے اس نے کام کرتے ہوئے اپنی شرٹ ساری بھگو لی تھی۔ بچوں کے آنے سے
گھنٹہ قبل دونوں نے سارے کام ختم کر کے کچن سنبھال لیا۔ وہ ایپرن باندھ کے
سے پہ پیاز کی کٹنگ کر رہا تھا۔ شاہم نے چائے بنائی۔ ایک کپ اس کے آگے رکھ دیا۔

"تھینک یو۔" اُس کی کٹنگ بھی مکمل ہو گئی تھی۔

شاہم نے پیاز کو تلنے کے لئے ہلکی آنچ پہ رکھ دیا اور خود چائے پینے لگی۔

''میں نے سنا ہے، جو عورت کچن سنبھال سکتی ہو، وہ شوہر بھی اچھی طرح سنبھال لے ہے۔'' وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔

''بشرط یہ کہ شوہر آپ جیسا نہ ہو۔'' اس نے دوبدو جواب دیا۔

''مجھ جیسے سے کیا مراد ہے؟'' اس نے مصنوعی گھورا۔

''جو پکڑائی ہی نہ دے۔'' چائے کا کپ رکھ کر وہ پیاز ہلانے لگی۔ وہ مسکرا کے رہ گ منصور اُس کے ساتھ تقریباً سارا کام کروا چکا تو شاہم نے اسے کپڑے تبدیل کر کے لئے زبردستی بھیجا۔ وہ چاول نکال کر صاف کرنے لگی۔ اتنے میں منصور بھی آ گیا۔

''شاہم! آئی تھنک، بچوں کو ہم دونوں لینے جاتے ہیں۔'' وہ کچھ زیادہ ہی موڈ میں تھ

''ابھی مجھے چاول پکانے ہیں۔'' شاہم نے اپنی مصروفیت بتائی۔

''چاول شام میں بنا لینا۔ ہم آتے ہوئے روٹیاں بازار سے لے آئیں گے۔''

''اچھا..... اوکے، میں چینج کر لوں۔'' وہ جلدی سے رضامند ہو گئی۔

وہ دونوں، ماں باپ کو یوں اکٹھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور تمتماتے سرخ چ لئے باری باری ان سے لپٹ گئے۔ سارے راستے وہ سیٹوں کے درمیان پھنسے رہے۔

شاہم نے ٹیبل پر کھانا لگایا اور منصور نے انہیں چینج کروا دیا۔ وہ دونوں پہلی با دوسرے کے ساتھ خود کو مکمل اور بہت خوش محسوس کر رہے تھے۔

☆★☆

شام سے چھائے بادل، رات کو برسے تھے۔ ماہم کی جان، بادل کا ٹکڑا د نکل جاتی تھی۔ اسے گہرے بادلوں، بارش اور بجلی کی کڑک سے بہت ڈر لگتا تھا۔ نے اسے رات بھر تک سونے نہ دیا۔ کھڑکی، دروازے بند کئے وہ بیڈ پہ دبکی بیٹھی ملازمہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی ورنہ وہ اسے اپنے پاس روک لیتی۔ تیز بارش کی بوچھا بجلی کی چمک، کھڑکی سے ٹکرا رہی تھی۔ بجلی کی چمک کا کھڑکی کے شیشے سے ٹکرانا ا خوفزدہ کر رہا تھا۔

وہ بڑی ہمت کر کے، سہمتے ہوئے اُٹھی تاکہ پردے برابر کر سکے۔ بیڈ تک کا فاصلہ اس نے بمشکل طے کیا۔ پردہ بائیں ہاتھ میں پکڑے اس نے اپنی لئے باہر روش پہ سکیورٹی گارڈ کو دیکھا جو وہاں نہیں تھا۔ روش پہ کاشا کی مرسڈیز کھڑ



''کاشف.....'' اس کے منہ سے اتنا ہی نکلا تھا کہ اس نے لان میں زمین پر لیٹے اپنے ساتھ چمٹاتے بارش میں بھیگے کاشا کو دیکھا۔

وہ تیزی سے پلٹی اور الماری کھول کے اس کے سب سے نچلے خانے سے چھتری لی صوفے پہ پڑی چادر اُٹھا کے اپنے گرد اچھی طرح لپیٹ کے وہ باہر لان کی طرف ل۔ اس کا سارا خوف زائل ہو گیا تھا۔ اسے صرف یہ یاد تھا کہ کاشف لان میں پڑا ۔ وہ احتیاط سے بھاگتی ہوئی اس تک پہنچی۔

''کاشف!..... کاشف!'' وہ اسے جھنجوڑنے لگی۔

کتا اس نے چھڑوا دیا، جو زبردستی اس نے پکڑ رکھا تھا۔ بارش میں بھیگنے سے کتا بھی لا ہو رہا تھا۔ چھوٹتے ہی وہ دُور بھاگ گیا۔

''کیا ہے؟..... مجھے اس سے..... باتیں کرنا..... ہیں..... تم جاؤ.....''

اس نے بہت زیادہ پی رکھی تھی۔ آنکھیں بے تحاشا سرخ تھیں۔ ماہم کے ہاتھ پیر ول گئے۔ وہ مکمل بھیگ چکا تھا۔ اس نے چھتری اُس پہ کر دی۔

''اُٹھو کاشف!..... اندر چلو۔'' وہ رو دینے کو تھی۔

چوکیدار باہر کیبن میں تھا۔ سکیورٹی گارڈ اپنی ڈیوٹی سے غافل کوارٹر میں پڑا سو رہا تھا۔

''سکیورٹی.....'' اس نے زور سے آواز دی، جو بارش کے شور میں دب گئی۔

''نا..... نہیں..... یہیں..... تکیہ لا..... دو..... مم..... مجھے نیند..... آ رہی ۔'' وہ رک رک کر بات کر رہا تھا۔ آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔

''اُٹھو پلیز!'' اس نے پورا زور لگا کے اسے تھوڑا سا اوپر کیا۔

''کہاں..... جانا ہے؟'' وہ گرتے گرتے بیٹھا تھا۔

''اندر..... بیڈ روم میں جا کے سو جانا۔'' وہ بھی بارش میں گیلی ہو گئی تھی۔ وہ اُٹھ نکار رہا تھا۔

''نہیں، مجھے..... یہیں سونا ہے..... تم..... تم بھی لیٹ جاؤ۔'' اس نے ماہم کو بازو سے پکڑ کر کھینچا۔

''نہیں..... اُٹھو کاشف!''

اب اُس نے کھڑے ہو کر اس کا بازو اوپر کو کھینچا۔

''اچھا.....'' وہ لڑکھڑاتے ہوئے اُٹھا۔

ماہم نے اُس کے مان جانے پر خدا کا شکر ادا کیا۔ اسے سہارا دے کر بڑی مشکلوں

سے بیڈ روم تک لائی۔ وہ بیڈ کے وسط میں گر گیا۔ نیند سے اس کی آنکھیں بھری تھیں
چھتری پرے پھینک کر خود پر سے اس نے گیلی چادر بھی اُتار کر کاؤچ پہ رکھ دی اور
کے بوٹ اُتارنے لگی۔

بوٹ اُتار کر ٹانگیں اوپر کیں اور اسے کندھوں سے کھینچ کر سر تکیے پہ رکھا۔ اسے یہا
تک لانے میں وہ نڈھال سی ہو کر نیچے کارپٹ پہ گر سی گئی۔

وہ پچھلے دو ہفتوں سے بڑا پُراسرار سا ہو گیا تھا۔ کافی خاموش، گم صم سا۔ اپنے آ
سے اور اردگرد سے کافی لاپروا۔

''کاشف.....!'' اس نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

وہ رو رہی تھی۔ اسے کاشا کی حالت پہ رونا آ رہا تھا۔ وہ اس طرح سے تو کبھی
نہیں رہا تھا۔ اب اسے کیا ہو گیا ہے؟ وہ بہت زیادہ پینے لگا تھا۔ چین اسموکر بن گیا
آج اس کا یوں نشے میں دھت ہو کر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھنا۔ وہ جتنی بھی ڈرنک
لیتا، اس کے حواس قائم رہتے تھے۔ یقیناً کچھ غلط ہوا ہے، جو وہ ماہم سے بھی شیئر نہیں
چاہتا۔ حالانکہ اس نے دو ایک بار پوچھا بھی۔

وہ اس کا ہاتھ چھوڑ کر کارپٹ پہ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس کے چہرے پہ
پھیرنے لگی۔ چوڑی پیشانی سے بھیگے بالوں کو انگلیوں سے سمیٹ کر پرے کیا۔ آنکھ
کے پپوٹے ہلکے ہلکے سوجے تھے۔ رنگت چند ہی دنوں میں زردی مائل ہو گئی تھی۔ شیو
ہوئی تھی۔ اس نے ہمیشہ اپنا بہت خیال رکھا تھا۔

صبح بہت خاموشی سے طلوع ہوئی۔ اس نے گھر کے کام نمٹانے میں کافی احتیاط
کام لیا۔ اسے کاشا کے اُٹھ جانے کا خدشہ تھا۔

وہ دوپہر کے دو بجے اُٹھا تھا، جب وہ کچن میں آخری مراحل میں کام نمٹا رہی
کسمسانے کے بعد وہ بیڈ سے نیچے ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ دونوں ہاتھوں میں سر گرا
کندھوں کو جھکائے بیٹھا رہا۔ آنکھوں کو ہتھیلیوں سے مسل کر وہ سستی سے اُٹھا۔ پا
گلاس بھر کر پیتے ہوئے وہ اپنے مخصوص ریفریجریٹر کی طرف آ گیا۔ ابھی اُس نے
پکڑا ہی تھا کہ یکدم اُس کی نظر اپنی شرٹ پہ چلی گئی۔ کین واپس رکھ کر وہ پلٹا۔ گلاس
پہ دھر کر بالوں میں اُنگلیاں پھنسائے وہ رات کا واقعہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ا
کچھ کچھ یاد تھا۔ اور یہ بھی کہ اس نے کل یہ کپڑے نہیں پہنے تھے۔ بارش کا خیال آ
اس نے زور سے ماہم کو پکارا۔



''ماہم.....!'' دوسری پکار پہ وہ حاضر تھی۔

''جی.....جی۔'' اُس کی بوکھلاہٹ بہت واضح تھی۔

''رات کیا ہوا تھا؟'' اس کا لہجہ تفتیشی تھا۔

''رات بارش ہوئی تھی اور آپ بہت ڈرنک کئے ہوئے.....'' وہ آنکھوں میں نمی
واپس پلٹی ہی تھی کہ کاشا نے اُس کی کلائی جکڑ لی۔

''کیوں کر رہے ہو ایسا؟.....تم اتنے کیئر لیس تو کبھی نہیں تھے۔ رات تم نشے میں
اگر گاڑی کسی سے ٹکرا جاتی یا پولیس تمہیں اریسٹ کر لیتی، تو؟.....اگر اپنا خیال
رکھنا تو مجھے رکھ لینے دو۔ مجھے تمہاری یہ خود سے غفلت قطعاً برداشت نہیں ہو پا رہی۔
کہ برے سہی، مگر تمہیں تکلیف میں دیکھا میرے بس سے باہر ہے۔ پلیز، سنبھالو خود
'' اس کے مقابل کھڑے یہ سب کہتے ہوئے اس کے آنسو نکل رہے تھے۔

''میرا سوٹ کیس تیار کر دو۔'' اس سے نظریں چرا کے وہ بڑا دھیما بولا۔

''کہاں جا رہے ہو؟''

''امریکہ.....امریکہ جا رہا ہوں۔'' وہ ابھی بھی نظریں چرائے ہوئے تھا۔

''امریکہ.....تم امریکہ کیوں.....''

کاشا نے اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔

''تم کہتی ہو، میں بہت برا ہوں۔ مگر جھوٹا نہیں ہوں۔ آئی سویئر، زندگی میں پہلی بار
.....پہلی بار سچ بولنے کے لئے ہمت نہیں پاتا۔ اینڈ آئی ریکویسٹ یُو پلیز.....پلیز کچھ
پوچھو۔ تھوڑا سا انتظار کرو اور پھر سب کلیئر ہو جائے گا۔'' اس کے گالوں سے آنسو پونچھ
راس نے ماہم کو سینے سے لگا لیا۔

☆★☆

وہ واش روم سے، ہاتھ سے ہی پانی چہرے سے پونچھتا باہر نکلا۔ وہ ابھی آفر
آیا تھا۔ رحیم خان، پانی کا اگلاس لئے کھڑا تھا۔

''تھینک یُو رحیم!'' اس نے گلاس پکڑ لیا۔

''کاشا صاب آیا تھا۔'' رحیم خان نے اطلاع دی۔ وہ پانی پیتے پیتے رُک گیا۔

''کیا کہہ رہا تھا؟''

''آپ کے لئے میسج چھوڑا ہے۔ رات دس بجے ایئرپورٹ پہنچ جائیں۔ وہ ام
رہے ہیں۔ آپ سے ملاقات ضروری ہے۔''

رحیم خان اسے سوچوں میں گھرا چھوڑ کے چلا گیا کاشا نے اس سے اپنے
جانے کی خواہش کا ذکر کیا تھا، جس کے لئے وہ لیلیٰ کو سیڑھی کے طور پر استعمال کر
تھا۔ اُس بات پر ان کے درمیان تھوڑی بحث بھی ہوئی تھی۔ کاشا نے لیلیٰ سے شادی
اور ماہم کا گھر بھی سیل کر دیا، تب بھی غنی کے ذہن کے کسی خانے میں یہ نہیں آ
امریکہ چلا جائے گا۔ اس سے قبل اُس نے کبھی امریکہ جانے کی خواہش کا ذکر نہیں
نہ ہی غنی کو کبھی اتنے سالوں سے اس کی باتوں سے پردیس کی خوشبو آئی تھی۔ مگر
ہی اس نے امریکہ جانے کا شوشہ چھوڑ دیا، جسے غنی نے اپنی مصروفیات میں بھلا دیا

کاشا کی فطرت سے واقف ہونے کے باوجود کہ وہ اس سے نہ اتنا سنجیدہ
ہے، نہ ہی جھوٹ بولتا ہے، غنی نے اس کی وہ بات فراموش کر دی۔ وہ آج رات
وقتی یوں اچانک، چپ چاپ، ناراض یہ ملک چھوڑ کے جا رہا تھا۔ غنی اس سے
ناراض نہیں تھا۔ نہ ہی وہ ناراضی کے اس عرصہ کو اتنا طول دینا چاہتا تھا۔ بس ا
شعوری طور پر کاشا کا انتظار رہا تھا۔ اور شاید ایسا ہی کچھ انتظار، کاشا کو بھی رہا ہوگا۔

پورے دس بجے اُس نے اپنی گاڑی، اسٹینڈ پہ لگائی۔ اُسے کاشا کے یوں



انے پر دکھ تھا۔ کئی بار اس کا جی چاہا کہ اب عین وقت پر بھی نہ جائے۔ مگر وہ ایسا
تو سکتا تھا، کرنا مشکل تھا۔

ایئرپورٹ پر کافی گہما گہمی تھی۔ اُس نے متلاشی نگاہیں اِدھر اُدھر دوڑائیں۔ اتنے رش
یک چہرہ تلاشنا کافی مشکل تھا۔ وہ موبائل نکال کر کاشا کو کال کرنے لگا۔

''غنی!'' بہت عرصہ بعد اس نے غنی کا نام پکارا تھا۔

''ہاں کاشا!..... میں ایئرپورٹ پر ہوں۔ تم.....''

''ارائیول ڈیپارچر کی طرف آ جاؤ۔''

موبائل جیب میں رکھ کے وہ اس طرف بڑھ گیا۔ اس نے تھوڑے سے فاصلے سے
شا کو دیکھ لیا مگر پہچاننا مشکل سے۔ اس نے داڑھی رکھ لی تھی۔ غنی نے دُور سے
۔غنی پہ نظر پڑتے ہی اس نے اپنے ساتھ لیلیٰ کو بیگ پکڑا کر جنگلے کے دوسری طرف
ے کا کہہ دیا۔

دونوں ایک دوسرے کے قریب پہنچ کر رکے، چند لمحے خاموش رہے۔ غنی کو سینے سے
نے میں کاشا نے پہل کی تھی۔

''نہیں آیا نا، تُو۔'' اس نے گلے لگتے ہی شکوہ کیا۔

''تُو نے بلایا ہی کب؟..... اب بھی خود آ گیا ہوں۔''

''میں تیرا انتظار.....'' وہ دونوں ایک ساتھ بولے۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر
انے لگے۔

''کیوں جا رہا ہے امریکہ؟..... روکا تھا میں نے تجھے۔ تُو نے میری کبھی نہیں مانی۔
بھی کر لی اپنی مرضی۔'' غنی بہت دکھ سے یہ سب کہہ رہا تھا۔

''تُو ہمیشہ کہتا تھا کہ میں بہت لکی ہوں اور آلویز ونر بھی۔ بٹ یو ریئلی ڈونٹ نو یار!
ا ایم جسٹ لوزر..... جسٹ لوزر۔''

غنی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کاشا کہہ رہا ہے۔ غنی نے بہت غور سے اسے
کھا۔ اس کا لہجہ اور انداز بہت تھکے تھکے سے تھے۔ آنکھیں ابھی بھی سرخ تھیں۔ بڑھی
ئی شیو اور زردی مائل رنگت، آنکھوں کے نیچے سیاہی مائل سے حلقے۔ اسے کیا ہوا تھا؟
اس طرح سے کیوں سوچنے لگا تھا؟

''اتنی ڈس اپائنٹ منٹ (نا اُمیدی) کاشا؟'' وہ حیران تھا۔

''ڈس اپائنٹ منٹ نہیں، ریئلیٹی آف لائف۔ (نا اُمیدی نہیں، زندگی کی حقیقت)''

اس نے ذرا سا پیچھے مڑ کر جنگلے کے اس پار دیکھا۔

''ماہم کا کیا کیا؟'' غنی نے بھی جنگلے کے اُس پار منتظر لیلیٰ کو دیکھا۔ اُسے ماہم کا خیال آ گیا۔

کاشا اس سوال پہ کسی گہری سوچ میں اُتر گیا۔

''میں نے..... اپنی زندگی میں شاید دو عورتوں سے محبت کی ہے۔ ان میں سے ایک میری ماں ہے..... بہت سال لگے مجھے یہ confess (اعتراف) کرنے میں۔ بلیوی یار! مجھ سے دوغلا بن کر نہیں جیا جاتا۔ میں نے یہ ڈیسائیڈ کر لیا تھا کہ ہر برائی چھوڑ چھاڑ کے ایک صاف ستھری لائف گزاروں گا..... بٹ ناٹ، یہاں بدقسمتی نے دوسری بار میرا دامن تھام لیا۔ وہ، جو شہ رگ سے بھی قریب تر ہے، آئی سوئیر یار! اُسے بھی میری توبہ قبول نہیں۔ میں نے کبھی اس سے نہیں مانگا، اسے نہیں پکارا۔ مگر وہ..... وہ صرف مانگنے والوں کو ہی نہیں دیتا، سب کو دیتا ہے۔ مگر مجھے نہیں دیا۔ ایک عورت ہی مانگی تھی نا، کیا جا اس کا..... میں نے بہت کوشش کی، غنی!..... مگر ہار گیا ہوں۔''

وہ بولتے بولتے تھک گیا۔ اس کا ہاتھ غنی کے کندھے پہ تھا۔ وہ کم فہمی سے اس کی گفتگو کو سمجھ رہا تھا، وہ دوسری عورت کون تھی؟ کاشا کیونکر یہ سب کہہ رہا تھا۔ اُس کے اندر اتنی بڑی تبدیلی کیسے آ گئی؟ اور محبت..... محبت سے اس کا لین دین کبھی رہا ہی نہیں تھا۔

''دوسری عورت؟'' اس نے استفسار کیا۔

''تم نے میرے بہت سے کام کئے ہیں، آخری دو اور ہیں۔'' اس نے غنی کے سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔

''یہ ماہم کو دے دینا۔'' اس نے کوٹ کی اندرونی جیب میں سے سفید رنگ کا لفافہ نکال کر اسے تھمایا۔

''کیا ہے اس میں؟'' اس نے لفافہ دیکھ کر کہا۔

''ماہم..... کے..... ڈائیووَرس پیپرز ہیں۔ اسے کل کی ڈیٹ میں وہ گھر بھی خالی کرنا ہوگا۔ وہ لوگ قبضہ لینے آ جائیں گے۔''

اس نے غنی سے نگاہیں چرا لی تھیں۔

''کاشا!..... اتنا بڑا دھوکا.....''

ملال میں گھرے غنی کے منہ سے بس اتنا ہی نکل پایا۔

''محبوب کو منزل کے قریب لے جا کر دھوکا دیا جائے تو اُس کی بے وفائی پہ بھی یقین



جاتا ہے اور نفرت کرنا بھی آسان ہو جاتا ہے۔ اگر میں یہ سب نہ کرتا، تو وہ شاید میری واپسی کی منتظر رہتی۔''

غنی، ماہم کی بحث میں مزید اُلجھنا نہیں چاہتا تھا جبکہ طلاق کے کاغذات بھی اس کے ہاتھ میں تھے اور کاشا ملک چھوڑ کر جانے والا تھا۔ پہلے بھی ان کے مابین ''عورت'' ہی جھگڑے کا باعث تھی۔

''دوسرا کام؟''

''میری واپسی تک یہیں ٹھہرنا۔ پاکستان میں ہی، اسی گھر میں۔ جب تک میں لوٹ آؤں۔''

کاشا کی واپسی کا سن کر غنی کے چہرے پہ ہلکا سا خوشی کا تاثر اُبھرا۔

اس نے کاشا کا ہاتھ تھام لیا۔

''تمہارے لئے بھی کچھ چھوڑا ہے میں نے۔ بس عادت ہے، تم سے کچھ بھی نہ چھپانے کی۔ میرے کمرے میں جو میرا پرسنل لاکر ہے، اس میں ایک فائل پڑی ہے، اسے پڑھ لینا۔''

''تمہاری طبیعت ٹھیک ہے کاشا؟''

غنی کو وہ اور اُس کی معنی خیز گفتگو بہت پُراسرار لگ رہی تھی۔

''ہاں، ٹھیک ہے۔ کیا ہونا ہے مجھے..... تم اپنا بہت سا خیال رکھنا۔'' اس نے غنی کے گال پہ محبت سے ہاتھ پھیرا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی ہلکی نمی تھی۔

''کاش! ہم دونوں کبھی جدا نہ ہوتے۔''

''کاش! میں نے کبھی تمہاری مان لی ہوتی۔'' اس نے غنی کو دوبدو جواب دیا۔ اب وہ ایسا ہی محسوس کرتا تھا۔

کاشا نے کلائی پہ بندھی گھڑی میں ٹائم دیکھا۔ امریکہ کی فلائٹ کے لئے اناؤنس منٹ ہونے لگی تھی۔

''جب جانا ہی تھا، پھر گھر کیوں نہیں آئے مجھ سے ملنے؟'' اناؤنس منٹ نے غنی کے دل کی دھڑکن تیز کر دی۔ بچھڑنے کا وقت آ گیا تھا۔

''آ جاتا تو سوال کرتا۔ میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔'' اُس نے سچائی بتائی تھی۔ وہ اُس کے پاس جا سکتا تھا، مگر وہ غنی کے سوالات سے ڈرتا تھا۔ غنی سے مباحثہ جیتنے کے لئے اس کے پاس دلائل نہیں رہے تھے۔

''چلنا چاہئے۔'' کاشا نے جنگلے کے اس پار ہاتھ ہلاتی لیلیٰ کو دیکھ کر کہا۔

''اُس دوسری عورت کا نام بتاتے جاؤ، جس سے تمہیں محبت ہے۔'' غنی کو یا آ گیا تھا۔

''چھوڑو پرے۔'' وہ اُس کا ذکر گول کر رہا تھا۔

''وہ دوسری عورت..... ما..... ماہم ہے، کاشا؟''

غنی شاید پہلی بار اتنی جلدی گہرائی تک پہنچ گیا تھا، حالانکہ ماہم کی آزاد کاغذات اس کے ہاتھ میں مقید تھے۔

''بہت یاد آئے گا۔''

کاشا نے خاموشی سے اسے گلے سے لگا لیا۔ ایک دوسرے کے سینے سے دونوں بہت بے قرار تھے۔ کاشا کی آنکھوں سے آنسو نکل کر غنی کے کندھے میں ہونے لگے۔ غنی بھی بہت ضبط کے باوجود رو پڑا۔

☆☆☆

ایئرپورٹ سے گھر تک کے تمام راستے، وہ آنکھوں کی نمی رگڑتے آیا تھا۔ کا اس کی بول چال تین مہینے سے بند تھی۔ اس کے دل پہ کسی قسم کا بوجھ نہیں تھا۔ اب اپنا دل پھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ گاڑی پورچ میں لگا کے وہ سیدھا کاشا کے بیڈروم اس کی سیف کا پرسنل لاکر غیر مقفل تھا۔ سامنے ہی واحد فائل کھلی پڑی تھی۔

''شیخ زید ہسپتال۔'' فائل پکڑے وہ بڑبڑایا۔

کسی انہونی کا دھڑکا اسے لرزا گیا تھا۔ ہلکی کپکپاتی انگلیوں سے اسے کھولا۔

یہ کاشا کی میڈیکل رپورٹ تھی۔

''کک..... کاشا..... ایچ آئی وی پازیٹو۔''

اسے اپنے گرتے وجود کو سنبھالنے کے لئے سیف کا سہارا لینا پڑا تھا۔ اسے لگ تھا کہ کمرے کی بھاری چھت اس کے اوپر آ گری ہے۔ اُس کی آنکھیں دُھندلا گئی تھیں کاشا نے واقعی اس سے کبھی کچھ نہیں چھپایا تھا۔ ابھی ایئرپورٹ پہ اسے کاشا کی بہت معنی خیز اور اُس کی شخصیت پُراسرار لگ رہی تھی۔ اب اس کا راز کھلا تھا۔ اس جملے جو اس کے سر پر سے گزر گئے تھے، اب سمجھ آ رہے تھے۔ اس نے خود کو بدنصیب تھا، بالکل درست تھا وہ۔

وہ ڈینجر زون کا شیدائی، خطرات کو چیلنج کرنا اور مسائل کو چٹکی سے حل کرنے



ے کے اس کڑے امتحان کے چیلنج کو قبول نہیں کر سکتا تھا۔ وہ آلویز ونر باؤنڈری کے ار بے بسی سے کھڑا تھا۔ اس نے زندگی میں جو کچھ کیا، اس کی سزا اسے کتنی مہنگی، ا قابل علاج بیماری کی صورت ملی تھی۔

غنی فائل دبوچے نیچے بیٹھا رو رہا تھا۔ کاشا کا دُکھ اس کا اپنا تھا، جیسے کاشا کا گھر چھوڑ ے کے بعد بھی اس کا تھا۔ وہ اور کاشا کبھی بھی ناراض نہیں ہوئے تھے۔ چند لمحے کے ی ان کی بول چال بند نہیں ہوئی تھی۔

اس نے سات سالوں میں کاشا کو ہر برائی میں ملوث پایا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ بھی اس اتھ دینے لگا تھا۔ وہ اس کی ہر کمینگی میں برابر رہتا، مگر کاشا فاتح تھا۔ عورت ان کے خاموش تنازع رہی تھی، مگر جھگڑے نے کبھی اتنا طول نہیں پکڑا تھا۔ وہ کاشا کے نے کبھی اونچا نہیں بولا تھا۔ اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا تھا۔ ملازمین کو سختی سے ت تھی کہ کاشا کے کام میں تاخیر نہیں ہونی چاہئے، اسے زبان سے کہنا نہ پڑے۔ وہ لی سے اس کے دلائل، وضاحتیں اور فلسفے سنتا تھا۔ وہ رات جب تک کاشا کو دیکھ نہ اس سے بات نہ کر لیتا، اسے نیند نہیں آتی تھی۔ اس نے کاشا کو بہت سے روپ میں ا۔ وہ درندہ تھا اور فرشتہ بھی۔ وہ دونوں ہنستے مسکراتے اپنے اپنی ہی موج میں زندگی ر رہے تھے کہ اچانک ایک عورت ان کے بیچ آ گئی۔

ماہم..... ماہم پر ہی ان کی پہلی بار گرما گرمی ہوئی تھی۔ ماہم سے لیلیٰ اور اختتام پہ ماہم۔

غنی نے کاشا سے الگ ہو کر اس کے بارے میں بہت سوچا تھا۔ خاص طور پر تب، اسے کاشا نے بتایا تھا کہ وہ ماہم کا گھر بیچ رہا ہے۔ وہ کاشا کے کردار کی اچھائیوں برائیوں کا آنکھوں دیکھا گواہ تھا۔

غنی جو بزنس کر رہا تھا، اس میں آدھے سے بھی زیادہ شیئر کاشا کے تھے۔ اس کے ا صرف تھوڑی سی رقم تھی۔ کاشا نے اسے پیروں پر کھڑا کرنے کے لئے مکمل طور پر ٹ کیا تھا۔ آفس صرف غنی جاتا تھا۔ ہر بزنس ڈیل، میٹنگ، مشینری کا حساب کتاب، انتظام سب غنی کے ہاتھ میں تھا۔

شروع میں غنی اسے آفس کے مسائل اور ترقی کے متعلق آگاہ کرتا تھا، تب اس نے ٹ کیا کہ کاشا کو بزنس میں ذرا بھی دلچسپی نہیں۔ وہ بولتا جاتا اور کاشا کی لاپروائی عروج ہوتی۔ اس نے غنی سے کبھی حساب کتاب نہیں کیا تھا۔

غنی نے ایمان داری سے اپنا فرض نبھاتے ہوئے اپنا اور کاشا کا جوائنٹ اکا
کھلوا لیا، تاکہ اسے جب ضرورت ہو، مانگنا نہ پڑے۔ وہ کبھی کبھار ہی رقم نکالتا
سارے منافع کی پھر سے انویسٹ منٹ کرتا گیا اور یوں بزنس بھی ترقی کرتا چلا گیا
نے پوری ایمانداری سے اپنی اور کاشا کی پائی پائی کا حساب رکھا تھا، جس کے مطابق
70 فیصد کا شیئرز ہولڈر تھا۔

غنی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ماہم کے آٹھ، دس کروڑ کاشا کو اپنی طرف کیوں
تھے جبکہ اس سے زیادہ کا مالک تو وہ خود تھا۔ کیا اسے پیسے کی ہوس تھی؟ اس نے
اس کی شخصیت میں کسی قسم کا لالچ محسوس نہیں کیا تھا۔ نہ ہی کسی اور چیز کی طمع کی بُو اس
لہجے سے آتی تھی۔ وہ اپنی جیب سے لاکھوں روپے عورتوں پر خرچ کر دیتا تھا۔ ہزار
فقیروں اور ضرورت مندوں کو دے دیتا۔ اس کا اکاؤنٹ امریکن ڈالرز سے بھرا پڑا
اسے ماہم کے پیسے کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔ ضرورت تو شاید شاہم کی بھی نہیں تھی۔

پھر لیلیٰ کی ڈرامائی انٹری..... امریکہ جانے کی خواہش۔ لیلیٰ کے آنے سے پہلے
اس نے کبھی امریکہ کا نام نہیں لیا تھا۔ وہ ٹی وی دیکھتے ہوئے، گوروں کو منہ بھر بھر
گالیاں دیتا تھا۔ اپنے ملک سے محبت نہیں تھی، مگر اپنے ملک کی آزادی سے محبت تھی
آزاد پنچھی اُونچی اُڑان بھرنے والا تھا۔ وہ لیلیٰ کی مدد لئے بغیر بھی امریکہ جا سکتا
اس نے یہ سب کیوں کیا تھا؟ وہ ہر کام بہت سوچ سمجھ کر کرتا تھا۔

ان تمام سوالوں کے جواب صرف کاشا ہی دے سکتا تھا۔ غنی صرف سوچ سکا
رات بہت گزر چکی تھی۔ وہ کارپٹ سے اُٹھ کر بیڈ پہ آ گیا۔ اسے اپنے بستر پہ
کہیں نیند نہیں آتی تھی۔ مگر یہ رات اسے کاشا کے بستر پر ہی سو کر گزارنا تھی۔

☆☆☆

ماہم، طلاق کے کاغذات تھامے بے یقینی اور حیرت سے ششدر کھڑی تھی۔
صدمہ بہت جان لیوا ہوتا ہے، وہ بھی اس صدمے سے گزر رہی تھی۔

وہ اتنی آسانی سے کیونکر یقین کر لیتی کہ کاشا بلاوجہ ہی یوں اسے طلاق دے گا
کل دوپہر کے بعد اس نے کاشا کا سوٹ کیس تیار کر دیا تھا۔ وہ اتنا خاموش
اور گم صم تھا کہ ماہم اس سے کوئی سوال کر ہی نہ پائی۔ حتیٰ کہ اس نے یہ بھی نہ
واپس کب آئیں گے۔

کاشا نے کہا تھا۔ ''سب کلیئر ہو جائے گا۔''



کلیئر کس انداز میں ہوا تھا۔ اس کے کسی بھی عمل سے یہ نہیں لگ رہا تھا کہ وہ انتہائی
قدم اُٹھانے جا رہا ہے۔ اس نے جاتے ہوئے پورچ میں کھڑی گاڑی میں بیٹھنے سے قبل
ماہم کو ساتھ لگا کر اس کی پیشانی پہ بڑی نرمی سے بوسہ دیا تھا۔ پہلی بار اس کی اتنی نرمی نے
ماہم کی آنکھوں میں نمی بھر دی تھی۔ وہ محض رات سے سہی، اس کی قربت میں تھی۔

اس نے کاشا کی ہر شکایت کو دُور کر دیا تھا۔ اُس کی ہر تلخی کو صبر سے پی لیا تھا۔ وہ
اُف بھی کئے بغیر اس کے رنگ میں ڈھلتی چلی گئی۔ اُس کی بے اعتنائی سہہ کر بھی اُسے
محبت دی، اس کی محبت میں اپنا بسا بسایا گھر، شوہر اور بچے چھوڑے۔ خاندان کی عزت داؤ
پہ لگائی۔ وہ اُسے اپنے قدموں کی دُھول کر گیا تھا۔ وہ اُسے کس کے آسرے پہ چھوڑ گیا
تھا۔ اس کا سب کچھ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اس کے پاس واپسی کا کوئی راستہ، کوئی رشتہ
نہیں بچا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی، وہ اس پہ یہ ظلم ڈھا گیا۔

''جلدی نکل جانا یہاں سے ماہم! وہ لوگ کچھ ہی دیر میں قبضہ لینے آ جائیں گے۔''

غنی نے اس کے نام کے ساتھ بھابی کا لفظ ہٹا دیا تھا۔ وہ اپنی بے بسی پہ رو رہی تھی،
غنی کو اس کے رونے میں کوئی دلچسپی تھی، نہ ہی ترس آ رہا تھا۔ اسے کاشا کے ماہم کے
متعلق کہے الفاظ یاد آئے۔

''ماہم بری عورت ہے۔''

کاشا کی بیماری اور دُوری کا دکھ، وہ جس دوراہے پہ کھڑے تھے، اس کا آغاز اس
عورت نے کیا تھا۔ غنی کا سارا غصہ اس کے لئے تھا۔ اس کا رونا بھی اسے زہر لگ رہا تھا۔
اسے پتہ تھا کہ اس کے پاس کوئی پناہ گاہ نہیں۔ مگر اسے کیا، وہ اس سے ذرا بھی ہمدردی
نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کاشا نے جتنا اس سے کہا تھا، اس نے کر دیا تھا۔ وہ واپس جا رہا تھا۔
اسے اب ماہم کے پاس مزید نہیں ٹھہرنا تھا۔

''پلیز! کوئی میری مدد کرے۔ پلیز!''

وہ دلدوز انداز میں چیخنے لگی تھی۔ وہ بے تحاشا رو رہی تھی۔ غنی نے مڑ کر دیکھا۔ اس کا
رونا کسی بھی نرم دل انسان کی برداشت سے باہر تھا۔ وہ بری ضرور تھی، مگر اس وقت
لاوارث، بے یار و مددگار تھی۔

غنی چند لمحے سوچتا رہا، پھر طیش میں اس کی طرف بڑھا۔

''اُٹھو..... چلو میرے ساتھ۔ میں پہنچاتا ہوں تمہیں اصل ٹھکانے پہ..... میں کرتا
ہوں مدد۔''

وہ اسے بازو سے پکڑ کر تقریباً گھسیٹتا ہوا باہر لے جانے لگا۔

☆★☆

''شاہم!.....شاہم! چھوڑو سارے کام اور ادھر آؤ۔''

وہ کچن میں شیف کے ساتھ شام کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی، جب منصور
آیا۔ وہ شاپنگ کرنے گیا ہوا تھا۔ اسے اپنے لئے خریداری کرنا تھی۔ اس نے شاید شاہ
کے لئے بھی کچھ خریدا تھا۔

''ایک منٹ منصور! میں ابھی.....''

''نو.....نو۔ ظفر کر لے گا۔ تم ابھی میرے ساتھ آؤ۔'' اس نے شاہم کی کلائی پکڑ لی

''اچھا بابا!.....اور ظفر! یہ آنچ ہلکی کر دو، میں آتی ہوں۔'' وہ اسے ہدایت کر
منصور کی طرف آ گئی۔

''کیا ہے منصور؟'' اس نے کچن سے نکل کر پوچھا۔

''دیکھو گی تو پتہ چلے گا۔'' وہ بہت خوش لگ رہا تھا۔

کمرے میں آ کے وہ ٹھٹک گئی۔ بیڈ پہ چار، پانچ خوب صورت سی ساڑھیاں پڑ
تھیں۔

''یہ سب کس لئے؟'' اس نے خوشی اور اشتیاق سے سب دیکھا۔

''تمہارے لئے؟ اگر کسی اور کے لئے لاؤں بھی تو تمہیں ہی برا لگے گا۔''
خوشی سے چہکتے لہجے میں شرارت تھی۔

''اچھا..... یہ جو پنک والی ساڑھی ہے، یہ ابھی پہن کے دکھاؤ۔'' اس نے پنک
اُٹھا لیا۔

''مگر منصور!..... میں نے کبھی ساڑھی نہیں باندھی۔ میں کیسے.....'' وہ تذبذ
میں تھی۔ اس نے ساڑھی صرف دوسروں کو پہنتے دیکھا تھا۔

''میں تمہیں اس جینز، شرٹ اور کُرتے میں دیکھ دیکھ کے تھک گیا ہوں۔ لگتا ہی
کہ تم میرڈ ہو۔ تھوڑا چینج کرو۔ اور جہاں تک ساڑھی باندھنے کا مسئلہ ہے، وہ میں حل
دیتا ہوں۔ کیا خیال ہے؟'' اس نے شرارت سے آفر دی تھی۔

منصور کی نظروں اور الفاظ سے وہ محجوب سی ہو گئی۔

''اب اتنی بھی اناڑی نہیں ہوں۔'' نروس ہوتے اس نے ساڑھی اُٹھا لی۔

منصور نے پہلی بار اپنی پسند سے اس کے لئے شاپنگ کی تھی۔ وہ اسے قطعاً انکار



رکتی تھی۔ اب تو اس کا موڈ بھی بہت خوشگوار رہنے لگا تھا۔ وہ اس پر اور بچوں پر توجہ بھی
تا تھا۔

''اور اگر میں گر گئی منصور؟'' وہ جاتے جاتے رُکی۔

''کوئی بات نہیں، میں تھام لوں گا۔''

اس کے قریب ہو کر اس نے شاہم کو اپنی نظروں میں مقید کیا۔ وہ سرخ چہرہ لئے،
رخ موڑ کے ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔

باہر کسی انجانی گاڑی کے ہارن دینے پر چوکیدار نے گیٹ سے باہر جا کر تھوڑا جھک
کر آنے والے سے شناخت مانگنا چاہی۔ مگر وہ ڈرائیور کی ساتھ والی سیٹ پہ ماہم کو دیکھ کر
حیرت سے چپ رہ گیا۔ وہ غنی سے کوئی سوال نہ کر سکا۔ چوکیدار وہی پرانا تھا، ماہم کو وہ
کیسے بھول سکتا تھا؟ اس گھر کے مالک سے اسے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ اس عورت
کے لئے گیٹ کھولا جائے کہ نہیں۔

گیٹ کھلنے پر غنی گاڑی اندر لے آیا۔ ماہم نے خائف ہوتے اس گھر اور غنی کو
دیکھا۔ سارے راستے غنی کے تاثرات اتنے پتھریلے رہے تھے کہ وہ اس سے کچھ نہ پوچھ
سکی کہ مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟ پھر اس کے پاس کون سا کوئی ٹھکانہ تھا۔ وہ کسی بھی
محفوظ جگہ پر لے جاتا، مگر یہاں نہیں، جہاں وہ لے آیا تھا۔

''یہی تمہاری اصل اور محفوظ پناہ گاہ ہے، اس کے مکینوں کے دل بہت وسیع ہیں۔
''تم جیسی'' کو کسی نہ کسی کونے کھدرے میں جگہ مل ہی جائے گی۔ اُترو نیچے۔''

غنی نے ''تم جیسی'' بہت چبا کر کہا تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھ نہیں رہا تھا، جبکہ وہ
ساکت تھی۔ زندگی نے اسے کس مقام پر لا پٹخا تھا۔ غنی نے بازو آگے کر کے اس کی طرف
کا دروازہ کھول دیا۔

اس کے منجمد وجود میں لرزش ہوئی۔

اس کے اُترتے ہی اس نے گاڑی تیزی سے موڑ لی۔

☆★☆

''منصور.....!'' وہ بہت گھبرائی سی تھی۔

منصور ایک جھٹکے سے صوفے سے اُٹھا۔ اس نے چمکتی، توصیفی نگاہوں سے شاہم کا
بغور جائزہ لیا۔ گلابی رنگ اس کا پسندیدہ تھا اور شاہم پر جچ بھی بہت رہا تھا۔

''دیکھو.....دیکھو نا پریٹی وومن!'' وہ شرارت سے گنگنایا۔ شاہم مزید جھینپ گئی۔

''سیریسلی یار! بہت زبردست لگ رہی ہو۔ بالکل ڈریم گرل۔'' منصور اتنی ملا
اور لگاوٹ سے اس کی تعریف کر رہا تھا۔ خوشی اس کے بھی انگ انگ سے پھوٹنے لگ
''آپ کی پسند بھی لاجواب ہے منصور!'' اس کا اشارہ ساڑھی کی طرف تھا۔
''اچھا جی۔''
منصور نے اس کے کندھے کے گرد بازو لپیٹ کر اسے ساتھ لگا لیا۔ شاہم
اچانک التفات کے لئے تیار نہیں تھی۔ منصور کی قربت اسے سُن کر رہی تھی۔
''صاحب جی!.....صاحب جی! وہ باہر۔''
حواس باختہ سی ماجدہ، دستک دیئے بغیر داخل ہوئی تھی۔ شاہم اس سے بھی
پھرتی سے منصور سے الگ ہوئی۔
''کیا ہے ماجدہ؟''
''وہ صاحب جی! ..... باہر آئیں، جلدی سے۔'' اس نے اُڑتے ہوئے تا
کے ساتھ صرف اتنا ہی کہا اور باہر پلٹ گئی۔
''منصور.....!'' وہ ایک قدم آگے بڑھا ہی تھا کہ شاہم نے بازو پکڑ لیا۔ ''پلیز
مت جائیں۔''
اُس کا لاشعور یک دم کھٹکنے لگا تھا۔ منصور نے شاہم کی بدلتی رنگت کو دیکھا۔
''ڈونٹ وری، یار! آ جاؤ تم بھی میرے ساتھ۔'' منصور نے اُس کا ہلکا سرد ہو
تھام لیا۔
بیرونی دروازے کے اس پار ماہم تھی یا قیامت۔ سارے ملازمین کو اطلاع
تھی۔ سب اردگرد کھڑے تھے اور ان کے بیچ متورم چہرہ اور اُجاڑ حلیہ لئے ماہم
سر جھکائے تھی۔
شاہم نے رُکتی سانسوں نے منصور کو اور منصور نے شاہم کو دیکھا۔ اس نے منصو
ہاتھ پہ دباؤ بڑھا دیا۔

☆★☆

اُٹھو کاشا!..... بیڈ ٹی تیار ہے۔''
چائے کی ٹرالی، بیڈ روم کے وسط میں کھڑی کر کے وہ کاشا کی طرف آ
اوندھے منہ لحاف میں دبکا پڑا تھا۔
''اے کاشا! اُٹھو۔'' اس نے زور سے اسے جھنجوڑا۔



''ڈیلی بکواس کرتا ہوں، مجھے مت جگایا کرو۔ پتہ نہیں، تمہیں نیند بھی آتی ہے کہ
سویرے سویرے نازل ہو جاتی ہو۔''
س پہ ابھی بھی نیند کا خمار تھا۔
صبح جلدی اُٹھنا اچھی بات ہے۔ اور بائی دا وے، ساڑھے نو ہو چکے ہیں۔'' وہ دھم
ا کے بیڈ پہ گری۔
''جو بھی ہے، نہیں اُٹھا جاتا مجھ سے۔'' وہ کسمسا کے رہ گیا۔
''تمہیں ڈاکٹر نے ایڈوائز کی تھی، ڈیلی ایکسرسائز کی۔ تم نے ایک دن بھی عمر نہیں
اس نے کمبل اس کے منہ سے کھینچا۔
''ہوں.....نہیں ہوتی۔''
''میڈیسن لی تھی، رات کو؟'' اس نے بیڈ کراؤن پہ پڑی اُس کی میڈیسن دیکھی۔
''ہوں۔'' وہ ہلکی غنودگی میں تھا۔
ب اس نے سارا کمبل کھینچ دیا تھا۔
''سو اسٹوپڈ لیلیٰ!'' وہ بے دلی سے اُٹھ گیا۔
ہ اسے دھمکاتا، سلیپر پیروں میں اڑس کے واش روم میں چلا گیا۔ لیلیٰ چائے بنانے
اس کے چائے تیار کرنے تک وہ بھی باہر آ گیا۔
''میرے بغیر چائے تمہارے حلق سے نہیں اُترتی۔'' منہ ہاتھ دھو کے وہ کافی ہشاش
تھا۔
''نہیں.....آج تم میرے ساتھ باہر نکلو گے۔ جب سے آئے ہو، اپارٹمنٹ میں
ہو۔'' اس نے اپنی پلاننگ بتائی۔
ہ صوفے پہ اس کے پاس آ بیٹھا اور اس سے چائے کا کپ پکڑ لیا۔
''میں کہیں نہیں جاؤں گا۔'' اس نے کپ منہ کو لگا لیا۔ ''اوں ہوں..... وِد آؤٹ
'' اس کے منہ کا ذائقہ خراب ہو گیا تھا۔
''یہ ضروری ہے۔''
''مجھ سے نہیں ہوتا یہ سب۔'' چمچہ بھر چینی اپنے کپ میں ڈالی۔
''کرتے رہو اپنی مرضی۔ میں جا رہی ہوں۔ گو ٹو ہیل۔'' وہ ناراض ہو کے اُٹھ گئی۔
نے بھی اسے روکا نہیں تھا۔

☆★☆

''منصور! آپ ان کو سکول چھوڑ دیں گے؟''

عمیر کے بیگ میں اس کی کتابیں رکھتے اس نے اخبار پڑھتے منصور سے کہا۔ منصور کو بھی جلدی جانا تھا۔ وہ بھی ان کے ساتھ ہی ٹیبل پر بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا۔

''ان کی وین نہیں آئی؟'' اخبار سے دھیان ہٹا کر اس نے جوس کا گلاس اُٹھایا۔

''آئی تھی۔ مگر یہ دونوں لیٹ تھے۔ آپ یہ تکلیف کر لیجئے پلیز!''

بیگ کی زِپ بند کر کے وہ منصور سے مخاطب تھی۔

''اوکے فائن۔ عمیر کو دودھ کا گلاس دو، اس نے نہیں لیا۔'' جوس کے گھونٹ بھر پھر سے اخبار کی طرف متوجہ ہو گیا۔

عمیر نے برا سا منہ بنا کے باپ کو دیکھا۔ اسے دودھ پسند نہیں تھا۔ اسے روز ڈ کر پلایا جاتا تھا۔

''تم چیٹنگ کرنے سے باز نہیں آؤ گے؟ چلو پیو۔'' اس نے مصنوعی غصے ڈانٹتے، گلاس اس کے منہ سے لگا دیا۔ حمزہ نے عمیر کو چڑایا تو اس نے مُکا اُس کے پر دے مارا۔

''عمیر! کیا بدتمیزی ہے؟'' شاہم نے اسے گھورا۔

''ماما! میری بچھ (بس)'' دعا جو کرسی پہ بیٹھی اپنی گود میں رکھی پلیٹ میں سلائس انڈا کھا رہی تھی، اس نے ہاتھ اوپر کر کے ماں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

''تمہاری بس میں کرواتی ہوں۔ آدھا سلائس ویسے ہی ہے۔ کیا کھایا ہے تم ذرا میں ان کو فارغ کر لوں، آتی ہوں تمہاری طرف بھی۔'' شاہم نے ٹشو، ڈبے کرا سے پکڑایا، تاکہ وہ ہاتھ صاف کر لے۔

''شاہم! وہ کہہ رہی ہیں، انہیں ناشتہ نہیں کرنا۔'' ماجدہ، ناشتہ کی ٹرے واپس تھی۔ ''رات کے کھانے کی ٹرے بھی ویسے ہی پڑی ہے۔''

ماجدہ کی وہ سے مراد، ماہم تھی۔ جو اوپر اپنے ہی کمرے میں ٹھہری تھی۔

منصور کا منہ کی طرف جاتا گلاس رک گیا۔ اس نے شاہم کو دیکھا۔

''اوکے..... میں خود دیکھتی ہوں۔''

شاہم نے منصور کو بغور دیکھ کر کہا تھا۔ منصور اس کے آ جانے پر ذرا چپ شاہم اسے پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''آپ جلدی کریں، بچے لیٹ ہو جائیں گے۔''



''چلو، ہری اپ بوائز!'' منصور، اخبار کو گول کر کے فوراً اُٹھ گیا۔

''اللہ حافظ، پاپا کی جان!'' اس نے جھک کر بیٹی کا گال چوما۔

''اپنا خیال رکھنا۔ اللہ حافظ!'' بیرونی برآمدے میں شاہم سے بریف کیس پکڑ کر اس بہت دھیمے سے کہا۔ عمیر اور حمزہ، گاڑی میں بیٹھ گئے تھے۔

''اللہ حافظ!'' گاڑی کے گیٹ سے نکلتے ہی وہ اندر آ گئی۔ ناشتے کی ٹرے ماجدہ ٹیبل پہ ہی رکھ دی تھی۔

''ماجدہ آپا! میرے ساتھ آئیں۔''

ماجدہ نے ٹیبل سے برتن اُٹھانا چھوڑ کر دوبارہ ٹرے اُٹھا لی۔ دروازہ کھلا تھا۔ ماہم بیڈ ی تھی۔

''ناشتہ کیوں نہیں کیا؟'' رُوکھے سے انداز میں اس نے سیدھا پوچھا۔

وہ تین دن سے آئی ہوئی تھی اور آج ان دونوں کا سامنا ہوا تھا۔ شاہم نے اس کے آنا یا کچھ پوچھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

''بھوک نہیں۔'' شاہم کا اندازِ تخاطب اس نے محسوس کیا تھا۔

''یہاں کوئی تمہارا ذاتی ملازم نہیں۔ نہ ہی کسی کے پاس اتنا فضول ٹائم ہے کہ تمہاری ں کرے۔ آئندہ ٹرے واپس نہیں آنی چاہئے۔ اور ہاں ماجدہ آپا! اگر یہ ناشتہ نہ کریں دوپہر کا کھانا بھی نہ بھجوانا۔''

اس کے جھکے سر کو گھورتی وہ واپس مڑ گئی۔

منصور اور اس کے درمیان خاموش کشیدگی ختم ہوئے دن ہی کتنے ہوئے تھے۔ ں اور ملازمین کے ساتھ وہ نارمل رہتے تھے۔ انہوں نے کبھی ان پر کچھ ظاہر نہیں نے دیا تھا۔

شاہم کی طرف سے نہیں، مگر منصور کا رویہ کھنچا کھنچا ہی رہتا تھا۔ شاہم نے بھی ہمت ں ہاری تھی۔ اس نے پوری سچائی اور لگن سے منصور کو زیر کر ہی لیا تھا۔ اس کی بے ئی کو صبر سے برداشت کیا تھا۔ ابھی وہ اپنی قربانی اور محنت کا صلہ ہی نہ پا سکی تھی کہ وہ اسے سب کچھ چھیننے چلی آئی تھی۔

اس سب کے باوجود ماہم تھی تو بہن۔ شاہم اتنی سخت دل بھی نہ تھی۔ ماہم اس سے ا سال بڑی تھی۔ اس نے ہمیشہ شاہم کا خیال رکھا تھا۔ بس اس نے ذرا سی کوتاہی برتی ر شاہم کا سب کچھ لٹ گیا۔

کچن میں آ کر وہ آنکھوں کی نمی کو پلکیں جھپکا جھپکا کر خشک کر رہی تھی، ماجدہ بھی آ گئی۔

''کیا کرنے لگی ہیں ماجدہ آپا؟'' رُخ موڑتے ہی اس نے ماجدہ سے پوچھا۔

''کچن سمیٹنے لگی ہوں۔''

''تم اوپر کمرے کی صفائی کر لو۔ کچن میں دیکھ لیتی ہوں۔'' وہ ماہم کا نام نہیں لیتی تھی۔ اوپر سے مراد، ماہم کا کمرا ہی تھا، جہاں وہ پہلے رہتی تھی۔

''ادھر آ جائیں صوفے پہ، صفائی کرنا ہے۔''

ماجدہ، ڈسٹنگ کے لئے کپڑا ہاتھ میں پکڑے کھڑی تھی۔ وہ اُٹھ کے صوفے پہ گئی۔ تکیے کراؤن پر رکھ کے وہ بیڈ شیٹ درست کر کے بچھانے لگی۔

''ماجدہ! بچے..... بچے کہاں ہیں؟'' تین دن بعد اس نے کوئی سوال کیا تھا۔ چادر درست کرتے اس کے ہاتھ ذرا کی ذرا رُکے۔

''اسکول گئے ہیں۔'' بے تاثر سے لہجے میں اس نے بتا دیا۔

''اور..... دُعا؟''

''وہ..... کھیل رہی ہے۔''

ماہم کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس گھر میں آ کے اسے پہلا خیال بچوں کا ہی آیا تھا جن کی شکلیں ابھی تک نہیں دیکھی تھیں۔ بیٹے اس قابل ہو گئے تھے کہ اسکول جانے لگے تھے اور بیٹی چلنے لگی تھی۔ منصور اتنا سخت دل کب سے ہو گیا کہ اس نے بچوں کو اس سے ملوایا بھی نہیں تھا۔

''شاہم نے شادی نہیں کی؟'' اس گھر کی تبدیلیوں سے وہ واقف نہیں تھی۔

''کر لی ہے۔'' ماجدہ نے چادر کی شکنیں دُور کیں اور تکیے درست کر کے رکھنے لگی۔ وہ بھی شوہر اور اولاد والی تھی۔ ماہم کے ساتھ بھی اس نے ایک عرصہ گزارا تھا۔ وہ ان سے دُور پار کے رشتے داروں کے ہاں نوکر تھے۔ وہ مالکوں کی ٹیڑھ، سیدھی نہیں کر سکتے تھے۔ ماجدہ کو ایک عورت ہونے کے ناتے ماہم پہ بہت غصہ یا شاید نفرت سی تھی۔ جس گھرانے سے وہ تھی، وہاں عورت کو شوہر کی عزت اور غیرت پکارا جاتا تھا۔ شوہر، مجازی خدا مانا جاتا تھا۔ ماہم کی ان حرکات پہ وہ توبہ استغفار کرتی تھی۔ ماہم کے آ جانے سے اسے شاہم کا گھر خطرے میں پڑتا محسوس ہو رہا تھا۔

''بچوں کی دیکھ بھال کے لئے گورنس ہو گی۔''



اس کے منہ سے بچوں کا لفظ، ماجدہ کو اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ مگر وہ اس سے کوئی بحث نہیں کر سکتی تھی۔

''نہیں۔'' اس نے یک لفظ کہا۔ وہ تیز تیز ہاتھ چلاتی ڈسٹنگ کرنے لگی۔ وہ اسے سننا نہیں چاہتی تھی۔

''شاہم یہاں کیوں رہتی ہے؟''

ماجدہ اُس دن سے کھانا یہ کہہ کر لاتی تھی کہ شاہم بی بی نے بھجوایا ہے۔

ماجدہ نے اب کی بار تپ کے اسے دیکھا۔

''اس لئے جی کہ یہ ان کے شوہر کا گھر ہے۔ بیوی اپنے شوہر کے گھر میں ہی رہتی ہے۔'' اس کی تلملاہٹ بہت واضح تھی۔

''یہ..... اس کے شوہر کا گھر..... میں سمجھی نہیں۔'' وہ تذبذب کے عالم میں تھی۔

''نا سمجھی والی کوئی بات ہی نہیں۔ شاہم بی بی، منصور صاحب کی بیوی اور ان کے بچوں کی ماں ہیں۔ اور کچھ پوچھنا ہے آپ کو؟''

ماجدہ دھاڑ سے کہتی، کپڑا زور سے جھٹکتی باہر نکل گئی۔

ماہم نے سرد ہوتے اس خبر کو سنا۔ وہ اتنی بے یقین تھی کہ اس کی نگاہیں غیر مرئی نقطے پہ جم گئی تھیں۔

☆★☆

ماہم جب سے آئی تھی، اوپر صرف کمرے تک محدود تھی۔ وہ ابھی کاشا کے صدمے سے ہی سنبھل نہ پائی تھی کہ منصور اور شاہم کی شادی کی خبر نے اس کے اعصاب بالکل ہی توڑ کر رکھ دیئے تھے۔ شاید منصور اور شاہم کی شادی کی خبر، کاشا کے جانے سے زیادہ تکلیف دہ اور بھاری تھی۔ شاہم اس روز کے بعد نہیں آئی تھی۔ صرف ماجدہ اسے کھانا دینے اور صفائی کرنے آتی تھی۔ اس کا ذہن ماضی اور حال کی مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا رہتا۔

وہ بہت سا وقت روتے اور خود کو کوستے گزار دیتی۔ اُس کی شدید خواہش تھی کہ صرف ایک نظر بچوں کو دیکھ لے۔ وہ ان کی آواز تک نہ سن پائی تھی۔ کاشا کے پاس اسے بچوں کی کمی اتنی شدت سے محسوس نہیں ہوئی تھی، جتنی اب ہوتی تھی۔ چاروں طرف سے تہی داماں ہو کر اسے اب بچے ہی آسرا لگنے لگے تھے۔

کمرے کی گھٹن اور اپنے اندر کے حبس سے گھبرا کر اس نے کھڑکی کھول دی۔ نیچے لان میں کھیلتے بچوں پر جیسے ہی اُس کی نگاہ پڑی، پلٹ نہ سکی۔ وہ تینوں بیٹ بال کھیل رہے تھے۔ حمزہ باؤلنگ کروا رہا تھا اور عمیر بیٹنگ پہ تھا۔ دعا سارے لان میں بھاگ بھاگ کر بال پکڑنے پہ تھی۔ لان میں لگائی گئی میز کرسیوں پر منصور اور شاہم بیٹھے باتوں میں مصروف تھے۔ سارا منظر بہت خوب صورت اور مکمل لگ رہا تھا۔

''ماما! حمزہ میرا اوور نہیں دے رہا، میں نے اسے بیٹ مار دینا ہے۔'' عمیر نے قبل از اقدام، اطلاع دی۔

''نو ماما! میں نے پورے سکس بال دیئے ہیں، اسے ایک کم لگتا ہے۔'' حمزہ نے بھی فوراً وضاحت کی۔

''چلو حمزہ! آپ ایک بال اور کرا دو، بھائی ہے آپ کا۔'' منصور نے حمزہ کو پچکارا۔



''آپ ہمیشہ اس کی سائیڈ لیتے ہیں۔'' وہ روہانسا ہو رہا تھا۔

''آپ ماما کے اچھے والے بیٹے ہو، مان جاؤ۔'' شاہم نے تھوڑی اُس کی طرف کی۔

''جسٹ ون بال۔'' اس نے تنک کر عمیر سے کہا اور بال کروانے لگا۔

''آپ چکن پکوڑا ٹیسٹ کریں، میں نے فرسٹ ٹائم ٹرائی کی ہے۔'' شاہم نے اس کی طرف بڑھائی۔

''تھینک یو۔'' اس نے پلیٹ پکڑ لی۔

''منصور! آپ نے.....''

''ماما! وہ کون ہیں؟''

عمیر کے پکارنے پر شاہم کی بات بیچ میں ہی رہ گئی۔

ان دونوں نے عمیر کی طرف دیکھا۔ وہ اوپر کھڑکی میں کھڑی، ماہم کی طرف ہاتھ اشارہ کر رہا تھا۔ ماہم نے ان دونوں کی نظر خود پر پڑتے ہی کھڑکی زور سے بند کر دی۔ وہ لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ اوپر ہونے کی وجہ سے وہ بچوں کے چہرے ٹھیک طرح نہیں دیکھ پائی تھی۔

ماہم کے کھڑکی بند کرنے پہ انہوں نے دوبارہ کوئی سوال نہیں کیا۔

''آپ نے کیا سوچا ہے؟'' شاہم نے اپنی پلیٹ واپس ٹیبل پہ رکھ دی۔

''کس بارے میں؟'' منصور کسی اور ہی سوچ میں گم تھا۔

''اس کا۔'' شاہم نے ابرو سے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

''کچھ نہیں۔'' پھر وہ کافی توقف کر کے بولا۔ ''تم کیا کہتی ہو؟''

''سب آپ کے سامنے ہیں۔ ہم دونوں نے کن مشکلات سے گزر کے سب سیٹل کیا اور.....اور اب اس کے آ جانے سے مجھے لگتا ہے، صرف لمحہ لگے گا سب تباہ ہونے میں۔ منصور! اِن شارٹ یہ کہ آپ کے اور اپنے بیچ میں کسی تھرڈ پرسن کو برداشت نہیں کر سکتی، چاہے وہ کوئی بھی ہو۔''

وہ دبے لفظوں میں کہنا چاہ رہی تھی کہ اسے ماہم کا اب اس گھر میں رہنا پسند نہیں۔ اس کے لئے مستقبل میں خطرے کا باعث بن سکتی ہے۔

''تم خود کو اَن سیکیور (غیر محفوظ) محسوس کرنے لگی ہو یا.....مجھ پر ٹرسٹ نہیں رہا؟''

وہ ماہم کا کہہ رہی تھی اور منصور نے رخ اپنی طرف موڑ لیا تھا۔

''آپ کو یہ خوش فہمی کب سے ہو گئی کہ میں آپ پہ ٹرسٹ کرتی ہوں؟'' منصور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتی وہ اُٹھ گئی۔

☆☆☆

''ہیلو ڈیئر! اکیلے ہی کارڈز کھیل رہے ہو۔''

لیلیٰ کوٹ اور شولڈر بیگ کاؤچ پہ پھینک کر کارپٹ پہ کاشا کے سامنے بیٹھ گئی، ج کارڈز میں اتنا غرق تھا کہ نہ ہی اس کے آنے کا نوٹس لیا، نہ جواب دیا تھا۔

''میں بھی کھیلوں گی۔'' اس نے کشن پہ پڑے کارڈز پہ ہاتھ رکھ دیا۔

''میں عورتوں کے ساتھ جواء نہیں کھیلتا۔'' اس نے لیلیٰ کے ہاتھ پہ ہاتھ دھر کے اُٹھا چاہا۔

''ہم جواء نہیں کھیلیں گے۔ اور یاد رہے، میں عورت نہیں، تمہاری بیوی ہوں۔'' ا نے کاشا کا ہاتھ تھام لیا۔

''اچھا..... پھر دیکھتے ہیں۔'' وہ پتے اکٹھے کرنے لگا۔

''کون وِن کرے گا؟'' اس نے پتے پھینٹتے یوں ہی پوچھا۔

''آف کورس، یُو۔'' وہ حاضر جواب تھی۔

''جب تمہیں یقین ہے ہار کا تو پھر کھیل کیوں رہی ہو؟'' اس نے ہاتھ روک استفسار کیا۔

''مجھے تو یہ بھی یقین ہے کہ تم مجھ سے محبت کرنے لگو گے، تندرست ہو جاؤ گے اور ساری زندگی ساتھ گزاریں گے۔ ہارنے کے ڈر سے گیم نہیں چھوڑنی چاہئے۔'' وہ یہ اس کے چہرے کو دیکھ کر نہیں کہہ سکتی تھی۔

''دنیا میں محبت کے علاوہ بھی بہت سے دھندے ہیں۔ تم تو بس۔'' اس نے نفی سر ہلا کے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''واٹ اباؤٹ آف یُو؟'' کاشا کی غیر سنجیدگی نے اسے دُکھ دیا تھا۔

''تم مجھے نہ سوچا کرو۔'' اس کے لئے نصیحت کرنا آسان تھا۔

''میڈیسن ریگولر لیا کرو۔'' اس نے گہری سانس خارج کرتے موضوع بدل دیا۔

''ہاں، لے رہا ہوں۔''

''کاشا! میں نے تمہارا چیک کیش کروا لیا ہے۔'' یاد آنے پر اس نے بتایا۔

''بینک گئی تھیں؟'' وہ کارڈز بانٹنے لگا تھا۔



''ہاں، ایک نیوز اور ہے۔ پیٹرسن نے مجھے بتایا کہ تمہارے اکاؤنٹ میں پاکستان پچاس لاکھ آئے ہیں۔ میں نے نام و پتہ پوچھا تھا، پیٹرسن نے چیک کر کے غنی کا نام اکاؤنٹ نمبر بتایا۔''

''غنی نے کیوں پیسے بھیجے ہیں؟'' وہ زیرِ لب پُرسوچ بڑبڑایا۔

''ظاہر ہے، تم اُس کے بزنس شیئرز ہولڈر ہو۔ تمہارا حصہ ہی بھیجا ہو گا۔ کوئی خدا ی تھوڑی کی؟''

''شٹ اپ، تمہیں یہ رائٹ کس نے دیا ہے کہ تم میرے اس قدر پرسنل میٹر میں رفیئر کرو۔ آئندہ اتنی جرأت نہ کرنا۔ اینڈ یُو کین گو ناؤ۔'' غصے سے سرخ ہوتے اس نے ارے کارڈز کو ہاتھ مار کر بکھیر دیا۔

''سوری کاشا!'' وہ خائف سی ہو گئی۔

''واٹ سوری؟ آئندہ کبھی غنی کے بارے میں اس انداز سے بات مت کرنا۔''

''اسٹاپ اینڈ لسن ون تھنگ (رکو، اور ایک بات سنو) وہ رقم غنی کے اکاؤنٹ میں انسفر کروا دو۔'' اس کا انداز تحکم بھرا تھا۔

''ہو جائے گی۔ گڈ نائٹ۔'' وہ دھیمے پن سے کہتی نکل گئی۔ وہ بالوں میں اُنگلیاں پھنسائے کچھ سوچنے لگا تھا۔

☆☆☆

منصور، ٹی وی پہ بزنس اپ ڈیٹس دیکھ رہا تھا۔ حمزہ وہیں نیچے کارپٹ پہ سو گیا تھا۔ عا اور عمیر وہیں کھیل رہے تھے۔ شاہم بھی اپنا کام نمٹا کر ان کے پاس آ بیٹھی۔

''عمیر! ہوم ورک کمپلیٹ ہے؟'' اس نے سینٹر ٹیبل سے نیوز پیپر سمیٹتے ہوئے کہا۔

''جی ماما!..... میرا بھی اور حمزہ کا بھی۔''

''منصور! آپ کے ہاتھ میں تو ریموٹ آنا ہی نہیں چاہئے۔''

شاہم، منصور کے ٹاک شوز اور بزنس نیوز دیکھنے سے بہت بور تھی۔

''سوری، میں تمہیں اسٹار پلس کے لیچڑ سوپ کے لئے ریموٹ دینے کو متحمل نہیں ہو سکتا۔'' منصور کی رگِ شرارت پھڑکی تھی۔

''دفع دُور، اسٹار پلس۔ نہ میری کوئی نند، نہ ساس۔ آئی ڈونٹ نیڈ ٹو لرن دِس ناسٹی ٹرک۔''

ماجدہ اوپر سے سیڑھیاں اُتر کے سیدھی لاؤنج میں ان کے پاس آ گئی۔

''شاہم بی بی! اُن کی طبیعت بہت خراب ہے۔ بہت ہی تیز بخار ہے۔''

ماجدہ دوپہر کو بھی اوپر گئی تو وہ بستر پہ لیٹی تھی۔ وہ کھانا رکھ کے واپس آ گئی، اب بھی کھانا ویسا ہی پڑا تھا۔ وہ بے سُدھ آڑی ترچھی بستر پر پڑی تھی۔

''اچھا..... ایسا کرو، پیناڈول کی دو ٹیبلٹ دودھ کے ساتھ دے دو، افاقہ ہو جائے گا۔'' شاہم نے لاپروائی سے کہا۔

اسے ماہم یا اس کی ذات میں ذرا بھی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے جو کچھ کیا تھا، اب بھگتنے کا وقت آیا تھا اور شاہم اسے اس کے کیے کی اچھی طرح نصیحت دلوانا چاہتی تھی۔ اس نے بچوں کا اوپر والے پورشن میں جانا سختی سے بند کر دیا تھا۔ ماجدہ نے اسے بتایا تھا کہ ماہم، بچوں کا پوچھتی ہے۔ وہ اور محتاط ہو گئی تھی۔ وہ بچوں پر اُس کا سایہ تک نہیں پڑنے دینا چاہتی تھی۔

''تمہیں ڈاکٹر کو کال کرنا چاہیے۔'' منصور نے ٹی وی کا والیوم کم کر کے لہجے حتی الامکان نارمل رکھا۔

''فیملی ڈاکٹر، شہر سے باہر گئے ہیں۔ اور کس ڈاکٹر کو بلاؤں؟''

''تم جاؤ، ماجدہ! اور جیسا میں نے کہا ہے، ویسے ہی کرو۔ جلدی سے اپنا کام ختم کرو اور کوارٹر میں جاؤ۔''

یہ سب کہتے ہوئے اس کی نظریں، ٹی وی اسکرین پہ جمی رہیں۔ ماجدہ سر ہلاتی چلی گئی۔ منصور کو شاہم کا انداز بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔ ماہم کی غلطیاں اپنی جگہ، مگر اس وقت وہ بیمار تھی، انہیں اس کا خیال رکھنا تھا۔

''اس کی طبیعت زیادہ بھی خراب ہو سکتی ہے۔'' تھوڑا توقف کر کے وہ بہت سنجیدگی کے بولا۔

''کس کی طبیعت؟'' اس کے چہرے پہ حد درجہ بے گانگی تھی۔

اُس کا نام کبھی شاہم نے نہیں لیا تھا، وہ کیسے لے لیتا۔ پھر منصور سے زیادہ گہرا رشتہ اس کا تھا۔ وہ اسے احساس دلانے کی غلطی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ شاہم کے حساس دل اور عقل مندی کا وہ خود گواہ تھا۔

''ہوا کرے۔ آپ والیوم تیز کریں اور ٹی وی پہ دھیان دیں۔ چلو عمیر!'' ان دونوں کو اٹھاتے اس نے جھک کر کارپٹ پہ سوئی گڑیا کو بھی احتیاط سے بازوؤں میں بھر لیا۔

☆☆☆



''تُو نے پیسے واپس کیوں بھجوا دیئے ہیں، کاشا!'' غنی نے پوچھا تھا۔

''کیا کرنا پیسوں کا۔ سیریسلی غنی! مجھے پیسوں کی ضرورت نہیں ہے۔ سب کچھ ہے... کچھ۔''

وہ نیچے کارپٹ پہ بیٹھا تھا۔ صوفے کے بازو سے ٹیک لگائے تھکا ماندہ سا۔

''تمہارے ٹریٹ منٹ کے لئے کاشا! ضرورت تو پڑے گی۔ کیسی طبیعت ہے اب تمہاری؟''

''فائن، کوئی سر یا پیٹ کا درد نہیں ہے۔'' اسے اپنی بیماری کا بالکل دکھ نہیں تھا۔ اس نے جو کچھ ساری زندگی کیا، یہ اس کا نتیجہ تھا۔ وہ اپنی باقی رہ جانے والی زندگی کو پچھتاووں سے برباد نہیں کر سکتا تھا۔

''ایسا مت بول، کاشا! تُو ٹھیک ہو جائے گا۔ میں دعا کروں گا۔''

''میں خود کو کوئی جھوٹی تسلی نہیں دینا چاہتا۔ رہ گئی دعا، وہ مت کیا کر..... میں دعاؤں سے بہت آگے نکل چکا ہوں۔''

اس کے لئے کبھی کسی نے دعا نہیں کی تھی۔ اس نے اپنے لئے فقیروں کے علاوہ کسی کو دعائیہ کلمات نہیں سنے تھے، نہ ہی اس نے کبھی خود دعا مانگی تھی۔ اسے تو یہ بھی نہیں پتہ کہ دعاؤں میں اثر ہوتا بھی ہے کہ نہیں۔ لوگ کیوں جھولیاں اٹھاتے ہیں، کیوں منتیں، دعائیں مانگتے ہیں۔ گڑگڑانے میں تاثیر کیوں ہوتی ہے؟ اس کا اس سب عمل سے کبھی واسطہ نہیں رہا تھا۔

''تم نے مجھے پاکستان میں ٹھہرنے کو کیوں بولا تھا؟ سم تھنگ اسپیشل۔'' بالوں میں انگلیاں پھنسائے وہ چند لمحے سوچتا رہا۔

''ڈونٹ مائنڈ یار! بس میں تھوڑا سا خودغرض ہو گیا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ پاکستان میں کوئی تو میرا منتظر ہو۔ میرا جنازہ، اجنبیوں کے کندھوں پر نہ اُٹھے۔ پلیز غنی! آخری ٹائم تک میرے ساتھ رہنا۔''

وہ یہ کہتے ہوئے ضبط کے باوجود بھی رو دیا تھا۔ غنی اسے روتے ہوئے سن رہا تھا۔ دونوں کی جذباتی تکلیف ایک ہی نہج پہ تھی۔

''بولتا ہوں نا، بکواس نہ کیا کر، پر تُو باز نہیں آئے گا۔'' وہ روتے ہوئے رک رک کر کہہ رہا تھا۔

اس تلخ حقیقت سے وہ دونوں غیر معمولی انداز میں نظریں چراتے تھے۔

"سچ بتاؤں، تُو مجھے دیکھے گا تو حیران رہ جائے گا۔ میں سب کچھ چھوڑ چکا ہوں۔"
ہتھیلی سے آنسو صاف کرتا، گال پھر بھیگ جاتے۔ وہ دونوں آمنے سمنے شاید کبھی نہ
روتے یا پھر روتے ہوئے ایک دوسرے کے آنسو پونچھتے۔ غنی کے آنسو اس لئے نہیں
رہے تھے کہ کاشا جیسا مضبوط مرد بھی رو رہا تھا۔ اس کا جگر رو رہا تھا۔ کاشا، غنی کے
کروائے بغیر کیسے رونا بند کر دیتا۔

"ہاں، لیکن تُو نے بہت دیر کر دی۔"

"یا..... یا، اس دیر کا رزلٹ بھگت رہا ہوں۔ بٹ ڈونٹ وری۔ میں ہمت
ہاروں گا۔ نہیں ہاروں گا۔" اس نے بچوں کے سے انداز میں گال پونچھے۔

"پلیز کاشا! تُو نے میری کبھی کوئی بات نہیں مانی، صرف ایک مان لے، مجھے
آنے کی پرمیشن دیدے۔"

"میں نے غنی....."

اس نے غنی کو ٹوکا تھا، جبکہ اس نے بھی اسے بات مکمل نہ کرنے دی۔

"زیادہ دن نہیں رُکوں گا۔ بس کچھ دن..... پلیز یار!" وہ منت کر رہا تھا۔

وہ چاہے حقیقت کو جتنا بھی جھٹلا لیتا، یہ اٹل ہی تھا کہ کاشا کی بیماری آخری
تھی۔ ایک ناقابلِ علاج بیماری اپنے آخری مرحلے میں۔ اس کی فطرت میں لاپروا
عنصر سے وہ آگاہ تھا۔ ان دنوں اسے بہت دیکھ بھال کی ضرورت تھی۔

"میں، ماما سے ملنے جا رہا ہوں۔ اپنی ماں سے۔ پورے ستائیس برس بعد غنی
میں اپنی ماں کو دیکھوں گا، اس کے سینے سے لگوں گا۔ میرے سینے اور جسم میں بہ
رہتا ہے۔ جب..... جب میں ماں کی آغوش میں سر رکھوں گا تو میرا سارا درد
جائے گا..... مجھے بہت درد ہے غنی!..... بہت درد۔"

وہ پھر سے رونے لگا تھا۔ اسے درد کی شدت یا شاید ماں سے دُوری کا احسا
رہا تھا۔ اپنی موت سے قبل وہ اپنی برسوں کی ناآسودہ خواہش کی تکمیل کر لینا چاہتا
صرف ایک بار اس آغوش کا طلب گار تھا، جو چند دن کا وعدہ کر کے ستائیس برس
نہیں لوٹی تھی۔

"ٹھیک ہے، میں نہیں آتا، تُو ماں سے ضرور مل۔"

غنی کو اس سے بڑھ کر اور کچھ نہیں چاہئے تھا۔ اس کا امریکہ جانے کا ایک
بھی تھا کہ وہ کاشا کو کسی بھی طرح اس کی ماں سے ضرور ملوائے گا، تاکہ دونوں



ے دلوں میں ایک دوسرے کو دیکھنے کی حسرت نہ رہ جائے۔

"میں، ماں سے مل لوں، تھوڑی طبیعت بہتر ہو جائے تو تیرے پاس آ جاؤں گا۔ میں
ی کب پردیس میں رہنا چاہتا ہوں۔" اس نے غنی کو اطمینان دلایا۔

"پکا والا پرامس ہے نا۔"

"بالکل پکا والا۔" اس نے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیر کے دوسرے کان سے فون لگایا۔

"اچھا، اپنا بہت زیادہ خیال رکھنا۔ میڈیسن ٹائم پہ لینا۔ اور جن چیزوں سے ڈاکٹرز
نے پرہیز بتایا ہے، عمل کرنا۔ میں روز تجھے کال کروں گا۔ بی کیئر فل۔ اللہ حافظ۔" اس
نے ڈھیر ساری نصیحت کی۔

اسے کاشا کی لاپرواطبیعت سے بڑا خطرہ محسوس ہوتا تھا۔

"اللہ حافظ!"

فون بند کر کے اس نے الماری میں سے اپنے کپڑے نکالے اور بیڈ پر پھینک کر
اش روم میں چلا گیا۔ نچڑتے چہرے کو اس نے آئینے میں غور سے دیکھا۔ رنگت ہلکی
زردی مائل تھی۔ رنگ بھی قدرے سنولا گیا تھا۔ آنکھوں کی چمک عرصہ ہوا، ماند پڑ چکی
تھی۔ انگلیوں سے گالوں پر سے بہتے پانی کے قطرے جھٹک کر اس نے چہرہ پونچھا۔
کپڑے اُٹھا کے وہ ڈریسنگ روم میں چلا گیا۔ آئینے کے سامنے ذرا کی ذرا رُک کے
بالوں کو انگلیوں کی مدد سے ہی سلجھانے کے بعد باہر نکل گیا۔ ماں کے گھر کا مکمل ایڈریس
اس کے پاس تھا۔ کیب کی پچھلی سیٹ کی بیک سے ٹیک لگائے وہ خود کو خالی الذہن رکھنے
کی حتی الامکان کوشش کر رہا تھا۔

وہ عورت کیسی ہو گی؟

سات سال کی عمر کے بچے کے ذہن میں ماں کی حقیقی دھندلی سی شبیہ تھی۔ اس کے
نانی والے گھر میں اس کے بیڈ روم میں ماں کے ہمراہ کئی فوٹو تھے۔ جب گھر چھوڑا تو
تصویریں بھی وہیں رہ گئیں۔ اسے باتیں یاد رکھنے اور یادیں اکٹھی کرنے کی عادت نہیں
تھی۔ وہ ایک کھرا اور حقیقت پسند انسان تھا۔ اپنی بیماری اور اس کی نوعیت سے بھی اچھی
طرح آگاہ تھا۔ اسے یہ تسلیم کرنے میں بھی عار نہیں تھا کہ وہ صرف چند مہینوں کا مہمان
تھا۔ اس نے شاید اپنی پوری زندگی میں ایک عورت سے محبت اور اسی کی عزت کی تھی،
جسے وہ کبھی ماں کہتا تھا۔

وہ واشنگٹن ڈی سی کے ایک خوب صورت، عالی شان گھر کے باہر کھڑا تھا۔

گھر تھا یا محل۔

اونچے، مضبوط لوہے کی سلاخوں والے گیٹ کے اس پار باوردی چوکیدار نے اُس کی شناخت مانگی۔

"میڈم رابعہ سے ملنا ہے۔ پاکستان سے آیا ہوں۔"

اسے انگلش میں اپنی شناخت بتا کے وہ خود پہ حیرت زدہ تھا۔ اتنے برس بعد اچانک اس کے منہ سے ماں کا نام نکل گیا تھا۔ اسے ابھی تک اس عورت کا نام یاد تھا، مگر وہ اپنا نام نہیں بتا پایا تھا۔ نہ ہی ان کے لئے ماں کا لفظ استعمال کر سکا۔

چوکیدار نے انٹرکام پہ آنے والے کے بارے میں بتایا اور اسے اندر بھیجنے کی اجازت لے کر اس کے لئے گیٹ کھول دیا۔ لمبی روش اس نے بہت سست روی سے طے کی تھی۔ اندرونی دروازہ ایک چھوٹے سے قد کی ادھیڑ عمر انگریز عورت نے کھولا اور اسے اپنی رہنمائی میں ڈرائنگ روم تک پہنچا دیا۔

"پلیز ویٹ۔" وہ دہلیز سے واپس مڑ گئی۔

وہ ڈرائنگ روم تھا یا حیرت کدہ، وہ سحر زدہ سی کیفیت میں گھرا کھڑا رہا۔ وہ کھلی آنکھوں سے اِردگرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ ڈرائنگ روم کی زیب و آرائش اپنے مکینوں کی مالی حیثیت کا منہ بولتا ثبوت تھی۔

اس حیرت کدے کی ملکہ ایک شان سے دھیرے دھیرے قدم اس کی طرف بڑھا رہی تھی۔ ہلکے رنگ کی خوب صورت سی ساڑھی، کنپٹیوں پہ صرف چند ایک سفید بال اُس کی عمر کی چغلی کھاتے تھے، نازک سے فریم کا چشمہ۔ وہ ابھی بھی بھرپور جوان لگ رہی تھیں۔

"کون ہیں آپ؟" وہ اُس کے پاس آ رُکیں۔

اُن کے سوال نے کاشا جیسے مضبوط اعصاب کے شخص کا سینہ چیر دیا تھا، خون اپنے خون کو دیکھ کر جوش مارتا ہے۔ وہ کیسی ماں تھی، جسے اپنے جنے ہوئے کی پہچان نہیں تھی۔ اس کا جی چاہا، چپ چاپ اس ڈرائنگ کے دروازے سے باہر دوڑ لگا دے۔ ایک پل کے لئے مزید یہاں نہ رُکے۔ اس جیسے صاف گو اور منہ پھٹ بندے پہ یہ لمحہ بہت بھاری تھا۔

"مم..... میں کک..... کاشف حسین..... کلرک غلام حسین مرحوم کا اکلوتا بیٹا۔"

ماں کی بے خبری نے اُس کا لہجہ بھاری کر دیا۔

زندگی میں پہلی بار اس کی خوداعتمادی اور زبان لڑکھڑائی تھی۔



اس عورت نے ہی اس کا نام، کاشف رکھا تھا، ورنہ وہ اپنے اور دنیا والوں کے لئے ف کاشا تھا۔

اس کی زیرک نگاہوں نے ماں کے خدوخال کو بہت غور سے پرکھا، جن میں کوئی بے اری واضح نہیں ہوئی تھی۔ اس نے شاید ان لمحات کا کبھی تصور نہیں کیا تھا۔ وہ سات ا کا بچہ اتنا بھرپور جوان ہو کر اس کے سامنے مضبوط اپنے قدموں پہ کھڑا تھا کہ اب ے ماں کی انگلی کا سہارا بھی درکار نہیں تھا۔

"کاشف! بیٹھو۔"

"جی....." اس کے حلق سے پھنسی ہوئی جی نکلی۔

کتنا خلافِ توقع بولی تھی، وہ عورت۔ اس عورت کے لئے اس نے کتنے برسوں کا طے کیا تھا۔ اپنی تکلیف کے باوجود وہ یہاں تک پہنچا تھا۔ اس نے سنا تھا کہ ماں کے وں تلے جنت ہوتی ہے۔ اسے موت کے بعد ملنے والی جنت اور دوزخ میں بالکل ں نہیں تھی۔ اسے تو صحیح طور پر جنت اور دوزخ کے فرق کا بھی علم نہیں تھا۔ مگر وہ ایک ن قدموں کو چومنے کا خواہاں تھا۔ وہ دونوں چپ چاپ سر جھکائے بیٹھ گئے۔ کتنے یوں ہی بے معنی خاموشی کی نذر ہو گئے۔ کاشا کے جسم میں اچانک درد ہونے لگا۔

ایک لڑکی بڑی سی ٹرالی گھسیٹتی ہوئی آئی۔ کمرے کے سامنے والی دیوار کے ساتھ ٹیبل رسیاں تھیں۔ وہ ٹرالی سے لوازمات ٹیبل پہ منتقل کرنے لگی۔ کمرے میں صرف برتنوں لکنے کا ہلکا سا شور اُبھر کر معدوم ہو رہا تھا۔

"پلیز میم! کم ہیئر۔" اس نے ساری کراکری سیٹ کر دی تھی۔

وہ دونوں گونگے بہرے بنے بیٹھے تھے۔ وہ اپنا فرض نبھا کے واپس چلی گئی۔

کاشا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان سے کیا پوچھے؟ کہاں سے گفتگو کا آغاز ے؟ صورتِ حال کا آغاز ہی اُس کی سوچ کے برعکس ہوا تھا۔

"آپ..... آپ مڑ کے آئیں نہیں۔"

بالکل غیر ارادہ ہی اس نے شکوہ کر دیا۔ حالانکہ وہ گڑے مردے اُکھاڑنے نہیں آیا ماں نے گزرے برسوں میں ایسا کبھی نہیں سوچا تھا۔ وہ اس مقدس رشتے کو مخمصے میں نہیں چاہتا تھا۔

"بعض اوقات منزل کے حصول کے لئے بہت سے ہموار رستوں کو چھوڑ کر چلنا پڑتا ہر رشتہ، منزل پہ جا کے ختم نہیں ہوتا۔ کبھی تھوڑے سے سکون کے لئے بہت بڑی

قربانی دینا پڑتی ہے۔ مگر میں آج تک فیصلہ نہیں کر پائی کہ میں نے جو قربانی دی، وہ
تھی یا چھوٹی۔ مجھے سکون ملا کہ نہیں۔ ایک عورت کے، اس کے سگوں کے دیئے ہو
دکھ کبھی الفاظ میں بیان نہیں کئے جا سکتے۔ میں نے اپنی پوری زندگی کا صرف دو
آسودگی اور خوش حالی میں گزارا، جو غلام حسین کے ساتھ بیتا۔ ڈھائی مرلے کے
کے دو کمروں میں، میں کلرک غلام حسین کے ہمراہ بہت خوش تھی۔ تم پیدا ہوئے تو
دنیا کی ساری خوشیاں میرے قدموں میں ڈھیر ہو گئیں۔ تمہارے باپ کے منہ سے
نے کبھی اپنے لئے "نہیں" کا لفظ نہیں سنا تھا۔ سب کچھ درست چلتے چلتے یک دم
برہم ہو گیا، جب تمہارے باپ کی میت آئی۔ میری بدنصیبی نے دوبارہ مجھے تمہارے
اور ماموں کے در پہ لا پٹخا۔ بس..... اُس روز سے میری بربادی کی ابتدا ہو گئی۔ ت
بڑھتی ہوئی ضروریات اور کفالت کے لئے مجھے گھر سے باہر قدم نکالنا پڑا۔ حالا
سختیوں کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرنے کے لئے تمہارے مرحوم باپ کی دلوائی ہو
میرے کام آئی۔ میری لائی ہوئی کمائی سے تمہارا پیٹ تو تب بھرتا، جب میری ما
بھائیوں کا بھرتا۔ میں نے دوہرا عذاب مول لے لیا تھا۔ تم میری اولادِ نرینہ تھے
تمہارے سہارے اپنی زندگی کا سفر کاٹ سکتی تھی۔ میں اچھا خاصا کما رہی تھی۔ بھائ
ہڈ حرامی سے اُکتا کر میں نے فیصلہ کیا کہ واپسی اپنے مرحوم شوہر کے گھر لوٹ جا
میں نے ماں سے اپنے فیصلے کا ذکر کیا تو اس نے بتایا کہ وہ گھر تمہارے بھائی نے
کے لئے گروی رکھا تھا۔ کاروبار جما نہیں، سُود دیا نہیں جا سکا، اس طرح گھر بک گ

میری آمدنی سے تم اچھے اسکول میں پڑھ سکتے تھے۔ بہترین لباس اور اچھی
بھی پوری ہو سکتی تھی۔ مگر میری پائی پائی، گھر کے راشن پانی میں صرف ہو رہی تھی۔
قطعاً منظور نہیں تھا کہ میں اپنے بیٹے کا حق ان نکھٹوؤں پہ لٹاؤں، تب میں نے ماں
کہ میں الگ گھر کرائے پہ لے کر رہوں گی۔ میرے بھائیوں نے یہ سنا تو مجھے
دیں۔ وہ مجھے ہاتھ سے نکلنے نہیں دینا چاہتے تھے۔ میں بہت پریشان رہنے لگی۔
دنوں میری ملاقات آفس میں اپنے باس کے فرینڈ، جرار احسان سے ہو گئی۔

جرار احسان دو جوان بیٹیوں کا رنڈوا باپ تھا۔ عمر میں مجھ سے دو دہائیاں بڑ
اصول پسند شخص تھا۔ اس نے میرے باس سے میری ہسٹری سنی اور جانے کیوں
نظر مجھ پہ ٹک گئی۔ اس نے مجھے اپنے آفس میں پرسنل سیکرٹری کی جاب آفر کر دی
سیلری کی کشش مجھے اس کے آفس تک لے گئی۔ آہستہ آہستہ ہمدردی سے باتوں



اس نے میرے تمام حالات مجھ سے معلوم کئے۔ میں تو اس کی نیت سے اس روز بھی
بر تھی، جس دن اس نے مجھے پرپوز کیا۔ مجھے لگا، جیسے قیدِ زندان سے چھٹکارا پانے
لئے سیڑھی میسر آ گئی ہو۔ آٹھ، دس قدم اوپر اُٹھاؤ اور باہر آزاد فضا میں۔ ہم دونوں
پہلی شادیوں سے اولادیں تھیں۔ نہ میں نے اس کی بیٹیوں کا تذکرہ چھیڑا، نہ اس
نہارا۔

مجھے لگا، جیسے سب خاموشی سے طے ہے۔ جب میں ایک بڑی عمر کے شخص، جس کی
ان بیٹیاں ہیں، سے شادی پر رضامند ہوں تو اسے میرے چھ، سات سالہ بیٹے پر کیا
اض ہو سکتا ہے۔ میں اپنے خیالوں کی دنیا میں تمہیں بھی جرار احسان کے گھر میں کھیلتا
تھی، مگر یہ صرف میری خام خیالی نکلی۔ جرار احسان کی گاڑی میں صرف میرے لئے
ی، میرے جگر کے ٹکڑے کے لئے نہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ میں اپنی محبت اور
ت سے اسے رام کر لوں گی۔ آخر میں نے بھی تو اس کی بیٹیوں کے لئے فراخ دلی کا
ت دیا تھا۔ وہ سخت اصول پسند شخص، سخت دل بھی تھا اور میرے حتیٰ کہ اپنی ذاتی
ں تک کے لئے بہت پوزیسیو تھا۔

وہ مجھ سے دُور اور میں تم سے دُور نہیں رہ سکتی تھی۔ ہمارے مابین ایک کشمکش کا سلسلہ
گا۔ وہ تمہیں دنیا کی ہر سہولت، آرام دینے پر رضامند تھا۔ مگر اپنے گھر میں جگہ نہیں،
، اپنے اور میرے بیچ تم تھرڈ پرسن لگتے تھے۔ جب اس نے دیکھا کہ میرا دھیان کسی
طور پر تم سے نہیں ہٹتا تو اس نے مسئلے کا حل بڑی عقل مندی سے ڈھونڈ نکالا۔ اس نے
ہی اندر امریکہ شفٹ ہونے کی ساری تیاریاں مکمل کر کے مجھے آگاہ کیا۔

"میں بہت روئی، تڑپی، مگر اس نے اپنے کان اور آنکھیں بند کر لیں۔ میں تمہیں
ں کے رُوپ میں دشمنوں کے حوالے کر کے چلی گئی۔ میں پھر سے ماں بننے والی تھی
ہر وقت تمہارے لئے روتی رہتی۔ میں جب بھی پاکستان فون کرتی، میری ماں تم سے
ری بات ہی نہ کرواتی۔ کوئی نہ کوئی بہانہ گھڑ دیتی۔ تم ان لوگوں کے لئے ایک بینک کے
ٹ تھے۔ وہ تمہیں ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتے تھے۔ میں اپنی طبیعت کی وجہ سے
ستان نہیں آ سکتی تھی۔ جرار احسان کو اپنے کروڑوں کے بزنس اور جائیدادوں کا وارث
نے والا تھا۔ میں نے اس کے بیٹے کو جنم دیا تھا۔ ایک اور بیٹے کی ماں بننے کے بعد تمہاری
مجھے مزید ستانے لگی۔ تمہارے معاملے میں مجھے اپنی ماں اور بھائیوں پر قطعاً بھروسہ
نہ تھا۔

جرار احسان اس عمر میں بیٹا پا کر بے انتہا خوش تھا۔ مجھے اہمیت بھی پہلے سے کہیں زیادہ دینے لگا تھا۔ تب میں نے ہمت کر کے اس سے پاکستان جانے کی بات کی۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔ میں نے ضد کی تو کہا، کاغذ لو اور ہمیشہ کے لئے واپس لوٹ جاؤ میں تمہیں بیٹا بھی نہیں دوں گا۔ پہلے بیوہ ہوئی اور اب طلاق یافتہ، ہر طرف سے مایوس کر میں نے اس کی بہت منت وسماجت کی کہ میرے بیٹے، میرے کاشف کو بھی یہیں لو، تمہیں اس معصوم بچے سے کیا بیر ہے؟ کہنے لگا، ابھی سے اپنے بیٹے کا شریک اس کے سر پہ لا بٹھاؤں؟ میں روتی رہی، وہ تمہارے متعلق ایک لفظ بھی سننے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے میری ضد اور رونے دھونے سے اُکتا کر مجھے ایک دن سختی اور قطعیت سے کہا کہ باپ، بیٹے کی زندگی سے ہمیشہ کے لئے چلی جاؤ۔ میں اپنا بیٹا خود پالوں گا۔

ایک کے لئے تڑپ رہی تھی، دوسرے کو کیسے چھوڑ دیتی۔ جرار احسان نے مجھ سے قسم لی کہ اگر میں اس کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں تو مجھے تمہیں بھولنا پڑے گا۔ میں کبھی تمہارا اور پاکستان جانے کا نام نہیں لوں گی۔ اس کے بدلے میں اس نے وعدہ کیا کہ مرتے دم تک تمہاری ہر ضرورت پوری کرے گا۔ تمہیں ہر طرح کا عیش و آرام دے گا پہ پیسہ لٹانے سے دریغ نہیں کرے گا۔

جرار احسان سے میرے بیٹے نہیں جانتے کہ میں ان کے باپ سے پہلے بھی شادی شدہ تھی۔ وہ دونوں بھی اپنے باپ کی طرح بہت پوزیسیو ہیں۔ ہم دونوں نے اپنی زبان کی پاس داری کی۔ میں نے غلط کیا یا ٹھیک، اس کا فیصلہ تم کرو۔"

وہ اپنی داستان مکمل کر کے اس کی طرف منتظر نگاہوں سے دیکھنے لگی تھیں۔

اسے کیا فیصلہ کرنا تھا۔ اس کی داستان میں ماں سے کہیں زیادہ محرومیاں تھیں۔ اسے نانی، ماموں یا جرار احسان کا نہیں، صرف ماں کا دامن پکڑنا تھا، جو بظاہر اسے بھی مظلوم نظر آ رہی تھی۔ وہ یقیناً سچ ہی کہہ رہی ہو گی کہ طلاق اور دوسرے بیٹے کے چھن جانے کا خوف ہی اس کے اور ماں کے درمیان حائل رہا ہو گا۔

"مجھے آپ سے کوئی وضاحت نہیں چاہئے، جرار احسان نے اپنا وعدہ ایفا کیا یا ابھی تک کر رہے ہیں اور آپ....."

باہر کسی گاڑی کے انجن کی آواز آنے پر وہ ذرا رُکا اور اس کی ماں کرنٹ کھا کے جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ بیرونی پردہ ہٹا کر باہر دیکھا اور گرا دیا۔

"عثمان آ گیا ہے۔ میرا..... میرا دوسرا بیٹا۔" وہ بہت حواس باختہ ہو گئی تھیں۔



"تو....." کاشا بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔

"میں نے بتایا نا کہ وہ بھی باپ کی طرح بہت پوزیسیو ہے، تو میں..... میں اس سے تمہارا کیا تعارف کراؤں گی؟ تمہیں اس سے پہلے یہاں سے جانا ہو گا۔ میری..... میری....."

وہ پھولی ہوئی سانسوں سے تیزی سے سب کہتیں کسی کو آوازیں دینے لگیں۔

"جی میم!" ایک عورت فوراً سے پیشتر حاضر تھی۔

"انہیں دوسرے دروازے سے باہر نکال دو۔ عثمان کی نگاہ نہ پڑے۔ ہری اپ۔"

اس نے عجلت میں پھر سے پردہ ہٹا کے دیکھا۔

"میں آپ سے....." کاشا کی آنکھوں میں نمی تھی۔

وہ عورت اس کی ماں، اسے سینے سے لگائے بغیر اپنے گھر سے چوروں کی طرح نکال رہی تھی۔

"میں تمہاری مجبور ماں، عمر کے اس حصے میں تمہیں کیا دوں گی؟ جب تمہیں میری ضرورت تھی، وہ وقت تم نے میرے بغیر کاٹ لیا۔ اب..... میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں کہ یہاں پھر کبھی مت آنا۔ تمہیں جتنا پیسہ، جو کچھ بھی چاہئے، میں تمہیں دوں گی، یہاں نہ آنا۔" وہ ہاتھ جوڑے رو رہی تھیں۔

کاشا کی آنکھوں میں بھی نمی تیر رہی تھی۔ اس نے اپنے کپکپاتے ہاتھوں سے ان کے ہاتھوں کو تھام کر چومنا چاہا، مگر پھر بے دلی سے نفی میں سر ہلاتا بازو سے آنکھیں رگڑتا وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

اس نے واپسی کے سفر کے لئے ٹیکسی نہیں لی، وہ پیدل چل رہا تھا۔ کیونکہ وہ چونتیس سالہ کا فہم و فراست رکھنے والا کاشا نہیں سات سال کا کاشف تھا، جسے اس کی ماں نے بے دردی سے جھٹلایا تھا۔ اس بے دردی کا زہر اس کے پورے جسم میں پھیل رہا تھا۔ وہ کبھی عورت کے لئے نہیں رویا تھا، مگر وہ عورت اس کی ماں تھی۔ وہ لوگوں سے بھری، رواں دواں ٹریفک میں سات سال کے بچے کی طرح روتا ہوا چل رہا تھا، جیسے بچہ بھیڑ میں گم ہو جانے پر روتا ہے۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی پیسے کی پروا نہیں کی تھی، نہ اس کی فطرت میں کسی قسم کا لالچ تھا۔ ماں کی ممتا، پیسوں کے برابر نہیں تولی جا سکتی تھی۔ عمر کے اس حصے میں بھلا کب ماں کے سہارے کی ضرورت تھی؟ وہ تو صرف اس سے ملنے آیا تھا۔ وہ اب کوئی معصوم بچہ نہیں رہا تھا، جسے تحفظ کے لئے جرار احسان کا آسرا

درکار تھا۔ وہ تب ان کی زندگیوں میں مداخلت نہ کر سکا، اب کیا کرتا۔ جرار احسان
اسے پاکستان جانے اور بیٹے سے نہ ملنے کو کہا تھا۔ یہ تو نہیں کہ اگر بیٹا خود چل
پاکستان آ جائے تو اسے پیار بھی نہ کرنا، گلے سے بھی نہ لگانا۔

وہ چلتا جا رہا تھا، روتا جا رہا تھا۔ وقت نے اسے کہاں لا پٹخا تھا، وہ کتنا بے بس
پون گھنٹے کی پیدل مسافت طے کر کے وہ گھر پہنچا۔ اس نے لیلیٰ کو گھر سے باہر جانے
متعلق نہیں بتایا تھا۔ غنی کو اس نے صرف اس لئے فون کیا تھا کہ اسے بتا سکے کہ میں
سے ملنے جا رہا ہوں۔ لیلیٰ ابھی نہیں آئی تھی۔ وہ کچن میں آ گیا۔ اس نے ریفریجریٹر
جو کہ لاک تھا۔ لیلیٰ خود بھی ڈرنک کرتی تھی۔ مگر کاشا کی طرف سے احتیاط برتتے ہو
اس نے ریفریجریٹر لاک کیا ہوا تھا۔ وہ باؤلا سا ہو گیا۔ اس نے بایاں ہاتھ ریفریجریٹر
اوپر رکھا، تاکہ اس کا بیلنس برقرار رہے اور دائیں سے اس کا ہینڈل مضبوطی سے پک
جھٹکا دیا۔ دوسرے جھٹکے پہ وہ کھل گیا۔ اس میں سے کین نکالا اور وہیں کھڑے کھڑے
لگا کے چڑھا گیا۔

وہ اپنی بیماری، ڈاکٹرز کی ہدایت، غنی اور لیلیٰ کی تمام نصیحتیں بھلائے، کین پہ
چڑھا رہا تھا۔

☆☆☆



چھٹی کے دن کام بہت بڑھ جاتے تھے۔ عام روٹین میں وہ کام ختم کر کے تھوڑی
رام بھی کر لیتی تھی۔ چھٹی کے دن اسے بالکل وقت نہیں ملتا تھا۔ وہ ملازموں کے
برابر ہاتھ بٹاتی تھی۔ بچوں کی تمام ذمہ داری مکمل اسی پر تھی۔

آج بھی اس ناشتے سے بھی پہلے واشنگ مشین لگا لی تھی۔ بچوں کے بہت کپڑے جمع
ئے تھے۔ ماجدہ بھی صبح سے کاموں میں جتی ہوئی تھی۔ وہ دُھلے ہوئے کپڑے بیڈ پہ
رتہہ لگا رہی تھی، تاکہ وارڈروب میں رکھ سکے۔ منصور، بالوں کو تولیہ سے رگڑتے
ئے واش روم سے نکلا۔ عمیر اور حمزہ، دروازے کو زور سے دھکا دے کر بھاگتے ہوئے
آئے۔

"کیا ہو گیا ہے؟..... کیوں بھاگ رہے ہو؟" اس نے کپڑے چھوڑ کر دونوں کو
ا۔ منصور انہیں دیکھ کر مسکرا کر رہ گیا۔

"وہ ہم بہت دُور سے آ رہے ہیں، مجھے سانس نہیں آ رہا، پانی دیں ماما!" عمیر کا
ں پھول رہا تھا۔ وہ صوفے پر بیٹھ کر ہانپنے لگا۔ شاہم سے پہلے منصور نے جگ میں
، پانی کا گلاس بھر کر اس کے منہ سے لگایا۔

"آرام سے، چھوٹے چھوٹے سِپ لو، پھُولے ہوئے سانس کے درمیان پانی نہیں
ہ۔" وہ اسے ساتھ میں ہدایت بھی کرتا جا رہا تھا۔ حمزہ کے چہرے پر بھی گھبراہٹ تھی۔
م بیڈ سے اُٹھ کر ان کے پاس آ گئی۔

"کہاں سے آ رہے ہو حمزہ؟"

عمیر نے کہا تھا کہ بہت دُور سے آ رہے ہیں۔ شاہم نے بھی یاد کیا کہ وہ تقریباً
ے گھنٹے سے غائب تھے۔ وہ کاموں میں مصروف یہ سوچ کر رہ گئی کہ یہیں کہیں چھپے
ئے کوئی شرارت کر رہے ہوں گے۔

''ماما!.....وہ.....وہ.....'' اس نے عمیر کی طرف دیکھا۔ وہ اٹک رہا تھا۔ منصور بھی مکمل طور پر ان کی طرف متوجہ تھا۔ ان کی ہچکچاہٹ ظاہر کر رہی تھی۔ وہ کچھ غلط کر کے چھپا رہے ہیں۔

''حمزہ! عمیر کی طرف نہیں، میری طرف دیکھو اور جلدی بتاؤ، کہاں تھے؟'' شاہم نے لہجہ سخت کر لیا۔ عمیر نے اسے سب بتانے کا اشارہ دیا۔

''ماما! ہم نے گھوسٹ (بھوت) دیکھا، اسی لئے ہم ڈر گئے تھے۔'' وہ ابھی بھی ہوا تھا۔

''بھوت؟.....وہ کہاں دیکھ لیا؟ وہ بھی گھر میں۔'' وہ حیران ہوئی۔

منصور دھیما سا مسکرا دیا۔ ان دونوں کی شرارتیں عقل سے پیدا ہوتی تھیں۔ خاص طور پر چھٹی کے دن وہ سارا گھر سر پر اٹھائے رکھتے۔ شاہم کبھی ڈانٹ دیتی یا نظر انداز کر دیتی۔ وہ بچوں پر زیادہ سختی کی ہرگز قائل نہیں تھی۔

''وہ ماما! اوپر.....اوپر اُس روم میں، جس میں آپ نے جانے سے.....منع کیا تھا۔'' اب عمیر نے اٹک اٹک کر بتایا۔

شاہم نے ماہم کے اوپر شفٹ ہونے کے بعد انہیں اس طرف جانے سے منع کر دیا تھا۔ وہ بچوں کی شکل بھی ماہم کو دکھانے کی روادار نہیں تھی۔

''جب میں نے تمہیں روکا تھا، پھر کیوں گئے وہاں؟ تمہیں ماں کا کہا سمجھ میں نہیں آتا؟'' اس نے حمزہ کو بازو سے پکڑ کر ہلکا سا جھنجوڑا۔ عمیر، باپ کی طرف کھسک گیا۔

''عمیر نے کہا تھا، اُدھر گھوسٹ ہو گا جیسا موویز میں ہوتا ہے۔'' وہ شاہم کے تاثرات سے خاصا نروس ہو گیا تھا۔

''پھر دیکھ لیا بھوت؟'' منصور نے شاہم ٹالنے کے لئے خود ہی بچوں سے ہلکے پھلکے انداز میں پوچھا۔

''یس پاپا! ایک آنٹی کے روپ میں۔ ہم دروازے سے آگے نہیں بڑھے۔ ہمیں بولا، آؤ بیٹا! اندر آ جاؤ، آؤ نا بیٹا! میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گی، ڈرو مت۔'' باپ کی نرمی عمیر کی زبان چلنے لگی۔

ان کا اشارہ، ماہم کی طرف تھا، وہ اسے بھوت سمجھ رہے تھے۔

''پاپا! اس نے ہم سے جھوٹ بھی بولا۔ وہ بھوت کہنے لگا، میں بھی تمہاری ماما ہوں آؤ میرے سینے سے لگو، میں بھی.....''



''جسٹ اسٹاپ اِٹ حمزہ!''

اس میں مزید سننے کی سکت نہیں تھی، اسی لئے حمزہ کو ٹوک گئی۔ وہ اندر ہی اندر رونے لگا۔ اس نے منصور کو دیکھا، جس نے نگاہیں چرا لیں۔

''آئی ایم سوری ماما!'' وہ دونوں کورس میں بولے۔ ''ہم دونوں کبھی بھی اوپر نہیں جائیں گے۔ آپ کو ہرٹ بھی نہیں کریں گے۔'' حمزہ، ماں کا ہاتھ پکڑے اپنی غلطی کا ازالہ کر رہا تھا۔

''نہیں ماما کی جان! نہیں۔ پھر ایسا کبھی مت کرنا۔'' اس نے دونوں کو خود میں بھینچ لیا۔ وہ اپنے اندر کی ٹوٹ پھوٹ، بچوں پر آشکار نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''آپ دونوں باہر لاؤنج میں جا کے کارٹون دیکھو، میں تھوڑا سا کام نمٹا کر آتی ہوں، پھر کھانا کھاتے ہیں۔''

اس نے ان دونوں کو پچکار کر باہر بھیج دیا۔ اب کمرے میں صرف وہ اور منصور تھے۔ کمرے میں ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا۔ بلکہ ماہم کے سلسلے میں وہ کچھ نہیں کہتا تھا۔ کبھی وہ ہوتا تو یوں انجان بن جاتا، جیسے یہاں موجود ہی نہیں۔ مگر اب اکثر شام میں وہ اُداس سا ہو کر اسٹڈی روم میں مقید ہو جاتا۔ جیسے وہ شاہم سے اپنا آپ چھپانا چاہ رہا ہو۔

''آپ کوئی حتمی فیصلہ کیوں نہیں کرتے منصور؟'' کافی توقف کر کے وہ بولی۔

''کیسا فیصلہ؟'' وہ انجان تھا، یا بن رہا تھا۔

''اُس عورت کا، جو ہمارے سروں پر بیٹھی ہے۔ ابھی بچے اسے بھوت سمجھ رہے ہیں، کل کو ماں کہنے لگیں گے۔ وہ آخر یہاں کیا لینے آئی ہے؟''

وہ منصور پر چڑھ دوڑی۔ اسے یہ بھی خیال نہیں تھا کہ فی الوقت منصور سے زیادہ اس سے اس کا رشتہ بنتا ہے۔

''میں اسے اٹھا کے نہیں لایا۔ کوئی اور پناہ گاہ نہیں ملی ہو گی، وہ یہاں چلی آئی۔ اس میں میرا کیا قصور ہے؟'' منصور اپنی جگہ سچا تھا۔

''یہ کوئی ایدھی سینٹر یا دارالامان نہیں ہے، جس کا جب جی چاہے، منہ اٹھائے چلا آئے۔ گھر ہے ہمارا، فیملی ہے۔ آپ اسے یہاں سے جانے کو کہہ دیں۔ میں اسے مزید برداشت نہیں کر سکتی۔''

وہ غصے سے لال پیلی ہو رہی تھی۔ اس کے منہ سے بات نکلنا مشکل تھی۔

''سوری، آئی کانٹ۔'' اس نے ہاتھ اٹھا کر صاف انکار کر دیا۔

''او کے، آپ نہیں تو میں خود ابھی جاتی ہوں اور اسے دھکے دے کر گھر سے باہر نکالتی ہوں۔ دیکھتی ہوں کیسے نہیں نکلتی۔'' شاہم غصے میں آگے بڑھی تو منصور سامنے آ گیا۔

''واٹ نان سینس۔ بچوں کے سامنے تماشا کری ایٹ کرو گی؟ ملازم ہیں، وہ کیا سوچیں گے؟..... میں کرلوں گا اس کا کچھ بندوبست۔ مجھے سوچنے تو دو، صرف تھوڑا ٹائم اور پلیز۔''

اس نے بہت نرمی سے اسے روکا۔ ورنہ وہ ابھی عمل کرنے والی تھی۔ یہ بھی شکر تھا کہ یہ واقعہ منصور کی موجودگی میں پیش آیا تھا۔ ورنہ ماہم کی خیر نہیں تھی۔

وہ ساری شام منصور نے اسٹڈی روم میں خاموش کچھ سوچتے گزاری۔ اسی کمرے میں ماہم نے اپنے جرم کا اعتراف کیا تھا اور اسی کمرے میں اس نے منصور سے طلاق کا مطالبہ بھی کیا تھا۔ ماہم نے اسے پھر سے کشمکش میں ڈال دیا تھا۔ اسے پہلے روز ہی دیکھ کر منصور نے سوچا تھا کہ اسے یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ منصور نے پورے چھ سال اس سے پل پل بے انتہا محبت کی تھی۔ وہ محبت کسی بھی وقت انگڑائی لے کر بیدار ہو سکتی تھی۔ وہ دل میں بغض، کینہ یا کھوٹ رکھنے والا انسان نہیں تھا۔ اس کی فطرت میں معاف کر دینے، صلہ رحمی اور بھول جانے کا عنصر بہت زیادہ تھا۔ ماہم کی حرکات اسے شروع سے کھٹکتی آئی تھیں۔ مگر اس نے اپنے ذہن کو کسی بھی شک و شبے میں نہ پڑنے دیا۔ مگر ماہم نے وہی کیا، جسے وہ نظرانداز کرتا رہا تھا۔ ماہم چلی گئی بچے اُس کے سپرد کر کے۔ وہ چاہتا تو شاہم کے کردار پر شک کر کے اس کی بہن کے کئے کا غصہ اس پر نکال سکتا تھا، اسے گھر سے باہر کر سکتا تھا۔ مگر اس نے ایسا کرنا تو درکنار، سوچا بھی نہ۔

وہ اس بات کو تسلیم کرتا تھا کہ شاہم نے اس سے شادی کا فیصلہ محبت کی نہیں، عقل کی بنیاد پہ کیا تھا۔ محبت تو ابھی بھی ان دونوں میں صرف نام کی حد تک تھی۔ ورنہ وہ دونوں صرف اپنے رشتے کا احترام کرتے تھے۔ ان دونوں نے ایک دوسرے سے محبت، التفات جیسی توقعات کبھی نہیں رکھی تھیں۔ نہ شاہم سج سنور کر منصور سے تعریف و توصیف سننے کی خواہاں تھی، نہ ہی وہ اس کے ناز نخرے اٹھاتا تھا۔ ان دونوں کے اس تعلق کا واحد سبب صرف بچے تھے۔

ماہم کے آ جانے پر اس نے چند ایک بار سوچا تھا کہ کاش! میں نے شاہم کی زبردستی کا یہ بندھن قبول نہ کیا ہوتا۔ جب سے ماہم آئی تھی، شاہم صرف ایک بار اوپر گئی تھی۔ وہ بھی اسے تنبیہ کرنے کے لئے۔ منصور کے سامنے اگر وہ ماجدہ سے اس کی پوچھ گچھ کرتی



تی، وہ انجان بن جاتا۔ وہ شاہم کو اپنی طرف سے کوئی تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا۔ کیونکہ ہم سے محبت نہ سہی، وہ اس کی قربانی اور ہمت کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اس کے ماہم کے ساتھ گزارے چھ سال کا شاہم کے ہمراہ بتائے پونے دو سال کا ازنہ کیا جاتا تو شاہم کا ساتھ ہر زاویے سے بہتر تھا۔ وہ ایک اچھی ماں، اچھی بیوی اور فہ مند عورت تھی۔ گھر کے بیرونی کام بھی سرانجام دے لیتی تھی۔ جب بھی اسے گھر ے باہر جانا ہوتا، وہ آفس فون کر کے منصور سے اجازت ضرور لیتی۔ وہ اس کو اطلاع یئے بغیر کبھی گھر سے باہر قدم نہیں رکھتی تھی۔ اتنے ملازمین کی موجودگی میں بھی وہ وٹے سے چھوٹا کام اپنی نگرانی میں کرواتی۔

اس نے منصور کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ نہ کوئی چھوٹی بڑی خواہش، نہ ہی ی معاملے میں بحث۔ منصور کے منہ سے نکلا ہر لفظ اس کے لئے حرفِ آخر تھا۔ منصور ں کی خدمات کا دل سے قدردان تھا۔ مگر جب سے ماہم لوٹی تھی، اس کا دل عجیب سا ڑکنے لگا تھا۔ وہ شاہم سے بے ایمانی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی عقل کہتی تھی کہ م کو جتنی جلدی ممکن ہو، اس گھر سے فارغ کر دیا جائے۔ جبکہ دل کی منطق اس کی عقل ے برعکس تھی۔ وہ خطرہ محسوس کرنے کے باوجود آنکھیں بند کئے ہوئے تھا۔

آج کا واقعہ، خطرے کا الارم تھا۔ اس نے بچوں کو اپنے پاس بلایا تھا اور انہیں یہ بھی یا تھا کہ میں تمہاری ماں ہوں۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ابھی تو بچے اسے بھوت یال کر رہے تھے۔ وہ بھوت نہیں بلکہ ان کی حقیقی ماں ہے۔ اور یہ حقیقت کبھی بھی کھل تی ہے۔ ماہم کو جتنی جلدی یہاں سے فارغ کر دیا جاتا، ان دونوں کے، بچوں کے اور نا کے رشتے کے حق میں بہتر تھا۔ لیکن اگر وہ اسے نکال دیتے تو وہ کہاں جائے گی؟ یہی وچ منصور کو ستاتی تھی۔

ماجدہ، رات کا کھانا لے کر اوپر گئی تو ماہم، عشاء کی نماز پڑھ رہی تھی۔ ماجدہ کھانا رکھ کر اس کی نماز ختم ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ اس نے نماز باقاعدگی سے پڑھنی شروع کر ی تھی۔ جتنے گناہ وہ کر چکی تھی، شاید ان کا کفارہ ادا ہو پاتا۔ اس کے اپنے، معاف کرنے کو تیار نہیں تھے۔ وہ رب سے معافی کی طلب گار تھی۔ ہر طرف سے خود کو بے آسرا کر کے اب اسے بچے اپنا سہارا نظر آنے لگے تھے۔ وہ ان سے ملنے کے لئے تڑپتی تھی۔ ہر نماز کے بعد دعا مانگتی کہ بچے اسے مل جائیں۔''

''کھانا رکھ دیا ہے۔'' اس کے سلام پھیرنے پر ماجدہ اطلاع دے کر پلٹنے لگی کہ اس

نے روک لیا۔

''ماجدہ.....!''

''جی.....'' وہ پلٹی۔

اس کو ماہم کے اندر آنے والی اس نئی تبدیلی سے بڑا خوف آتا تھا۔ گھر کے
ملازمین کو شاہم سے دلی لگاؤ تھا۔ وہ سب بھی اس کی قربانی کو دل سے سراہتے تھے۔
سب کے خیال میں بھی ماہم کا اب یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں تھا۔

''ایک کام کر دو گی میرا؟ کسی تک پیغام پہنچانا ہے، مہربانی کر دو۔''

وہ ماجدہ سے بچوں کی خیر خیریت پوچھتی رہتی تھی۔ اس کی ماجدہ سے زیادہ تر گفت
بچوں کے متعلق ہی ہوتی تھی۔ جو وہ ہرگز شاہم کے گوش گزار نہیں کرتی تھی۔

''جی بتائیں۔'' ماجدہ کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

''منصور سے کہو، مجھ سے ایک بار مل لیں۔ مجھے ان سے ضروری کام ہے۔
ماجدہ! تم یہ کر سکتی ہو۔''

ماجدہ گھبرا کر پیچھے ہٹی۔ وہ اس گھر کی ملازم ہی نہیں، ان کی دُور پار کی رشتے دا
تھی۔ یہاں کی سچی خیر خواہ اور نمک خوار تھی۔ ان کے آپس کے معاملات کے بارے
وہ اپنی الگ سے ذاتی رائے تو رکھ سکتی تھی، مگر مداخلت کی جرأت نہیں تھی۔ پھر وہ
کے حق میں بھی تھی۔ وہ اسے بے خبر رکھ کے وار نہیں کر سکتی تھی۔

''نہ بی بی جی! کسی کو دھوکا دے کے نمک حرامی نہیں کر سکتی۔ شاہم بی بی کے
اتنی زیادتی نہیں۔ ہرگز نہیں۔'' وہ بہت گھبرا گئی۔

''میرا یقین کرو ماجدہ! میں جائے نماز پہ بیٹھی ہوں۔ منصور سے ملنے کا میرا کو
مقصد نہیں ہے، نہ ہی میری نیت میں کوئی کھوٹ ہے۔ اب وہ میری چھوٹی بہن کا
ہے۔ مانا کہ میں بری ہوں ماجدہ! مگر ظالم نہیں۔ میں نے منصور سے صرف اپنے
کے متعلق بات کرنا ہے۔ تمہیں اللہ کا واسطہ، ماجدہ! تم بھی تو ماں ہو۔ مجھ پہ یہ احسا
دو۔'' وہ ہاتھ باندھ کر رونے لگی تھی۔

ماجدہ کا دل اس کے آنسوؤں کے آگے نرم پڑتا جا رہا تھا۔ وہ بھی ماں تھی۔
بچوں کے لئے بے چینی اس سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔

''وہ جی ٹھیک ہے، میں..... کوشش کروں گی۔'' ماجدہ نے تذبذب کے
ہامی بھر لی۔



وہ نیچے آئی تو سب کھانا کھا چکے تھے۔ شاہم نے ٹیبل سمیٹ لی تھی۔ منصور کھانے
کے بعد گھنٹہ دو گھنٹہ ٹی وی دیکھتا تھا۔ شاہم بچوں کو سلانے کے لئے لے گئی تھی۔
ماجدہ ہاتھ رگڑتی اُس کے پاس آ رُکی۔ ماجدہ کو نہیں پتہ تھا کہ منصور اس پیغام کو کس
طرح لے گا؟

''کیا بات ہے ماجدہ! کچھ کہنا چاہتی ہو؟'' منصور کی نظر اُس پر پڑ گئی۔

''جی.....وہ.....وہ صاحب جی!'' اُس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

''گھبراؤ نہیں۔ بولو کیا بات ہے؟'' اس نے نرمی سے استفسار کیا۔ ماجدہ کو اُس کی
نرمی سے حوصلہ ملا تھا۔

''پتہ نہیں صاحب جی! مجھے یہ سب کرنا چاہئے کہ نہیں..... مجھے جی، ماہم بی بی نے
آپ کے نام پیغام دیا کہ آپ ان سے مل لیں، کوئی ضروری کام ہے انہیں۔'' ماجدہ نے
کسی مجرم کی طرح سر جھکا لیا۔

منصور نے ٹی وی کا والیوم کم کر دیا اور ماتھے کو انگلیوں سے رگڑنے لگا۔

''میں چلتی ہوں صاحب جی! بارش ہونے والی ہے..... مجھے اپنا سامان وغیرہ اندر
کرنا ہے۔'' اُسے شاہم کے آ جانے کا ڈر تھا۔ وہ اسے منصور کے پاس کھڑا دیکھ کر ضرور
کچھ پوچھتی۔

''ہاں، جاؤ۔'' وہ اس سے زیادہ کیا کہہ سکتا تھا۔

وہ صوفے پہ نیم دراز ہو کے سوچوں میں گھر گیا۔

☆☆☆

اپارٹمنٹ کے اندر اندھیرے نے اس کا استقبال کیا۔ باہر تیز بارش کے ساتھ ہلکی
ہلکی باری بھی ہو رہی تھی۔ موسم کی ٹھنڈک، ہڈیوں کو منجمد کرنے والی تھی۔ دروازہ بند کر
کے وہ تھوڑا جھنجلا گئی۔

''اتنا لاپروا ہے یہ، لائٹ بھی آن نہیں کی۔ پڑا رہتا ہے اپنے کمرے میں۔'' اس
نے بڑبڑاتے ہوئے موبائل ٹارچ سے سوئچ بورڈ تک کا فاصلہ طے کیا۔ روشنی کر کے وہ
سیدھی کاشا کے کمرے میں چلی گئی۔

''ہیلو کاشا! آر یو ہیئر؟'' اس کے کمرے میں بھی زیرو پاور کی روشنی تھی۔

''کیا مصیبت ہے کاشا!..... ہر جگہ بلیک آؤٹ کیا ہے۔'' اس نے بٹن پہ انگلی رکھ
کر ایک دم اسے کمرے کے سرد ٹمپریچر کا احساس ہوا۔ باہر کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھلی

تھی، جس سے بارش اور ٹھنڈی ہوا اندر آنے سے کمرے میں اچھی خاصی ٹھنڈک
تھی۔ کاشا، کارپٹ پہ بیٹھا، گھٹنوں میں سر دیئے ہوئے تھا۔ خالی بوتلیں اور گلاس اس
پاس پڑے تھے۔

لیلیٰ یہ سارا منظر دیکھ کر حیران رہ گئی۔

''کیا ہوا کاشا! آر یُو اوکے؟'' اس نے کاشا کا بازو ہلایا۔ اس نے آدھے بازو
شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ اس کے بازو پہ رونگٹے کھڑے تھے۔ سارا جسم سرد تھا۔ وہ ہو
حواس سے بے گانہ تھا۔

لیلیٰ اسے چھوڑ کر کھڑکی کی طرف بڑھی، اسے بند کر کے بھاری پردے برابر
جلدی سے ہیٹر آن کیا۔ کاؤچ پہ پڑا ہوا اس کا گرم لانگ کوٹ اٹھا کے اس کے کندھو
ڈال دیا۔

''کاشا! کیسی طبیعت ہے تمہاری؟.....ڈاکٹر کو بلاؤں؟'' وہ اس کے گال تھپتھ
تھی۔ اس کی حالت نے لیلیٰ کو حواس باختہ کر دیا تھا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ پریشان مت ہو۔'' اس نے لیلیٰ کو خود پر سے پرے کر
''ہوں، اوکے!'' اس نے ناراضگی سے نفی میں سر کو جھٹکا۔ ''تمہیں معلوم۔
الکحل تمہارے لئے کتنا نقصان دہ ہے، اس حالت میں۔ پھر بھی تم نے ڈرنک کیا۔
تحاشا ڈرنک۔''

وہ اُس کی حالت پہ کُڑھ رہی تھی۔

''کچھ نہیں ہوا مجھے۔ مرا نہیں ہوں۔ زندہ ہوں ابھی۔'' اس نے کلائی اس کی
بڑھائی۔

''مجھے نظر آ رہا ہے۔ مرنے کی کوشش تو کی ہے نا۔ تمہارا پرابلم کیا ہے؟ صبح میں
اچھا بھلا چھوڑ کے گئی تھی۔''

کاشا نے اسے بالکل نہیں بتایا تھا کہ وہ اپنی ماں سے ملنے جانے والا ہے۔

''لمحہ بھر میں دنیا ختم ہو جاتی ہے، تم صبح سے رات تک کی بات کر رہی ہو۔'' ابھ
اس کے حواس قائم تھے۔

''چائے بناؤں؟''

''ہوں۔''

کاشا کے اثبات میں سر ہلانے پر وہ اسے گھورتی ہوئی اُٹھ گئی۔



چائے بنانے رکھ کے اس نے خالی بوتلیں شیلف کے نیچے رکھ دیں۔ گلاس دھو کے
بین میں رکھا اور اسٹینڈ سے دو مگ اُتار لئے۔ فریج میں سے اس نے بریڈ نکالی اور
ینڈوچ تیار کرنے لگی۔

''تم نے دن بھر کوئی دوا نہیں لی نا۔ نہ ہی کھانا کھایا ہے۔'' ٹرے اس کے آگے رکھ
ے وہ وہیں بیٹھ گئی۔

اس نے مگ اٹھا کے منہ سے لگا لیا۔ لیلیٰ نے اصرار نہ کیا۔ وہ اس کی نہ کو ہاں میں
یں بدل سکتی تھی۔

''جب تم کنفیوز ہوتی ہو، کیا کرتی ہو؟'' وہ مگ کے کناروں پہ انگلی پھیر رہا تھا۔

اپنی ماما کو کال اور دعا۔'' اس نے سینڈوچ کی بڑی سی بائٹ لی۔

کاشا نے یک دم اسے دیکھا۔ یہ دونوں کام اس کے بس سے باہر کے تھے۔ ماں کا
وہ باقی ماندہ زندگی میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا اور دعا کا وہ قائل نہیں تھا۔

''تم دعا پہ بلیو کرتی ہو؟''

''یس، اللہ پاک پہ کسے بھروسہ نہیں ہوتا؟ ''میں جب بھی، جس چیز کے لئے بھی
Pre کرتی ہوں، وہ مجھے دیتا ہے۔'' اس نے فٹ بتا دیا۔

''اور اگر نہ دے تو نہیں مانو گی؟''

''نہیں کاشا! ایسا مت بولو۔ یہ سراسر کافرانہ سوچ ہے کہ اگر وہ ہمیں دے گا تو اسے
یں گے۔ اس کے نہ دینے میں بھی کوئی نہ کوئی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔ وہ ہماری
لائی کے لئے ہی ہمیں محروم رکھتا ہے۔ وہ ہم سے ستر ماؤں جتنا پیار کرتا ہے۔ ہم ایک
ں کی محبت اور شفقت کا قرض پوری زندگی نہیں چکا پاتے۔''

اسے بھی مذہب کی بہت زیادہ معلومات نہیں تھیں۔ جتنا پتہ تھا، بتا رہی تھی۔ مگر اسے
کاشا کی باتوں سے عجیب سا خوف آ رہا تھا۔ اس نے کبھی دین، مذہب کو موضوعِ بحث
یں بنایا تھا۔

''پتہ نہیں، کیونکہ میری ماں نہیں ہے۔ اس نے ہمیشہ مجھے اپنی مرضی سے دیا، جس کی
ہ میرے اندر تھی، وہ کبھی نہیں۔'' اس کا انداز بہت مایوسانہ تھا۔

''مے بی وہ تم سے بہت محبت کرتا ہو اور اسی میں تمہاری بہتری ہو۔'' لیلیٰ اسے بہت
ظ سے سمجھا رہی تھی۔

''مجھے پیار لینا آتا ہے نہ دینا۔ مجھے یاد ہے، غنی نے کہا تھا، محبت خدا کا تحفہ ہے۔''

اسے غنی کی چند سال قبل کہی بات یاد تھی۔

''سچ بولو کاشا! تمہیں کسی سے محبت نہیں؟ کبھی کسی کو دیکھ کر ہارٹ بیٹ مِس نہیں کی؟''

وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا، پھر بولا۔

''سیریسلی نہیں..... ماہم سے تھوڑا بہت جسٹ لگاؤ تھا۔ مجھے بھی کبھی کسی نے پیار نہیں کیا۔ پیدا ہونے سے لے کر اب تک، میں نے کسی اپنے کی آنکھوں کی محبت کی چمک نہیں دیکھی۔ پھر جو مجھے نہیں ملا، وہ میں دوسروں کو کہاں سے دوں؟..... صرف ایک شخص مجھے بہت چاہتا ہے، غنی۔ میرا جگر، ویل وشر۔''

غنی کی اس سے محبت کسی سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔ وہ کئی برس ایک دوسرے کے ہمراہ ایک چھت تلے رہے تھے۔ ان دونوں کی دوستی میں زیادہ ہاتھ غنی کا تھا۔ کاشا اس کے ساتھ بھی اُکھڑا ہوا ہی رہتا۔

''تمہیں اپنی ماں سے محبت نہیں ہے؟ تم نے کبھی ان کا ذکر نہیں کیا۔'' لیلیٰ نے اس کا موڈ دیکھ کر بہت ہمت سے استفسار کیا۔ ورنہ وہ کسی کو بھی اپنی ذاتیات میں دخل انداز کی اجازت نہیں دیتا تھا۔

اس نے ایک لمبی، ٹھنڈی سانس لی۔

''میری ماں مر گئی، اسی روز جب میرا باپ مرا۔ جب اس نے میری کفالت کے لئے باہر قدم رکھایا تب، جب اپنے باس سے شادی کی یا..... یا شاید پھر آج۔ میں۔ زندگی اسی الوژن میں گزاری کہ وہ ہے سات برس کے بچے کو اس کی محبت، شفقت اور توجہ کی ضرورت تھی اور اس نے میری معصومیت کا سودا پیسوں کے عوض کر لیا۔ اسے تھا، اس بچپن نامی شے سے میں نا آشنا ہوں، پتہ ہی نہیں چلا، میں کب نانی کے چا اور ماموں کی گالیاں کھاتا بڑا ہو گیا۔ اتنا بڑا کہ گالیوں کا جواب گالیوں سے دیتا، نانی اپنے گال کی طرف بڑھا ہاتھ تھام کر جھٹک دیتا۔ گلی میں دو چار لڑکوں سے پنگے لئے کاشف سے کاشا بن گیا۔ کتابوں کی جگہ ہاتھ میں ریوالور آ گیا۔ ماں سے الگ اور بڑے گھر کا مطالبہ کر دیا۔ اب میں نانی کے ساتھ نہیں رہ سکتا تھا۔ میں اپنی اتنی آزادی کا ناجائز استعمال کرنے لگا۔ کوئی پوچھنے والا تھا، نہ سمجھانے والا۔ میں نے ہر وہ کام کیا، جو مجھے زیب نہیں دیتا تھا۔

مجھے وہ عورت قابلِ نفرت لگتی، اُس کی ذات اور عزت کی دھجیاں اُڑانا میرا محبوب مشغلہ بن گیا۔ میں پیسے کا بے دریغ ضیاع کرتا۔ اسی پیسے نے مجھ سے میرا واحد خونی رشتہ



لیا تھا اور باقی کو لالچی کیا تھا۔ حتیٰ کہ میری ماں، مجھ سے دُور چلی گئی۔ اُسے دھن مجھ سے زیادہ عزیز ہو گئی۔ میں کتنا بدنصیب ہوں، مجھے کبھی کسی غیر نے ریجیکٹ کیا، میری ماں مجھے دھتکار رہی ہے، پیسوں کی طمع دے کر دھتکار رہی ہے۔''

س نے گھٹنوں میں سر دے لیا تھا۔ لیلیٰ کو لگا، وہ رو رہا ہے۔ اس کی گفتگو کا کچھ حصہ سمجھ میں آیا تھا، کچھ نہیں۔ وہ اس سے وضاحت نہیں مانگ سکتی تھی۔ وہ اسے صبح ماضا چھوڑ کر گئی تھی۔ اب اس کی حالت اس قدر بگڑی ہوئی تھی کہ آنکھوں کے نیچے ے سیاہ حلقے واضح ہو رہے تھے۔

''میرے جسم میں بہت درد ہو رہا ہے۔ بہت درد لیلیٰ۔'' وہ ہاتھ سے بازو کو دبانے لگا تکلیف کے آثار اس کے چہرے پر بہت واضح تھے۔

''تم نے میڈیسن ڈوز نہیں لی، اسی لئے درد ہو رہا ہے۔ میڈیسن کھا لو۔'' لیلیٰ نے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔

''نہیں..... یہ درد، دوا سے نہیں جائے گا۔ نہیں جائے گا۔'' اُسے اُٹھنے میں لیلیٰ نے دیا اور بیڈ پر لے آئی۔ اسے لٹا کر اچھی طرح کمبل اوڑھا دیا۔

''تم سو جاؤ کاشا!..... میں نے کتنی بار بولا ہے، ہسپتال میں ایڈمٹ ہو جاؤ۔ تم نہیں مانتے؟ اگر اپنا مکمل علاج نہیں کروانا تھا تو پاکستان میں رہتے۔ امریکہ آنے کا یوں کیا؟''

وہ اس کی حالت پہ کوس رہی تھی۔

''میں نے کنفرم کر لیا ہے۔ پاکستان کے لئے فلائٹ جا رہی ہے، میری بکنگ کروا جا چلا جاؤں گا۔'' تکیے پہ سر رکھے، بند آنکھوں سے وہ کہہ رہا تھا۔

لیلیٰ اس کے پاس ہی ترچھی سی ہو کر ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔

وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ سو گیا۔ وہ احتیاط سے اس کے پاس سے اُٹھی۔ وال کلاک پہ ٹائم دیکھا۔ کمبل کو مزید اس پہ اوڑھایا، ہیٹر بند کیا، لائٹ بند کر کے وہ باہر نکل آئی۔

☆★☆

شور سے اُس کی نیند ٹوٹی تھی۔

کمرے میں چار سُو اندھیرا تھا۔ یعنی ابھی صبح نہیں ہوئی تھی۔ کمرے میں بہت مدھم روشنی میں اس نے اپنے ساتھ دعا اور شاہم کو لیٹے دیکھا اور کروٹ بدل گیا۔ بادل کی

زوردار گرج نے یک دم اس کے حواس بیدار کر دیئے۔ اس نے کان لگا کے سنا تو بارش
آواز آئی۔ وہ فوراً اُٹھ کے بستر پہ بیٹھ گیا۔ اسے یاد تھا، ماہم بارش، بجلی کی چمک
بادلوں کی گرج سے بہت ڈرتی تھی۔ وہ تصور کر سکتا تھا کہ وہ اس وقت سہمی ہوئی، بارش
رکنے کی دعائیں کر رہی ہوگی۔ اسے رات ماجدہ کا دیا پیغام بھی یاد تھا۔ اس کا دماغ کہہ
تھا کہ سب کچھ ذہن سے جھٹک کر لیٹ جاؤ۔ جبکہ دل کی آواز تھی کہ ماہم کو سہارے
ضرورت ہے۔

بارش کا زور بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے سوئی ہوئی شاہم پہ طائرانہ سی نگاہ ڈالی اور
گیا۔ کمرے کا دروازہ احتیاط سے بند کر کے وہ دھیمے دھیمے چلتا، لاؤنج میں آ گیا۔ یہ
بھی لائٹ روشن نہیں تھی۔ ملازم اپنے ٹھکانوں پر دبکے پڑے تھے۔ وہ پیچھے مڑ کر
رُکتا، سوچتا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ وہ اپنے نئے رشتے میں پہلی چوری کرنے جا رہا
وہ شاہم کو دھوکے میں رکھ کے محبت میں بے ایمانی کرنے والا تھا۔ اگر ماہم نے اس
کچھ ضروری بات کرنا تھی تو وہ شاہم کو اعتماد میں لے کر اس کے ہمراہ، ماہم کے
جاتا۔ اس کا دونوں سے رشتہ تھا۔ معاملہ بھی گھر کا تھا۔ اس نے غلطی کی تھی، مگر اب
لوگوں کے سوا اس کے پاس کوئی ٹھکانہ بھی نہیں تھا۔ انہیں مل کر اس کا مسئلہ حل
چاہئے۔ شاہم کو منانا اُس کے لئے مشکل نہیں تھا۔ مگر یہ سب باتیں تو ہوش و حواس
عقل کی تھیں اور اس کی عقل پر پردہ پڑ چکا تھا۔

ہینڈل گھمانے پر دروازہ کھلتا چلا گیا۔ وہ بیڈ کے وسط میں بیٹھی بری طرح کپکپا
تھی اور رو رہی تھی۔ وہ تیزی سے اس تک پہنچا۔

''ما..... ماہی! کیا ہوا؟..... رو کیوں رہی ہو؟'' وہ بے تابی سے اس کا بازو
پوچھ رہا تھا۔

کتنا کچھ بدل گیا تھا، مگر اس کے آنسوؤں نے آج بھی منصور کو بے تاب کر دیا

''منصور.....''

ماہم نے روتا ہوا، خوف زدہ چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا اور اس کے ساتھ لگ گئ
روتی جا رہی تھی۔ منصور ساکت و صامت ایک عرصہ بعد عورت کے وجود کو اپنے
جڑے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔

☆★☆

فون کی مسلسل چیختی بیل نے اُس کی نیند خراب کی تھی۔ نیند میں مدہوش اس



اپہ دھر لیا۔ بیل کا دم پھر بھی نہ ٹوٹا، البتہ اُس کی نیند ٹوٹ چکی تھی۔ کارڈلیس کو گھور
نے کان سے لگایا۔

''ہیلو'' آواز پہ ابھی بھی غنودگی کا عنصر تھا۔

''آر یو لیلیٰ؟'' دوسری طرف غنی تھا۔

''یس۔ اینڈ یو؟''

''غنی اسپیکنگ فرام پاکستان۔ ویئر از کاشا؟'' وہ کچھ حواس باختہ سا لگ رہا تھا۔

''وہ اپنے کمرے میں سو رہا ہے۔ آپ اس وقت.....''

غنی کا نام سن کر اس کا لہجہ بدل گیا۔ وہ کاشا کا واحد دست تھا۔ غنی سے کاشا نے اس
خاصا تعارف کروا رکھا تھا۔

''پلیز! آپ اُسے جگائیں۔ مجھے بات کرنا ہے، ابھی۔''

اس نے ''ابھی'' پر خاصا زور دیا۔ پچھلے دو، ڈھائی گھنٹے سے اس کا دل، کاشا کی طرف
وسوسے میں گھرا ہوا تھا۔ اسے کاشا کے متعلق عجیب عجیب سے خیال آ رہے تھے۔

''سم تھنگ از رونگ؟'' وہ کاشا کو اُٹھانے سے ہچکچا رہی تھی۔ وہ غنی کو بتانا نہیں
تھی کہ اس کی طبیعت بہت بگڑی ہوئی ہے۔ اتنی مشکلوں سے تو وہ سویا تھا۔

''پلیز!'' اس نے چبا کر کہا۔

''اوکے۔'' وہ کارڈلیس ہاتھ میں لئے اُٹھ گئی۔ چپل پیروں میں اڑس کے وہ باہر
۔

کاشا کے کمرے کا ہینڈل گھمانے پر اسے دروازہ مقفل ملا۔ وہ حیران رہ گئی۔ وہ خود
دروازے کو کھلا چھوڑ کر گئی تھی۔ پھر وہ اور کاشا کبھی بھی اپنے کمرے مقفل کر کے نہیں
تے تھے۔ کاشا تو سو چکا تھا، پھر دروازہ کس نے بند کیا؟

''ہیلو، غنی! کاشا کا کمرا لاک ہے۔ حالانکہ میں خود اسے کھلا چھوڑ کر گئی تھی اور تب
شا بھی سو چکا تھا۔''

اب اس کے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ اسے کسی گڑبڑ کا اندیشہ ہوا۔

''دروازہ ناک کرو۔'' غنی نے اسے ہدایت دی۔

''کاشا!..... کاشا! اوپن دا ڈور..... پلیز کاشا!'' وہ پورے زور سے دروازہ
دھڑا رہی تھی۔ جب سے وہ بیمار ہوا تھا، اس کی نیند بہت گہری نہیں ہوتی تھی۔ ہلکی سی
آہٹ سے ٹوٹ جاتی تھی۔

''لیلیٰ! تمہارے پاس ڈپلی کیٹ چابی ہے؟'' اس نے ہاتھ میں پکڑے کارڈلیس پر غنی کو کہتے سنا اور اسے کان سے لگا لیا۔

''ہاں ہے۔ مگر ڈھونڈنا پڑے گی۔'' اس نے جلدی سے یاد کر کے بتایا۔

''جلدی ڈھونڈو.... ہری اپ۔'' بالوں میں اُنگلیاں پھنسائے وہ مسلسل چکرا رہا تھا۔

''یا اللہ! خیر کرنا۔'' بے اختیار مصیبت میں اس کے منہ سے مالک کا نام نکلا۔

لیلیٰ نے ریک کی ساری چیزوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ درازوں میں سے وہ چیزیں نکال نکال کر باہر پھینکتی جا رہی تھی، ہر چیز کو اُلٹ پلٹ کر رہی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن بہت تیز تھی اور ہونٹ خوف سے خشک ہو گئے تھے۔ کارڈلیس، کراؤن پر رکھ کے اس نے بیڈ کی دراز کو باہر کھینچا۔ اس میں کچھ کاغذات تھے، جو اس نے پرے اُچھال دیئے۔ نیچے کچھ اور فالتو چیزوں کے ساتھ چابیوں کا گچھا بھی تھا۔ چابیاں مٹھی میں جکڑ کر اس نے کارڈلیس اُٹھا کر باہر دوڑ لگا دی۔

''چابی مل گئی ہے۔ کھولتی ہوں۔''

نمبر پڑھ کے چابی، لاک میں گھماتے ہوئے اس کے ہاتھ واضح طور پر کپکپا رہے تھے۔ ٹانگوں سے جان نکلی جا رہی تھی۔ دروازہ دھکے سے کھول کر وہ اندر داخل ہوئی۔ آگے کے منظر نے اس کی سانس روک دی۔ وہ بت بن گئی تھی۔

''ہیلو!..... ہیلو لیلیٰ!..... ہیلو لیلیٰ! کاشا کیسا ہے؟..... اس کی طبیعت ٹھیک ہے؟''

غنی دوسری طرف سے جواب نہ پا کر چیخ رہا تھا۔

''غنی..... کاشا اِز نو مور..... اس نے سوسائیڈ کر لی۔''

وہ کارپٹ پر گرا تھا۔ خون نے سارا کارپٹ رنگ دیا تھا۔

☆☆☆



''میں سوچتی تھی، آپ کبھی شادی نہیں کریں گے۔''

''تم مجھے سوچتی تھیں؟'' منصور نے دل میں کہا۔

وہ دونوں کارپٹ پہ بیٹھے تھے۔ منصور اس کے سامنے گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے، سر ئے اسے سن رہا تھا۔ اسے رات کے اس پہر اپنی سابقہ بیوی کے کمرے میں تنہا، اتنی ے نہیں بیٹھنا چاہئے تھا۔

''مگر انسان جو سوچتا ہے، ویسا ہی کب ہوتا ہے۔ میں جانتی ہوں منصور! اب ان ا کا وقت نہیں ہے۔ میں نے نہ صرف آپ لوگوں کے ساتھ بلکہ خود اپنے ساتھ بھی برا کیا۔ غلطی کا احساس ہوا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ پروفیسر زوہیب رضا کی بیٹی کتنی قوف یا شاید خراب نکلی۔ انہوں نے اپنی بیٹی کی تربیت اس انداز میں تو نہیں کی تھی۔ ا نے تو میری شخصیت میں چن چن کے اچھائیوں کا اضافہ کیا تھا۔ میں ان کا مان، فخر ۔ جب یونیورسٹی میں میرا پہلا دن تھا، ایک رات پہلے انہوں نے مجھے اپنے پاس کہنے لگے، ماہم! تم ایک سمجھ دار بچی ہو۔ میں نے تمہاری عقل کو اتنا پالش ضرور کیا ہ تم اچھے اور برے میں تمیز کر سکو۔ کل سے تم کو ایجوکیشن میں جاؤ گی۔ بہرحال ی عمر کا نازک مرحلہ ہے۔ میں تم پر کوئی پابندی نہیں لگا سکتا۔ نہ ہی میں کوئی کنزرویٹو ہوں۔ پھر ہمارا مذہب اسلام، بالغ عمر کی بچی کو ایک حد تک آزادی دیتا ہے۔ مجھے ا ہے کہ میری بیٹی کبھی اس آزادی کا ناجائز استعمال نہیں کرے گی۔ تم چاہو تو اپنی ی سے زندگی کا ہم سفر چن لینا۔ مگر ہم سفر ایسا ہونا چاہئے کہ ایک بیٹی کا ذمہ دار باپ نے کی حیثیت سے ذوہیب رضا کے پاس انکار کی گنجائش نہ رہے۔

میں اپنے باپ کے پڑھائے ہوئے سارے اسباق بھول گئی۔ میں نے اپنے باپ کا ا بدنام کر دیا۔ ساری سچویشن سمجھتے ہوئے بھی اگنور کیا، میں نے خود بدنصیبی اپنا مقدر ذلت کے راستوں پر چلی، کسی راستے کی پروا نہیں کی۔ تم میرے شوہر تھے۔ میں

نے تمہیں کبھی عزت کا مقام نہیں دیا۔ تمہاری قربت مجھے وبالِ جان لگتی تھی۔ تم نے مجھے
محبت، عزت اور تحفظ دیا، میں نے بدلے میں تمہیں دنیا والوں کا تماشا بنا دیا۔ اپنی چھوٹی
بہن کا بھی نہیں سوچا، جو ماما کے مرنے کے بعد میرے ساتھ لگ کے سوتی تھی۔ جس کی
اسکول جاتے ہوئے میں لنچ باکس اور پونیاں بناتی تھی۔ جسے میں ادب و اخلاق کے درس
پڑھاتی تھی۔ میں نے اسے ہمیشہ اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھا تھا۔ ایک ماں کی طرح
اسے پروٹیکٹ کرتی تھی۔

پھر میں اتنی سخت دل، کٹھور کیوں ہو گئی کہ میری اولاد، میرے اپنے جنے ہوئے
میرے پیروں کی زنجیر نہ بن سکے۔ مجھے اپنی دو ڈھائی ماہ کی بچی پہ بھی ترس نہیں آیا
لوگ، اولاد کے لئے ترستے ہیں، جھولیاں پھیلا پھیلا کر دعائیں مانگتے ہیں اور میں بدبخت
ان کی قدر نہ کر سکی۔ کبھی انہیں سینے سے نہیں لگایا، ان کے لئے ایک رات تک نہیں جاگی
کبھی فیڈر نہیں بنایا۔ روتے ہوئے چپ نہیں کروایا۔

میں غلطی پہ غلطی کرتے تمہیں بے خبر سمجھتی رہی، میرے نزدیک تم ایک بے وقوف
سے زیادہ نہیں تھے، جو اپنی انسلٹ کروا کے بھی، میرے سامنے جھکتا تھا۔ تم بے وقوف
نہیں، مجبور تھے۔ تمہاری مجبوری، مجھ سے محبت تھی۔ جس کی میرے اندر ذرّہ برابر بھی قدر
نہیں تھی۔ تم دیتے جاتے اور میں اِتراتی۔ تمہاری توجہ، محبت کو میں اپنا حق سمجھ کر وصول
کرتی اور فرض کبھی ادا نہیں کیا۔ میں نے تمہیں کیا دیا؟ بد زبانی، ذلت، نظر انداز
دھتکار، رُسوائی اور..... اور بے وفائی۔ مجھے یہ اعتراف ہے کہ میں تمہارے قابل نہیں
تھی، تمہارے کیا، کسی بھی رشتے کے قابل نہیں تھی۔ میں ایک بری بیٹی، بری بیوی اور بری
ماں ہوں۔ مجھے محبت، چاہت، عزت کچھ بھی راس نہیں آیا۔ میں اپنے پیروں میں
جنت کی بھی لاج نہیں رکھ سکی۔ میں نے جو کچھ بھی کیا، اب اس کی سزا مل رہی ہے۔ میں
نے اپنے ساتھ ساتھ تمہارا بھی بہت نقصان کیا ہے، منصور! تم مجھے معاف کر دو۔"

اس نے منصور کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔ وہ بے تحاشا رو رہی تھی۔

منصور کا اندر رو رہا تھا۔ اس نے جو بھی کہا، لفظ بہ لفظ سچ تھا۔ اس نے اعتراف
کرنے میں واقعی بہت دیر کر دی تھی۔ اس عورت کے آنسو آج بھی منصور کو تکلیف دے
رہے تھے۔ اس کے اندر ٹوٹ پھوٹ ہونے لگی تھی۔ اس کے دل کی زمین بھی ہلنے لگی
جا رہی تھی، جس سے اس نے چھ سال لمحہ لمحہ اپنی ہر سانس کے ساتھ محبت کی تھی۔ اسے
سینت سینت کر رکھا تھا، اس کی عزت کا رکھوالا، مضبوط محافظ بنا رہا تھا۔



وہ شروع میں ہی اپنے رشتے سے کی جانے والی اس کی بے ایمانیاں جان گیا تھا مگر
نے بغیر ثبوت کے سطحی ذہنیت کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ روایتی مردوں کی طرح مار پیٹ
کی تھی۔ وہ واقعی بے وقوف تھا یا اس عورت کی محبت اسے کمزور کر کے بے وقوف بنا
تھی۔ وہ اسے بے اعتنائی اور بے رخی کے باوجود محبت دینے پر مصر تھا۔ اسے لگتا تھا
وہ ایک دن اس کے دل کی دنیا بھی بدل ڈالے گا، وہ بھی اسے چاہنے لگے گی۔ مگر
نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ مکمل طور پر غلط ہے۔

اور اب شاید غیر محسوس انداز میں وہ دوسری بار یہ غلطی کر رہا تھا۔ اس کا ثبوت اس کا
گئے، ماہم کے کمرے میں ہونا، اس کی روداد سن کر اپنے دل میں نرم گوشہ اور
ی محسوس کرنا تھا۔

"مجھے معاف کر دو منصور! پلیز۔ میں تم لوگوں کی زندگیوں سے دُور چلی جاؤں گی،
کے لئے۔ میں اپنا منحوس سایہ تم لوگوں کی ہنستی بستی زندگی پہ نہیں پڑنے دوں گی۔
نہیں اور شاہم کو دوسری بار لوٹنا نہیں چاہتی..... مجھے معاف کر دو۔"

وہ ہاتھ جوڑے، آہ و بکا کر رہی تھی۔ منصور کے دل پہ بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔

بے اختیار ہو کے اس نے اس کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو تھام لیا۔ نفی میں سر ہلاتے
ں کے گالوں پہ پھیلے آنسوؤں کو صاف کرنے لگا۔

زوردار آواز سے دروازہ کھول کر جذبات سے بھری شاہم اندر آئی۔ ماہم اُچھل کر
در سے دور ہوئی۔ جبکہ منصور نے اسے دیکھ کر سر جھکا لیا۔ اس کے چہرے پر کوئی خاص
ات نہیں اُبھرے۔

وہ دعا کے رونے سے اُٹھی تھی۔ منصور کو اپنے ساتھ اور واش روم میں بھی نہ پا کر
ڑتی ہوئی باہر آئی۔ اس نے گھر کا کونا کونا چھان مارا۔ لان میں بھی اس کی تلاش کی،
سے کہیں نہ ملا۔ بالآخر اسے اوپر کے شک نے گھیرا۔ وہ اسی طرف آ گئی۔ اندر سے
اماہم کی بوجھل آواز نے اس کا شک، یقین میں بدل دیا۔

"رات کے اندھیرے میں، میری پیٹھ پیچھے یہ گل کھلاتے ہو تم دونوں..... اس کی
ت کی اتنی ہی چاہ تھی تو دوسرا کیوں کیا تھا؟ اس کے پاس رہتیں۔ یا اب پھر منہ کا
قہ بدلنے آ گئی ہو؟"

اس کے الفاظ تھے کہ تیر، ماہم زرد چہرہ لئے، آنکھیں پھاڑے اس کی زبان کے تیر
رہی تھی۔

"اب سمجھ میں آیا، منصور! آپ اسے گھر سے نکالنے پر رضامند کیوں نہیں ہوتے۔ پچھلی یادیں تازہ کرتے ہیں، رنگ رلیاں مناتے ہیں، مجھے پاگل سمجھ رکھا ہے۔"

منصور کا سر ابھی بھی جھکا تھا، وہ بالکل خاموش اسے سن رہا تھا۔

"نن.....نہیں شاہم! ایسا کچھ نہیں۔"

"بکواس بند کرو۔ میری آنکھوں میں دھول جھونکتی ہو میری آنکھوں دیکھے کو جھوٹ کہہ رہی ہو۔ اندھی ہوں میں یا تم ریہرسل کر رہی تھیں اس کے ساتھ۔"

ماہم کی بات کاٹ کر وہ زور سے بولی۔ اس کا چہرہ سرخ اور نتھنے پھول رہے تھے۔ اسی لمحے کا اُسے ڈر تھا، جو آ گیا تھا۔ وہ ماہم کے آ جانے سے منصور کی بٹتی ہوئی توجہ سے آگاہ تھی۔

"تم جیسی ناپاک، ذلیل، مردوں کو کھانے والی عورت، شریف گھروں میں رہنے کے قابل ہی نہیں ہے۔ آپ سے تو میں بعد میں نمٹوں گی، تم اسی وقت نکلو یہاں سے۔"

وہ اس کی طرف بڑھی اور اس کا بازو پکڑ لیا۔ منصور نے جھکے سر سے شاہم کا بازو پکڑ لیا۔

"میرا بازو چھوڑو منصور!" وہ منصور کی طرف منہ کر کے پھنکاری۔

وہ چپ چاپ اُٹھ کھڑا ہوا۔ باری باری دونوں کو دیکھا۔ دوسرے ہاتھ میں ماہم کی کلائی پکڑی۔ ایک ہاتھ میں شاہم کا بازو تھا۔ دونوں کو الگ کر دیا۔

"ماہم کہیں نہیں جائے گی۔ یہیں رہے گی۔" اس کی آنکھوں میں غصہ اور لہجہ میں سنجیدگی تھی۔

"یہ عورت یہاں نہیں رہے گی۔ میں تمہاری بیوی ہوں، میرا بھی حق ہے۔ جبکہ میں اپنے سارے فرائض پورے کرتی ہوں۔ میرا جی چاہے، اسے اپنے گھر میں رکھوں یا دھکے دے کر باہر نکالوں، تم مجھے نہیں روک سکتے۔"

وہ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے، چبا چبا کر بولتی آپ سے تم پر آ گئی تھی۔ ماہم اُس کے لئے اوّل روز سے ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ بہن ہونے کے ناتے بھی اسے کسی بھی رعایت دینے پر راضی نہیں تھی۔

"تم بھول سکتے ہو، میں نہیں۔ اس گھر کو بچانے کے لئے میں نے کتنی قربانی دی۔"

"قربانی.....کیسی قربانی؟.....کس نے مانگی تھی تم سے قربانی؟.....میں نے ہاتھ جوڑے تھے؟ تمہارے پیروں میں گرا تھا کہ مجھ سے شادی کر لو؟ میرے بچوں کی ماں بن جاؤ؟.....میں نے تمہیں خودکشی کی دھمکی دی تھی؟.....میری غلطی ماہم نہیں، تم ہو۔



جانے کے بعد مجھے تمہیں دھکے دے کر اس گھر سے نکالنا چاہئے تھا، مجھے تمہارے کردار پر بھی شک کرنا چاہئے تھا۔ مگر میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ تمہیں تحفظ دیا، مان دیا، ہر طرح سے خیال رکھا اور تم نے مجھ پر ہی وار کر دیا۔ میری نرمی کا غلط مطلب لے کر مجھے بلیک میل کیا، میرے بچوں کی برین واشنگ کر کے اُنہیں ٹریپ کیا۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ مجھے ارسل سے ملواؤ، جسے تم نے اپنی محبت کا جھانسہ دے رکھا تھا۔ مگر تم نہیں مانیں۔ تم نے اپنی من مانی کی، میرے پاس چلی آئیں، اپنے اموشنل ڈائیلاگز لے کر۔ اگر تم سچی تھیں تو جھوٹا میں بھی نہیں ہوں۔

میں کہوں گا کہ مجھے ذاتی طور پر نہ تب تمہاری ضرورت تھی، نہ اب ہے۔ میں اسی بے وفا عورت کی یادوں کے ساتھ پوری زندگی بِتا سکتا تھا، جس میں آ کر تم نے خلل ڈالا۔ ہاں ہے مجھے اس کی قربت سے لگاؤ۔ تم خود پر پہرے بٹھاؤ، میں نہیں۔ تمہیں بھی تو اس سے محبت ہے، اس کی یاد میں روتی ہو آج تک۔ بار بار اپنے عمل کی وضاحت دیتی ہو۔ ہوں.....قربانی.....قربانی نہیں شاہم بی بی! قتل۔ تم قاتل ہو، اُس شخص کے ارمانوں کی، اس کے خوابوں کی، اس کی زندگی کی۔ آئی نو کہ وہ ایک قدرتی حادثہ تھا، مگر اس کا سبب تم تھیں۔ اگر یہ ناپاک، ذلیل، مردوں کو کھانے والی ہے تو تم بھی اسی کیٹیگری کی ہو، کم نہیں ہو اس سے۔"

اس نے ماہم کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا۔ شاہم صدمے سے چُور اُسے سن رہی تھی۔ وہ شاہم کے بارے میں بالکل اتنا غلط نہیں سوچتا تھا۔ وہ اس سے محبت نہیں، عزت کرتا تھا۔ شاہم نے زبردستی اس سے شادی کی، اس کے بدصورت رویے کو برداشت کر کے بھی اس کی ہر ذمہ داری نبھاتی رہی، بچوں کو سگی ماں سے بڑھ کر پیار دیا، اس کا گھر سنوارا، بنایا۔ ماہم کے آنے سے پہلے تک وہ اس کا مداح تھا، اسے سب کچھ بہت مکمل لگا۔ شاہم اپنے اس عمل میں درست لگتی تھی۔ اس کی سوچ نے رخ ماہم کو دیکھ کر بدلا تھا۔ وہ یہ سوچنے لگا تھا کہ کاش میں شاہم کی زبردستی میں نہ آیا ہوتا۔

"یہ اسٹوپڈ بہانے مت گھڑو، اسٹریٹ فارورڈ کہو کہ اس پر نیت خراب ہو گئی ہے۔" کافی توقف کے بعد منصور کی گھٹیا سوچ کو حلق سے اُتارتی وہ تمسخرانہ مسکراتی اس کے سامنے ڈٹ گئی۔

منصور نے پورے زور کا تھپڑ، شاہم کے گال پر مار دیا۔

وہ اُس کی جرأت پہ گال پہ ہاتھ رکھے اُسے دیکھتی رہ گئی۔ ماہم تب سے خاموش

تماشائی بنی کھڑی تھی۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کسے چپ کروائے۔

''میں بکواس کر رہی ہوں، تمہارے پاکیزہ کردار پہ الزام لگا رہی ہوں، تو ٹھیک ہے۔ اگر تم سچے ہو تو اسے ابھی، اسی وقت خود اس گھر سے نکالو۔'' اس نے منصور کو چیلنج کیا، جو اسے کسی صورت قبول نہیں تھا۔

''یہ..... یہ تمہاری بہن ہے شاہم!'' وہ یکدم نرم پڑ گیا۔

''میری بہن اسی روز مر گئی تھی، جب اس نے میرے مرحوم باپ کی سالوں کی کمائی ہوئی عزت پر دنیا کو تھو تھو کرنے کا موقع دیا تھا۔ یہ بہن نہیں، ڈائن ہے۔ ڈائن بھی سات گھر چھوڑ کر وار کرتی ہے۔ میں تمہیں آخری دفعہ وارن کر رہی ہوں منصور! اگر تم اس حرافہ، بازاری عورت کو گھر میں رکھو گے تو میں چلی جاؤں گی۔'' وہ زور سے چلانے لگی تھی۔

''بکواس بند کرو۔'' منصور نے غصے میں بپھرتے ہوئے اسے بازو سے پکڑ کر سختی سے جھنجوڑا۔

''تم، ہم دونوں کا تماشا کیا دیکھ رہی ہو؟ چلی کیوں نہیں جاتیں، بے شرم عورت!'' اس نے منصور سے اپنا آپ چھڑوا کر ماہم کو زور کا دھکا دیا۔ وہ بیڈ پہ اوندھے منہ گری۔ اس کا سر، بیڈ کی دراز سے ٹکرایا اور خون نکلنے لگا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔

''ماہم!'' اس کا خون دیکھ کر منصور تڑپا۔

''میں چلی جاؤں یا اسے باہر پھینکو گے؟'' وہ گری ہوئی ماہم کو سنبھالنے لگا تھا کہ اس نے بازو سے کھینچ لیا۔

''ہاں، تم نکل جاؤ اس گھر سے، میری زندگی سے، دُور ہو جاؤ۔'' وہ بے اختیار چلاتے ہوئے شاہم کو دھکے دینے لگا تھا۔ اُس کے حواس بالکل کام کرنا چھوڑ چکے تھے۔

''ایسے نہیں جاؤں گی، ہمیشہ کے لئے نکالو۔ طلاق دے دو مجھے۔'' اس کے دھکوں سے کارپٹ پہ گری ہوئی شاہم روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

بہت غلط موقع پر اس نے غلط الفاظ بول دیئے تھے۔ اس کی کھوپڑی اُلٹی ہوئی تھی۔ اس کے ذہن پہ اس وقت صرف ماہم کا بھوت سوار تھا، جسے شاہم نے زخمی کر دیا تھا۔

''تمہارا یہ شوق بھی پورا کر دیتا ہوں..... آئی ڈائیوورس یُو۔''

شاہم کو لگا، ساری دنیا تہس نہس ہو گئی ہے۔ اُس کے گرد غبار اُڑنے لگا تھا۔

ماہم نے بمشکل سر اُٹھا کے دیکھا۔



''آئی ڈائیوورس یُو۔''

''نہیں منصور!'' ماہم چلائی تھی۔ شاہم، کارپٹ پر گری ساکت تھی۔

''آئی ڈائیوورس یُو۔'' وہ نہیں رُکا تھا۔

''نہیں..... نہیں.....'' ماہم رونے لگی تھی۔

وہ دونوں اُس کا رونا سن رہے تھے۔ ایک دوسرے کے چہرے پہ طوفان کے آثار کی ج لگا رہے تھے۔

☆☆☆

شہرِ خموشاں میں چار سُو خاموشی کا راج تھا۔ کاشا کی میت ابھی ابھی دفن کی گئی تھی۔ کے جاننے والے، غنی کے آفس کا سارا اسٹاف اور ملازمین اُس کی نمازِ جنازہ میں ں تھے۔ سب لوگ کھڑے دُعائے مغفرت کر رہے تھے۔ غنی، دعا کے انداز میں ہاتھ ئے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ مگر دعا کے لئے اس کے لب نہیں ہل رہے تھے۔ اس کی آنکھیں کر سُوجی ہوئی تھیں۔ دعا کر کے سب نے چہروں پہ ہاتھ پھیرے اور باری باری غنی ندھے پر دلاسے کے انداز میں ہاتھ رکھ کر قبرستان سے باہر نکلنے لگے۔

''گھر چلیں صاب!''

سب لوگ جا چکے تو رحیم خان نے اسے یونہی بیٹھے دیکھ کر کہا۔

''تم جاؤ، میں آ جاؤں گا۔''

اس کی آواز بہت بھاری اور بوجھل تھی۔ وہ کاشا کو اتنی جلدی چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا اسے کاشا کی آواز بہت دُور سے آتی سنائی دی۔

''میں ٹین ایج میں ایک رائٹر کو پڑھا کرتا تھا۔ میرا موسٹ فیورٹ رائٹر تھا۔ بہت یکھا میں نے اس سے۔ اسے پڑھ کر میرے اندر ایک چیز کا خوف ختم ہو گیا۔ موت کا ۔ ارنسلٹ ہیمنگوے۔''

غنی کو اپنا کہا بھی یاد تھا۔

''آخر اس نے خودکشی کر لی تھی۔''

''ہاں، وہ واقعی ایک بہادر آدمی تھا۔'' کاشا کے لہجے میں اس کے لئے فخر تھا۔ ایک بعد ایک یاد تھی۔

''جس دن مرا، تیرے جنازے کو کندھا دینے چار لوگ بھی نہیں آئیں گے۔''

غنی اُس وقت سخت غصے میں تھا۔

"تم تو آؤ گے نا۔" وہ دوبدو بولا۔

اور اس کی آخری فون کال میں کہی گئی بات۔

"چاہتا ہوں کہ پاکستان میں کوئی تو میرا منتظر ہو، میرا جنازہ، اجنبیوں کے کندھوں پہ نہ اُٹھے۔"

"میں ماں سے مل لوں، تھوڑی طبیعت بہتر ہو جائے تو تیرے پاس آ جاؤں گا۔ میں بھی کب اس پردیس میں رہنا چاہتا ہوں۔"

غنی، قبر کی گیلی مٹی پہ ہاتھ پھیر کر زار و زار رونے لگا تھا۔ گلاب کے پھولوں کی خوشبو اور اگربتیوں کی مہک، ماحول کو بہت سوگوار کر رہی تھی۔ اسے کاشا کا سب کہا یاد تھا۔

"تُو نے پکا والا پرامس کیا تھا، جگر! تُو تو کبھی مجھ سے وعدہ کر کے نہیں توڑتا تھا۔ روزِ محشر میں تم سے ضرور پوچھوں گا، تُو ہنس کے مجھے گلے لگائے گا، میں نہیں لگوں گا۔ میری زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ تھا تُو کاشا! تُو نے میرا کتنا بڑا نقصان کر دیا۔ اس نقصان کو کون پورا کرے گا؟ اب مجھے فلسفہ کون سنائے گا؟ میں نصیحتیں، روک ٹوک کسے لگاؤں گا؟ اتنی بڑی بے ایمانی..... میں رو رہا ہوں کاشا!..... تیرا جگر رو رہا ہے۔ چپ نہیں کروائے گا؟..... پلیز کاشا! ایسا مت کرو۔"

کتبے پر لکھی عبارت اس کے آنسوؤں نے دُھندلا دی تھی۔ وہ آستین سے اپنے آنسو رگڑنے لگا۔ آوازیں دینے سے کوئی بھی واپس آنے والا نہیں تھا۔

کاشا نے ہر کام ہمیشہ اس کی توقع کے برعکس کیا تھا۔ وہ اپنی ملاقات کے اوّل روز سے لے کر آخر تک اسے چونکاتا آیا تھا۔ لیلیٰ نے غنی کو آخری رات کی اس کی اپنی ماں کے متعلق کی جانے والی گفتگو بتائی تھی۔ جس سے غنی جان گیا تھا کہ یقیناً اس کی ماں کا رویہ اس کے ساتھ درست نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اتنا غلط قدم اٹھا لیا۔

☆☆☆

"وقت کا پہیہ اپنی رفتار سے گھومتا رہتا ہے، یہ کسی کے لئے رُکتا نہیں ہے۔ وقت کی بہت بری فطرت ہے کہ یہ خود سے پیچھے رہ جانے والوں کا تھوڑی دیر بھی رک کر انتظار نہیں کرتا، نہ ہی خود سے آگے بھاگنے والوں کو پکارتا ہے۔ موسم، رُتیں، چہرے، فطرتیں سب بدلتی رہتی ہیں مگر دُکھ..... یہ جو دُکھ ہوتے ہیں، یہیں رُکے رہتے ہیں۔ ان کی



کم ضرور ہو جاتی ہے، ختم کبھی نہیں ہوتی۔" وقت اپنے ساتھ بیس سال لے کر گزر اس بیس برس میں کیا کچھ بدل گیا۔ کس کے نصیب میں کیا آیا.....

ماہم اس وقت منصور سے طلاق لے کر گھر چھوڑ گئی۔ پھر کبھی نہ لوٹی۔ منصور نے اپنا بزنس کاروبار سیٹ کر لیا تھا۔ ماہم اپنے بچوں کے ساتھ یہاں رہتی تھی۔ منصور اور اس کے درمیان بیس برس بیتے، مگر ماہم نے منصور کے چہرے پر کبھی شگفتگی، سکون یا اسے مسکراتے نہ دیکھا۔ اسے پہلے والا منصور ڈھونڈنے سے بھی نہ ملا۔

غنی نے کاشا کی موت کے بعد اپنے آفس کی ایک مڈل کلاس گھرانے کی لڑکی سے شادی کر لی۔ جس گھر میں وہ رہتا تھا، وہ کاشا کے سوتیلے باپ کا تھا۔ اس میں ان دونوں کی بے شمار یادیں تھیں۔ اس کا دل اسے چھوڑنے کو نہیں مانتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ کاشا یہیں ہے، اسی گھر میں، اس کے آس پاس۔ اس نے اس کے سوتیلے باپ سے وہ گھر خرید لیا۔ ساری زندگی وہیں رہا۔ کاشا کے اس کے بزنس میں شیئرز تھے، جن کا پرافٹ سالوں کا ہو چکا تھا۔ اس نے ان پیسوں کا کاشا کے نام پہ صدقہ جاریہ کے طور پر "ٹرسٹ" قائم کیا، جس میں یتیم، لاوارث بچے پلتے تھے۔

☆☆☆

وہ دبے قدموں چلتا ہوا اندر داخل ہو رہا تھا۔ رات تین بجے کا وقت تھا۔ سب گھر سو رہے تھے۔ لاؤنج میں بھی ہلکی روشنی تھی۔ وہ دبے دبے قدم اٹھاتا کچن میں آ گیا۔ لائٹ جلا کر اس نے شکر ادا کیا کہ یہاں تک تو پہنچا۔ فریج میں سے پانی کی بوتل نکال کر اس نے منہ سے لگا لی۔

"کہاں سے آ رہے ہو کاشا؟"

پانی کی بوتل منہ سے لگائے وہ غٹاغٹ پی رہا تھا۔ ترچھی نگاہیں کر کے اس نے غنی کو دیکھا اور اپنے پیچھے ڈائننگ ٹیبل کی کرسی گھسیٹ کر اسی انداز میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ بوتل نے منہ سے ہٹانے کی زحمت نہیں کی تھی۔ غنی اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورتا جا رہا تھا۔

"میں اپنے فرینڈز کی طرف کمبائن اسٹڈی کے لئے گیا تھا۔ بیس دن بعد فائنل اسٹارٹ ہو جائیں گے۔"

غنی کا اٹھارہ سالہ بڑا بیٹا تھا، جس کا نام کاشف عبدالغنی عرف کاشا تھا۔

"آر یو شیور، وہیں سے آ رہے ہو؟" غنی مشکوک تھا۔

''بابا! کاشا نے کبھی جھوٹ بولا ہے؟ اور.....اور غنی سے تو کبھی بھی نہیں۔'' اس نے شرارت سے باپ کا نام لیا۔ وہ اپنے باپ سے کاشا کے متعلق بہت سن چکا تھا۔ اس کی بہت سی تصویریں بھی دیکھی تھیں۔

''اچھا چلو، اب جا کر سو جاؤ۔ پھر پڑھنے مت بیٹھ جانا۔'' اس نے فخر سے بیٹے شانہ تھپتھپایا۔

''جی پاپا! آپ بھی اپنے کمرے میں جائیں۔ میں بس تہجد کی نماز پڑھ کے سو جاؤں گا۔'' وہ دونوں چلتے ہوئے باہر آ گئے۔

غنی نے کاشا کی تربیت میں بہت احتیاط کی تھی۔ اسے بھرپور پیار اور شفقت سے پالا تھا۔ کیونکہ وہ دوسری بار کاشا کو کھونے کا صدمہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

☆★☆

لکڑی کے بوسیدہ، مٹی سے اٹے ہوئے دروازے کے سامنے سفید رنگ کی گاڑی آ کر رُکی۔

اس میں سے تقریباً پچاس سالہ عورت، جو اپنی عمر سے دس سال کم ہی دِکھتی تھی، نکلی۔ اس نے ہلکے رنگ کی خوب صورت ساڑھی باندھ رکھی تھی۔ اس کی شخصیت میں وقار تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پہ وہ شخص بیٹھا تھا، جو کبھی اس کا شوہر تھا۔ آج کل وہ پاکستان ہوا تھا۔ اس کی کنپٹیوں پہ کچھ سفید بال تھے۔ تھری پیس پہنے ہوئے اس مرد کے چہرے خاصی سنجیدگی تھی۔ وہ عورت اس کچے مکان میں چلی گئی۔

اس گھر کی واحد مکین کی حالت بہت مضمحل اور شکست خوردہ سی تھی۔ اس کی آنکھ میں ویرانی اور وحشت کا ڈیرا تھا۔ اس کے بال کھچڑی نما تھے۔ پرانے ملگجے سے کپڑے ہاتھوں کی اُبھری ہوئی نسیں، بڑی سی چادر اوڑھے وہ شاید کہیں باہر جانے لگی تھی۔ عورت کو آتا دیکھ کر چھوٹے سے صحن میں پڑے واحد تخت پر بیٹھ گئی۔ وہ عورت سر جھکا اس کے برابر جا بیٹھی۔

''اُنیس سال ہو گئے مجھے تمہارے پاس آتے ہوئے۔'' وہ بہت دھیما بول رہی تھی

''مزید اُنیس سال بھی آؤ، تب بھی کوئی فائدہ نہیں۔'' اس کی آواز بھی بہت پ تھی۔

''مجھے کہیں سکون نہیں ہے۔ راتوں کو میری نیند ٹوٹ جاتی ہے۔ ایک وسوسہ، ا



چینی سی مجھے گھیرے رکھتی ہے۔ اب تو دعا بھی بڑی ہو گئی ہے۔ مجھے ایک ماں ہونے تے اس کے نصیب سے بہت ڈر لگتا ہے۔ مجھے معاف کر دو شاہم! میں تمہاری گار ہوں۔ میں نے تمہیں اس حالت تک پہنچا دیا۔ مجھے معاف کر دو اور میرے ساتھ چلو۔ پلیز شاہم!'' اس کی آواز گلوگیر ہو گئی۔

وہ ماہم تھی۔ شاہم نے اس رات گھر سے نکل کر کہاں کہاں دھکے کھائے، وہ ایک کہانی ہے۔ اس کا آخری ٹھکانہ یہ قبرستان تھا۔ وہ قبرستان، جہاں ارسل دفن تھا۔ ان وں کے رکھوالے ایک بوڑھے سے شخص نے اسے اپنے مکان میں پناہ دی تھی۔ وہ اس ے ساتھ ہی رہنے لگی۔

''تم یہاں کیسے گزارہ کرتی ہو؟ کیا حالت بن گئی ہے تمہاری، میری بہن!..... رے ساتھ چلو۔'' وہ یونہی ہر بار اس کی منت وسماجت کیا کرتی تھی۔

''تم میری فکر نہ کرو، اس مالک نے رزق کا وعدہ کیا ہے، کھا کر ہی سوتی ہوں۔ ہنے کو چھت بھی ہے۔ تمہارے ساتھ جا کر کیا کروں گی؟'' اس کا ہمیشہ والا جواب تھا۔

''شاہم! اتنے برس تو میں خدا سے معافی مانگتی تو وہ بھی مجھے معاف کر دیتا۔ اور تم.... مجھے معاف نہیں کرتیں۔ میرے دل کا بوجھ ہلکا نہیں کرتیں۔'' وہ رونے لگی تھی۔

''میں کتنی بار کہہ چکی ہوں۔ جب وہ مجھے معاف کرے گا، میں تمہیں معاف کر دوں گی۔ وہ مجھے معاف نہیں کرتا تو میں تمہیں کیسے معاف کر دوں؟ جاؤ، چلی جاؤ یہاں سے۔ یہاں مت آیا کرو۔ کیوں ستاتی ہو مجھے؟ چلی جاؤ یہاں سے۔ پھر کبھی نہ آنا۔''

شاہم اُسے پرے جھٹکنے لگی تھی۔ وہ ہمیشہ شاہم کو یونہی منع کرتی۔ وہ چلی جاتی، پھر کچھ عرصہ بعد اس سے معافی مانگنے چلی آئی۔ منصور کبھی اس کے سامنے اندر نہیں آیا تھا۔ شاہم اسے معاف نہیں کرتی تھی۔ وہ روتی دھوتی واپس چلی جاتی۔ ابھی بھی وہ آنسو پونچھتی اُٹھ گئی۔

اس کی گاڑی کے جانے کی آواز سن کر وہ تخت سے اُٹھی۔ دیوار کے قریب پڑا پیتل کا جگ اُٹھایا اور چادر درست کرتی باہر آ گئی۔ دروازہ بھیڑ کر وہ قبرستان کی دیوار کے ساتھ نڈھال سی چلنے لگی۔

''تم تو مجھ سے، اپنی شامی سے کبھی ناراض نہیں ہوئے تھے، اب کیوں ہو؟..... تم نے میرے لئے دنیا چھوڑ دی۔ میں نے بھی تو سب کچھ چھوڑ دیا، تمہارے پاس ہی رہتی ہوں۔ تم مجھے معاف کر دو ارسل! اتنی معافی میں خدا سے مانگتی تو وہ بھی مجھے معاف کر

دیتا۔ مگر مجھے خدا بھی معاف نہیں کرے گا، جب تک تم معاف نہیں کر دیتے۔ میرے اندر
جو بے چینی، بے سکونی ہے، یہ تب ختم ہو گی، جب تم معاف کر دو گے۔ ورنہ میں یونہی
بھٹکتی پھروں گی۔ میری سزا کم کر دو، ارسل!..... میری سزا ختم کر دو ارسل!"

وہ گیلی مٹی پہ ہاتھ پھیرتی جاتی اور روتی جاتی تھی۔ اسے ارسل کے آخری الفاظ بہت
ستاتے تھے۔

اسے لگتا تھا، جس رات وہ ارسل کو خواب میں دیکھے گی، اس سے ملے گی، وہ اسے
معاف کر دے گا۔ اس نے اتنے برسوں میں اسے کبھی خواب میں نہیں دیکھا تھا۔

وہ رو رہی تھی اور اس کے کتبے پہ لکھا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ (کرم اللہ وجہہ)
کا فرمان دُھندلا رہا تھا۔

"میں نے اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے رب کو پہچانا۔"

☆☆☆



## اِک گھر بنانا ہے

ایتھے کسے نے نئیں پکا ڈیرا لایا
پروڑیاں نوں جانڑا پیندا اے
ایتھے کسے نے نئیں پکا ڈیرا لایا

قوالی کی آواز پورے دربار اور اس کے گرد و نواح میں گونج رہی تھی۔
چڑھتے ہوئے سورج کی چمکیلی دھوپ سارے احاطے میں پھیلی ہوئی تھی۔ صبح کے
وقت عورتوں اور بچوں کا آنا جانا قطعی نہیں تھا۔ مگر دوپہر ڈھلتے ہی یہاں پیر دھرنا
مشکل ہو جاتا۔

دربار کے چند رکھوالوں نے کچے احاطے میں پانی کا چھڑکاؤ کر کے جھاڑو لگا دی
ہوا کی زد پہ درختوں کے بکھرے ہوئے پتوں کو ڈھیر کر کے آگ لگا دی گئی۔ مزار کو
گلاب سے غسل دینے کے بعد، منت کی چادر چڑھائی۔ سب چادروں کو درست کر
پھول چڑھائے جا رہے تھے۔ سلگائی گئی اگربتیوں کی خوشبو سارے میں پھیلی ہوئی
دربار کے صحن اور احاطے میں ہمہ وقت ڈیرہ ڈالے ہوئے مست اور اپنے آپ
سے بے نیاز، قوالی کے بلند پاک کلام کے ساتھ دھمال چوکڑی ڈالتے ہوئے خود سے
بے نیاز اور ہوش و خرد سے بے گانہ ہوتے جا رہے تھے۔

پاک دامن بی بی ہمیشہ کی طرح مزار کی عقبی دیوار کے قریب لگے بوڑھے برگد کے
تنے کے چوڑے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ بوڑھا درخت تقریباً آدھے دربار کو
کسی قیمتی متاع کی طرح سایہ دیتا تھا۔

صدیوں پرانے برگد کے اس درخت کی بیشتر شاخیں زمین تک جھکی ہوئی تھیں، جو
پاک دامن بی بی کو خود میں چھپائے رکھنے کا فریضہ کسی عقیدت مند کی طرح سرانجام

دیتی تھیں۔

دربار میں روز سینکڑوں لوگ آتے جاتے تھے۔ کبھی آنے والوں سے ان کی شناخت نہیں پوچھی گئی تھی۔ انہی آنے والوں میں سے ایک یہ عورت بھی تھی، جو ایک دن چپ سے یہاں آ کر ڈیرہ ڈال گئی۔ کسی نے اس سے کچھ نہ پوچھا۔ اسے ہمیشہ ایک ہی جگہ چپ چاپ بیٹھا دیکھ کر دربار پر حاضری دینے والی عورتیں اس کی طرف متوجہ ہونا شروع ہو گئیں۔ پھر آہستہ آہستہ خود ان عورتوں نے اسے پاک دامن بی بی کا نام دے دیا۔ دربار پہ ہر جمعرات اور چاند کی گیارہویں تاریخ کو پھول چڑھانے والی ہر عورت، پاک دامن بی بی کے گھٹنے ضرور چھوتی اور اس سے اپنی منتیں، مرادیں بر آنے کے لئے دعاؤں کا استدعا کرتی۔ مگر اس کی بے نیازی قابلِ دید تھی۔ وہ سیاہ رنگ کی چادر میں اپنا سارا جسم چھپائے، سر کو ڈھانپے، منہ کے آگے تک گھونگھٹ سرکائے رکھتی تھی۔ کسی نے بھی آج تک اس کے چہرے کا دیدار نہیں کیا تھا۔ یہاں موجود کوئی بھی شخص، حتیٰ کہ دربار کا گدی نشین بھی پچھلے چھ سالوں سے اس کی عمر نہیں جان سکا تھا۔

کبھی کبھار وہ بے حال ہو جاتی تو قوالی کے بلند کلام کے ساتھ ساتھ سر کو دائیں بائیں ہلانے لگتی۔ اسے ماننے والی عورتوں کا کہنا تھا کہ جب وہ اس کیفیت میں ہوتی تب ہی اس سے کروائی گئی دعائیں پوری ہو جاتی ہیں۔

☆★☆

جہاں آرا بیگم نے چھالیہ کترتے ہوئے کن انکھیوں سے بیٹی کو دیکھا، جو پلازما اسکرین پہ مختصر سے لباس میں ملبوس، بارش میں بھیگتی لڑکی کو ناچتا ہوا دیکھ کر خود بھی محظوظ ہو رہی تھی۔ بے ہودہ گانے کی اونچی آواز کے ساتھ ٹیبل پہ دھرے اس کے پاؤں بھی اتنی ہی تیزی سے محوِ رقص تھے۔

''اس کمبخت کو تو بند کرو۔ کیا اس گھر میں یہ سب نہیں چلتا، جو تم اسے دیکھنے گئیں؟'' جہاں آرا بیگم، درشتی سے کافی اونچی آواز میں بولیں۔ وہ کافی دیر سے بیٹی کی طرف متوجہ ہوتا نہ دیکھ کر کُڑھ رہی تھیں۔

''کیا بات ہے اماں؟ تم صبح سے بلاوجہ چلّا رہی ہو۔'' والیوم کم کرتے ہوئے نے ایک ناگوار سی نظر ماں پہ ڈالی۔

''ارے میں کہتی ہوں، سو حرام زادے ملاؤ، تب کہیں جا کر ایک پولیس والا بنتا۔ اپنی نانی کی جوانی اور اپنے بچپن سے لے کر، اب اپنے بڑھاپے اور اپنی نواسیوں



تک، میرا ان سے پالا پڑ رہا ہے۔ مجھ سے بہتر انہیں کوئی نہیں سمجھتا۔'' جہاں آرا بیگم نے تنف اور چونا چھوڑ کر ہاتھ لہرا لہرا کر اپنی بات کا یقین دلانا چاہا۔

''ہمیں کیا لینا ہے، انہیں سمجھ کر۔ شیخ صاحب خود انہیں سمجھ بھی لیں گے اور اچھی طرح سمجھا بھی دیں گے۔'' اسے رات سے ہی اپنی ماں کی پولیس والوں کے متعلق وقتاً فوقتاً کی جانے والی معلومات سخت بری لگ رہی تھیں۔ اس نے کون سا زندگی سات میں گزاری تھی۔ اکثر ان کے ہتھے جوانی میں خود بھی چڑھ چکی تھی۔ اور پھر ایسی جگہ میں والوں کا چھاپہ پڑنا معمولی سی بات تھی۔ مگر رات کو غیر معمولی واقعہ یہ ہوا تھا کہ نے کا نیا اے ایس پی، ان کی دونوں بیٹیوں کو زبردستی اُٹھا کر لے گیا تھا۔ جہاں آرا ب سے پریشان تھیں۔ جبکہ بیٹیوں کی ماں کے کان پہ جوں تک نہ رینگی تھی۔

''میں کہتی ہوں، تمنا بائی! دونوں لڑکیاں رات سے جیل میں بند ہیں۔ نہ تو آج مرد کی چھنکار ہوئی اور نہ ہی ساز چھڑے۔ طوائفوں کے کوٹھوں پہ ویرانی اچھا شگون ہوتی۔'' جہاں آرا بیگم نے پان کی گلوری بنا کر منہ میں رکھی۔ انہیں بیٹی کا اتنا لاپروا بہت برا لگتا تھا۔

''اسی لئے تو میں انہیں دیکھ رہی ہوں۔'' اس نے ٹی وی کی طرف اشارہ کیا۔

''اب کیا میں خود گھنگھرو باندھ لوں، اس برے شگون کا توڑ کرنے کے لئے؟'' تمنا نے کوفت بھرے انداز میں سر ہلایا اور ریموٹ، ٹیبل پہ پٹخ دیا۔ اسے جہاں آرا بیگم کی ہر کام میں مداخلت سخت بری لگ رہی تھی۔

''واہ..... یہ خوب کہی۔ جب وقت تھا یہ سب کرنے کا، تب تو تم نوابوں اور رئیسوں عشق میں گری آہیں بھرا کرتی تھیں۔ اور اب..... اونہہ۔ شکر ہے، دونوں لڑکیاں تم پہ آ گئیں، ورنہ بھوکے مرتے۔'' جہاں آرا بیگم نے لحاظ کئے بغیر ایک ہی جملے میں اپنے دل کی بھڑاس نکال کر تمنا بائی کے غصے کو ہوا دے دی۔

''ہاں، تو اسی عشق کا نتیجہ ہے نا یہ تینوں، ورنہ ہم جیسی شریف زادیوں کو کوئی بے غیرت گھٹیا شخص، اپنے کمرے میں تو دُور، گھر کی چوکھٹ پہ بھی برداشت نہیں کرتا۔'' تمنا بائی ماں کی بات گولی کی طرح لگی، اسے ہمیشہ یہ طعنہ بہت چبھتا تھا۔

تمنا بائی کو اپنی جوانی میں کتنے ہی مردوں سے محبت ہوئی تھی اور ان میں سے چند نے تو اسے اپنانے کے لئے بھی رضامند ہو گئے تھے، مگر جہاں آرا بیگم نے اس کی یہ خواہش کبھی بھی پوری نہیں ہونے دی تھی۔

اسی وقت باہر گاڑی رُکنے کی آواز سنائی دی۔ وہ دونوں اپنی بحث چھوڑ کر اسی طرف متوجہ ہو گئیں۔

''پھر کیا بنا؟'' جہاں آرا بیگم نے تیزی سے اُگل دان میں پان کی پیک تھوک کر اندر داخل ہوتی نواسیوں اور بلن کو دیکھ کر پوچھا۔

''بننا کیا تھا؟ ساری رات تو وہ شیخ اور انور سلیم کو ڈراتے دھمکاتے رہے۔ جب ہماری باری آئی تو ہم نے ایک ہی بات کہی اور اس انسپکٹر نے ہمیں چھوڑ دیا۔'' بڑی رشمہ نے ایک تیکھی نظر، ماں اور نانی پہ ڈال کر اپنے ساتھ پکڑے جانے والے دونوں کے متعلق بھی بتایا۔

''کیا کہا تھا تم نے؟'' جہاں آرا بیگم کو نواسی کی ذومعنی سی بات بالکل پلے نہیں پڑی تھی۔

''میں نے اسے بتایا کہ ہمارے کمروں کی کھونٹی پہ آئی جی اور وزیروں تک کی وردیاں لٹکی رہتی ہیں۔ تم اے ایس پی ہو، بہتر ہے کہ اپنی اوقات میں رہو۔ سمجھ دار تھا، میری بات اُس کے پلّے پڑ گئی۔ ورنہ اپنا ہی نقصان کرتا۔'' اپنی بات پوری کر کے وہ رُکی نہیں بلکہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کی تقلید اس سے چھوٹی، خاموش کھڑی چاندنی نے بھی کی تھی۔

''شیخ اور انور سلیم کا کیا ہوا؟'' تمنا بائی نے سوچوں میں ڈوبے ہوئے بلن سے پوچھا۔ اس کی آنکھوں میں اپنی بیٹی کی اس قدر ذہانت پہ بڑی واضح چمک اُبھری تھی۔

''ماں کی آغوش سے نہیں، طوائف زادی کی آغوش سے پکڑے گئے ہیں۔ پر ابھی پرچہ نہیں کٹا۔ پولیس تو ان کی شرافت کا نقاب اُتارنے کے لئے پریس اور میڈیا تک کی دھمکیاں دے رہی ہے، کر لیں گے مُک مُکا وہ بھی۔ موٹی آسامی ہیں، دیر تو لگے گی نا۔'' بلن نے ہاتھ مسلتے ہوئے انہیں باقی کی ساری تفصیل سنائی۔

''مگر اب ہمیں چند دنوں کے لئے احتیاط کرنی ہو گی۔'' اس کی پیشانی پہ اُبھری لکیریں اسے خاصا پریشان ظاہر کر رہی تھیں۔

''پتہ ہے، اسی لئے سارے گیٹ بند کروا دیئے ہیں۔ آنے والوں کو بھی منع کر دیا ہے۔'' تمنا بائی کو کاروبار ماند پڑ جانے کا بہت دکھ تھا۔ اس کی فطرت خالصتاً طوائفوں والی تھی، جن کے نزدیک پیسہ ہر چیز سے بڑھ کر ہوتا ہے۔

☆★☆



''جو میں نے سوچا تھا، وہی سچ نکلا، اور پھر وہی ہوا، جس کا مجھے ڈر تھا۔'' بلن نے آواز میں جہاں آرا بیگم اور تمنا بائی کو مخاطب کر کے کہا تھا۔ دائیں سے بائیں چکر اس نے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں سختی سے ایک دوسرے میں پیوست کر لیں۔

جہاں آرا بیگم اور تمنا بائی خاموش بیٹھی اسے سنتے ہوئے صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش ی تھیں۔ وہ اس وقت سخت غصے میں تھا اور ان دونوں کی جرأت نہیں تھی کہ اس کے ایک لفظ بھی بول جاتیں۔

''جانے کس غلیظ شخص کا گناہ ہے یہ لڑکی، پورے بائیس سال کی ہو چکی ہے اور پچھلے سے اپنی ہڈیاں تڑوا رہی ہے۔ ہڈیاں گل گئیں مار کھا کھا کے، مگر اس کی ڈھٹائی نہ اس کے بات کرنے کے انداز سے وہ دونوں جان گئی تھیں کہ وہ ستارہ کی بات کر مگر اس سے کچھ پوچھنا، بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف تھا۔

جہاں آرا بیگم اور تمنا بائی، اس کے مزاج کے ہر ہر انداز سے آشنا تھیں۔ وہ گزرے سالوں سے ان کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ جہاں آرا بیگم نے گاؤں سے چھوٹے کام کرنے کے لئے کوئی لڑکا بلوایا تھا۔ بیس سال کا نوجوان بن ماں باپ کا بلن، فٹ قد، سیاہ رنگت اور چوڑے مضبوط کاندھوں والا یہ لڑکا انہیں پہلی نظر میں بہت ا۔ تب سے لے کر آج تک وہ ان کا دایاں بازو بنا ہوا تھا۔ کون کتنا مالدار ہے؟ سے کتنی ڈیل کرنی ہے؟ اور کس کے ساتھ لڑکی بھجوانی ہے؟ یہ سب وہی طے کرتا لیاں اسے دیکھ کر اپنی سانس تک روک لیتی تھیں۔ مگر یہ ستارہ کی ہی ہمت تھی، جو مار کھانے کے باوجود اس کے قابو میں نہیں آئی تھی۔

''کیا ہو گیا ہے؟'' جہاں آرا بیگم نے نرم لہجے کو مضبوط کر کے پوچھا۔

''جو ہو چکا ہے، وہ اب بھگتنا پڑے گا۔'' اس نے اپنی واک میں رکاوٹ بنتے سینٹر پوری طاقت سے ٹھوکر ماری تھی۔ ٹیبل پیچھے کو اُچھل گیا تھا اور اتنی ہی تیزی سے ں کے دل بھی۔

''پانچ لاکھ دے کر جان چھڑوائی ہے، انور سلیم اور شیخ نے۔'' اس نے اپنے سارے انگلیاں کھول کر اشارے سے بتایا۔

''پتہ چلا ہے، اُس فیبر کس والے نے مخبری کی تھی، جس کے منہ پہ تمہاری اس ستی نے بھری محفل میں صرف چھونے پہ تھپڑ دے مارا تھا۔ اور ابا اس پانچ لاکھ کو پورا ے گا۔'' اس کی آنکھیں لال سرخ ہو رہی تھیں۔ جہاں آرا بیگم اور تمنا بائی کے

چہرے، پانچ لاکھ کا سن کر مرجھا سے گئے۔

"پہلے ہی ایک ہفتے سے مندی پڑی ہے اور اب اس نئے نقصان کی تلافی کے لئے اگلے ایک ہفتے تک کے لئے سب کچھ ٹھپ۔" اس نے قہرناک لہجے میں یہ خبر سنائی تھی اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ابھی جا کر ستارہ کا گلا دبا دیتا۔

"پھر ایک ہفتہ۔" تمنا بائی نے سینے پہ ہاتھ دھر لیا۔

"دیکھ تمنا بائی! اگر یہ سب کچھ یونہی چلتا رہا نا، تو ایک دن یہ لڑکی تمہیں فٹ پاتھ لے آئے گی۔ اور تُو آپا بیگم!" وہ جہاں آرا بیگم کے قریب آ کر رک گیا۔ "تُو انہی رئیس زادوں سے بھیک مانگے گی..... بھیک۔" بلن کے منہ سے اپنے مستقبل کا خاکہ سن کر ان دونوں نے ناگواری سے جھرجھری لی۔

"اونہہ..... شریف زادی بنی پھرتی ہے، جو یہ تک نہیں جانتی کہ رگوں میں دوڑنے والا خون کس کا ہے۔ جہاں تک میں جانتا ہوں، سات نہیں پوری نو نسلوں کی تاریخ یہ ہے کہ یہ طوائف زادیوں کے خاندان میں سے ہے، اور اس سے پہلے والی نسلوں کے متعلق بھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" بلن نے حقیقت کی حد کر دی تھی۔

"بلن.....!" جہاں آرا بیگم کی آواز میں ہلکی سی سرزنش تھی۔ اس عمر میں بھی، جب ٹانگیں قبر میں تھیں، انہیں اپنے طوائف رہ چکنے پر فخر تھا۔ وہ کبھی بھی اپنے خاندان کی توہین برداشت نہیں کرتی تھیں۔

"تمنا بائی! اسے آخری بار سمجھا دے کہ گھنگھرو باندھ لے، ورنہ....." اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"ورنہ....." تمنا بائی نے صرف دل میں دہرایا تھا، پوچھا نہیں۔

"ورنہ میں اسے کاٹ کر پھینک دوں گا۔" وہ بات پوری کر کے رُکا نہیں تھا، جبکہ تمنا بائی اور جہاں آرا بیگم اچھی طرح سے جانتی تھیں کہ بلن مرنے مارنے کی بات یونہی نہیں کیا کرتا۔

☆☆☆

"اے لڑکے! کہاں کی تیاری ہے؟" وہ، جو سیاہ جینز اور اسکائی بلیو شرٹ میں ملبوس بڑے مگن سے انداز میں برآمدے میں سے گزر رہا تھا، اس آواز پہ رک گیا۔

"وہ..... امی! میں ذرا آفس کے کام سے جا رہا تھا۔" ان کی کڑک دار آواز پہ اس نے جھجکتے ہوئے وضاحت دی۔



"آفس؟..... مگر آج تو چھٹی ہے نا۔" اس نے شکی نظروں سے گھورتے ہوئے اور پاؤں کی ٹھوکر سے ٹب آگے کھسکا کر نل پورا کھول دیا۔

"وہ، سر نے ایک ضروری کام کہا تھا، بس وہی نمٹانا ہے۔ جلدی آ جاؤں گا، صرف دو تین گھنٹے۔" اس نے غور سے ان کے تپے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ سالوں سے یہ چہرہ دیکھ رہا تھا اور اب اس کے پل پل بدلتے رنگ سمجھنے لگا تھا۔

"دو، تین گھنٹے کا کام ہے نا۔ شام میں بھی ہو سکتا ہے۔ کپڑے دھونے والی ماسی آ گئی ہے اور صفائی والی آئی نہیں۔ ناشتے کے برتن بھی پڑے ہیں۔ ابھی سے میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے، مگر کسی کو احساس ہو، تب نا۔ مفت کی نوکرانی ملی ہے، چل سو چل۔ وہ تو منہ اندھیرے کے باہر دفع ہو گئے، ورنہ وہی..... خیر، تم میرے ساتھ کپڑوں کا ٹب لدواؤ، پھر جہاں مرضی آوارہ گردی کرنا۔"

اس کے حلیے کا نوٹس لینے کے باوجود انہوں نے حکم جاری کر دیا تھا۔ اپنی بات مکمل کر کے اس کے کھلے ہوئے احتجاجی ہونٹوں کو نظرانداز کرنے کے لئے رخ موڑ لیا۔ ٹب، پانی سے بھر گیا تھا۔ اس نے مشین سے نکالے ہوئے کپڑے ایک ایک کر کے پانی میں ڈالنے شروع کر دیئے۔

"میں....." وہ اس نئی مصیبت پہ بھونچکا رہ گیا۔ ایک نظر اپنی تیاری پہ ڈالی جو پورے چالیس منٹ لگا کے کی گئی تھی۔ اور پھر آفس کے اس ضروری کام کو یاد کیا، جس کو آج کی تاریخ میں ضرور انجام تک پہنچانا تھا۔

"تو اور کیا میں؟..... آفس کیا جانے لگے، گھر کو تو تم نے دھوبی گھاٹ ہی سمجھ لیا ہے۔" اُس کی "میں" پہ مڑ کر انہوں نے غصیلی نظر اس پہ ڈالی، جو منہ پھلائے کھڑا تھا۔ ٹب سے گھسیٹ کر دُھلے ہوئے کپڑوں کے ٹب کو اس کے آگے کر دیا۔

"یہاں تمہاری ماں نہیں بیٹھی ہوئی، ناز اٹھانے والی۔ اتنی بھاری بھاری پینٹ، ایک پہنو اور دوسرے دن مشین میں۔ میرے کندھے ٹوٹ گئے اور ہاتھوں میں الگ سوجن آ رہی ہے۔ اور ان محترم کو صرف کپڑے پھیلانے پر ہی اعتراض ہے۔ تمیز تو جیسے چھو کر بھی نہ گزری۔ ایک ہمارے بچے ہیں۔" اس کو ٹس سے مس نہ ہوتا دیکھ کر انہوں نے بڑبڑانا شروع کر دیا تھا۔

وہ، جو ڈھیٹ بنا کھڑا تھا، ان کے بچوں کا ذکر آتے ہی ٹب احتیاط سے اٹھا کے دھم دھم کرتا سیڑھیاں چڑھ گیا۔

''تمہارے وہ چھوٹے دونوں خبیث گئے ہوں گے کوئی تین کلومیٹر دور گراؤنڈ میں کرکٹ کھیلنے۔ تاکہ جب دھاندلی کریں، دو تین لڑکوں کے سر پھاڑ دیں تو گھر میں شکایت نہ آسکے۔ اور وہ بڑے والے لاٹ صاحب، اپنے ہی جیسے آوارہ گردوں کے ساتھ نئی بائیک پہ ون ویلنگ کر رہے ہوں گے۔'' جی تو اس کا چاہ رہا تھا کہ یونہی کپڑے چھت پہ دھر کے چلا جائے۔ وہ یہ بھی کر گزرتا، اگر اسے اپنی اس حرکت کے انجام کی خبر نہ ہوتی۔

''ہونہہ..... سوتیلی ماں۔ پچھلے اکیس سال سے یہ لفظ سن رہا ہوں۔ اب اگر سگی بھی دوبارہ زندہ ہو کے آجائے تو اسے بھی میں سوتیلی ہی سمجھوں گا۔ سوتیلی اور ماں۔'' اس نے نفرت سے سر جھٹکا۔

''تین سال کا تھا، جب یہ ماں کے ساتھ سوتیلی کا دُم چھلا لگا کر اس گھر میں آئی تھیں۔'' بولتے بولتے وہ یک دم رک گیا۔ سارے کپڑے پھیلائے جا چکے تھے۔ اسے اب چلے جانا چاہئے تھا۔ مگر وہ وہیں قریب پڑی لوہے کی کرسی پہ بیٹھ گیا۔ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ اپنی اس سوتیلی ماں کے متعلق ہی سوچے چلا جا رہا تھا۔ اپنی سوتیلی ماں کے مزاج کو سمجھنے میں وہ ہمیشہ غلط فہمی کا شکار رہا تھا۔ اس کے لئے وہ نرم تو کبھی بھی نہیں رہی تھیں۔ مگر جب سے اسے پچھلے تین ماہ سے جاب ملی تھی، وہ مزید بگڑنے لگی تھیں۔ ان کا نیا رویہ، ان کی سوچ سے بالاتر تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اب شاید ان کے رویے میں کچھ تبدیلی آجائے، مگر جب اس نے پہلی تنخواہ لا کر تھمائی تو انہوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ وہ اسے بچپن سے ہی یہ احساس دلاتی آرہی تھیں کہ وہ اس کی سوتیلی ماں ہیں۔ وہ ان سے ممتا کے پیار کی اُمید نہ رکھے۔ وہ اسے ماں تو کہہ سکتا ہے مگر سمجھنے کی سنگین غلطی کبھی نہ کرے۔

☆☆☆

''کیا میں اندر آسکتی ہوں؟'' اس نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر اندر جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں آؤ، آؤ چاندنی!'' وہ ہاتھ میں پکڑی کتاب بند کر کے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''کیسی ہو؟'' وہ بیڈ کے وسط میں آلتی پالتی مار کے بیٹھ گئی۔

''ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ، کیسی ہو؟'' اس نے مسکرا کر کتاب سائیڈ دراز میں ڈال دی۔

''تمہیں کیا واسطہ ہم سے؟ پتہ تو ہوگا کہ چھاپے میں پولیس پکڑ کر لے گئی تھی۔ مگر



جھانکنے تک نہ آئیں۔'' اس نے خفگی سے گلہ کیا۔

''وہ..... میں ضرور آتی۔ مگر اُس دن بلن چلاتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ یہ سب میری وجہ سے ہوا۔ میں..... میں اسی لئے نہیں آئی کہ کہیں تم لوگ بھی مجھے ہی قصوروار نہ ٹھہرا دو۔'' اس نے سر جھکا کر مجرم کی طرح وضاحت دی۔ وہ اس دن بلن کی ساری باتیں سن چکی تھی۔

''بلن کو چھوڑو۔ میرے اور شمع کے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں۔ صرف ایک ہفتے کی تو بات ہے۔ اور نہ جانے ایسے کتنے دن بلکہ سال ہماری زندگی میں آکے گزر بھی گئے۔ جانے دو۔''

اس نے جیسے ناک پر سے مکھی اُڑائی۔ وہ جانتی تھی کہ ستارہ کتنی حساس ہے اور اس پیشہ کو بالکل اچھا نہیں سمجھتی۔ اسی لئے تو اب تک ڈٹی ہوئی ہے۔

پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے اسے بتانے لگی۔

''شمع کو پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے۔ بالکل گم صم، کھوئی کھوئی سی رہنے لگی ہے۔''

''ہو سکتا ہے، کسی نے اسے.....''

''نہیں۔'' چاندنی نے اس کا خدشہ ظاہر کرنے سے پہلے ہی رد کر دیا۔

''تم تو محفوظ ہو؟'' کتنی حسرت تھی اس کی آواز میں۔

''میں بھی کسی حد تک۔ مگر شمع!..... وہ تو ہر روز جیتی ہے اور ہر رات مرتی ہے۔'' وہ خاموش ہو گئی۔ وہ بھی مزید کچھ نہ کہہ سکی۔

''ہم نے اسی جگہ پہ آنکھ کھولی۔'' کافی دیر کے بعد چاندنی نے ہی خاموشی توڑی تھی۔ ''مگر آج تک ہم تینوں کبھی اس ماحول میں رچ بس نہیں سکیں۔ اندر کہیں چبھن سی ہمیشہ رہی۔ شاید نانی ٹھیک ہی کہتی ہیں کہ ہم تینوں کی رگوں میں کسی شریف آدمی کا خون دوڑ رہا ہے۔'' وہ گہرے دکھ کی کیفیت میں تھی۔ ستارہ کتنی ہی دیر کچھ نہ بول پائی۔ حقیقتاً اُسے نانی کی اس بات سے اختلاف تھا۔

''شریفوں کی اولادیں، کوٹھوں پہ نہیں پلا کرتیں چاندنی!'' اس نے کاٹ دار انداز میں کہا۔ مگر چاندنی نے اس کی بات شاید سنی نہیں تھی۔ وہ یک ٹک سامنے والی دیوار کو دیکھ رہی تھی۔

''ستارہ! اس سامنے والی دیوار پہ ایک بڑا سا بورڈ آویزاں تھا نا، جو تم بازار سے لائی تھیں۔ جس پہ کچھ عربی لکھی تھی اور بلن نے دیکھتے ہی اسے اتار دیا تھا۔'' اس نے خالی

دیوار کو تکتے ہوئے، کھوئے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں، اُس پہ درود پاک لکھا ہوا تھا۔'' اس نے بھی دیوار پہ اک نظر ڈالی۔

''ستارہ! تمہیں نہیں لگتا، یہ دیوار خالی ہی نہیں بلکہ ویران سی بھی ہو گئی ہے۔ بلکہ..... بلکہ پورا کمرہ ہی۔'' وہ بدستور وہیں نظریں جمائے ہوئے تھی۔ وہ خود بھی تو یہی سوچا کرتی تھی۔

''اس کمرے میں رہنے والے کون سے آباد ہیں۔'' وہ یونہی سوچ کر خود کو تسلی دیا کرتی تھی۔

''ستارہ! ایک بات تو بتاؤ، بالکل سچ سچ۔'' وہ تکیوں کے ساتھ ٹیک لگا کر اونچی ہو کے بیٹھ گئی۔

''ہاں پوچھو۔'' وہ بھی پوری طرح متوجہ ہوئی۔

''تم..... تم آخر چاہتی کیا ہو؟ ایسی کون سی چیز یا بات ہے، جو تمہیں اب تک اندر سے روکے ہوئے ہے؟ اتنے سالوں سے تم پہ مختلف ظلم ڈھائے جاتے ہیں، مگر تم.....'' اس نے اُلجھتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ کچھ دیر خاموشی کے بعد بولی۔

''تم نے کبھی خواب دیکھے ہیں چاندنی!'' اس کے انداز میں ایسا کچھ ضرور تھا کہ چاندنی چونک گئی۔

''خواب تو رات کو آتے ہیں۔ اور ہماری تو ساری راتیں جاگتے گزرتی ہیں۔ البتہ دن میں دکھائی دینے والے خواب جھوٹے ہوتے ہیں۔''

''خواب..... خوبصورت مستقبل کے خواب۔'' وہ خواب ناک آواز میں بولی۔ وہ اپنی حیران نظریں، ستارہ کے چہرے سے ہٹا نہ پائی تھی۔

''خواب، مستقبل۔'' اس نے زہر خند لہجے میں یہ الفاظ دہرائے۔

''ہمارا کوئی مستقبل نہیں ہوتا۔ صرف اور صرف ماضی ہوتا ہے، جس سے ہم پہچانی جاتی ہیں اور جو ہماری شناخت ہوتا ہے۔ یا پھر وہ حال، جس میں ہم دوسروں کی مرضی کے مطابق جیتے ہیں۔'' وہ چبھتی ہوئی تلخی سے بولی۔ کتنا کچھ ٹوٹ گیا تھا اس کے اندر۔

''دنیا کی ہر عورت، چاہے وہ پندرہ سال کی معصوم لڑکی ہو یا ساٹھ سال کی ڈھلتی عمر کی عورت، وہ خواب ضرور دیکھتی ہے۔ بس سوچوں میں تضاد ہوتا ہے اور پھر ہم.....''

''ضرور دیکھتی ہوں گی، کیونکہ وہ عورتیں ہیں۔'' اس نے تیزی سے ستارہ کی بات کاٹی۔

''اور ہم..... کیا ہم عورتیں نہیں ہیں؟'' اس نے اپنی طرف اشارہ کر کے پوچھا



سے چاندنی کی بات حیرت میں ڈال گئی تھی۔

''نہیں..... صرف ہمارا تعلق ان کی جنس سے ہے، ورنہ ہمیں پکارنے والے تو ورت نہیں، طوائف کہہ کر بلاتے ہیں۔ اور یہی حقیقت ہے۔'' چوٹ بہت گہری تھی۔

تارہ نے تڑپ کر بہن کی طرف دیکھا۔ جس کی آنکھیں خشک اور چہرہ سپاٹ تھا۔

''مگر چاندنی! میں طوائف نہیں بننا چاہتی۔ میں ..... خود کو عورت کہلوانا چاہتی وں۔'' وہ کتنی بے بس سی لگ رہی تھی۔

''قصور تمہاری سمجھ کا نہیں، بلکہ خواہش کا ہے۔'' وہ طنزیہ انداز میں مسکرائی۔

''تم اپنے ماضی اور حال سے بھاگنا چاہتی ہو نا؟'' اس نے بغور ستارہ کے رنگ بدلتے چہرے کو دیکھ کر پوچھا۔ اس نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تو بھاگ جاؤ۔ ماضی سے جتنا بھاگ سکتی ہو، بھاگ لو۔ مگر جب تھک کر بدن چُور ہو جائے اور پیروں میں چھالے پڑ جائیں اور سوچو کہ ماضی بہت دُور رہ گیا، رُک جانا۔ پھر یہ اندازہ کرنے کے لئے کہ تمہارا بھیانک کل، تم سے کتنا پیچھے رہ گیا، مڑ کے مت دیکھنا۔ کیونکہ تمہارا ماضی، تمہارا حال بن کے تمہارے سامنے کھڑا ہو گا۔ اگر فرار ممکن ہوتا تو آج میں اور شمع یہاں نہیں ہوتیں۔'' وہ بہت کچھ کہہ گئی تھی اور بھی نہ جانے کیا کچھ کہنے جا رہی تھی کہ ستارہ کی پیلی پڑتی رنگت اور کپکپاتے ہونٹوں نے اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ اس نے گہرا سانس بھر کے خود کو پُرسکون کیا اور بڑی محبت سے اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

''اچھا بتاؤ، تم کیا خواب دیکھتی ہو؟'' اسے تلخ سچائی کے حصار سے نکالنے کے لئے وہ بہت ہلکے پھلکے انداز میں بات کرنے لگی۔

''وہ..... وہ.....'' اس نے کن انکھیوں سے بہن کی طرف دیکھا۔

''مجھے اک گھر بنانا ہے۔'' اس نے ہچکچاتے ہوئے، سالوں سے اپنے سینے میں چھپا کر رکھا گیا راز کھول دیا تھا۔

☆☆☆

''میں نے تمہارے کہنے پہ، پھر اس سے بات کی تھی بلن! مگر وہ کسی طور نہیں مانتی۔''

تمنا بائی، بلن کے بھیجنے پر ستارہ کے پاس گئی تھی مگر اس نے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی انکار کر دیا تھا۔ جبکہ وہ خود، بلن اور جہاں آرا بیگم اب اس مسئلے کو جلد از جلد حل کرنا چاہتے تھے۔ انہیں صرف پیسے سے غرض تھا۔ ستارہ، چاندنی اور شمع ان کے لئے ایک مشین کی سی

حیثیت رکھتی تھیں۔ شمع اور چاندنی کو تو کم عمری میں ہی قابو کر لیا گیا تھا، مگر ستارہ بچپن سے ہی ڈھیٹ تھی۔ جس کام کے لئے ضد پکڑ لیتی، اس سے ایک انچ بھی نہ پیچھے ہٹتی۔ اس کی یہ ہٹ دھرمی ہی ان کے لئے پریشانی کا باعث بن گئی تھی۔

''دیکھ تمنا بائی! جب شمع ذرا اُونچی ہوئی تو ہمارے پاس ناچنے اور گانے والی تھی، ہم نے شمع کو دوسرے دھندے میں ڈال دیا۔ چاندنی نے قد نکالا تو اس کی آواز اتنی سریلی تھی، گاتی تو غضب ڈھاتی، وہی نتیجہ نکلا۔ ساری منڈی کے تماش بین کہیں ٹکتے نہیں۔ اب اسے ہم نے کتنا کہا کہ شمع کے ساتھ لگ جاؤ، مگر یہ نہ مانی۔ کہا، رقص کی تربیت لو، تب بھی انکار۔ کم از کم گانے کا ریاض کر لو، تب بھی اس منحوس کے منہ سے انکار ہی سنا۔ مگر آج اس بند کمرے میں فیصلہ ہو کے رہے گا کہ آخر اس لڑکی کا کرنا کیا ہے۔ بول تمنا بائی!'' محض ماں ہونے کے ناتے وہ ان سے پوچھ رہا تھا۔ ورنہ اٹل فیصلہ تو اسے ہی کرنا تھا۔

''میں..... میں کیا بولو؟ تجھے جو مناسب لگتا ہے، کر لے۔'' اس نے بھی بلن کو مکمل اختیار دے دیا۔ ستارہ کے معاملے میں وہ ہمیشہ سے بلن کی ہم خیال رہی تھی۔ وہ خود بھی اب ستارہ کا کوئی آخری علاج چاہتی تھی، مگر جہاں آرا بیگم ان دونوں کے ارادوں کے آڑے آ جاتی تھیں۔

''چل پھر ٹھیک ہے، میں اسے نکال کر کوئی اور لے آتا ہوں۔''

''کیا کہہ رہا ہے تُو بلن؟..... ہماری روایت ہے کہ ہم طوائف زادی کو شریف زادی نہیں بننے دیتے۔ اور شریف زادی کو طوائف نہیں۔'' جہاں آرا بیگم کو بلن کی یہ بات بھی پسند نہیں آئی تھی۔

''آپا بیگم! میرا منہ نہ کھلواؤ۔ تم نے بھی تو چار کو جنم دیا تھا، تمنا کے بعد ایک تیرے پاس ہے، باقی کی دو کہاں ہیں؟ ہمارے دھندے میں سب چلتا ہے، پرانی کو نئی لانا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ یہاں وہی حساب ہے۔ جو بیٹا، ماں باپ کو کما دے گا، وہی سب کچھ، ورنہ گھر سے باہر۔'' بلن، جہاں آرا بیگم کے سامنے اس انداز میں بات نہیں کرتا تھا۔ مگر اسے جہاں آرا بیگم کا ستارہ کی حمایت کرنا سخت چبھتا تھا۔

''مگر بلن! یہ گھر کی لڑکی ہے۔ پھر یہ بھی تو سوچ، ہم سے نہیں مانی، کہیں اور جا کر خاک دھندا کرے گی؟'' جہاں آرا بیگم نے پھر اسے روکنا چاہا۔

''سن آپا بیگم!'' اس نے اپنے خاص انداز میں سارا ہاتھ کھول کر بند کیا۔ ''وہ پرانے زمانے لد گئے۔ اب نیا دور ہے، آج کا تماش بین، تاشا کی ساری بازی ایک ہی



کر کھیلنا چاہتا ہے۔ اس طرح گاہک بھی نہیں ٹوٹتا اور لاکھوں روپیہ الگ ہے۔ اب چاندنی، شمع کب تک بوجھ اٹھائیں؟ اسے کیا ہم نے وعظ کرنے کے لئے رکھا ہے؟'' اس نے مونچھوں کو بل دیتے ہوئے جہاں آرا بیگم کو غور سے پرکھا تھا کہ ان کے پلّے کچھ پڑا نہیں۔

''وہ تو میں بھی دیکھ رہی ہوں بلن! چاندنی بلاوجہ ہی اُلجھنے لگی ہے۔ شمع جانے کیوں اداس اُداس سی پھرتی ہے۔ میں تو ڈرتی ہوں کہ کہیں ستارہ کا رنگ ان دونوں پہ بھی نہ چڑھ جائے۔'' جہاں آرا بیگم نے بھی اپنے خدشات بتائے، جو وہ کئی دنوں سے محسوس کر رہی تھیں۔

''یہی..... یہی تو میں نے بھی نوٹ کیا ہے، تبھی کہہ رہا ہوں کہ جتنی جلدی ہو سکے، ستارہ کو فارغ کرو۔ یہ سب اسی کی دیکھا دیکھی ہو رہا ہے۔ جس دن یہ دونوں ٹیڑھی ہو گئیں، پھر ہاتھ ملتی رہ جاؤ گی۔'' بلن نے ہاتھ ملتے ہوئے انہیں مزید حقیقت بتا کر خوف زدہ کرنا چاہا۔

''پر تُو اُس موئی کا کرے گا کیا، بلن؟'' تمنا بائی نے پوچھا۔

''نہ تو میں کون سا اُسے مدینے کا ٹکٹ لے کر دوں گا، یا میں کون سا اس کے لئے حجرہ تعمیر کروانے جا رہا ہوں۔'' اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے طنزیہ انداز میں مسکرا کر کہا۔

''سنا ہے، وہ شادی کرنا چاہتی ہے۔ گھر بسانا چاہتی ہے۔ میں اُسے گھر بنا کر دوں گا۔'' بلن کی آنکھوں میں ہوس کی چمک بڑھ گئی تھی۔ اس کے بلند و بانگ قہقہے میں تمنا بائی اور جہاں آرا بیگم کی رضامندی، ہنسی کی شکل اختیار کر گئی۔

☆☆☆

''پچھلے تین سال سے ہم شمالی علاقہ جات کے پروگرام کو کینسل کرتے آر
ہیں، مگر اس دفعہ نہیں۔'' وہ چاروں کافی دیر سے اسی سلسلے میں گفتگو کر رہے تھے کہ ہر
کی طرح اس دفعہ کون سی جگہ، سیر کے لئے سلیکٹ کی جائے۔

''یار اکمل! اب تو تیری جاب بھی ہو گئی۔ اس بار تُو بھی ہمارے ساتھ چل۔''
نے اس کے کندھے پہ ہاتھ دھر کے اسے راضی کرنا چاہا۔ وہ کبھی بھی ان لوگوں کے
اس طرح کی ایکٹیوٹیز میں شرکت نہیں کرتا تھا۔ مگر اس بار وہ خود بھی جانے کے لئے
رہا تھا۔

''تنخواہ کی کچھ رقم ہے یا وہ تیری سوتیلی ماں اُڑا لے گئی؟'' وہ سب ایک ہی محا
رہتے تھے، کئی سالوں کا ساتھ تھا۔ اکمل کی سوتیلی ماں کا روّیہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں
مگر اسے یوں بھی کسی کا بات کرنا پسند نہیں تھا۔ ناصر کی منہ پھٹ عادت سب کو ہی بر
تھی۔ مگر وہ ان کا بہت اچھا دوست تھا۔ اسی لئے وہ اسے اکثر معاف کر دیا کرتے تھے۔

''نہیں۔ انہوں نے مجھ سے ایک روپیہ بھی نہیں لیا۔ تھوڑی بہت میں نے ضرور
کی چیزیں خریدی تھیں۔'' اکمل نے حسبِ عادت اسے گھور کر جواباً اپنی بات پوری کی۔

''دائم یار! تُو بھی چلے گا نا؟'' اکمل نے اپنے اکلوتے قریبی دوست سے پوچھا،
خاموشی سے ان کی گفتگو سن رہا تھا۔

''یہ اپنی فیانسی سے پوچھ کر بتائے گا، آج کل اس کا ٹائم ٹیبل، وہی سیٹ کرتی ہے۔''
وہ دونوں قہقہے لگا کر اس کے مکے سے بچنے کے لئے دُور ہٹے۔

''تم لوگ تو اپنی بولتی بند کرو۔ مجھے اس سے بات کرنے دو۔'' اکمل ان کو ڈپٹ
پھر دائم کی طرف متوجہ ہوا۔ ''ہاں بولو۔''

''پہلے میں ان دونوں کو کلیئر کر دوں کہ وہ ابھی میری فیانسی نہیں بنی۔ ہماری منگنی



بعد ہے۔'' اس نے خفیف سا مسکراتے ہوئے بتایا۔ ''رہی جانے کی بات تو میری فیملی
ے پہ گئی ہے، ان کے واپس آنے میں ابھی دن دن باقی ہیں۔ پھر مجھے گھر کی حفاظت
ی تو کرنی ہوتی ہے۔'' اس نے اپنی نہ جانے کی مجبوری بتائی۔

''ہاں، وہ تو ہمیں بھی نظر آ رہا ہے۔ صبح تالا لگا کر نکلتے ہو اور شام گئے گھر واپس
تے ہو۔ سارا دن تو بائیک لئے ہماری گلیوں میں چکر لگاتے ہو۔ اچھے چوکیدار ہو۔''
ر کی زبان کب چپ رہ سکتی تھی؟

''یار! میرا اس نئی کالونی میں دل نہیں لگتا۔ پھر میرا وہاں کوئی دوست بھی نہیں۔'' دائم
ا یہی ایک رونا تھا۔ وہ کئی سال اسی محلے میں رہا تھا، مگر اب اس کے والد نے ایک
وبصورت سی کالونی میں ویل فرنشڈ گھر خرید لیا تھا اور ادھر شفٹ ہو گئے تھے۔ مگر دائم ہر
وز ادھر ہی پایا جاتا۔

''یار اکمل! تُو لکھ کے رکھ لے میری بات، ہم اپنا بیس دن بعد کا بھی پروگرام سیٹ کر
یں نا، یہ تب بھی نہیں جائے گا، جانتے ہو، کیوں۔'' ان تینوں نے سوالیہ انداز سے اسفر
کی طرف دیکھا، جو یقیناً کوئی اُلٹی بات ہی کرنے جا رہا تھا۔

''کیونکہ اسے محبت ہو گئی ہے۔ اب یہ کسی کام کا نہیں رہا۔'' بڑے مدبرانہ انداز میں
وجہ بتا کر اس نے داد چاہی تھی اور اسے ناصر داد دینے والا موجود تھا۔ دائم اپنے سارے
دوستوں میں سے واحد منگنی شدہ ہونے جا رہا تھا۔ اسے شرمندہ کرنے کا کوئی موقع وہ
ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔

''دیکھ اسفر! تجھے میں بڑے دنوں سے برداشت کر رہا ہوں، اب اگر.....''

''چلتا ہوں۔ مجھے ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔'' دائم کے چہرے پہ خطرناک تیور
دیکھ کر اس نے بھاگنے میں ہی عافیت جانی تھی۔

''چل بچُو! اب تُو بھی نکل، ورنہ.....'' اکمل بات ادھوری چھوڑ کر، مُکا بنا کر ناصر کی
طرف بڑھا، جو پہلے ہی اُلٹے قدموں پیچھے ہٹ رہا تھا۔

''گھر میں سب ٹھیک ہے نا، اور جاب کیسی جا رہی ہے؟'' دائم نے اسے غور سے
دیکھ کر پوچھا۔ وہ بچپن سے ہی قریبی دوست تھے اور اپنی ہر پرسنل بات ایک دوسرے
سے شیئر کرتے تھے۔

''جاب ٹھیک جا رہی ہے، اور گھر..... گھر اتنے سالوں سے ٹھیک نہیں ہوا، اب کیا
ہو گا۔ میرا خیال تھا کہ جاب کروں گا تو امی کے روّیے میں شاید کچھ تبدیلی آ جائے۔ مگر

انہوں نے تو پے لینے سے بھی انکار کر دیا۔ بقول ان کے، انہیں میرے دیئے ہو
پیسوں کی ضرورت نہیں۔'' وہ دائم کی بائیک پہ چڑھ کے بیٹھتے ہوئے اس کے پوچھنے
بتانے لگا۔ اس کی کوئی بات اس سے چھپی ہوئی تو نہ تھی۔

''تُو نے اپنی ماں کو خوش کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی ہے، اب ایک آخری حر
بھی آزما لے۔'' دائم نے کچھ سوچتے ہوئے صلاح دینی چاہی۔

''وہ کیا؟'' اس نے بائیک کے اسٹیئرنگ کو دائیں سے بائیں موڑتے ہوئے پوچھا

''تُو شادی کر لے۔ ہوسکتا ہے کہ مفت کی نوکرانی کے آجانے سے آنٹی کا رویّہ
بدل جائے۔'' اس نے اپنے تئیں بڑا ہی مفید مشورہ دیا تھا۔ ان دنوں اس پہ صرف شا
کا ہی بھوت سوار تھا۔

''یہ تُو مجھے خلوص سے مشورہ دے رہا ہے؟'' اکمل نے حیرانی اور مشکوک نظروں
اسے ٹٹولتے ہوئے استفسار کیا۔

''ہاں، بالکل۔'' اس نے سنجیدگی کے ساتھ زور و شور سے سر ہلایا۔

''اگر مجھے، تیرے اس خلوص پہ ذرا سا بھی شک ہوتا نا تو میں تجھے گولی مار دیتا
اس نے نفی میں سر جھٹکا۔

''اسٹوپڈ، ایک عورت میری زندگی میں کم ہے، جو میں دوسری کا بھی ڈھول ڈ
لوں؟'' اس کا انداز کافی برہمی لئے ہوئے تھا۔ دائم چند لمحوں کے لئے چپ چاپ ا
کے سرخ چہرے کو دیکھتا رہا۔

''تو کیا تُو عمر بھر شادی نہیں کرے گا؟'' اس کی سُوئی ابھی بھی شادی کروانے پہ
اٹکی ہوئی تھی۔

''میں نے کبھی سوچا نہیں۔'' آہستگی سے جواب دے کر وہ بائیک سے نیچے اُتر گیا

☆★☆

اس کی ماں، تمنا بائی جسے ہمیشہ پیسے سے مطلب رہا، وہ پیسے کے لئے کچھ بھی کر
تھی۔ شاید کسی کی ناحق جان بھی لے سکتی تھی۔ بلن، جس نے بارہ سال کی عمر سے
بائیسویں سال میں داخل ہونے تک اس پہ ہر قسم کے ظلم ڈھائے تھے۔ کتنی معصوم لڑکی
کو وہ اس دھندے میں لایا تھا اور نہ ماننے پر کتنوں کے ہاتھ پاؤں توڑے تھے۔ جہا
آرا بیگم، نانی جان جنہوں نے اٹھارہ سال کی عمر میں ایک رئیس زادے سے محبت کا دھ
کھانے کے بعد قسم کھائی تھی کہ نہ وہ خود کبھی شادی کریں گی اور نہ اپنی آنے والی نسلوں



کی اجازت دیں گی۔ ان کی یہ قسم، تمنا بائی کے ہر بار گھر بنانے میں آڑے آئی تھی اور
کے وقتی طور پر گھر بسانے کی خواہش کے باوجود نہیں ٹوٹی تھی۔

آج وہ تینوں اس کی جان کے دشمن، اس سے نفرت کرنے والے، اسے دو وقت کی
کے طعنے اور اسے بوجھ سمجھنے والے، بلن، تمنا بائی اور جہاں آرا بیگم اس کے کمرے
پہلی دفعہ موجود تھے۔ اس کے اردگرد دھماکے کر رہے تھے۔

''لڑکے نے چودہ جماعتیں پاس کی ہیں۔ یتیم خانے میں پلا ہے، بڑا ہی نیک بچہ
'' تمنا بائی، لمبی تمہید کے بعد اصل موضوع پہ آ گئی۔

''سنا تو ہوگا تُو نے، آج یقین بھی کر لے کہ اولاد سے زیادہ اس کی اولاد پیاری
ہے۔ میں نے صرف تیری خاطر اپنی برسوں پرانی ضد چھوڑی ہے۔'' جہاں آرا بیگم
اس کے بال سہلاتے ہوئے لہجہ میں حد درجہ شیرینی گھولی تھی۔

وہ خود پھٹی پھٹی آنکھوں اور ہونقوں کی طرح کھلے ہوئے منہ کے ساتھ باری باری
سب کو سن رہی تھی۔ ایک بولتا تو دوسرا چپ ہو جاتا۔

''میں نے تو زمانہ دیکھ رکھا ہے۔ بہت پہلے سمجھ گیا تھا کہ تُو ان لڑکیوں میں سے
ہا، جو دو دن کی بھوک اور چار ڈنڈے کھا کے ہماری بات مان لیں۔ تجھ سے تو کبھی سختی
ما کی، ورنہ تُو جانتی ہے کتنوں کو سیدھا کیا ہے۔'' بلن کا انداز بڑی رسانیت لئے
ئے تھا۔

مگر وہ بلن کے اس کھلے جھوٹ پہ احتجاجاً اختلاف بھی نہ کر سکی کہ دو دن نہیں، اس
چھ، چھ دن بھوکے رہنے کے بعد خود کو ہوش و حواس سے بے گانہ پایا تھا۔ اس نے بلن
دیئے گئے زخموں پہ کئی کئی دن ٹکوریں کی تھیں۔ اس نے یہ سب کچھ ان سے تو نہیں کہا
پھر وہ کہنے کی جرأت کر بھی نہ سکتی تھی۔

''میں کیسے یقین کر لوں؟ آپ سب کیسے مان گئے؟''

ان تینوں کی منصوبہ بندی یقیناً قابلِ بھروسہ تھی، مگر اسے یقین کرنے میں خاصی
داری پیش آ رہی تھی۔

پچھلے آدھے گھنٹے سے انہیں سننے کے بعد وہ پہلی بار بولی تھی۔ گو کہ اسے متاثر کرنے
لئے انہوں نے اپنے کردار اور پوزیشن کی وضاحت بھی دی تھی، مگر وہ ڈانواڈول تھی،
کچھ اور ہی محسوس ہو رہا تھا۔ جو شاید کہیں غلط بھی ہوسکتا تھا اور سچ بھی۔

''دیکھ لڑکی! ہم نے تمہیں.....'' تمنا بائی نے ہاتھ اٹھا کر بلن کو بولنے سے روک

دیا۔ وہ کسی وقت بھی مشتعل ہوسکتا تھا۔ اور وہ معاملہ بگاڑنا نہیں چاہتی تھی۔

اتنی مشکل سے تو وہ قابو میں آئی تھی۔ تمنا بائی خود بھی چاہتی تھی کہ وہ اپنے دماغ اُٹھتے سوالوں کو پوچھ لے، تاکہ بعد میں عین وقت پہ کوئی دُشواری نہ ہو۔ اور پھر اس پوچھنے کے انداز میں شک نہیں، بلکہ حیرانی تھی۔ اور تمنا بائی اچھی طرح جانتی تھی کہ کو چال کب چلنی ہے؟

''سچی بات تو یہ ہے کہ تمہاری دیکھا دیکھی، چاندنی اور شمع کے تیور بھی بدل ہیں۔ ہم تینوں تو خود ان کا دیا کھا رہے ہیں، بوجھ ہیں، اوپر سے تُو ان کے لئے ایک اضافہ ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ دونوں ہمارے ہاتھوں سے نکل جائیں، ہم نے فیصلہ کہ تمہارا بیڑا پار لگا دیا جائے۔'' تمنا بائی نے آدھا جھوٹ گھڑا۔ مگر وہ بھی کون سا تھی۔ یہاں سینکڑوں اس کے سامنے آئیں اور اور گئیں، مگر آج تک کسی کا گھر نہ بسا

''مگر شمع اور چاندنی.....'' اس نے پوچھنا چاہا۔

جہاں آرا بیگم کی جہاندیدہ سوچ نے بڑی پھرتی سے اس کی سوچ کی اُڑان کو پکڑ

''شمع اور چاندنی کی بات تو اب چھوڑو، انہیں اب کون بیاہے گا؟ شریف تو اُٹھانے سے رہے اور کسی بے غیرت سے بہتر تو ہم ہی ہیں، اپنے تو ہیں نا۔'' جہاں بیگم نے اپنے تئیں اُس کی ہر ممکن تسلی کروانی چاہی۔

''تُو چاہے تو لڑکے سے مل بھی سکتی ہے۔ نوکری کرتا ہے۔ دو کمروں کا چھوٹا فلیٹ ہے۔'' وہ اسے سوچنے اور سمجھنے کا موقع ہی نہیں دینا چاہتے تھے۔ وہ اسے کے چکر میں اُلجھا کے اسی وقت ''ہاں'' سننا چاہتے تھے۔

''وہ مجھے قبول کرلے گا؟'' یہ سوال پوچھتے ہوئے اس کا دل اتھاہ گہرائیوں میں زن ہوگیا۔

''لو بھلا، اسے کیا خبر کہ تُو ہماری بیٹی ہے۔ بلن کا ایک دوست ہے، وہ اس لڑ استاد رہ چکا ہے۔ اسی کے توسط سے یہ سب ہو رہا ہے۔ اس نے لڑکے کو بتایا ہے کہ کی یتیم بھتیجی ہے۔ اب گھر بسانے کے لئے تھوڑا بہت جھوٹ تو بولنا ہی پڑتا ہے۔ یہاں کون سا اچھی یادیں ہیں یا رشتے جڑے ہوئے ہیں؟'' تمنا بائی کسی بھی سوا لڑکھڑائے بغیر بڑی سہولت سے اسے جواب دے رہی تھی۔ اسے ماں کا لمس، محبت لہجہ، پیار، شفقت تو کبھی بھی یاد نہیں تھا، مگر آج وہ اسے صحیح معنوں میں اپنی اماں لگ تھی۔ اپنی بہتری کے بارے میں سوچتی ہوئی۔



.....وہ شمع اور چاندنی آ.....'' وہ بے ربط ہوئی تھی۔

شمع اور چاندنی..... وہ دس دن بعد آئیں گی۔ اسی لئے تو میں یہاں رکا ہوا یرا نکاح پڑھوا کے رخصت کروں، ان کے آنے تک۔ وہ پوچھیں گی تو ہم کہہ کہ کہیں بھاگ گئی ہے۔ اب کیا جاتے جاتے ہماری روزی روٹی بھی چھین لے وہ بھی تیری دیکھا دیکھی، خصم مانگیں گی۔''

سے جہاں آرا بیگم اور تمنا بائی کی اتنی نرمی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ ضبط کرتے ہ پھٹ پڑا۔ وہ کتنی ہی دیر سے تمنا بائی اور جہاں آرا بیگم کے آنکھوں سے کئے لے اشارے کنائیوں سے خود کو روکے ہوئے تھا۔ اس کا سوال پہ سوال کرنا اسے رہا تھا۔ وہ جلد سے جلد اسے یہاں سے دفع کرنا چاہتا تھا۔

خریدنا ہے، خرید لو۔ پرسوں نکاح ہے۔'' تمنا بائی، بات ختم کرنے کے انداز میں کر باہر چلی گئی۔ جہاں آرا بیگم بھی بیٹی کے اشارے پہ اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ وہ کہ بلن کے ساتھ مزید یہاں رُکنا سارا کھیل بگاڑ سکتا ہے۔

ری شادی.....'' وہ ان سب کے چلے جانے کے بعد کتنی ہی دیر ایک ہی زاویے متعلق سوچتی رہی۔

ن سے لے کر آج تک کتنی ہی یادیں اس کے ذہن میں تازہ تھیں۔ ماں اور نانی کے لئے ہوس، بلن کا مختلف لڑکیوں کو چکمہ دے کر اس دھندے میں لانا، مردوں ور ناپاک نظریں، چاندنی کے گھنگھروؤں کی چھن چھن، شمع کے ہر رات ٹوٹ نے والے موتیے کے گجرے اور اپنی آہ و زاری، اور اب شادی۔

کی مار پیٹ کے کچھ نشانے اس کے جسم پہ ان مٹ نقوش چھوڑ گئے تھے، جو سردیوں میں ٹیس بن کر اس کے سارے جسم میں درد جگاتے تھے۔ تمنا بائی کا مٹھی بھر نیچنا، بعض اوقات اُس کے سر درد کا باعث بن جاتا۔ نانی کا اسے دیکھتے ہی طنزیہ اسے کئی کئی دن کمرے سے باہر نہ نکلنے دینا۔ مگر آج ان کا لہجہ، اندازِ گفتگو، ئے طور اطوار اور رویہ سب کچھ اسے حیرت سے دوچار کر رہا تھا۔

یا یہ سب، مجھ سے دھوکا کر رہے ہیں؟'' وہ منفی خیالات کا شکار تھی۔

لن نکاح کیسے دھوکا ہوسکتا ہے؟'' اس نے خود ہی اپنے خیالات کی نفی کر دی۔

را ایسا کچھ ہونے جا بھی رہا ہے تو ٹھیک ہے ستارہ! کم از کم اس دوزخ سے تو بان چھوٹ جائے گی۔ بعد کی پھر بعد میں سوچنا۔'' اس کے اندر سے جیسے کوئی

بول رہا تھا، اسے سمجھا رہا تھا۔

''کیا کروں؟'' اس نے بے حد تھکے ہوئے انداز میں تکیے پہ سر ٹکا دیا۔

☆☆☆

کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر اس نے اپنی دونوں ہتھیلیوں کو آنکھوں پہ رکھ کے زور سے دبایا۔ ایسا کرنے سے آنکھوں میں ہلکی ہلکی جلن ہونے لگی تھی۔ چند لمحے یونہی آنکھیں موندے، پُرسکون ہونے کے بعد اس نے وال کلاک کی طرف نگاہ دوڑائی، جہاں رات پونا ایک بج رہا تھا۔ دیر کے احساس نے اس کی ساری تھکن اڑنچھو کر دی تھی۔ وہ تیزی سے کوٹ اور فائل کو سنبھالتا باہر نکل آیا۔ کل ایک ضروری اسائنمنٹ کی ڈیڈ لائن تھی اور ابھی اس پہ بہت سا کام ہونا باقی تھا۔ کمپنی کے ایم۔ڈی نے اس سمیت تین اور ایمپلائز کو بھی روک لیا تھا۔ خود بلڈ پریشر بڑھ جانے کے باعث وہ جلدی گھر چلے گئے تھے، ان کا بیٹا رات تک ان سب کے ساتھ مصروف رہا تھا۔

پارکنگ میں صرف تین گاڑیاں کھڑی تھیں۔ جن میں سے دو اس سے سینئر ایمپلائز کی تھیں اور ایک ایم۔ڈی کے بیٹے کی۔ وہ تینوں اپنی اپنی گاڑیوں کی طرف بڑھ گئے تو اس نے بھی روش پہ دھیمے دھیمے چلنے لگا۔ اس کے ہم عمر، اسد کے پاس اپنی بائیک تھی۔ جسے وہ بیس منٹ میں چلا گیا تھا۔ اس سے چھوٹے بھائی کو پچھلے دنوں ہی موٹر بائیک دلوائی تھی۔ جبکہ اس کے پاس اپنی سائیکل تک نہ تھی۔ آفس پک اینڈ ڈراپ کی سہولت تھا۔ مگر آج شاید لیٹ نائٹ کی وجہ سے وہاں کوئی ڈرائیور نظر نہیں آ رہا تھا۔ سڑکوں پہ اِکا دُکا ٹریفک ہی آ جا رہی تھی۔

''اکمل!..... اوئے اکمل! پیدل جا رہا ہے؟'' رضوان نے بائیک لا کر اس کے قریب روک دی۔ وہ جو اردگرد سے بے نیاز، کان بند کئے چلا جا رہا تھا، اس کے قریب آ کے رُکنے پہ ذرا سہم سا گیا۔

''جی ہاں، دیکھتا ہوں، کوئی کنویئنس مل جائے۔'' اس نے کلائی پہ بندھی رسٹ واچ کو دیکھتے ہوئے کہا اور تقریباً خالی سڑک پہ ایک طائرانہ سی نگاہ دوڑائی۔

اس کی ماں زرینہ اپنے بچوں کے لئے رات بھر بھی جاگ سکتی تھی، مگر اسے رات کے بجے بھی گھر آنے پہ صلواتیں سننا پڑتیں۔ وہ کوشش کرتا کہ جلدی گھر چلا جائے، مگر اسے آفس جوائن کیا تھا، اکثر و بیشتر دیر ہو ہی جاتی تھی۔

''میرے ساتھ آ جاؤ۔ میرا اسٹاپ تم سے پہلے آتا ہے۔ مگر میں تمہیں ڈراپ کر



''اس کے ڈھیلے ڈھالے انداز کو محسوس کر کے اس نے پُرخلوص آفر دی۔

''نہیں، بس اپنے اسٹاپ تک چھوڑ دینا، آگے میں خود ہی چلا جاؤں گا۔'' بڑھتے ہوئے وقت کے خوف سے اس نے لفٹ لے لی تھی۔ ورنہ ارادہ تو پیدل ہی گھر جانے کا تھا۔ تقریباً پونے دو بجے کے قریب وہ بے حد تھکا ہوا گھر پہنچا تھا۔ اپنے گھر کی طرف بڑھتے ہوئے اچانک اُس کی نظر برابر والے گھر پر پڑی۔ اسے بے حد حیرت ہوئی تھی۔ ناصر اپنے ڈرائنگ روم کے باہر سیڑھیوں پہ بیٹھا موبائل پہ کسی سے دھیمی آواز میں باتیں کرنے میں اتنا مگن تھا کہ اسے گلی میں اس کے گزرنے تک کی خبر نہ ہو سکی۔ وہ بیل دینے کے بجائے اس کی طرف آ گیا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟''

''کک..... کک..... کچھ نہیں۔'' وہ ہکلاتے ہوئے گڑبڑا کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ موبائل اُس کے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچا۔

''اوئے اکمل! بدتمیز، بدمزہ انسان! تُو۔'' اس نے حیرت اور ناگواری سے اسے گھورا، جو کسی انسپکشن آفیسر کی طرح کھڑا تھا۔

''تو اور کون؟''

''دھت تیرے کی، اتنی بھاری آواز ہو رہی ہے تیری۔ میں سمجھا، میرے ابا حضور، میری چوکیداری کرتے یہاں پہنچ گئے ہیں۔'' اس نے ہلکی سی خفگی کے ساتھ اپنا وہم بتاتے ہوئے سر کھجایا۔ جبکہ وہ اس کے چہرے کے بدلتے رنگ کو دیکھ کر کافی محظوظ ہو رہا تھا۔

''ہیلو!'' اسے انگلی کے ساتھ چپ رہنے کا اشارہ کر کے اس نے دوبارہ فون، کان کے ساتھ لگا لیا۔ مگر بار بار پکارنے پر بھی جواب موصول نہ ہوا۔ شاید لائن کٹ چکی تھی۔

''یہ محترمہ بھی داغِ مفارقت دے گئیں۔ شاید یہ بھی تجھے میرا ابا ہی سمجھی ہو گی۔'' وہ اس کی مایوسی اور تاسف سے سر ہلاتے بولا۔

''تو دوبارہ کر لے۔'' اسے اتنا افسردہ دیکھ کر اکمل نے سنجیدگی سے مشورہ دیا۔

''بیلنس فری ہے، یہ تو پیکج سیٹ کیا تھا۔ تُو اپنا موبائل دے دے مجھے، صبح واپس کر دوں گا۔'' اس نے اپنی شکل پر مسکینی سی طاری کر لی، جیسے بہت بڑی مشکل میں گرفتار ہو۔

''بکواس نہ کر۔ پہلے انٹرنیٹ کم تھا، جواب یہ لت پڑ گئی ہے تجھے؟'' ناصر کی بے چارگی خاطر میں نہ لاتے وہ ڈپٹ کر پوچھنے لگا۔

''اچھا، اچھا..... زیادہ نصیحتیں نہ کر۔ خود تو بتا، آدھی رات تک کہاں آوارہ گردی کر

رہا ہے؟'' وہ تیزی سے پینترا بدل کے اسی کے انداز میں پوچھنے لگا۔ اس کے تیزی سے ٹون بدلنے پر وہ ہولے سے مسکرا دیا۔

''آفس میں ایک ضروری کام تھا، اسی لئے سر نے روک لیا۔''

''چھٹیاں تو لے لی ہیں نا، یاد ہے، صبح ہم کاغان جا رہے ہیں۔'' اس کے سست سے انداز کو دیکھ کر ناصر کو تشویش ہوئی تھی۔

''ہاں، لے لی ہیں۔'' وہ اس کے ساتھ ہی سیڑھی پہ بیٹھ گیا۔

''اور پیکنگ کر لی؟ صبح جلدی نکلنا ہے۔'' اس نے اگلا سوال پوچھا۔

''کر لوں گا ابھی۔''

''تو جا پھر۔ دو بج چکے ہیں، جا تیاری کر۔'' ناصر کے وقت بتانے پہ وہ پھرتی سے کھڑا ہو گیا۔ صرف چند قدم چل کے وہ واپس آ گیا۔

''ناصر یار! تیری امی اور بہن تو سو گئی ہیں؟'' اس نے سوچتے ہوئے استفسار کیا۔

''ہاں، مگر کیوں؟'' اس نے اچنبھے سے اکمل کی طرف دیکھا۔

''ناصر! تُو جانتا ہے نا، امی دیر سے آنے پر کتنا ناراض ہوتی ہیں۔ میں ایسا کر ہوں، تمہاری چھت سے اپنی چھت پہ جا کے نیچے سیڑھیاں اُتر جاؤں گا۔'' رات کے ا پہر زرینہ کی نیند خراب کرنا اپنی شامت بلوانے کے مترادف تھا۔ زور زور سے بول بوا کے وہ نہ صرف سارے گھر بلکہ پورے محلے کو جگا دیتیں۔ ابھی اسے پیکنگ بھی کرنا تھی وہ کوئی بدمزگی نہیں چاہتا تھا۔

''اچھا چلو۔ مگر آہستگی سے۔'' اس نے تھوڑا سوچ کر ڈرائنگ روم کا دروازہ بغ آہٹ پیدا کئے دھکیل کر کھول دیا۔

☆☆☆



تمنا بائی نے کئی دفعہ پیغام بھجوایا کہ وہ ساتھ جا کے اپنی پسند کی شاپنگ کر لے، مگر نے ہر بار انکار کر دیا۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو رہی تھی تو تمنا بائی کو بھی اس خیال آ گیا تھا۔ آج تک تو کبھی بھی اُس نے سویٹر تک نہ خرید کے دیا تھا۔ چاندنی جب اپنے لئے شاپنگ کرنے جاتی، اس کی ضرورت کی چیزیں بھی اندازاً خرید لیتی۔ لیکن بائی اور جہاں آرا بیگم کو کبھی اس بات کا خیال نہیں آیا تھا۔ وہ اسے اناج کا دشمن اور سمجھتی تھیں۔ دو وقت کی روٹی، سو طعنوں کے ساتھ دی جاتی۔ اکثر و بیشتر باہر سے انے کے لئے کچھ نہ کچھ آیا رہتا، مگر اس کو کبھی حصہ نہ دیا جاتا۔ بے شمار تھکا دینے والی یں تھیں اور بیچ میں صرف ایک دن تھا۔ وہ جتنا سوچتی، اور اُلجھتی جاتی۔

اتوار کے دن اس کا نکاح اور رخصتی تھی۔ چاندنی اور شمع گھر پہ موجود نہیں تھیں، اسی ے کسی کا بھی آنا جانا بالکل بند تھا۔ اس سب کے باوجود بہت زیادہ احتیاط برتتے ہوئے ابائی اسی شہر کی کسی دوسری کالونی میں بنی خفیہ کوٹھی میں شفٹ ہو گئی تھیں۔ اسے وہیں ے رخصت کیا جانا تھا۔ گھر میں چند اعتماد کے ملازمین کے علاوہ باقی سب کی چھٹی کروا ائی۔ تقریباً ایک بجے کے قریب تمنا بائی اس کے کمرے میں آئی۔

''بارات آ چکی ہے، بس چند ایک لوگ ہیں۔ بے چارے کے ماں باپ تو ہیں نہیں، ردوستوں کو لے کر آیا ہے۔'' تمنا بائی نے اُکھڑے اُکھڑے لہجے میں ہمدردی سموتے ئے سرسری سے انداز میں بتایا۔

تھوڑی دیر بعد جہاں آرا بیگم، تمنا بائی، بلن اور ڈرائیور ایک مولوی صاحب کے اتھ دوبارہ اندر آئے۔ وہ سر جھکائے یونہی بیٹھی رہی۔ مولوی صاحب نے اسے نکاح کے کلمے پڑھوائے اور قبولیت کا اقرار لینے کے بعد نکاح کا رجسٹر دستخط کے لئے اس کے امنے رکھ دیا۔

بہت ضبط کے باوجود آنسوؤں کا ریلہ، گالوں کو بھگو گیا تھا۔ بھری ہوئی آنکھوں سے رجسٹر میں موجود نکاح نامے کو دیکھتی رہی۔ اس کے کانوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ خدشات، بے یقینی اور کسی حد تک خوشی جیسی کیفیت میں گھری اس نے کانپتے ہاتھوں سے سائن کر دیئے۔ کس شخص کے نام اس کے تمام جملہ حقوق محفوظ کر دیئے گئے تھے، وہ ٹھیک سے سن بھی نہ پائی تھی۔ بس ایک ہی احساس حاوی تھا کہ وہ اپنا آپ کسی کو سونپ چکی ہے۔

اللہ نے اس کی بھی سن لی ہے۔ اس کی جان ان تینوں سے چھوٹ گئی ہے۔

اس کا جی چاہا کہ وہ تمنا بائی کے گلے لگ کر جی بھر کے روئے اور وہ تمام آنسو بہا دے، جو خوف کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں جم چکے تھے۔ اور تمنا بائی..... تمنا بائی اس کے بال سہلاتے ہوئے، بھیگے لہجے میں ایک اچھی ماں کی طرح اسے ڈھیروں نصیحتیں کریں، اسے خوش نصیبی کی بے شمار دعائیں دے ڈالیں۔ آخر وہ ہمیشہ کے لئے ان سے ناتا توڑ کے جا رہی تھی، کبھی نہ واپس آنے کے لئے۔

مگر تمنا بائی اپنی سرسراتی ساڑھی کا پلو سنبھالتی، مردوں کے ساتھ ہی باہر نکل گئی۔ آنسو بہانے کے لئے وہ اکیلی رہ گئی۔ اسے شمع اور چاندنی بے تحاشا یاد آ رہی تھیں۔

"باجی! یہ کپڑے پہن لیں۔ تھوڑی دیر میں رخصتی ہے۔"

دس سال کی ملازمہ بچی نے ہینگ کیا ہوا شاکنگ پنک کلر کا کامدار سوٹ اور ساتھ میں بڑا سا ہم رنگ دوپٹہ اس کے سامنے ڈال دیا۔

اپنے گال پونچھتی، کپڑے اٹھا کر وہ واش روم میں چلی گئی۔ تولیے سے چہرہ خشک کرتی وہ باہر آئی، تولیہ ایک طرف پھینک کے وہ بال سلجھانے کے لئے ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھی، جہاں وہی بچی اس کی غیر موجودگی میں زیورات کے ڈبے رکھ گئی تھی۔ وہ ایک ایک کر کے ان زیورات کو کھولنے لگی۔ اس کی آنکھیں چمکتے زیورات سے خیرہ ہو رہی تھیں۔ اس کے کانوں میں تمنا بائی کے الفاظ گونجے۔

"لڑکے نے چودہ جماعتیں پاس کی ہیں، اپنا دو کمروں کا فلیٹ بھی ہے۔"

مگر زیورات تو دو کمروں کے مالک کی اوقات سے بڑھ کر تھے۔ وہ یونہی حیران سی کھڑی سوچ رہی تھی کہ زری اندر داخل ہوئی۔

اسے اکثر اوقات کسی خاص مواقع پر شمع اور چاندنی کی تیاری کے لئے بلایا جاتا تھا۔ آج بھی اسے بطورِ خاص ستارہ کے لئے بلایا گیا تھا۔

"آپ کے شوہر کو دیکھ کر آ رہی ہوں، بڑے ہی کیوٹ ہیں۔" زری نے اندر آتے



مسکراتے ہوئے کہا اور زیورات اٹھا کر بیڈ پر رکھنے لگی۔

"آئیں، میں پہلے آپ کو جیولری پہنا دوں، پھر میک اپ شروع کروں گی۔" اسے گم صم کھڑا دیکھ کر اس نے پکارا۔

"ویسے آپ کی اسکن قدرتی طور پہ اتنی خوب صورت اور فریش ہے کہ میک اپ کی ضرورت ہی نہیں۔"

وہ خاموش مجسمے کی طرح بغیر مداخلت کئے اس سے ہر کام کرواتی جا رہی تھی۔ زری نے اسے ڈریسنگ چیئر پہ بٹھا کے چہرے پہ بیس بنانی شروع کر دی۔ اس کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے اور اتنی ہی تیزی سے زبان بھی۔

"آپ بہت خوش قسمت ہیں، اللہ نے آپ کو گھر اور شوہر دے دیا۔ شمع اور چاندنی کی....." بلش آن لگاتے ہوئے وہ متواتر بولے چلی جا رہی تھی۔ مگر اس کا ذہن لفظ "گھر" پہ ہی اٹک گیا تھا۔

☆☆☆

اس نے کافی دیر سے جھکے ہوئے سر کو اٹھا کر خود کو پُرسکون کرنا چاہا۔ نکاح کے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ہی اسے رخصت کر دیا گیا تھا۔ سیاہ لینڈ کروزر میں اپنے شریکِ حیات اور دونوں ساتھیوں سمیت وہ اپارٹمنٹ میں پہنچی۔ اس کا ایک دوست اسے کمرے میں پہنچا کر باہر چلا گیا تھا۔

اس نے اردگرد کا جائزہ لینے کے لئے یونہی سر اُٹھایا۔ کمرہ کافی کشادہ تھا۔ خوب صورت کلر اسکیم، بہترین اور مہنگا فرنیچر، قیمتی قالین اور امپورٹڈ ڈیکوریشن پیسز، سیٹنگ پہ ذرا سی توجہ دینے سے پتہ چلتا تھا کہ یہ کسی انٹیریئر ڈیکوریٹر کے تصوراتی ذہن کا شاہکار کمرہ ہے۔ یہ یقیناً ایک لگژری اپارٹمنٹ تھا اور کسی بہت ہی اچھے علاقے میں تھا۔

قیمتی ملبوسات، ڈھیروں زیورات، لینڈ کروزر اور پھر..... لگژری اپارٹمنٹ..... وہ خوش ہونا چاہتی تھی۔ مگر یہ سب چیزیں اتنی حیران کن تھیں کہ وہ ٹھیک طرح سے خوش نہ ہو سکی۔ تمنا بائی اس کے شریکِ حیات کی مالی حیثیت واضح کر چکی تھی۔ پھر یہ سب کچھ کیا تھا؟

اسے یہاں بیٹھے بیس منٹ گزر چکے تھے۔ جتنی خاموشی کمرے میں تھی، اتنی ہی کمرے کے پار بھی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا، جیسے وہ وہاں اکیلی موجود ہو۔

"بھابی جان! کھانا کھا لیں۔ یقیناً آپ نے ٹھیک طرح سے کچھ کھایا نہیں ہو گا۔" کوئی ہلکا دستک دیئے سیدھا اندر گھس آیا تھا۔ وہ سٹپٹا کے الرٹ ہو گئی۔

"اب یہاں کوئی عورت تو ہے نہیں، جو اصرار کرے۔ آپ خود ہی کھا لیجئے۔ بے شک تھوڑا سا کھا لیں۔" وہ اس کے سامنے کھانے کی ٹرے رکھ کر خود بیڈ کے ساتھ ہی لگ کر کھڑا ہو گیا۔

اس کا ذہن اتنی سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا کہ اسے بھوک تو بالکل بھی نہیں تھی، مگر اسے وہاں سے ہٹانے کے لئے، جھجکتے ہوئے اس نے پہلا لقمہ توڑا۔ وہ بھی شاید اسی انتظار میں کھڑا تھا۔ فوراً ہی کمرے سے نکل گیا۔

کھانے کے چند لقمے لینے کے بعد اس نے تھوڑی سی بریانی کھائی اور ٹرے اٹھا کر سائیڈ ٹیبل پہ دھر دی۔ باہر پھر ویسی ہی خاموشی چھا چکی تھی، جو اس کے تھکے ہوئے ذہن پہ مزید وحشت سی طاری کر رہی تھی۔

تھوڑی دیر گزرنے کے بعد اسے اپنا سر بھاری بھاری سا محسوس ہونے لگا۔

"رات کو بھی نہیں سوئی اور کھانا تو کل دوپہر کے بعد اب کھایا ہے۔" چکراتے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئے اس نے خود ہی جواز ڈھونڈا۔

آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں نیند سے بند ہونے لگیں۔ مندی مندی آنکھوں سے اس نے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا، جو بند تھا۔ تکیہ اپنے پیچھے سیدھا کر کے، سر اس پہ ٹکا کر وہ خود بھی آڑی ترچھی سی لیٹ گئی۔

چند لمحوں میں وہ بالکل ہوش و حواس سے بے گانہ ہو چکی تھی۔

ہلکی ہلکی باتوں کی آوازیں کہیں نزدیک سے آ رہی تھیں۔ مدھر سی ہنسی اور جان دار قہقہے۔ آوازوں کا شور کبھی بلند ہو جاتا اور کبھی بہت ہی آہستہ۔ یہ خواب تھا یا شاید حقیقت، مگر یہ سارا عمل اسے ہوش کی دنیا میں واپس کھینچ رہا تھا۔

بالآخر کروٹ بدل کر تھوڑا سا کسمساتے ہوئے اس نے آنکھیں کھول دی تھیں۔

کمرے میں جلتی تیز فینسی لائٹوں کی روشنی سے اس کی آنکھیں لمحہ بھر کے لئے چندھیا سی گئیں۔ کمرے کا منظر واضح ہوتے ہی اس کی پہلی نظر وال کلاک پہ پڑی تھی جہاں رات کے پونے دس بج رہے تھے۔ وہ تیزی سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس احساس کے ساتھ کہ وہ پہلی رات کی دُلہن ہے۔ دوپٹہ ٹھیک طرح سے سر پہ جماتے ہوئے اس نے اردگرد کا بھرپور جائزہ لے ڈالا۔ جیسے کوئی چھپا بیٹھا اس کی ہر حرکت غور سے دیکھ رہا ہو۔ اتنی دیر تک سونے پر وہ شرمندگی سی محسوس کر رہی تھی۔

"کیا سوچیں گے وہ؟ کھانا کھاتے ہی سو گئی۔ وہ بھی اتنی دیر۔" خود کو سرزنش کر



جہ ہی دوپٹہ اور کپڑے درست کرتی جا رہی تھی۔ اچانک اس کے ہاتھ باہر سے آتی ں کو محسوس کر کے تھم گئے۔

"شاید وہ باہر بیٹھے، میرے اُٹھنے کا انتظار کر رہے ہوں گے۔" وہ خود کو ہر زاویے رست کر کے تھوڑا سا سر جھکا کے، پلکیں گرائے یوں بیٹھ گئی، جیسے ابھی کسی کی آمد ا ہو۔

اب باتوں کے ساتھ قہقہوں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ چند لمحے وہ یٹھی رہی، مگر جب اسے کسی کے آنے کے آثار نظر نہ آئے تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ں سے اُٹھی اور دروازے کے قریب آ کے کھڑی ہو گئی۔

دروازے میں بنے چھوٹے سے گلاس سوراخ سے اس نے باہر جھانکا۔ سامنے ہی نے پر ایک مرد بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے والے صوفے پہ جو مرد بیٹھے تھے، وہ ان کی ہونے کی وجہ سے چہرہ نہ دیکھ سکی۔ شاید دوسری دائیں طرف پہ بھی کوئی مرد براجمان مگر وہ گلاس سوراخ چھوٹا ہونے کی وجہ سے دیکھ نہ پائی۔ وہ بہت خوش اور مگن سے میں باتیں کر رہے تھے۔ اس نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔

"میں نے تو گاڑی صبح ہی ایئرپورٹ بھجوا دی تھی۔" سامنے نظر آتا شخص کسی سے کہہ تھا۔ "بتایا تو ہے کہ عین وقت پہ پریس کانفرنس شروع ہو گئی۔ تم ان جرنلسٹس کو تو نتے ہو، انہی سے پیچھا چھڑاتے چھڑاتے فلائٹ مس ہو گئی۔" بولنے والی آواز میں حد ہ اُکتاہٹ بڑی واضح تھی۔

"فلائٹ ہی مس ہوئی نا، کوئی بات نہیں۔ مگر تیری دُلہن تو نہیں مس ہوئی نا۔" ہر ف سے قہقہہ کی بوچھاڑ ہوئی تھی۔

"تمنا بائی تو کہہ رہی تھی، لڑکی نہیں بھیجوں گی۔ بلن بھی کھٹک رہا تھا۔ کہہ رہا تھا، ں بندہ آئے۔ وہ تو تیری ایک فون کال نے ان سب کو ٹھنڈا کر دیا۔" ایک محتاط مگر ی آواز اس کے کان میں پڑی۔

تمنا بائی اور بلن کا نام سن کر وہ تجسس لئے مزید دروازے کے ساتھ لگ کے کھڑی ی رہی۔

"کوئی کھڑاک کر کے تو دیکھتے۔ پوری قیمت ادا کی ہے لڑکی کی۔ اوپر سے اس ی اور دُلہن کے ڈرامے کے لئے زیورات الگ سے ارینج کرنے پڑے۔ خیر، اب ر تو ہم بھی پوری کریں گے۔"

الفاظ تھے کہ بچھو.....وہ یک دم کرنٹ کھا کر پیچھے کو اُچھلی۔ وہ اتنی ناسمجھ اور بچی نہ تھی کہ ان کی گفتگو سے اندازہ نہ لگا سکتی کہ اس کے ساتھ نکاح کے نام پہ دھوکا ہوا ہے۔ وہ تینوں اپنے نوٹ کھرے کر چکے ہیں اور اسے کتوں کے آگے ڈال دیا گیا ہے، جو شاید اسے بھنبھوڑنے کے لئے ہی اکٹھے ہوئے تھے۔

''تم نے اچھا نہیں کیا تمنا بائی! نہیں اچھا کیا۔'' منہ پر ہاتھ رکھ کے سسکیوں کو روکتے ہوئے وہ بولی۔ اتنی بھیانک حقیقت کا زہر اس کے سارے جسم میں پھیلتا جا رہا تھا۔

''اگر تم اپنی ضد کی پکی نکلی ہو تو میری رگوں میں بھی تمہارا ہی گندا خون دوڑ رہا ہے۔ میں بھی تم سے ہار نہیں مان سکتی۔'' اس نے بڑبڑاتے ہوئے انتہائی قدم اٹھانے کا سوچ لیا تھا۔

وہ وحشی انداز میں پورے کمرے میں نظریں دڑاتے ہوئے کوئی تیز نوکیلی چیز ڈھونڈ رہی تھی، جس سے اپنا آپ ختم کر سکے۔ وہ بیڈ کی درازیں چیک کرنے کے لئے قریب آ گئی۔

وہ جانتی تھی کہ اگر زندہ رہی بھی تو کچھ ہی دیر میں مُردوں میں ہی شامل ہو جائے گی۔ اگر اس کی قسمت میں موت ہی تھی تو اس میں اتنی ہمت تھی کہ وہ یہ کام خود اپنے ہاتھوں سے کر سکتی۔

دراز کو تیزی سے باہر کھینچتے اس کی نگاہ بیڈ کراؤن پر دھری چابیوں کے گچھے پہ گئی۔ اسے یاد آیا کہ ان میں سے ایک مرد نے اسی گچھے سے اپارٹمنٹ کا بیرونی دروازہ اور پھر اس کے کمرے کا دروازہ بھی انہی چابیوں میں سے ایک سے کھولا تھا۔ جبکہ اس کے بیڈ پہ بیٹھنے سے پہلے آگے بڑھ کر تکیوں کو درست کرتے اور کمبل اُٹھا کر ایک طرف رکھتے ہوئے اس نے شاید بے خیالی میں چابیاں یہاں رکھ دی تھیں اور بھول گیا تھا۔

اس کی یہ ذرا سی بھول ہی ستارہ کی نئی زندگی کی نوید بن گئی تھی۔

اس نے چابیاں تیزی سے جھپٹ کر ہاتھ میں دبوچ لیں۔ اس کا دماغ تیزی سے چل رہا تھا۔ کمرے کی پچھلی باہر کی دیوار میں ہاف وال گلاس ونڈو تھی، جو اسے فرار میں مدد دے سکتی تھی۔

وہ شاید ان خوش قسمت لوگوں میں سے تھی، جن کے لئے اللہ ہمیشہ ایک در کھلا رکھتا ہے۔

وہ دروازے کی طرف مڑی اور ڈور لاک پہ لکھے نمبر کے مطابق مطلوبہ چابی ڈھونڈ کر



میں ڈال دی۔ باہر سے آتی آخری آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔

''یار! تم سب کو بھی بھرپور موقع دیا جائے گا، مگر پہلا حق تو اس دُولہا کا ہی بنتا ہے اک مکروہ سی ہنسی گونجی تھی۔

''سوری، رئیلی سوری۔ میں تم لوگوں کی نفس کی بھوک نہ مٹا سکی۔'' چابی، ہینڈل میں گئی تھی۔

ایڑیوں کو تھوڑا سا اوپر اٹھا کے اس نے کھڑکی کھولی اور پوری سلائیڈ ہٹا دی۔ کھڑکی زمین تک کا فاصلہ ناپنے کے لئے جھک کر دیکھا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اس بلڈنگ کے فرسٹ فلور پہ بنے اپارٹمنٹ میں تھی۔ زمین تک پہنچنے کے لئے اسے مشقت نہیں کرنی پڑتی۔ وہ ابھی کسی مضبوط چیز کا سہارا لینے کا سوچ ہی رہی تھی کہ س کی نظر اوپر سے نیچے جاتے لوہے سے بنے پانی کے موٹے پائپ پر پڑی۔ وہ اسے بمشکل اپنا سارن وزن اپنے دونوں ہاتھوں پہ ڈال کر کھڑکی پہ چڑھ کے کھڑی ا۔ اس نے اپنی اونچی ہیل والے جوتے کو دیکھا جو یقیناً اس کے نیچے جانے میں ٹ کا باعث بن سکتا تھا۔ دونوں پاؤں جھٹک کر جوتے نیچے پھینک دیئے اور خود سے فٹ دُور پائپ کو مضبوطی سے اپنے ایک ہاتھ میں تھام لیا۔ پائپ کو پکڑتے ہی اس پنا سارا جسم سلائیڈ سے باہر کھینچ لیا۔ صرف ایک لمحہ کے لئے اس کا سارا جسم بے توازن ے ہوا میں ڈول گیا، مگر اگلے ہی لمحے اس نے اپنے دونوں پیر مضبوطی سے پائپ کے ر جوڑ دیئے تھے۔

آہستہ آہستہ گھسیٹ کر نیچے آنے میں اسے بمشکل ایک منٹ لگا تھا۔ بلڈنگ کے اس حصے پہ روڈ ہونے کی وجہ سے ٹریفک آ جا رہی تھی۔ اُس کی اس حرکت کو فٹ پاتھ پہ والوں، گاڑیوں میں بیٹھے اور سڑک کے اس پار دکانوں کے باہر براجمان لوگوں نے ت اور مشکوک نظروں سے دیکھا تھا۔ چند ایک لوگ اُس کے اس عمل کو کوئی کرتب ہ کچھ کر ابھی تک کھڑے مسکرا رہے تھے۔ مگر اس کے پاس ان لوگوں پہ توجہ دینے کا ا وقت نہیں تھا۔ وہ اسے چیک کرنے کسی بھی وقت کمرے میں آ سکتے تھے۔ یہ چتے ہی اس نے بھاگنا چاہا۔ مگر کس طرف؟ سامنے روڈ پہ بھاگنے سے خطرہ تھا۔ وہ اس کا پیچھا کرنے کے لئے یقیناً اسی طرف آتے۔ کچھ سوچتے ہوئے وہ تیزی سے لمحے کے بائیں سائیڈ پہ مڑ گئی۔ اس طرف کالونی واقع تھی۔ اور ان کا شک اس طرف کم ہی جاتا۔

اس کے پیروں میں جوتا نہیں تھا۔ وہ ننگے پاؤں اندھا دُھند بھاگتی جا رہی تھی۔ وہ اپنی زندگی میں کبھی اتنا تیز نہیں دوڑی تھی۔ وہ اپنی پوری طاقت سے قدم اٹھاتی اور جماتی۔ کئی دفعہ وہ لڑکھڑائی، منہ کے بل گری، مگر پھر سنبھل کے بھاگنا شروع کر دیتی۔ کتنے ہی پتھر اور کنکر اس کے پیروں میں چبھے، مگر اسے احساس ہی کب تھا۔ بے تحاشا تیز اور دُور بھاگنے کے بعد وہ ایک گھر کے باہر بنے سکیورٹی گارڈ کے کیبن کو تھام کر کھڑی ہو گئی۔ لمبے لمبے سانس خارج کرتے اس نے اپنے ہاتھ سے سینہ مسل کر تنفس بحال کرنے کی کوشش کی۔ سارا حلق اندر تک خشک ہو چکا تھا۔ اسے ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے اور ٹانگوں سے جان نکل چکی تھی۔ اس نے خشک ہونٹوں پہ لرزتی زبان پھیری اور ہانپتی ہوئی، کیبن کو تھام کر زمین بوس ہوتی چلی گئی۔

☆☆☆

بوٹ ہاتھ میں پکڑے، ننگے پیر مضبوطی سے سیڑھیوں پہ جماتے وہ جھکتا ہوا نیچے اُتر رہا تھا۔ دو، تین سیڑھیاں اُتر کر سہم کر اِدھر اُدھر نگاہ بھی دوڑا لیتا۔ اس سے چھوٹے تینوں اکثر ایسی حرکتیں کرتے رہتے تھے، مگر وہ آج پہلی بار کسی ایسے مرحلے سے گزر رہا تھا۔ اسے اپنی ماں زرینہ کا ہی ڈر تھا۔ اگر وہ اسے یہ سب کرتا دیکھ لیتیں تو بات کا بتنگڑ بن جاتا اور باپ کی ڈانٹ پھٹکار الگ سے سننی پڑتی۔

وہ سیڑھیاں اُتر کے دائیں طرف کے بنے کمروں کے پاس سے گزر کر جانا چاہتا ہی تھا کہ ڈرائنگ روم کے ساتھ والا کمرہ، جو زرینہ اور اس کے باپ کا تھا، کے پاس رک گیا۔ اس وقت اندر سے آتی ان کی آوازوں نے اس کے قدم خود بخود روک لئے۔

''اس کی عمر کے لڑکوں نے سارے سارے گھر کا بوجھ اُٹھایا ہوتا ہے۔ وہ جو نکڑ والے امجد صاحب ہیں، کتنے سالوں سے اسی محلے میں کرائے پر رہتے آ رہے ہیں۔ مگر اب ان کے بیٹے نے اپنا پلاٹ خرید کے مکان بھی تعمیر کر لیا۔ بس اس مہینے کے پورا ہوتے ہی شفٹ ہو جائیں گے۔ اور ان کا بیٹا، اکمل سے یہی کوئی دو، تین سال ہی بڑا ہو گا۔'' زرینہ بیگم نے مبالغہ آرائی کی حد کر دی۔ وہ اکمل سے دو یا تین نہیں، پورے سات برس بڑا تھا۔

''وہ تو ٹھیک ہے، مگر.....'' عارف صاحب نے کچھ کہنا چاہا۔

''اگر، مگر کیا؟..... میں نے اس کی تنخواہوں کا ایک روپیہ بھی نہیں لیا۔ بھلا میں اس کے پیسوں پہ بیٹھی ہوں؟'' اس کے باپ کی کمزور سی آواز، زرینہ بیگم کی کڑک کے آگے



ب کے رہ گئی۔

''پھر آج کل کے لڑکے کیا کچھ نہیں کرتے پھرتے؟'' باہر کھڑے اکمل کو سمجھ نہیں آ ہی تھی کہ آخر وہ اس سے اتنی بدگمان کیوں ہو رہی ہے۔

''بہتر ہے کہ اپنا پیسہ فضول کاموں میں خرچ کرنے کے بجائے اپنے لئے کچھ بنا ل۔ سینکڑوں ہاؤسنگ سوسائٹی سکیمیں چلتی ہیں، کہیں یہ بھی اپنے نام پلاٹ الاٹ کروا ل۔ اچھا ہے نا، مستقبل میں کام آئے گا۔'' مشورہ دینے کا انداز انتہائی مخلصانہ تھا۔

اور اکمل کو تو اپنے کانوں پہ یقین ہی نہ آ رہا تھا کہ جو بات ابھی اس نے سنی ہے، وہ ینہ بیگم یعنی اس کی سوتیلی ماں نے اس کے لئے کہی ہے۔ زرینہ بیگم اور اکمل کے ستقبل اور فائدے کی بات کر رہی تھیں۔ یقیناً کرنا تھوڑا نہیں، خاصا مشکل تھا۔''

''مگر یہ بھی تو اسی کا گھر ہے زرینہ!'' اس کے باپ کی کمزور سی آواز اُبھری۔

''بابا بھی نا.....'' اکمل نے نفی میں سر ہلایا۔ اسے زرینہ بیگم کا یہ آئیڈیا بہت بھایا تھا۔

''کیا مطلب عارف صاحب!..... دس مرلے کا گھر ہے، کوئی چار کنال کی کوٹھی ں۔'' وہ جو آگے بڑھ جانا چاہتا تھا، زرینہ بیگم کے منہ سے قدرے اونچی اور کرختگی سے یہ جملہ اس کے پیروں کی زنجیر بن گیا تھا۔

''ہمارے اپنے بھی تو تین بیٹے ہیں۔ کل کلاں ان کی شادیاں ہوں گی تو وہ کہاں یں گے؟ میں اپنے جیتے جی تو اپنے بیٹوں کو خود سے الگ نہیں کر سکتی۔ وہ بڑا جمال، ا کی تو ابھی سے اکمل سے نہیں بنتی۔ اور آپ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ وہ غصے کا نا تیز ہے۔ اکمل جوان ہے، کماتا ہے اور شادی کی عمر بھی ہے۔ اپنا کمائے، گھر بنائے شادی کروائے۔ ہمارے بچوں کی شادیوں میں ابھی کئی سال پڑے ہیں۔ پھر یہ تو میرا ر کرتا نہیں۔ کون سا سگی ماں ہوں؟ آنے والی مجھے کان سے پکڑ کر باہر کرے گی۔ پالا ا، جوان کیا، اب اگر اس قابل ہو گیا ہے تو اپنا ٹھکانہ کرے۔ صرف گھر سے ہی تو نے کا کہہ رہے ہیں، کوئی جائیداد سے تھوڑی عاق کر رہے ہیں۔ آپ اچھا سا موقع ر کر بات کریں۔ کہیں قسطوں پہ پلاٹ خرید لے، تعمیر کے پیسے چاہے آپ دے دیجئے۔'' آخری الفاظ انہوں نے ذرا دھیمے اور بے زار کن سے انداز میں کہے۔ معاملے کی کت کو وہ بھانپ گیا تھا۔ باپ اس کے حق میں آواز بلند کرے، اس کی توقع عبث تھی۔ وہ باپ کا فیصلہ سننے کا منتظر ساکت و صامت کھڑا رہا۔

تھوڑی دیر بعد عارف صاحب کی آواز آئی تو اسے لگا کہ سیلاب کی تیز لہر آئی ہو اور

اس کا سب کچھ بہا کے لے گئی۔

''کہتی تو تم ٹھیک ہو، کروں گا بات۔ سگے ہوتے تو اور بات تھی۔'' ہمیشہ کی طرح اکمل کے اس معاملے میں بھی وہ بیوی کے دلائل سے متفق ہو ہی گئے تھے۔ اس کی زندگی کا ایسا کون سا معاملہ تھا، جو انہوں نے اپنی مرضی سے طے کیا ہو۔

اس کی آنکھوں کے سامنے دُھند سی چھانے لگی تو وہ پژمردہ سے قدم اُٹھاتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ بیڈ پہ بوٹوں سمیت اوندھا لیٹے وہ زرینہ بیگم کے متعلق ہی سوچے چلا جا رہا تھا۔

کتنی نفرت تھی، جو کئی برس گزر جانے کے بعد بھی محبت میں نہیں بدل سکی تھی۔ اس نے کبھی زرینہ بیگم کو انکار نہیں کیا تھا۔ اس نے کبھی ان کے سامنے آنکھ اُٹھا کر بات نہیں کی تھی۔ وہ لاکھ اس کے ساتھ برا سلوک کرتیں، مگر اس کی ہمیشہ یہی کوشش رہتی کہ وہ ان کے قریب ہو سکے۔ وہ کبھی اپنے بیٹوں کی طرح اسے بھی سینے سے لگا کر چومیں۔ مگر یہ سب کچھ ایک خواب ہی تھا۔

میرے بیٹے، ہمارے بیٹے، ہمارا گھر..... اس میرے اور ہمارے میں اس کے لئے کبھی جگہ نہ بن پائی، وہ صرف تم ہی رہا۔

''میرا گھر کون سا ہے؟ میں اپنا رشتہ کس سے جوڑوں؟'' بے بسی کے احساس سے نکلتے، کتنے ہی آنسو تکیے میں جذب ہو گئے۔

''چلو، ماں سوتیلی سہی، مگر بابا کو صرف تین ہی کیوں نظر آتے ہیں؟ کیا میرا وجود ان کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا؟..... یا وہ مجھے اپنی یادداشت سے نکال چکے ہیں؟ وہ اپنی محبت اور شفقت صرف ان میں ہی تقسیم کرتے ہیں۔ میری باری کیوں نہیں آتی؟ میں پیچھے یا اردگرد کھڑا کب سے اپنا منتظر رہوں؟''

کتنے بے شمار سوالات تھے، مگر جواب کسی ایک کا بھی نہیں تھا۔ جن سوالوں کا جواب کسی دوسرے کے پاس ہو، انہیں سوچ کر بار بار دہرانا خود کو ذہنی اذیت میں مبتلا کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ یونہی روتے روتے اس کی پلکیں خمار آلود ہونے لگیں۔ دماغ پہ بھاری بوجھ تھا، جو پلکوں کے آپس میں ملتے ہی سرکنے لگا۔

☆☆☆

مدھم مدھم سرگوشیاں اسے اپنے قریب سے اُبھرتی محسوس ہو رہی تھیں۔ مگر بولنے والوں کی کوئی واضح شبیہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ لاشعوری طور پر اس نے ان آوازوں کو سننے



پہچاننے کی کوشش کی، مگر سر میں اُٹھتی درد کی ٹیسیں ناقابلِ برداشت تھیں۔ ہر طرف گہرا ہی اندھیرا تھا۔ اس کا ذہن ان اندھیروں میں بہت پیچھے کہیں گم ہونے جا رہا تھا کہ اپنے وجود پہ کسی کا لمس محسوس ہوا۔

''لگتا ہے، انہیں ہوش آ رہا ہے۔ پلیز آنکھیں کھولیں۔'' اس کے بازو کی نبض ایک انگلی لے کر چیک کرتے، دوسرے ہاتھ سے اس کا گال تھپتھپایا گیا تھا۔

''پلیز، ہوش کریں۔''

اس کے ذہن کی تمام منتشر، کھینچی گئی طنابیں ڈھیلی ہوتے ایک جگہ پہ یکجا ہو کر اس آواز کو محسوس کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وہ الفاظ سننا اور عمل کرنا چاہتی تھی۔ مگر آواز دُور سے آتی سنائی دے رہی تھی۔ آہستہ آہستہ بار بار پکارنے پہ آواز واضح ہوتی گئی اس نے ہلکا سا کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔

''تھینک گاڈ، آپ کو ہوش تو آیا۔'' بالکل سامنے کھڑی اٹھائیس، تیس سال کی لڑکی دونوں ہاتھ اُٹھا کر شکر ادا کیا۔

''آپ کو کہیں درد تو نہیں ہو رہا؟ آپ خود کو بہتر محسوس کر رہی ہیں؟'' اس لڑکی کے کھڑے تقریباً اسی کے ہم عمر مرد نے بغور اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

وہ آنکھوں میں خوف اور حیرانی لئے ٹکر ٹکر ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ دائیں سائیڈ پہ ملازمہ، ہاتھ میں دودھ کا گلاس لئے ابھی ابھی آ کر کھڑی ہوئی تھی۔

''میں کہاں ہوں؟'' وہ سہمے ہوئے انداز میں خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتی اُٹھ کر بیٹھا۔

''آپ ہمارے گھر میں ہیں۔ کل رات آپ، گھر کے باہر کیبن کے قریب بے ہوش ہوئی ملی تھیں۔ شاید آپ کے ساتھ کوئی حادثہ ہوا ہے، مگر اب آپ بے فکر رہیں۔ یہ آپ بالکل محفوظ ہیں۔'' لڑکی نے اس کے قریب بیٹھ کر بڑی نرمی سے اسے بتایا۔

اسے ابھی بھی کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کون لوگ ہیں؟ اور وہ ان تک کیسے پہنچی؟ مگر لڑکی کے منہ سے کل رات کا سن کر اسے سب کچھ یاد آنے لگا تھا۔ اُس کی آنکھیں بھر آئی گئیں۔

''آپ دودھ پی لیجئے، پھر آپ کے لئے کھانا لاتی ہوں۔'' لڑکی نے ملازمہ سے دودھ کا گلاس پکڑ کر اس کے منہ سے لگایا۔

ان اجنبیوں کے رویے میں ایک غیر معمولی سا اپنا پن تھا، جس کی وہ عادی نہیں تھی۔

یونہی سر جھکائے اس کی نظر غیر ارادی طور پر اپنی کلائیوں پر اُٹھ گئی۔ دائیں ہاتھ میں چمکتے سونے کی آٹھ چوڑیاں، بائیں بازو میں چار موٹے موٹے کنگن، گلے کا گلوبند اور موتی والا ہار شاید ڈوری ڈھیلی ہونے کی وجہ سے سینے پر جھول رہا تھا۔ احساسِ تحفظ نے اس کے گرد کمزور سا حصار کھینچ ہی دیا تھا۔ اس نے لڑکی کو دیکھا، جو ملازمہ کو کوئی ہدایات دے رہی تھی۔

''آپ کا نام کیا ہے؟'' جس ماحول میں وہ پلی بڑھی تھی، وہاں نہ تو نام کی پوچھ گچھ ہوتی تھی اور نہ ہی شناخت مانگی جاتی تھی۔

''ویسے میرا نام سارہ ہے اور یہ میرے شوہر، رضوان ہیں۔'' اس کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کے اس نے اپنا اور اپنے قریب کافی دیر سے خاموش کھڑے شوہر کا تعارف کروایا۔

''سارہ! تم ایسا کرو، پہلے انہیں کھانا کھلاؤ۔ یہ ابھی یہیں ہے نا۔'' اس کے شوہر نے ابرو سے اسے اُٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے ستارہ کی بہت بڑی مشکل آسان کر دی۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے فوراً باہر چلی گئی۔

☆☆☆



''میرا نام یسریٰ ہے۔ میرے والدین، میرے بچپن میں ہی انتقال کر گئے تھے۔ ے سوتیلے چچا نے میری پرورش کی اور بعد میں اپنے لائق، ہونہار بیٹے جو اچھی پوسٹ ز تھے، ان سے میری شادی کروا دی۔ لیکن میری بدقسمتی کہ شادی کے تین ماہ بعد ہی کی روڈ ایکسیڈنٹ میں ڈیتھ ہو گئی۔ بس پھر میرے چچا اور ان کے بچوں کا رویہ بدل ۔ وہ سب لوگ مجھ سے میرے زیورات اور گھر جو اُن کا بیٹا منہ دکھائی کے طور پر ے نام کر چکا تھا، مجھ سے چھین لینا چاہتے تھے۔ مگر جب میں نے سب کچھ دینے انکار کر دیا تو انہوں نے مجھے مارنے کی پلاننگ کی۔ اس رات ہم کسی قریبی رشتے دار شادی میں شریک تھے۔ میں ان کی ساری منصوبہ بندی سے آگاہ ہو چکی تھی، اسی لئے ی اپنے گھر سے رات کے پہر موقع دیکھتے ہی فرار ہو گئی۔''

کہانی اختتام پذیر ہو گئی۔ کوئی کچھ نہیں بولا۔ ان تینوں نفوس کے موجود ہونے کے ود گہری جامد خاموشی اس قدر تھی کہ اس کی طوالت سے وہ تینوں گھبرا گئے۔

وہ دونوں میاں بیوی پچھلے تین دن سے اسے بہلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اب کی آنسوؤں کے درمیان سنائی گئی آپ بیتی سن کر بنا ایک لفظ کہے اُٹھ کر باہر چلے ۔ بند ہوتے دروازے کو دیکھ کر اس نے تکیوں سے ٹیک لگا دی۔ نرمی سے اپنے وؤں کو رگڑ کر پونچھا اور بھیگے لبوں سے مسکرا دی۔

تو یوں ستارہ بائی سے یسریٰ تک کا سفر طے ہو گیا۔ اس سفر میں کتنی مشکلات آئیں، ے زخم لگے، کیا کچھ کھویا؟ اس کا ذکر بالکل نہیں کرنا۔ کیونکہ جو حاصل ہے، وہ کھونے کہیں زیادہ ہے۔ شبِ ظلمت نے رات کی سیاہی کا فائدہ اٹھا کر کئی دفعہ اپنے پنجے نے کی کوشش کی، مگر وہ ہر بار بچ نکلی۔ بالکل اسی طرح اسے یقین تھا کہ ایک دن اس ہ بائی سے بھی بچ نکلے گی۔ وہ اپنے اندر کی اس بائی نام کی لڑکی کو مار دے گی۔ شاید

مارتو اسی دن دیا تھا، جب پہلی بار بلن اور تمنا بائی کے سامنے سر اٹھایا تھا۔

''میں طوائف نہیں، گھریلو عورت بن کر جینا چاہتی ہوں۔ مجھے شوہر چاہئے۔ مگر ہر رات چہرے بدلنے والا نہیں، وہ شوہر جسے میں اللہ کو حاضر ناظر جان کر قبول کروں، جو میرے تمام جملہ حقوق کا مالک ہو۔ جو میرے بچوں کا باپ ہو۔ میرے بچوں کی ولدیت کے خانے میں اس کا نام درج ہو۔ میرے تمام بچوں کی رگوں میں صرف ایک ہی غیرت مند باپ کا خون گردش کر رہا ہو۔ مجھے ایک گھر چاہئے، جو سکون کا گہوارہ ہو، جس میں سکون ہو۔ صرف سکون۔ میرا نام یسریٰ ہے اور مجھے اسی نام سے پکارا جائے۔'' اُس نے پُرسکون ہو کر آنکھیں موند لی تھیں۔ اب صرف گھر کی خواہش باقی تھی۔

☆☆☆

''ہیلو..... کیا؟ ..... نہیں یار! ہم بہت تھکے ہوئے ہیں۔'' ناصر نے جھنجلا کر فون پر دوسری طرف کسی کو انکار کیا۔

''ضروری کام تمہیں ہے، خود آ جانا بعد میں۔''

''اسے گھر سے آ کر پک کر لے۔ ہم نوکر نہیں ہیں۔'' اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''اچھا، ناراض نہ ہو۔ چھوڑ دیتے ہیں..... کہا نا، چھوڑ دیتے ہیں۔'' اس نے فون بند کر دیا۔

''کون تھا؟'' گاڑی کی بیک سیٹ سے ٹیک لگائے اکمل نے ذرا سی آنکھیں کھول کر پوچھا۔

''وہی تیرا یار، دائم۔ کہہ رہا تھا کہ تجھے اس کے گھر ڈراپ کر دیں، ضروری کام ہے۔'' ناصر نے نفی میں سر ہلاتے اطلاع دی۔ اسے دائم کا یہ نیا حکم قطعی پسند نہیں آیا تھا۔

وہ سب ابھی شمالی علاقہ جات سے بائی روڈ واپس آ رہے تھے۔ ہر کوئی جلدی گھر پہنچ کر لمبی نیند لے کے تھکان اُتارنا چاہتا تھا۔ ایسے میں دائم کا میسج انہیں تپا گیا تھا۔

''ناصر! تُو انکار کر دیتا۔'' اسفر سب سے زیادہ بے زار تھا۔ اس کی وجہ ڈرائیونگ تھی جو وہ پچھلے پانچ گھنٹے سے کر رہا تھا۔

''کیا تو تھا، مگر وہ ناراض ہو رہا تھا اور سختی سے اکمل کو اپنے گھر چھوڑنے کی تاکید کر رہا تھا۔'' دائم کا گھر دوسرے ایریے میں تھا۔ اس طرف کے روڈ کے لئے انہیں لمبا چکر کاٹنا پڑتا۔

''یقیناً کوئی ضروری کام ہوگا حالانکہ موڈ تو میرا بھی نہیں بن رہا۔'' اکمل نے انگڑائی



تھکن کا احساس زائل کرنے کی کوشش کی۔

دائم پہلے سے گیٹ پر موجود تھا۔ گاڑی کے رُکتے ہی وہ ان کی طرف بڑھا۔ ان سے حال احوال پوچھ کر اکمل کا سفری بیگ اٹھا کر اندر چلا آیا۔

''گھر میں کوئی نہیں؟'' اکمل نے گہری خاموشی محسوس کرتے پوچھا۔

''نہیں۔ پرسوں سب گھر والے عمرے سے واپس آئیں گے۔'' اس نے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولتے ہوئے جواب دیا۔

''بیٹھو، بہت زیادہ تھک گئے ہو، میں کھانا لاتا ہوں۔'' اس کے سست سے انداز کو دیکھ کر دائم نے اندازہ لگایا۔

''نہیں دائم! تم بتاؤ، کیا کام ہے؟ کھانا میں گھر جا کر کھاؤں گا اور لمبی نیند بھی لینی ہے۔'' وہ ٹانگیں آگے کو پسار کر ڈھیلے ڈھالے انداز میں صوفے میں دھنس گیا۔

''کام تو کوئی نہیں تھا۔'' بالوں میں اُنگلیاں چلاتے وہ پُرسوچ لہجے میں بولا۔

''تو پھر بلایا کیوں تھا؟'' یکدم ہی اکمل کے لہجے میں خفگی در آئی۔ اس نے جواباً دائم کو بغور دیکھا۔

''تم پریشان ہو دائم؟'' دائم تو کبھی بھی غمگین نہیں ہوتا تھا، ہمیشہ وہی اپنے رونے کے پاس لے کر آتا تھا۔

''نہیں، پریشان تو نہیں ہوں۔ بس یونہی۔'' وہ بے قراری سے اس کے پاس سے اٹھا۔ وہ الفاظ ترتیب دے رہا تھا کہ آخر بات کہاں سے شروع کرے؟

''دائم! کہیں تیری منگنی ہونے سے پہلے تو نہیں ٹوٹ گئی؟'' اس کے ذہن میں یہی بات آئی تھی۔ کیونکہ دائم کے پاس یہی موضوع ہوتا تھا۔

''نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' پھیکی سی مسکراہٹ سے اس نے اکمل کی سوچ کی تردید کی۔ ہاتھوں کو مسلتے، لب بھینچتے وہ بہت مضطرب لگ رہا تھا۔ ہر بات کا جواب بھی نفی میں دے رہا تھا۔

''دائم! ہمارے درمیان میں اتنا تکلف تو کبھی بھی نہیں رہا۔ میں بھی تو اپنی پریشانی تجھ سے ہی شیئر کرتا ہوں۔ تم پریشان ہو تو بتاؤ گے نہیں؟'' دائم کا بدلا بدلا سا روپ اسے کھٹک رہا تھا۔ وہ اسے قریب آتے ہی صوفے پر بٹھا کر حوصلہ دینے لگا۔

''اکمل! میں جانتا ہوں کہ تم نے شروع سے لے کر اب تک اپنے تمام مشکل حالات کو بڑے حوصلے اور صبر سے مقابلہ کیا ہے۔ اب بھی اگر ایسی ویسی بات ہو گئی ہے تو تم ہرگز

نہیں گھبراؤ گے۔ سنا رہے ہو نا میری بات؟'' اس نے آغاز سے پہلے تمہید باندھی اور ا
کے کاندھے پر ہاتھ دھر کے اسے رام کرنے کی کوشش کی۔

''کیا، کچھ ہو گیا ہے؟'' وہ ہونقوں کی طرح دائم کا چہرہ دیکھتے پوچھنے لگا۔ دائم کی ا
تمہید سے وہ جان گیا تھا کہ کچھ دائم کے ساتھ نہیں، خود اس کے ساتھ اس کی غیر موجو
میں ہو چکا ہے۔

''ہاں.....'' دائم کا ایک لفظی جواب صرف کچھ کی نہیں بلکہ بہت کچھ کی طرف اش
کر رہا تھا۔

''کیا ہوا؟'' اس نے ہمت مجتمع کر کے پوچھا۔

''وہ آخری رات تم..... تم اپنے آفس سے لیٹ نائٹ آئے تھے اور پھر اگلی صبح م
چلے گئے۔'' وہ تھوڑی دیر کو رکا۔ ''جبکہ اسی رات تمہارے آفس سے ستر لاکھ کیش چوری
گیا۔'' وہ سانس لینے کو رکا اور اکمل کا سانس ہی رک گیا۔

''سس..... ستر لاکھ کیش۔'' کافی دیر بعد بے ربط سے الفاظ اس کے منہ سے نکلے

''ہاں۔ تمہارے جانے کے بعد پولیس آئی تو پتہ چلا۔''

''پو..... پولیس..... میرے گھر..... مگر کیوں؟'' اس نے اپنی طرف اشارہ کر
ہوئے حیرانی اور بے یقینی سے پوچھا۔

''تمہیں اریسٹ کرنے کے لئے۔'' دائم کی آواز کافی مدھم اور نحیف سی تھی، مگر وہ
چکا تھا۔ ''تمہارے ساتھ اُس رات دو سینئرز اور ایک لڑکا اور بھی تھا، وہ سب اس جیل
ہیں اور پولیس تمہاری بُو بھوکے کتے کے مانند سونگھتی پھر رہی ہے۔'' دائم نے اسے سا
بات بتا دی۔

''مگر دائم! اس رات تو ایم۔ ڈی کا بیٹا بھی وہیں تھا۔'' اتنی پریشانی کے باوجود ا
یاد آ گیا تھا۔

''ہاں، تھا۔ مگر رپورٹ تم چاروں کے خلاف ہوئی ہے۔ اس کا بیٹا ٹھیک تین دن
انگلینڈ چلا گیا۔''

''مگر میں نے کچھ نہیں چرایا۔''

''کون یقین کرے گا؟'' دائم نے اس کے ستے چہرے پہ ایک اچٹتی سی نگاہ دوڑائی

''تم..... تم تو یقین کرو گے نا دائم! میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں چور نہیں ہ
دائم!'' وہ دونوں بچپن سے دوست تھے، ایک دوسرے کو جانتے تھے، مگر بات ان کی



نہیں تھی۔

''ایک اور..... خبر بھی ہے۔'' دائم نے ذرا ہچکچاتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ دائم جانتا
کہ وہ اتنا فکر مند ہو چکا ہے کہ اسے دوسری بات نہ بتائی جائے۔ مگر بتائے بغیر چارہ
بس تھا۔ آگے کا لائحہ عمل تیار کرنے کے لئے سارے حالات کا بغور مشاہدہ ضروری تھا۔

''یہ پڑھو۔'' اس نے تھوڑا سا پیچھے جھک کر سائیڈ ٹیبل پر پڑا پرانا سا نیوز پیپر اٹھا لیا۔

''میں اپنے بیٹے اکمل احمد ولد عارف احمد کو اس کی غنڈہ گردی، چوری چکاری اور بوجہ
فرمانی اپنی تمام منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد سے عاق کرتا ہوں۔'' اس کے باپ، عارف
مد کی طرف سے چھپنے والا عاق نامہ۔ دائم نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹا لی تھیں،
س کی رنگت زردی مائل ہوتی جا رہی تھی۔ ساکت بیٹھا وہ کوئی پتھر کا بنا مجسمہ لگ رہا تھا۔

''اتنا سب کچھ ہو گیا اور تم نے مجھے بتایا نہیں۔'' اس کے لہجے میں ابھی بھی بے یقینی
ی ہلکی سی جھلک تھی۔

''میں نے دوسرے دن ہی بتانا چاہا، مگر سارا وقت سگنل پر ابلم رہی اور اگلے ہی دن
نہارے فادر نے یہ عاق نامہ چھپوا دیا۔ اس طرح انہوں نے اپنا بچاؤ تو کر لیا، مگر.....
پولیس میرے گھر کے بھی کئی چکر لگا چکی ہے۔ میں نے کہہ دیا تھا کہ میرا، تم سے رابطہ نہیں
ہے۔ میں اس مسئلے کا حل ڈھونڈ رہا تھا۔'' دائم نے وجہ بتائی۔

''پھر ملا حل؟'' اس کا لہجہ زہر خند تھا۔ ''مسٹر دائم صدیقی! چند دن تو ایک طرف، آپ
کئی سال بھی سوچ لیں تو اس مسئلے کا حل نہیں ملے گا۔ جانتے ہیں کیوں؟ کیونکہ یہ مسئلہ
اکمل احمد کی زندگی سے جڑا ہوا ہے..... اور اکمل کی زندگی میں کچھ اچھا ہو جائے،
ناممکن..... نیور۔''

زرد پڑتا سپاٹ چہرہ۔ آنکھوں میں ٹھہر سی گئی نمی، نفرت اُگلتے ہونٹ، کتنا کمزور لگ
رہا تھا، پانچ فٹ گیارہ انچ کا وہ شخص، جس کے چوڑے کاندھے اور مضبوط مسلز دیکھ کر
اس کے ہم عمر لڑکے اس سے ناجائز یا اُلٹی سیدھی بات کرنے سے پہلے کئی بار سوچتے۔ جو
خود تو کالج سے گھر تک پونے تین کلومیٹر تک کا فاصلہ پیدل طے کر لیتا، مگر بس اسٹینڈ پہ
مانگنے والے فقیر کو کبھی خالی ہاتھ نہ جانے دیتا۔ جس نے اپنی پچیس سالہ زندگی میں اگر کسی
عورت کا ذکر کیا بھی تھا تو وہ صرف اور صرف اس کی ماں کا تھا۔ جو رشتوں کے لئے اتنا
ہی شیدائی تھا، جتنا رشتے اس سے الرجک۔

''اللہ پر بھروسہ رکھو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' دائم نے اس کے دونوں سرد ہاتھ

مضبوطی سے تھام لئے۔

اسی وقت باہر بھاری ٹائروں کی چرچراہٹ کی آواز سنائی دی۔ کوئی گاڑی دروازے کے پاس آ کر رکی تھی۔ دائم تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑکی کی طرف لپکا۔ باہر کے منظر میں پولیس کے چند آدمی، گاڑی سے نیچے اُتر رہے تھے۔

''اکمل! بھاگ۔ پو..... پولیس۔'' اس نے پھرتی کے ساتھ اکمل کو بازو سے پکڑ کر باہر کی طرف گھسیٹا۔

☆★☆

وہ ایک پرائیویٹ ہسپتال میں ڈے شفٹ میں جاب کرتے، فلیٹ میں آ کے تھکن کے باوجود اپنے لئے کھانا بناتے اور ہر سنڈے کو تفصیلی صفائی کرتے، کپڑے دھوتے ہوئے، فلیٹ کو سجانے کے لئے چھوٹی چھوٹی چیزوں کی خریداری کرتے اور رات کو بستر پہ لیٹتے ہی میٹھی اور پُرسکون نیند کی آغوش میں جاتے، اسے ایک بات تو سمجھ میں آ گئی تھی کہ ارادہ اور ثابت قدمی، انسان کے ایسے ہتھیار ہیں، جو بڑے بڑے ناخداؤں کو اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیتے ہیں، جو ہر طرح کے نامساعد حالات کو آپ کے حق میں موافق کر دیتے ہیں۔ تقدیر لکھنے والے کو کبھی آپ پر رحم آ ہی جاتا ہے۔

ستارہ بائی سے یسریٰ بن جانا آج بھی جیسے ایک خواب سا لگتا تھا۔ ایسے، جیسے پیاسے کو صحرا میں کنواں اور ستانے کے لئے سرسبز باغ مل جائے۔

اس نے لمبی سانس خارج کرتے ہوئے ٹھنڈی ہوتی چائے کو ہونٹوں سے لگا لیا۔ وہ تنہا ہی تو رہتی تھی، مگر تنہائی جب زیادہ محسوس ہونے لگتی تو یونہی خود سے باتوں میں مصروف ہو جاتی۔ ڈھیروں ڈھیر باتیں، جو وہ خود سے کرتی اور خوش ہوتی۔ اسے ڈھائی ماہ ہو گئے تھے، اپنے اس فلیٹ میں شفٹ ہوئے۔ سارہ اور رضوان بھائی کو اپنے یسریٰ ہونے کی کہانی سنا کر وہ خود بے چین ہو گئی تھی، گو کہ انہوں نے اس سے کبھی مزید کچھ نہیں پوچھا، مگر اس کے اندر کا چور اس کے دل میں انجانے وسوسے ڈالتا رہتا۔ پہلے تو وہ ضد کر کے ان کے گھر کی ہی انیکسی میں شفٹ ہو گئی، مگر وہ لوگ تو اسے اپنے گھر کا فرد ہی سمجھنے لگے تھے۔ اس کا یوں انیکسی میں رہنا انہیں اچھا نہیں لگتا تھا، جبکہ وہ مزید کسی کے رحم و کرم پہ نہیں رہنا چاہتی تھی۔ اگر رضوان یا سارہ کو اس کے ماضی کی بھنک بھی پڑ جاتی تو پھر اس کا ٹھکانہ کہاں ہوتا؟ درحقیقت وہ فرار ان سے نہیں، اپنے ماضی سے چاہتی تھی۔ اسے اپنی بات پہ مضبوط اور بہتر مستقبل کے لئے پریشان دیکھ کر رضوان بھائی نے ہی



مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنے تمام زیورات بیچ کر فلیٹ خرید لے اور پھر انہی کے توسط سے ان کے دوست کے پرائیویٹ ہسپتال میں اسے نرسنگ جاب بھی مل گئی تھی۔

وہ بلن، تمنا بائی اور جہاں آرا بیگم کے چنگل سے نکل تو آئی تھی، مگر وہ ابھی تک کبھی کبھار کسی خوفناک آسیب کی طرح اس کے ذہن پر سوار ہو جاتے تھے۔ وہ اپنی طرف آتے لوگوں سے کترانے لگی تھی۔ اسے ہر شخص اپنے ماضی کا شناسا اور تماشائی سا لگتا، حتیٰ کہ وہ یسریٰ بن کے اپنا ماضی فراموش کر چکی تھی، مگر ستارہ بائی کا نام ابھی بھی اس کے اندر میں کھٹکتا رہتا تھا۔

☆★☆

''پلیز آپی! مان جائیے نا۔ صرف چند دنوں کی تو بات ہے۔ جب کوئی اور بندوبست ہو جائے گا تو میں اسے لے جاؤں گا۔'' دائم نے سارہ کو مناتے ہوئے کہا۔

پولیس کے اندر آنے سے پہلے ہی وہ اکمل کو بیس منٹ میں چھپا چکا تھا۔ پولیس نے سارے گھر کی تلاشی لی تھی اور اکمل کو نہ پا کر اسے دھمکیاں بھی دی تھیں کہ اگر وہ اپنا بچاؤ چاہتا ہے تو اکمل کا پتہ بتا دے۔ مگر اس نے بھی اپنی ازلی خود اعتمادی سے پولیس والوں کو جواب ٹکا ٹکا کر جواب دیئے تھے، جن سے یہ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ رات کے آخری پہر وہ اکمل کو لے کر اپنی بڑی بہن سارہ کے گھر آ گیا تھا تاکہ اسے چند دن یہاں چھپا کر مزید کوئی متبادل انتظام کر سکے۔ فی الحال اس کے پاس اس گھر کے علاوہ کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔

''مگر دائم!..... رضوان، بزنس ٹور سے تین دن بعد لوٹیں گے۔ میں ان سے پوچھے بغیر کیسے؟..... اور پھر تم جانتے ہو نا کہ رضوان کی امی کی طبیعت کتنی خراب ہے۔ وہ ہسپتال میں ایڈمٹ ہیں۔ مجھے اور رضوان کو بلوایا ہے، ہم پندرہ دن بعد انگلینڈ جا رہے ہیں۔ کم از کم ایک ماہ کے لئے۔'' سارہ نے بھی اپنی مجبوری بتائی۔ سارہ کے گریز کی اصل وجہ بھی یہی تھی۔ ورنہ وہ خود بھی اکمل کو کئی سالوں سے اپنے گھر آتا جاتا دیکھتی رہی تھی۔

''رضوان بھائی سے میں خود بات کر لوں گا، آپی!..... ماما، پاپا پرسوں واپس آ رہے ہیں۔ پولیس بھی کئی دفعہ ہمارے گھر آ چکی ہے۔ اب بھی بڑی مشکل سے بچ کر یہاں آئے ہیں۔ ایسے حالات میں ہمارے پاس کوئی محفوظ ٹھکانہ نہیں ہے، سوائے اس گھر کے۔ پلیز سارہ آپی!'' دائم انہیں اپنی مشکل سمجھانے کے ساتھ ساتھ اب باقاعدہ منت سماجت پر اُتر آیا تھا۔

جبکہ وہ خاموش بیٹھا ان دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔ دائم کو اپنے حق میں وکالت کرتے دیکھ کر شرمندہ ہو رہا تھا۔

''اچھا..... ٹھیک ہے۔ یہ انیکسی میں ٹھہر جائے۔ میں رضوان کو بتا دوں گی۔ اور تم بھی اسے کال کر دینا۔'' وہ مان تو گئی تھی، مگر رضوان کا خیال ابھی بھی دامن گیر تھا۔

''سب پتہ ہے مجھے۔ رضوان بھائی نے تو آپ کو کبھی اُف تک بھی نہیں کیا۔'' پچھلے پچیس منٹ سے منت وسماجت کرتا دائم اب ان کے اقرار سے بالکل ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔

''سو تو ہے، اسی لئے تو مجھے ہر کام میں ان کی مرضی کا دھیان رکھنا پڑتا ہے۔'' وہ ذرا اِتراتے ہوئے مسکرا کے بولی۔

''اور ہاں، آپی! آپ کی انیکسی میں تو یسریٰ باجی رہتی ہیں نا۔'' دائم نے معاً کسی کا خیال آنے پر پوچھا۔ دو، تین دفعہ آنے پہ اس کی یسریٰ سے ملاقات ہو چکی تھی۔

''اسے تو ڈھائی تین ماہ کا عرصہ ہوا، چلی گئی۔ اپنا فلیٹ خرید لیا تھا، وہیں شفٹ ہو گئی۔'' سارہ نے بکھرے بالوں کو بینڈ میں جکڑتے ہوئے بتایا۔

''اچھی لڑکی تھی۔'' اس نے سرسری انداز میں کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اکمل کا بیگ پکڑ کر انیکسی کی طرف جا رہا تھا۔ بیگ زمین پہ دھر کے اس نے دروازہ اندر سے تھوڑا سا بند کر دیا۔

''دیکھو اکمل! تم یہاں پہ بالکل محفوظ ہو، پریشان بالکل نہ ہونا۔ میں آؤں گا تو نہیں ڈر ہے کہیں پولیس مجھے ٹریس نہ کر لے۔ مگر فون ضرور کرتا رہوں گا۔ کسی کی بات کا برا نہ منانا۔'' وہ شاید سارہ کی باتوں کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ تسلی دینے کے ساتھ اسے سمجھا بھی گیا۔

''میں..... میں تمہارا شکریہ ادا نہیں کروں گا دائم! کیونکہ جو کچھ تم نے میرے لئے کیا ہے، شکریہ اس کے لئے بہت چھوٹا سا لفظ ہے۔'' اس کی آنکھوں میں تشکر اور لہجے میں ممنونیت تھی۔

''بکواس نہ کر۔ بہت ماروں گا۔'' دائم نے بے اختیار اسے گلے سے لگا لیا۔ دائم کی آنکھوں سے دو قطرے نکل کر اس کے کالر میں جذب ہو گئے۔

''چلتا ہوں، رات ہو رہی ہے۔'' وہ اُس کی طرف دیکھے بغیر تیزی سے باہر نکل گیا۔

''ہاں، رات بہت ہو گئی ہے۔'' اس نے بند دروازے سے پشت ٹکا کر آنکھوں میں رکے ہوئے آنسوؤں کو پیچھے دھکیلا۔



☆☆☆

''السلام علیکم!'' ایک تیس، بتیس سالہ خاتون، دروازہ کھولنے پر سامنے کھڑی تھی۔

''وعلیکم السلام!'' یسریٰ نے حیرانی سے اس خاتون کو دیکھا، جو تھوڑا سا اچکتے ہوئے جھانک رہی تھی۔

''جی فرمائیے، کون ہیں آپ؟'' اس عورت کی حرکت اسے معیوب سی لگی۔

''جی میں، آپ کے ساتھ والے فلیٹ میں رہتی ہوں۔ نازیہ نام ہے میرا۔ اتنا عرصہ ہو گیا، آپ کو یہاں آئے ہوئے، کبھی آپ سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ میں نے سوچا، آپ سے خود ہی مل لیا جائے۔'' اس نے اپنا تعارف کرانے کے ساتھ، آنے کی وجہ بھی بتائی۔

''ایکچوئیلی میں یہاں پہ کسی کو جانتی نہیں ہوں، پھر میں جاب بھی کرتی ہوں۔ بزی رہتی ہوں، وقت ہی نہیں ملتا۔'' اس کا مدعا سن کر اندر آنے کا راستہ دے کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔

''میں جانتی ہوں، آپ جاب کرتی ہیں۔ آپ کے شوہر کیا کرتے ہیں؟ وہ تو کبھی نظر ہی نہیں آئے۔'' اس نے اِدھر اُدھر گھومتی نگاہیں یسریٰ پہ ٹکا کے پوچھا۔

''وہ..... مم..... میرے شوہر..... وہ تو نہیں ہیں۔'' بے ربط سے الفاظ اس کے منہ سے نکلے۔ اس غیر متوقع سوال کے لئے وہ قطعی تیار نہیں تھی۔ اس کے تو وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ اسے اکیلی دیکھ کر لوگ کیا سوچتے ہیں؟

''کیا مطلب؟..... آپ اکیلی ہیں؟ آپ کی شادی نہیں ہوئی؟'' اب حیران ہونے کی باری نازیہ کی تھی۔

''نن..... نہیں، میرا یہ مطلب تو نہیں ہے۔'' اس نے اپنے حواسوں پر قابو پایا۔

''میرے شوہر، فارن میں ہوتے ہیں، اسی لئے میں تنہا رہتی ہوں۔'' بروقت اسے بہانہ سوجھ گیا۔

''اور آپ کی سسرال؟'' درمیانی صوفے پہ بیٹھتے ہوئے اس نے بات کو مزید آگے بڑھایا۔

''میرے شوہر اکلوتے ہیں اور میں بھی۔ کچھ عرصہ پہلے میرے سسر کا انتقال ہو گیا تو میں گھر بیچ کر اس بلڈنگ میں شفٹ ہو گئی۔ میرا خیال ہے، فلیٹ کی زندگی میں زیادہ ڈر، خطرہ نہیں ہوتا اور پھر یہاں سکیورٹی کا انتظام بھی کافی اچھا ہے۔'' وہ خود پہ کافی حد تک

قابو پا چکی تھی، مگر پھر بھی اسے بوکھلاہٹ ہو رہی تھی۔ خود بھی غصہ آ رہا تھا کہ اس عورت کو گھسنے ہی کیوں دیا؟ وہ اب اپنی جگہ سے اُٹھ کر گھوم پھر کے فلیٹ دیکھ رہی تھی۔

''آپ کا فلیٹ تو کافی بہتر حالت میں ہے، لگتا ہے آپ کو گھر سجانے کا بہت شوق ہے۔'' سینٹر ٹیبل پہ پڑے خوبصورت شو پیس کا جائزہ لیتے، وہ عجیب سے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

''جی، آپ بیٹھیں۔ میں آپ کے لئے چائے بناتی ہوں۔'' وہ جانے جاسوس تھی یا یونہی عام عورتوں کی طرح ہر بات سن گن لینے والی تھی، اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

وہ خود کو کوستی ہوئی کچن میں چلی آئی۔ اسے کبھی ہمسائیوں کا تجربہ نہیں رہا تھا اور نہ ہی پتہ تھا کہ اردگرد بسنے والوں کی فطرت کیسی ہوتی ہے؟ انہیں کیسے ہینڈل کرنا چاہئے؟ وہ ابھی چائے کا پانی ہی بوائل کر رہی تھی کہ نازیہ وہیں چلی آئی۔

''میرے شوہر بینک میں جاب کرتے ہیں۔ پہلے میں اپنے سسرال میں رہتی تھی، لیکن میری نندیں بہت ہی فسادن اور جھگڑالو قسم کی ہیں اور دیور نکما نکھٹو، سارا بوجھ میرے شوہر بے چارے کے کاندھوں پہ تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے کبھی مجھے بھابی کا درجہ نہیں دیا۔ میں ان کے لئے محض ایک نوکرانی تھی۔ آئے روز جھگڑے، چخ چخ، حالانکہ میں تو بڑی صلح جُو اور امن پسند طبیعت کی ہوں۔ پھر ایک دن گھر میں زبردست لڑائی ہوئی اور بات ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ بس پھر میں نے فیصلہ کر لیا، رہوں گی تو الگ گھر میں۔ میرے شوہر نے میری ضد پہ یہ فلیٹ خرید لیا۔ اپنے والدین کو بھی خرچہ بھجواتا ہے، مگر کب تک؟ اب تو ہمارے بچے بھی بڑے ہو رہے ہیں، دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے میری۔ آپ کے بچے نہیں ہیں؟''

نازیہ نے نان اسٹاپ اپنے گھریلو حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے اچانک پھر اس کو بیچ میں گھسیٹ لیا تھا۔

یسریٰ کا جی چاہا تھا کہ گرم گرم چائے کو کپ میں انڈیلنے کے بجائے اس امن پسند اور صلح جُو طبیعت کی مالک کے منہ پر ڈال دے۔

☆★☆

وہ پچھلے تین، چار منٹ سے دروازے کی چوکھٹ کے ساتھ ٹیک لگائے اسے دیکھ رہا تھا۔ جو اپنے اردگرد سے بے گانہ، دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے یک ٹک چھت کو گھورے جا رہا تھا۔



''کیا جاگتے میں سونے لگے ہو؟'' اس کی گہری محویت کو دیکھ کر وہ کہے بنا نہ رہ سکا۔

''تم آؤ اندر..... وہاں کیوں کھڑے ہو؟..... کب آئے؟'' وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تم کے لئے جگہ بنائی۔

''کافی دیر سے کھڑا دیکھ رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں، تمہیں بھی میری طرح جاگتے ونے کی عادت پڑ گئی ہے۔'' وہ اس کے برابر آ بیٹھا۔

''میں سو نہیں رہا تھا، بلکہ سوچ رہا تھا۔'' اپنی پیشانی مسلتے ہوئے اس نے سنجیدگی سے ب دیا۔

''اچھا، اتنی گہرائی میں جا کے کیا سوچا جا رہا تھا؟''

''وہ سارہ آپی اور رضوان بھائی، انگلینڈ جا رہے ہیں نا۔ سارے ملازمین بھی چھٹی پہ جائیں گے۔'' وہ مزید کچھ نہ کہہ سکا۔

دائم سنے بغیر ہی جانتا تھا۔ آج سارہ نے اسے یہی بات کرنے کے لئے بلایا تھا۔ وہ اسی سے مل کے آ رہا تھا۔ وہ یہ خبر سن کر بہت پریشان تھا، کیونکہ بہت کوشش کے دابھی تک کوئی محفوظ جگہ نہیں مل سکی تھی۔

''تُو بھی نا بس، ہر وقت روتا دھوتا رہتا ہے۔ اس ڈھائی کنال کے گھر میں تیرے جگہ نہیں تو کیا باقی کی ساری دنیا میں بھی نہیں؟ کبھی اتنا تو ہوتا نہیں تجھ سے کہ میری میں بھی شریک ہو جائے۔ جب ملو، اپنی رام کہانی۔'' دائم نے اس کی فکرمند سی شکل رموضوع بدلنے کے لئے اسے چھیڑا۔ فی الحال وہ اس متعلق نہیں سوچنا چاہتا تھا۔

''اچھا، تجھے کون سی خوشی مل گئی؟'' اس نے بے دلی سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''خوشی تو مجھے چند دن پہلے ملی تھی، اتنی بڑی خوشی کہ مجھ سے سنبھالی نہیں جا رہی۔'' نوابناک سے لہجے میں ایکٹنگ کرتے ہوئے بولا۔ اس کا اشارہ اپنی منگنی کی طرف تھا۔

''ہاں، سنبھلے گی بھی کیسے؟ پانچ فٹ پانچ انچ کی جو ہے۔'' اکمل نے اس کی طرف لربرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

''ہیں، تیرے منہ سے ایسی بات، خیر تو ہے؟'' پہلی دفعہ اس کے منہ سے کسی لڑکی کا لن کر اسے خوشگوار حیرت ہوئی تھی۔ ورنہ اس کا تو کبھی ''امی نامہ'' ہی ختم نہیں ہوتا تھا۔

''کیوں، مجھے ڈاکٹر نے لڑکیوں سے پرہیز بتایا ہے یا لڑکیاں میرے لئے شجرِ ممنوعہ ؟'' دائم کے انداز پہ وہ چڑ کے پوچھنے لگا۔

''نہیں..... نہیں یار!..... یہ تو بڑی خوش اُمید بلکہ خوش آئند بات ہے۔ میں تو خود

چاہتا ہوں کہ تم اب اسی طرح سوچو، کیونکہ تمہارے سارے مسئلوں کا حل بھی اب یہی ہے۔" اس نے بڑے مدبرانہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"کیسا حل؟" اکمل نے ناسمجھی سے استفسار کیا۔

"یار اکمل! تُو نے کبھی سوچا ہے بلکہ کبھی خود کو دیکھا ہے، تو اچھا خاصا خوبرو اور خوش شکل نوجوان ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ تیری شکل سے بیک وقت مسکینی اور یتیمی ٹپکتی ہے۔ مگر لڑکیوں کو ایسے ہی مرد پسند ہوتے ہیں، بدھو اور نمونے سے، تھوڑے تھوڑے بے وقوف سے۔" اکمل نے اپنے متعلق اتنی گوہر افشانیاں سن کر ایک زور کا مُکا اُس کی کمر میں لگا دیا۔

"ہائے ظالم! سچائی بری لگی نا۔ مگر تمہارا اتنا ہیوی ویٹ مُکا کھانے کے بعد دہرا دوں گا نہیں۔" اس نے کراہتے ہوئے کمر سہلائی۔

"مگر آگے تو میری پلاننگ سنو۔" اس نے مزید بات آگے بڑھائی۔

"میرے خیال میں اگر کوئی خوب صورت، چلو بدصورت بھی ہو تو کوئی بات نہیں۔ تو ویسے بھی صابر و شاکر سے بندے ہو۔ امیر، دولت مند، اکلوتی لڑکی تم پہ مرمٹ جائے اور ظالم سماج کی تمام کچی پکی دیواریں گرا کے تم سے شادی کر لے نا تو..... تو میری جان تم سے چھوٹ جائے، میرے بھائی!" آخری جملہ اس نے دونوں ہاتھ اکمل کے سامنے جوڑ کر قدرے اونچی آواز میں کہا۔

"پلاننگ تو تیری ٹھیک ہے، مگر یہ بدصورتی والی بات۔" اکمل نے اسے گھورتے ہوئے بات ادھوری چھوڑی۔

"ہاں، تو اس بدصورتی کو خوش دلی سے قبول کرنے کے بدلے، تم ان کے گھر ساری عمر گھر داماد بن کے رہنا۔ اسی طرح تمہاری جان ان پولیس والوں....."

"دائم!" پکارنے کے ساتھ ہی ایک اور کرارا سا مُکا اس کے بازو میں مار دیا۔

"ہائے، مر گیا۔"

"تیرے جیسا دوست مر ہی جائے تو اچھا ہے۔ تُو مجھے جیل کی چند سال کی سزا دینے بجائے عمر قید کٹوانا چاہتا ہے۔ ایک تو بدصورت لڑکی اور اوپر سے گھر داماد، وہ بھی زندگی بھر کے لئے۔" اس نے چڑتے ہوئے اسے لتاڑا۔

"کمینے انسان! اپنے ان مضبوط ہاتھوں کے مکے کی پریکٹس کبھی اپنی بیوی کی نازک کمر پہ مت کر دینا۔ ریڑھ کی ہڈی کریک ہو گئی تو باقی ماندہ عمر اسے گود میں اُٹھا



ے گا۔" وہ ابھی بھی باز نہیں آیا تھا۔

"دائم! میں کہہ رہا ہوں، باز آجا۔" اس نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے تنبیہ کی۔

"دائم! اب کیا ہوگا؟" وہ یک دم پھر سنجیدہ ہو گیا۔

"تمہارے والد گرامی صاحب، مجھے مارکیٹ میں ملے تھے۔ میں نے یونہی سلام نے کے بعد تمہارا ذکر چھیڑ دیا، تاکہ ان کے خیالات جان سکوں تمہارے متعلق۔ پھر تھا؟ نہ تو انہوں نے میرے سلام کا جواب دیا اور مجھے وہ لعن طعن کی اور تمہارے لئے انیں بھیجی ہیں۔ اب پیچھے رہ گیا....." بات کرتے کرتے وہ یک دم چیخ مار کر اپنی جگہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ وہ جو پوری توجہ سے حالاتِ حاضرہ سن رہا تھا، اس کے یوں نے پر خود بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔

"یہ کیا ہے؟ پکڑے گئے نا۔ میں بھی کہوں، تمہیں اتنی باتیں کیسے بنانی آ گئیں؟" انے ہاتھ میں پکڑا ریشمی سا کپڑا اُس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا

"میں خود نہیں جانتا، یہ کیا ہے۔" اس نے بغور کپڑے کا معائنہ کیا وہ جس دن سے تھا، یہ کپڑا کھونٹی پہ لٹکتا دیکھ رہا تھا، مگر کبھی توجہ نہیں دی تھی۔

"میں بتا دیتا ہوں، یہ اسکارف ہے جو لڑکیاں اوڑھتی ہیں۔ اب یہ بتاؤ کہ یہ کس جین کا ہے؟ اور تمہاری انیکسی میں کیسے آیا؟ جلدی پھوٹو، پھر مجھے رشتہ دینے بھی جانا ہے۔" اس نے اتنی سنجیدگی سے یہ بات کہی کہ چند لمحے وہ ہونقوں کی طرح اسے دیکھتا رہ یا۔

"اب چل نا، اس نشانی دینے والی کی نشاندہی کر۔ مگر دیکھ!" اس کے کھلے ہوئے ہ کے سامنے اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "یہ جو روزانہ لان سے گرے پتے اُٹھانے آتی ہے نا، یہ بڑا سا چولا پہن کر، یہ نہیں ہونی چاہئے۔ کالی سی ہے، تیرے ساتھ جچے گی ہیں۔ البتہ سانولی لڑکی کچھ بہتر لگے گی۔ مگر اس چھنو کا نام بھی مت لینا، جو برتن مانجھنے تی ہے۔ ایسا ہے کہ ماسی رشیداں کی لڑکی جو اس کے ساتھ آتی ہے نا، وہ کافی اچھی ہے۔ بس ایک ہی خرابی ہے اس میں، بیس سال کی ہونے کے باوجود اس کی ناک بہتی ہے، مگر تیری خاطر....."

"دائم! تیری تو....." وہ جو کب سے اسے گھور رہا تھا، اسے نظر انداز کئے مسلسل راٹے بھرتا جا رہا تھا۔ تیزی سے دونوں ہاتھ گلا دبانے والے انداز میں کھولے اس کی رف بڑھا۔

"قسم لے لے، اب کچھ نہیں بولوں گا۔"

دائم نے اپنے بچاؤ کے لئے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ اپنی ہنسی روکتے ہوئے وہ بیڈ پہ خود بھی اس کے برابر بیٹھ گیا۔ مگر اسکارف ابھی بھی اس کے دوسرے ہاتھ میں موجود تھا۔

"میں تو جس دن سے آیا ہوں، اسے وہیں لٹکتے دیکھ رہا ہوں، مجھے نہیں پتہ تھا کہ یہ ریشمی کپڑا کسی لڑکی کا اسکارف ہے۔" اس نے آف وائٹ اور بلیک اسکارف کی طرف اشارہ کر کے بتایا۔

"تھینک گاڈ!" اکمل نے دونوں ہاتھ اٹھا کر شکر ادا کیا۔

"تُو جانتا ہے، ایک دن میں بہت بور ہو رہا تھا۔ میں نے رات کو سوچا، کیوں نہ اس کپڑے کو اچھی طرح لپیٹ کر تھوڑی سی باہر ہوا خوری کر لی جائے، اگر میں کہیں....."

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی دائم کا قہقہہ چھوٹ گیا، چند لمحے تو اسے گھورتا رہا، پھر خود بھی ہنسنے لگا۔

"اسکارف.....لڑکی....." یک دم دائم کی ہنسی کو بریک لگ گئے۔

"لڑکی.....اسکارف.....مل گیا، مل گیا اکمل!" اس نے خوشی سے اکمل کو پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا۔

"قارون کا خزانہ مل گیا؟" دائم سے اپنا آپ چھڑاتے ہوئے وہ ناگواری سے بولا۔

"نہیں، تیرے مسئلے کا حل۔ اسکارف والی، یسریٰ باجی زندہ باد۔" اس نے خوشی سے نعرہ بلند کیا۔

☆☆☆



پورے بیس منٹ لگا کر وہ یسریٰ کو اکمل کی کہانی سنا چکا تھا، جس میں واضح طور پر اس کے بے گناہ ہونے کا تذکرہ بھی بار بار کیا گیا تھا۔ اب وہ اس کا جواب سننے کا منتظر تھا۔ حیرت بلکہ شدید حیرت سے منہ کھولے اسے تکے چلے جا رہی تھی۔

"یسریٰ باجی! کچھ تو کہئے۔" اسے حیرت میں غرق دیکھ کر اس نے متوجہ کرنا چاہا۔

"دائم بھائی! میں مانتی ہوں، آپ کے دوست کے ساتھ یونہی ہوا ہوگا۔ وہ یقیناً بے گناہ ہوگا۔ مگر دائم بھائی....."

سارہ کا بھائی ہونے کے ناتے وہ اس کی بہت عزت کرتی تھی۔ اس کی ملاقات، دائم سارہ کے گھر تین چار دفعہ ہو چکی تھی۔ وہ اس سے بڑا ہونے کے باوجود سارہ کی طرح سے باجی کہہ کر پکارتا تھا۔ اس کے انکیسی میں شفٹ ہونے پہ بھی اس نے کتنا گلہ کیا تھا۔ وہ خود اس سے بات کرنے انکیسی آیا تھا۔ وہ ہر معاملات میں اس کا خلوص دیکھ کر دعا کرتی تھی کہ اگر میرا کوئی بھائی ہوتا تو بالکل ایسا ہی ہوتا۔ مگر اب جو بات وہ اس کے سامنے بیٹھا کر رہا تھا، اس نے یسریٰ کو شش و پنج میں ڈال دیا تھا۔

"سارہ آپی اور رضوان بھائی بھی نہیں ہیں، ورنہ میں ان سے پوچھ لیتی، میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔" اس نے ہاتھ مسلتے ہوئے کہا۔ اس کی ہمسائی نازیہ، باقی کے فلیٹس میں یہ بات پھیلا چکی تھی کہ اس کا شوہر اکلوتا بیٹا ہے اور باہر کے ملک میں جاب کرتا ہے۔ اب اگر ایک نوجوان مرد اس کے گھر آ کر ٹھہرتا تو وہ لوگوں کو کیا جواب دیتی کہ وہ کون ہے؟ پھر وہ کسی غیر مرد کو کس طرح اپنے ساتھ رکھ لیتی؟ پتہ نہیں وہ کیسا تھا؟ ان حال سے تو وہ ہمیشہ بھاگتی آئی تھی۔

"میں نے بتایا نا یسریٰ باجی! میرا دوست کافی عرصہ سارہ آپی کے گھر انکیسی ہی میں رہا۔ اب وہ لوگ جا رہے تھے تو میں نے ایک دوست کے گھر اس کا انتظام کیا تھا، مگر

وہاں پہنچنے سے پہلے ہی پولیس نے چھاپہ مارلیا۔ شکر ہے، وہ بے چارا پکڑا نہیں گیا۔ اب ان کا گھر تو لاک کرنا ہے، وہاں کوئی بھی نہیں ہے۔ اب آپ ہی بتائیں، میں کیا کروں؟"

دائم نے معصومیت کے ساتھ پہلے سے گھڑا ہوا جھوٹ بڑی روانی اور صفائی سے بولا۔ حالانکہ اس نے یہ سب کچھ سوچی سمجھی پلاننگ کے تحت کیا تھا۔ رضوان سے گھر کی چابی اس نے یہ کہہ کر لے لی تھی کہ ان کے جانے کے دو دن بعد اکمل بھی چلا جائے گا، وہ گھر کو لاک کر دے گا۔ جبکہ وہ اچھی طرح سے سوچ چکا تھا کہ اکمل کے لئے یسریٰ کے فلیٹ سے بہتر اور محفوظ جگہ اور کوئی نہیں۔ وہ یسریٰ کو بہن صرف کہتا ہی نہیں، سمجھتا بھی تھا۔ اسے اس بات کا بھی پوری طرح سے خیال تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی اور پھر تنہا ہیں۔ مگر وہ یسریٰ کو بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ اور اکمل کا کردار تو اس کے سامنے کھلی کتاب کے مانند تھا۔ اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ بھی تو نہیں تھا۔

اکمل کو رضامند کرنا ایک الگ مشکل مرحلہ تھا۔ وہ تو یہ سنتے ہی ہتھے سے اُکھڑ گیا کہ وہ اسے تنہا لڑکی کے ساتھ فلیٹ میں رہنے کو کہہ رہا تھا۔

"پاگل ہو گیا ہے۔ میں کہیں اور چلا جاؤں گا؟ تُو میری فکر نہ کر، کسی فٹ پاتھ پہ جاؤں گا۔ اس نے غصہ سے کہا۔

"فٹ پاتھ پہ کیوں؟ جیل میں رہنا نا، باقی تینوں کے ساتھ، جن کے گھر تک پولیس نے ضبط کر لئے ہیں۔ تُو تو پھر مفرور ہے۔ تیری خوب آؤ بھگت کریں گے۔" دائم بھی غصے میں تیز ہوتے ہوئے بولا۔

اتنی مشکل سے یسریٰ کو منایا تھا، اب یہ نخرے کر رہا تھا۔

"یار! میں ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ، جو خود اکیلی رہتی ہے، ہرگز نہیں۔" اس نے قطعی انداز میں کہتے ہوئے صاف انکار کر دیا۔

"تمہیں خود پہ بھروسہ نہیں ہے یا اَن دیکھی لڑکی پہ شک کر رہا ہے۔" دائم نے جان بوجھ کر شک بھرے لہجے میں پوچھا۔

"دائم....." اس نے تڑپ کر دائم کی طرف دیکھا۔

"دائم کو یہ بات نہیں کہنی چاہئے تھی۔" وہ سوچ کے رہ گیا۔

"اس لڑکے کو بھی کوئی شوق نہیں ہے، تجھے اپنے ساتھ رکھنے کا۔ جانتا ہے، کتنی منت وسماجت کے بعد مانی ہے۔ میں اسے اپنی بہن سمجھتا ہوں، اسی لئے اس نے میری بات مان لی ہے۔ ویسے بھی وہ بیوہ ہے۔" اس نے آخری بات آہستگی سے بتائی، جو وہ سا



یسریٰ کے متعلق سن چکا تھا۔

"لیکن دا....."

"تُو نہیں جانتا اکمل! میں تیرے لئے کتنا خوار ہو رہا ہوں۔" دائم نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر اسے کچھ بولنے سے روک دیا۔

"میں نے کتنے ہی دوستوں سے بات کی، سب کنی کترا گئے۔ سب نے مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ آج کل کوئی بھی اپنا گھر حتیٰ کہ بیٹھک بھی کرایہ پہ دیتے وقت پورا ڈیٹا مانگتا ہے۔ تو بتا، میں کیا کروں؟ میں نے بہت سوچ سمجھ کے، تم دونوں پہ بھروسہ کرنے کے بعد ہی یہ بات کہی ہے۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے میرے یار! پھر بھی تُو نہیں مانتا تو میں....."

وہ بے بسی سے بولتے بولتے اپنی بات ادھوری چھوڑ کر قریب پڑی کرسی پہ ڈھے گیا، وہ خاموش، ہونٹ کاٹتا دُھندلی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

"یسریٰ باجی! یہ میرا دوست اکمل ہے۔ اور اکمل! یہ میری بہن یسریٰ ہے۔" دائم نے بیٹھتے ہی ان دونوں کو متعارف کروایا

یسریٰ نے پہلے دائم کو دیکھا اور پھر دائم کے برابر، مگر اپنے بالکل سامنے سر جھکائے سرخ وسپید رنگت والے اونچے لمبے تقریباً پچیس سال کے نوجوان کو۔ اسی لمحے اس کا سرسری معائنہ کرنے کے بعد اسے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا تھا۔ آنے والے کا کوئی حل خاکہ تو اس کے ذہن میں نہیں تھا، مگر وہ جوان ہوگا، یہ بھی خبر نہیں تھی۔

اس نے دروازے سے اندر داخل ہونے، بیٹھ جانے اور تعارف ہونے کے باوجود لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ اسے عجیب سی کوفت اور گھبراہٹ ہو رہی تھی، جبکہ دائم بڑی ہی بے تکلفی کے ساتھ ڈھیلے ڈھالے انداز میں بیٹھا اُس کی خیر خیریت دریافت کرنے کے بعد اِدھر اُدھر کی ہانک رہا تھا۔ جو اس کے جھکے سر کا مشاہدہ کر رہی تھی۔

"یسریٰ باجی! رات بہت ہو رہی ہے۔ یہ نہ ہو، پاپا مجھے گھر سے نکال دیں اور اس کے ساتھ مجھے بھی یہاں شفٹ ہونا پڑ جائے۔ مجھے اجازت دیں۔" دائم مسکراتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔

"میں خود تو نہیں آؤں گا، مگر فون روزانہ کروں گا۔ پریشان مت ہونا۔" دائم نے جانے سے پہلے اسے تسلی دینا ضروری سمجھا، مبادا وہ کہیں اُٹھ کر ساتھ ہی نہ چل دے۔

اسے گھر جانے کی جلدی تھی، اس کی جواباً خاموشی اور اندرونی کشمکش کو نظرانداز کرتا وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

''آپ کھانا کھائیں گے؟'' دروازے بند کرنے کے بعد یسریٰ نے اس کے قریب رُک کر آدابِ میزبانی نبھانے چاہے۔

''نہیں۔'' منہ سے جواب دینے کے بجائے جھکا سر نفی میں ہلایا گیا۔

''چائے یا دودھ؟'' اب کی بار بھی سر نفی میں ہلانے پہ اکتفا کیا گیا۔

دائم نے اسے کل ہی اپنے آنے کی اطلاع دے دی تھی۔ اس نے اپنے فلیٹ کا دوسرا کمرہ اکمل کے لئے سیٹ کر دیا تھا۔ ضرورت کے سامان سے سجا کمرہ کافی صاف ستھرا تھا۔ ایک طائرانہ سی نگاہ ہر چیز پر ڈال کر وہ باہر آ گئی۔

''آپ آ جائیں، یہ سامنے والا کمرہ ہے۔'' اس نے کمرے کی طرف اشارہ کر کے بتایا۔ ''آپ فکرمند مت ہوں۔ اس بلنگ کا سکیورٹی انتظام بہت اچھا ہے۔ حتیٰ کہ پولیس کو بھی آنے کی اجازت نہیں ہے۔ سکیورٹی گارڈز ہر وقت الرٹ رہتے ہیں۔''

اس کی مسلسل خاموشی کو پریشانی سمجھ کر وہ بتانے لگی۔

''جی۔'' دروازہ بند کرتے اس نے رک کر اس کی بات سنی تھی اور وہ اس پر پڑتی نظر کو ہٹا نہ سکا تھا۔ بنا پلک جھپکائے یک ٹک دیکھتا رہا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟'' یسریٰ نے ہلکے سے غصے سے پوچھا۔ کہاں وہ تب سے نظر نہیں اٹھا رہا تھا، اب دیکھنے پہ آیا تو نظر ہٹا نہیں رہا تھا۔

''نہیں۔'' اس نے بوکھلاتے ہوئے زوردار آواز سے دروازہ بند کر دیا۔

''یسریٰ..... باجی..... بیوہ.....'' ذرا سانس بحال ہوتے ہی اسے دائم کے کہے الفاظ یاد آئے۔

''یہ..... یہ تو لڑکی ہے۔ دائم اسے باجی کہہ رہا تھا۔ یہ دائم سے تو کیا، مجھ سے بھی چھوٹی ہے..... اور بیوہ بھی..... بائیس تیئیس سالہ بیوہ۔''

وہ اُلجھ سا گیا۔ اس نے شاید اپنی زندگی میں پہلی بار اتنی کم عمر بیوہ دیکھی تھی۔

دروازے پہ ہوتی دستک پہ اُس نے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے وہی کھڑی تھی۔ چھوٹی سی ٹرے میں دودھ کا گلاس اور پانی لئے۔

''یہ لیجئے۔'' اس کے ہاتھ آگے بڑھانے پہ اس نے ٹیبلٹ ہتھیلی پہ رکھ دی۔

''کھا لیجئے، سکون کی دوا ہے۔ گھبرائیے مت، میں ایک پرائیویٹ ہسپتال میں نرس



''اس کو یونہی دیکھ کر اس نے ٹوکا۔

''گولی نگلنے کے بعد اکمل نے خالی گلاس اسے پکڑا دیا۔

''بیٹھ جائیں اور یہ دودھ بھی پی لیں۔''

''دودھ.....''

دودھ کا گلاس دیکھ کر کئی یادیں اس کے ذہن میں گردش کرنے لگی تھیں۔ اس کی ماں رات کو اپنے تینوں بیٹوں کو دودھ ضرور دیتی تھی۔ سب سے چھوٹا بیٹا کتنے نخرے کرتا سے دودھ ذرا بھی پسند نہیں تھا۔ یہ ہر روز رات کو چبھنے والی آخری سُوئی ہوتی تھی۔ انہوں نے کبھی بھولے سے بھی اسے دودھ نہیں دیا تھا۔ اور آج کوئی اس کے کھڑا اس سے دودھ پینے پہ اصرار کر رہا تھا۔

''آپ کہیں یہ مت سمجھ لیجئے گا کہ میں نرس ہوں تو ہر شخص کی شکل دیکھ کر مجھے اس رہونے کا وہم ستاتا ہے۔ آپ واقعی ذہنی طور پر کافی ڈسٹرب لگ رہے تھے۔'' س پکڑتے ہوئے اس نے اپنے سارے عمل کی وضاحت دی۔

''اب آپ لیٹ جائیں اور اچھی سی نیند سو جائیں۔''

ں کی آخری ہدایات پہ تیزی سے عمل کرتا وہ لیٹ گیا۔

رئی نے مبہم سا مسکرا کر اس کے انداز کو دیکھا۔ ٹرے اٹھا کر، لائٹ آف کر کے وہ آئی۔

☆☆☆

کیا اب آپ کو بائیس توپوں کی سلامی دی جائے، تب ناشتے کی ٹیبل پر آپ کی آوری ہو گی؟'' ایپرن گلے میں باندھے، اسکارف لپیٹے وہ اس کے سر پہ کھڑی وئے پوچھ رہی تھی۔

ا.....'' اس کی خفگی کی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

جی.....'' یسریٰ نے جی کو خاصا لمبا کھینچا۔ ''ایک تو آپ اُٹھے گیارہ بجے ہیں۔ صبح ما آپ کے اُٹھنے کا انتظار کر رہی ہوں۔ میں جلدی ناشتہ کرنے کی عادی ہوں، بھی جانا ہوتا ہے۔ مگر جب گھر میں دوسرا فرد موجود ہو تو کتنا برا لگتا ہے نا، اکیلا بیٹھ نا۔'' وہ کب سے اس کے اٹھنے کا انتظار کر رہی بھی۔ اب وہ اٹھا تھا تو باہر ہی نہیں ا تک آ کر وہ اس کے سر پر پہنچ گئی تھی۔

گھر کا فرد.....'' زیرِ لب دہراتے اکمل نے حیرت سے اس کے خفا خفا سے چہرے

کو دیکھا۔

''صرف دس مرلے کا گھر ہے، ہمارے اپنے بھی تو تین بیٹے ہیں۔''

اس کی ماں اتنے سال گزرنے کے باوجود بھی تین سے چار تک نہ پہنچ سکی اور یہ... یہ لڑکی صرف رات بھر میں ایک سے دو کا فاصلہ طے کر گئی۔

''آپ یونہی گھورتے رہیں گے یا اُٹھ کر چلیں گے بھی؟''

اسے گم صم ہوتا دیکھ کر وہ خاصی اونچی آواز میں بولی۔

''یہ آپ ہر دس سیکنڈ بعد کہاں کھو جاتے ہیں؟'' اس نے سلائس اور جیم رکھتے ہو استفسار کیا۔

''نن.....نہیں تو.....'' وہ سٹپٹا سا گیا۔

''بوکھلاتے بھی ہیں؟'' اس نے پلٹ کر پوچھا۔

''نہیں۔'' اب کی بار وہ خاصا زور دے کر بولا، کہیں وہ اسے تو تلا ہی نہ سمجھ لے۔

''میرے رات سے لگائے گئے اندازے غلط ہیں یا پھر آپ غلط بیانی کر رہے ہیں؟'' انڈوں سے بھری ٹرے سامنے رکھتے بڑی نرمی سے پوچھا گیا

''نہیں، بس کچھ یاد آ جاتا ہے۔'' اس نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

تب ہی اس کی نظر ٹرے پر پڑی، جس میں آملیٹ، بوائل ایگ، ہائف بوائل فرائی ایگ بڑی نفاست سے سجائے گئے تھے۔

''ہیں..... یہ اتنی ورائٹی کیوں؟'' اس کے ہونٹوں کی تراش میں بڑی خوبصورت مسکراہٹ اُبھری۔

''اس لئے کہ مجھے آپ کی پسند ناپسند کا اندازہ نہیں تھا۔ پہلی صبح اچھا نہیں لگا کہ آ سے پوچھوں، کیا کھائیں گے، کیا بناؤں۔''

''اگر آپ کو انڈا بالکل اچھا نہیں لگتا تو بے شک نہ کھائیں۔ میں آئندہ سے دھ رکھوں گی۔ یہ جیم یا بٹر لے لیں۔''

اسے مسلسل انڈوں کا معائنہ کرتے دیکھ کر اس نے بٹر اور جیم آگے کھسکا دیا۔ مگر ا کچھ اور ہی یاد آ رہا تھا۔

اسے فل بوائل انڈا پسند تھا، اس سے چھوٹے تینوں ہاف بوائل کھاتے تھے۔ اگر ماں ہمیشہ اس کے لئے بھی ہاف بوائل کر لیا کرتیں۔ بارہا بتانے اور منع کرنے کے بالآخر اس نے انڈا کھانا ہی چھوڑ دیا مگر انہوں نے اپنی روٹین نہیں بدلی تھی۔



☆★☆

رات کو ہی سارہ آپی اور رضوان بھائی کی کال آ گئی۔ دائم نے انہیں اپنی مجبوری بتا اری بات سچ سچ بتا دی۔ دائم کی کال سننے کے بعد انہوں نے فوراً ایسری کو فون کیا ہوں نے اکمل کے بارے میں اس سے پوچھا تھا، مگر وہ ایک دن اور رات میں اس رے میں کیا رائے دے سکتی تھی؟ مگر پھر بھی وہ اندازاً اسے اچھا ہی لگا تھا۔ رضوان ارہ نے بھی اس کی تعریف ہی کی تھی، جس سے وہ خاصی مطمئن ہو گئی تھی۔ اس کا اسے اگلے دو تین دن میں مل بھی گیا تھا۔ جس جگہ سے وہ آئی تھی، وہاں کھلے عام ردوں کا آنا جانا تھا۔ کسی قسم کی بھی پابندی نہیں تھی۔ اس کا واسطہ ہر طرح کے مرد پڑ چکا تھا اور پھر نسلوں سے اس پیشے میں ہونے کے ناتے مردوں کو پہلی ہی نظر میں لینے کی صلاحیت اس میں بھی پائی جاتی تھی۔ یہ سب اسے وراثت میں ملا تھا۔ ں اور چہرے پڑھنا وہ خوب جانتی تھی۔

☆★☆

اُسے یہاں ٹھہرے چار دن گزر گئے تھے۔ پہلے دن کے بعد اس کا رویہ خاصا بدل یا تھا۔ وہ اس کے ساتھ کافی اچھے انداز میں پیش آتی تھی۔ اس لڑکی کا خلوص اور ت دیکھ کر اسے لگتا تھا، جیسے وہ صدیوں سے ساتھ رہتے آ رہے ہوں۔ اس کے ے پر وہ اسے بچپن سے لے کر اب تک کی اپنی ساری داستان سنا چکا تھا۔ ایک انجان پہ اتنا اعتبار..... وہ خود پر حیران تھا مگر سب سننے کے لئے اس نے کتنا حوصلہ بڑھایا تنی ہمدردی تھی اس کے لہجے میں۔ اس کا اتنا نرم رویہ دیکھ کر اس کی جھجک ختم نہیں تو احد تک کم ضرور ہو گئی تھی۔ پچھلے اتنے عرصے سے جو ایک خوف اعصاب پہ سوار رہتا خود بخود کم ہوتا جا رہا تھا۔

''بس یار! اب اور نہیں۔'' اکمل نے کھانے کی چھوٹی سی مگر بھری ہوئی ٹیبل کو دیکھ کر

''آپ خود کو مہمان سمجھنا چھوڑ دیں۔'' اس نے لاپروا انداز میں کندھے اچکائے۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ مسٹر اکمل! کہ پچھلے چار دن سے آپ کے آنسو پونچھتے پونچھتے میرا سارا لا بھیگ گیا۔ آپ کو تسلی دیتے اور اپنائیت کا احساس دلاتے میری زبان تھک گئی۔ گھر ر کہتے کہتے میرا حلق خشک ہو گیا مگر آپ.....'' اس نے ذرا توقف کیا۔

''شاید گم صم ہی نہیں، بلکہ اچھے خاصے سر پھرے نوجوان بھی ہیں۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی۔

''آپ کی ہر بات بجا، مگر میری گستاخی تو بتا دیجئے۔ کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ کل تک تو آپ مجھے ایک گم صم سا بندہ کہہ رہی تھیں۔ آج آپ نے اپنے طور پر سر پھرے کا بھی اضافہ کر لیا۔ اب کل کلاں آپ وسیع النظری کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے پاگل کہہ کر نکال دیں گی تو میں کس کس کو جواب دوں گا کہ میں ایک معقول سا بندہ ہوں۔'' وہ بھی یسریٰ جیسے لہجے میں بولا۔

''آپ کا ڈر بالکل درست ہے قبلہ! کل پانچواں روز ہے۔ آپ کے حق میں بہتر یہی ہے کہ بلا چوں و چرا میرے ساتھ ایڈجسٹمنٹ کر لیں ورنہ میں واقعی.....''

بات ادھوری چھوڑ کر اپنے تاثرات چھپانے کے لئے اس نے پانی کا گلاس منہ سے لگا لیا مگر وہ دیکھ چکا تھا۔

''ایڈجسٹمنٹ.....ابھی وقت ہی کتنا ہوا ہے؟'' اکمل نے معصومیت سے پوچھا۔

''آپ کو سال چاہئے یا صدیاں؟'' گلاس پٹخ کر وہ تیکھے انداز میں پوچھنے لگی۔

''اچھا، میں سیریس ہوں۔ کہو!'' اس کے گرتے موڈ کو دیکھ کر وہ واقعی سنجیدہ ہو گیا۔

''ہوں.....اب ہم دونوں ایک جگہ مل کر رہتے ہیں۔ ہمیں زندگی کو خوشحال بنانے اور جینے کے لئے کمانا بھی تو پڑے گا نا۔ آخر پیٹ بھی تو پالنا ہے۔ آپ تو مجبوری کے تحت باہر نہیں جا سکتے۔ لہٰذا یہ کام میں سنبھال لوں گی، آپ میرا فرض پورا کر دیا کریں۔ یہ تو تھی تمہید، اب آگے.....''

''کیا یہ اتنی لمبی تمہید تھی؟'' وہ جو اتنے غور سے اُس کی بات سن رہا تھا، چلا اٹھا۔

''جی، اب آگے سنیے، چیخئے بلکہ چیخیں ماریئے گا۔ جب میں اکیلی تھی تو ہر ذمہ داری میرے کاندھے پر تھی، اب آپ بھی آ گئے ہیں تو آدھی ذمہ داری آپ بصد خوشی سنبھال لیجئے۔'' اس نے اطمینان سے اپنی بات پوری کی۔

''کیسی ذمہ داری؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''یہی کہ صبح آپ کو اپنا ناشتہ خود بنانا ہوگا۔ دوپہر کا کھانا بھی گرم کرنا ہوگا۔ ناشتے کے برتن صاف کرنے ہوں گے۔'' وہ جیسے کیسے کام بتاتی جا رہی تھی، اس کا منہ کھلتا جا رہا تھا۔

''شام کی چائے بنانی، ہر سنڈے کو میرے ساتھ کپڑے دھلوانے اور گھر کی تفصیل



بھی آپ کی ذمہ داری میں سے ایک ہوگی۔ باقی رہ گیا شام کا کھانا، وہ میں خود.....''

''نہیں، نہیں محترمہ!.....آپ تھکی ہاری لوٹ کر پھر مشقت کریں گی۔ شام کا کھانا میں پکایا کروں گا اور روٹی بھی میں ڈالوں گا۔ روزانہ آپ کے کپڑے پریس کرنا اور بھی مجھ پر چھوڑ دیں۔ اور ہفتہ وار ذمہ داری سے بھی آپ خود کو بری سمجھیں۔'' اس کو کر اس نے چڑ کر باقی کے کام بھی گنوا دیئے۔

''ریئلی تھینک یو۔ آپ بہت اچھے ہیں۔'' دونوں ہاتھ جوڑ کر وہ بھرپور ممنونیت کی ک کرتے ہوئے بولی۔

☆☆☆

وہ کب سے یسریٰ کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ کبھی بالکنی سے نیچے جھانک کر دیکھتا، فلیٹ کا زہ کھولتا اور سیڑھیوں تک دیکھ کر واپس آ جاتا۔ وہ روزانہ چھ یا سوا چھ بجے تک آ جایا تی تھی، مگر آج ساڑھے آٹھ ہو گئے تھے اور اس کی واپسی کے آثار تک نہیں تھے۔ وہ ال بھی فون کر چکا تھا، وہاں سے وہ معمول کے مطابق نکل چکی تھی۔

اس نے وال کلاک کو دیکھا اور اُٹھ کر بے چینی سے چکر لگانے لگا۔ جب اس کی ری پریشانی حدوں کو چھونے لگی اور خود جا کر اسے ڈھونڈنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ ازے پر مانوس سی دستک ہوئی۔ اس نے پھرتی سے جا کر دروازہ کھولا۔

''کہاں چلی گئی تھیں؟ اتنی دیر کیوں کی؟'' اس کے اندر داخل ہوتے ہی وہ بے تابی ے پوچھنے لگا۔

''جانا کہاں تھا؟ کچھ ضروری شاپنگ کرنے گئی تھی۔ سوچا تھا کہ جلد واپسی ہو جائے مگر وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلا۔''

وہ بھرے ہوئے شاپنگ بیگ صوفے پر دھر کے خود بھی بیٹھ گئی۔

''مگر یسریٰ! تم کم از کم ایک فون تو کر سکتی تھیں۔ جانتی ہو کتنے عجیب عجیب وہم آ ہے تھے مجھے، کتنا پریشان ہو رہا تھا میں۔''

وہ، جو صوفے کی پشت سے ٹیک لگانے جا رہی تھی، حیرت سے اسے یک ٹک دیکھتی گئی۔ پریشانی تو آج تک اس کے لئے کوئی بھی نہیں ہوا تھا۔ یہ لفظ اس نے پہلی دفعہ پنے لئے کسی کے منہ سے سنا تھا۔ کہنے والے کے جذبات اس کی آنکھوں اور چہرے سے ال ہو رہے تھے۔

''تم تھک گئی ہوگی۔ میں.....میں چائے بنا کر لاتا ہوں۔''

اس کی خود پہ جمی ہوئی نگاہوں میں نہ جانے اس نے کیا محسوس کیا تھا کہ سامنے سے ہٹ گیا۔

''فون اس لئے نہیں کیا کہ بیٹری ڈاؤن تھی۔'' تھوڑی دیر بعد وہ کچن کے دروازے میں کھڑی بتا رہی تھی۔

''اچھا سوری، آئندہ سے احتیاط کروں گی۔'' دوسری طرف کافی دیر خاموشی محسوس کرنے کے بعد وہ پھر سے بولی۔

''چائے۔'' اس نے ساسر میں رکھا کپ اس کی طرف بڑھایا۔

''اور تمہاری؟''

''میرا دل نہیں چاہ رہا۔'' نظریں چراتے ہوئے وہ آہستگی سے بولا۔

وہ پچھلے ڈھائی تین گھنٹے سے اس کے لئے اتنا پریشان ہو چکا تھا کہ اب اس کا کچھ بھی کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔

''میرا بھی دل نہیں چاہ رہا۔'' وہ بھی اس کے انداز میں دھیمے سے بولی۔

''چائے پینے کو؟''

''نہیں، تمہارے لئے بنانے کو۔''

یسریٰ نے اس کے ہاتھ سے مگ پکڑ لیا اور اسٹینڈ سے دوسرا کپ اُتار کر اس میں اپنے حصے کی آدھی چائے انڈیل دی۔

''یہ لو۔'' وہ خاموش کھڑا اسے یہ سب کرتا دیکھ رہا تھا، روکا نہیں تھا۔

''تم شام کو زیادہ چائے پیتی ہو۔'' کپ پکڑتے ہوئے اس نے یاد دلایا۔

''ہاں۔ مگر ہمیشہ تمہارے ساتھ۔ اکیلی کبھی نہیں۔''

چائے پیتے وہ شاپنگ بیگز میں بھی جھانکتی جا رہی تھی۔ کچھ چیزیں اس نے نکال کر باہر رکھ دی۔

''یہ دیکھو۔'' اس نے بڑا گھونٹ بھر کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا، جو منہ پھلائے تھوڑا سا رخ موڑے بیٹھا تھا۔

''کیا ہے یہ؟'' اس نے شرٹس، ٹراؤزر اور جینز پہ ایک طائرانہ سی نگاہ دوڑائی اور دوسری اس پر۔

''تمہارے لئے خریداری کی ہے، تمہارے سارے کپڑے پرانے سے ہو رہے تھے۔'' مزید چیزیں پھیلاتے وہ مصروف سی بولی۔



اسے یہ سب کچھ قطعی اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ پہلے ہی گھل مل جانے کے باوجود بھی شرمندہ رنادم سا رہا کرتا تھا۔ اکثر وہ صبح اس کے اُٹھنے سے پہلے ہی جا چکی ہوتی اور شام کو تھکی ہاری تی اور دونوں مل کر کھانا پکاتے۔ اس کا تھکا ہوا چہرہ دیکھ کر وہ خود بھی پژمردہ سا ہو جاتا۔ پنے بوجھ ہونے کا احساس بڑھنے لگتا۔ اس کے پاس جتنی بھی رقم تھی، وہ سیر سپاٹے میں ختم وگئی تھی۔ دائم نے یسریٰ کو کچھ رقم دینی چاہی تو اس نے ناراض ہوتے ہوئے رقم لینے سے ماف انکار کر دیا۔

''مجھے اس سب کی ضرورت نہیں تھی۔'' وہ نادم سا بولا۔

''مجھے لگا کہ تمہیں اس سب کی ضرورت ہے۔''

''تم نے یونہی یہ سب کیا۔ آخر.....''

''میں نے تو چلو یونہی کیا، تم کیوں کرتے ہو؟'' اس نے خفگی سے اس کے انکار کو ٹوک یا تھا۔

''میں کیا کرتا ہوں؟'' وہ حیرت زدہ ہوا۔

''کیوں پریشان ہونے لگتے ہو؟ کیوں میری ذرا سی دیر تمہاری جان کا عذاب بن جاتی ہے۔'' اب اس کے پوچھنے کے انداز میں خفگی نہیں تھی، نہ غصہ اور استفسار۔ مگر ایسا کچھ ضرور تھا کہ اسے جواب دینے کے لئے سوچنا پڑا۔

''اس لئے کہ..... ہم دونوں ساتھ رہتے ہیں، مجھے تمہارا ہی خیال رہتا ہے۔'' وہ اُلجھ سا گیا۔

''یہ سب بھی اس لئے کہ ہم دونوں ساتھ رہتے ہیں اور تمہاری طرح مجھے بھی تمہارا ہی بال رہتا ہے۔''

وہ چیزوں کی طرف اشارہ کرتے اس کا جواب بڑی سہولت سے لوٹا گئی۔

''اچھا چھوڑو، یہ دیکھو تمہیں پسند بھی ہے کہ نہیں۔'' وہ مسکراتے ہوئے بشاش سے لہجے ں اس کا دھیان بٹانے کے لئے شرٹ کھول کر دکھانے لگی۔

''میں سب کچھ بعد میں دیکھوں گا، تم دکھاؤ اپنے لئے کیا خریدا ہے؟'' شرٹس اس کے تھ سے پکڑ کر اس نے ایک طرف رکھ دی۔

''تمہارے لئے شاپنگ کرتے سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی، ویسے بھی اتنی دیر ہو چکی تھی کہ ں جلدی سے صرف دو سوٹ ہی خرید سکی۔ وہ بھی پرنٹ اور کلر پر دھیان دیئے بغیر۔'' وہ سرے دونوں بیگز اُس کے قریب کھسکا کر خود کچن میں کھانے کی تیاری کرنے چلی گئی۔ اس

نے بیگ کو پکڑ کر اُلٹ دیا، جس میں شیونگ کٹ، جینٹس پرفیومز اور اسی طرح کی چھوٹی موٹی ضرورت کی اشیاء تھیں۔

بلا ارادہ ہی وہ کچن کی کھڑکی سے نظر آتے اس کے عکس کو دیکھنے لگا، جو بال سمیٹ کر اب ایپرن باندھ رہی تھی۔

☆★☆

''تو پھر تم دوبئی چلے جاؤ گے۔'' اس نے افسردگی سے کوئی تیسری بار دائم سے پوچھا جو اپنے پاپا کے بزنس کو بیک سپورٹ کرنے کے لئے دوبئی جا رہا تھا اور جانے سے پہلے اس کی شادی کی تاریخ بھی طے کر دی گئی تھی۔

''ہاں یار! بتایا تو ہے۔'' دائم نے اُس کی اُداسی کا نوٹس نہیں لیا تھا۔

''تم نے تو کہا تھا کہ جانے سے انکار کر دو گے۔'' اکمل نے اس کی کہی گئی بات یاد دلائی۔

''میں نے تو انکار کر دیا تھا، جواباً پاپا نے بھی شادی ملتوی ہونے کا اعلان کر دیا۔ یار! اب میں اتنا بڑا رِسک تو نہیں لے سکتا نا۔'' دائم نے جاندار سا قہقہہ لگایا۔

''واپس کب آؤ گے؟''

وہ ابھی پہنچا نہیں تھا اور اسے واپسی کی بھی فکر ستانے لگی تھی۔ دائم کے جانے کی خبر اس کے لئے بہت پریشانی کا باعث بن رہی تھی۔ صرف وہی تو اس کے دکھ درد کا ساتھی، اس پر یقین کرنے والا اور سمجھنے والا تھا۔

''پاپا کا مجھے وہیں سیٹل کروانے کا ارادہ ہے، وہ عروسہ کو بھی ساتھ بھیجیں گے۔'' دائم نے اپنی متوقع وائف کا بھی بتایا۔

''میں تو تمہاری شادی میں نہیں آسکوں گا۔'' اکمل نے بے چارگی سے کہا۔

''کیا دوسروں کی شادیوں کے چھوہارے کھاتے پھر رہے ہو۔ اپنی کیوں نہیں کروا لیتے؟'' دائم کے اکثر مشورے بے موقع اور فضول ہی ہوتے تھے۔

''مجھ جیسے دربدر اور بے روزگار سے کون شادی کرے گی؟'' وہ بے دلی سے مسکرا دیا۔

''چھوڑو بھی، یہ تو وقتی پریشانی ہے۔ پھر تمہیں لڑکیوں کی کمی کیا ہے؟'' اس نے بچوں کی طرح اکمل کو پچکارا۔

''اچھا، اگر تیری کوئی ایکسٹرا سالی ہے نا، اسے میرے لئے راضی کر لے۔ بچی،



خوش رکھوں گا۔'' اس نے شرارت آمیز سنجیدگی سے دائم کو چھیڑا۔

''تُو ہے ہی بے وقوف۔ میری سالی کا خیال تو فٹ سے آ گیا اور جو تیرے قریب اس کا نہ سوچنا۔'' بلا ارادہ ہی اس کے منہ سے نکلا۔

''ارے، یسریٰ باجی.....''

''یسریٰ۔'' اکمل کی آواز سرگوشی میں نکلی۔ ''وہ بہت اچھی لڑکی ہیں اکمل! تم اتنے سے ان کے ساتھ رہ رہے ہو، مجھ سے زیادہ جان گئے ہو گے۔ مگر بیڈ لک یار! بے اتنی بھری جوانی میں بیوہ ہو گئیں۔ یہ کوئی اتنی بڑی بات تو نہیں۔ تم سوچو، ان کے میں یسریٰ سے زیادہ بہتر تمہارے لئے کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ پھر وہ بھی تمہاری ح بے سہارا ہیں، اچھا ہے تم دونوں ایک دوسرے کا سہارا بن جاؤ۔ تم بھی تو.....''

مزید کیا کہہ رہا تھا؟ وہ بالکل نہ سن پایا۔ اپنی منتشر ہوتی سوچوں کے دوران وہ کچھ چنے کی کوشش کر رہا تھا۔

☆★☆

وہ جنرل وارڈ کے مریضوں کا آخری راؤنڈ لے کر اسٹاف روم کی طرف جا رہی تھی کہ اسے نرس کولگ اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ اسے آتا دیکھ کر وہ وہیں ٹھہر گئی۔

''مس یسریٰ! آپ کو سر، آفس میں بلا رہے ہیں۔'' نرس پیغام دے کر آگے بڑھ گئی۔

''مجھے۔'' وہ اسٹاف روم میں جانے کے بجائے کوریڈور میں مڑ گئی۔

ڈاکٹر صلاح الدین اس پرائیویٹ ہسپتال کے اونر تھے۔ رضوان بھائی کے بہت اچھے دوست بھی۔ ان ہی کے توسط سے اسے یہاں نوکری ملی تھی۔ وہ رضوان بھائی کی نسبت سے بڑی شفقت سپیشل آتے تھے۔ اور اگر نرسنگ اسٹاف کو کوئی پرابلم ہوتی تو اکثر یسریٰ کو ہی معاملہ نمٹانے کو کہہ دیتے۔ وہ خصوصاً اس پہ سارے اسٹاف سے زیادہ اعتماد کرتے تھے۔

''مے آئی کم اِن سر؟'' اس نے ادھ کھلے دروازے میں داخل ہو کر اجازت چاہی۔

''جی، جی آیئے مس یسریٰ!'' انہوں نے فائل سے سر اٹھا کر اجازت دی۔

''سر! آپ نے بلوایا تھا؟'' انہیں دوبارہ فائل میں مگن دیکھ کر اس نے چند لمحوں بعد جھجکتے ہوئے یاد دلایا۔

''جی ہاں۔ مگر آپ کھڑی کیوں ہیں؟ بیٹھئے نا۔'' فائل بند کر کے دراز میں ڈال کر وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''مس یسریٰ! کوئی پرابلم تو نہیں؟''

''نو سر، سارے معاملات ٹھیک جا رہے ہیں۔''

''اسٹاف کو کوئی شکایت؟''

''نو سر! ایوری تھنگ اِز او کے۔'' اس طرح کے سوالات وہ اکثر و بیشتر اسے بلا کر پوچھا کرتے تھے۔



''مس یسریٰ! مجھے آپ سے کچھ مشورہ کرنا ہے۔'' انہوں نے ناک کی بھنگ پہ ٹھہری عینک درست کی۔

''مجھ سے سر؟'' یہ بات معمول سے ہٹ کر اور اس کی توقع کے بالکل برعکس تھی۔

''جی آپ سے..... آپ جانتی ہیں کہ میری مسز کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔ بچوں کے لئے آیا اور ملازم کا انتظام بھی ہے، خود میری والدہ بھی ابھی تک انہیں سنبھال لیتی تھیں۔ مگر..... مگر میری والدہ اب بیمار رہنے لگی ہیں۔ میری بڑی بیٹی کی اپنی اسٹڈیز ہے، پھر وہ بھی اتنی باشعور نہیں کہ دادی کو سنبھال سکے۔ پہلے میرے چھوٹے بھائی کی بیوی ان کی کیئر کرتی تھیں، اب وہ بھی ایک پرابلم کی وجہ سے امریکہ سیٹل ہو گئی ہیں۔ ویسے تو ایک فل ٹائم اٹینڈنٹ کا انتظام ہے، مگر آج کل ان کی طبیعت زیادہ ہی ناساز ہے۔ میں چاہتا ہوں ان کے لئے ایک نرس بھی رکھوا دوں، جو نائٹ ڈیوٹی میں ان کو لک آفٹر کرے۔''

''یہ تو اچھی بات ہے سر!'' ان کے ذرا سا توقف کرنے پہ اس نے آہستگی سے کہا جو ان کی ناسمجھ گفتگو سانس روکے سن رہی تھی۔

''اب آپ مجھے مشورہ دیجئے کہ اسٹاف میں کون سی نرس قابل اور ذمہ دار ہے؟ کس کو رکھا جائے جو اپنی ڈیوٹی پوری ایمانداری سے انجام دے۔'' عینک اتار کر صاف کرتے انہوں نے اتنے لمبے چوڑے آغاز کے بعد اصل بات بتائی تھی۔

''نرس۔'' اس نے اپنا رکا ہوا سانس کھینچ کر بحال کیا۔

''آپ کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟'' وہ ابھی غور کر ہی رہی تھی کہ انہوں نے یکدم پوچھ لیا۔

''میں.....'' اس نے اپنی طرف اشارہ کیا۔

''کوئی جلدی نہیں مس یسریٰ!'' اسے شش و پنج میں دیکھ کر وہ بولے۔

''آپ چند دنوں میں سوچ کر جواب دے دیجئے گا، میرے خیال سے تو آپ ہی مناسب ہیں۔ پھر بھی آپ کی کوئی مجبوری ہو تو کوئی بات نہیں۔''

''جی بہتر۔'' وہ ان سے چند دن کا وقت لے کر اٹھ گئی۔

اکمل کے آنے سے اخراجات کافی بڑھ گئے تھے۔ جب وہ اکیلی تھی تو کبھی بھی اپنے کھانے پینے کے لئے اتنا تردد نہیں کرتی تھی۔ صبح دل چاہا تو ہلکا پھلکا ناشتہ کیا، دوپہر میں ہسپتال کی کینٹین سے کھا لیا اور شام کو کبھی زیادہ تھکی ہوئی یا موڈ نہ ہوتا تو کھانا بنانے کے بجائے برگر یا پزا وغیرہ پیک کروا لیتی۔ ہر مہینے بچت کے چند سو سے وہ چیزوں کی خریداری

کر لیتی۔ مگر اب تینوں وقت اچھا خاصا خرچ ہو جاتا تھا۔ اس دوران وہ بینک میں رکھی گئی اپنی تھوڑی سی رقم میں سے بھی پیسے نکلوا چکی تھی۔ پرائیویٹ ہسپتال کی پے منٹ بھی کوئی اتنی زیادہ نہیں تھی کہ پُرتعیش زندگی گزاری جا سکتی۔ دائم نے شروع میں دو تین دفعہ اکمل کا خرچ دینا چاہا مگر اس نے لینے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ خود ایک لمبا عرصہ ان کے گھر رہی تھی۔ اب جبکہ سارہ اور رضوان بھائی بھی اکمل کی حمایت کر چکے تھے تو کچھ لینے کی گنجائش کہاں رہتی تھی؟ لمبے کوریڈور کو عبور کرنے تک وہ فیصلہ کر چکی تھی۔

☆★☆

وہ دونوں قریبی مارکیٹ سے مہینہ بھر کے روشن کی خریداری کر کے بڑے ہلکے پھلکے موڈ میں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے آ رہے تھے۔ اتنا عرصہ اندر رہنے سے اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ کھلی ہوا میں سانس لئے ایک مدت ہو چکی تھی۔ یسریٰ کے ہی اصرار پر وہ قریبی مارکیٹ اور ہر ویک اینڈ پہ اس کے ساتھ پارک میں چلا جایا کرتا تھا۔

''ہیلو یسریٰ! کہاں سے آ رہی ہو؟'' سیڑھیوں سے اُترتی نازیہ نے آنکھوں میں حیرت سے بھرپور چمک لئے اس کے ہمراہ اکمل کو دیکھا۔

''وہ..... ہم قریبی مارکیٹ گئے تھے، راشن لینے۔'' اسے اتنی گہری نظروں سے اکمل کا جائزہ لیتا دیکھ کر یسریٰ کا سر چکرا گیا۔

پہلے بھی ساری بلڈنگ میں اس کے شوہر کی باہر کے ملک میں جاب اور تنہا رہنے کی داستان، نازیہ نے ہی پھیلائی تھی۔ کئی دفعہ ملنے ملانے پر وہ اتنا جان چکی تھی کہ وہ بات کا بتنگڑ بنانے اور مرچ مسالا لگانے میں ماہر عورت ہے۔

''آپ کہاں؟'' اس نے بھی زبردستی مسکراتے ہوئے پوچھ لیا۔

''میں بچوں کی شاپنگ کرنے جا رہی تھی۔ تمہارے بھائی جان تو فارغ نہیں ہوتے۔ میں نے سوچا، آج خود ہی چکر لگایا جائے۔ بچے بھی بہت ضد کر رہے تھے۔'' اس نے اپنی تیاری کی تفصیل بتائی۔

''یسریٰ! بھائی جان باہر سے واپس بھی آ گئے، مگر تم نے بتایا ہی نہیں۔ اب آپ دونوں ضرور ہمارے گھر آنا۔'' ہمیشہ بنا سوچے سمجھے بولنے والی نازیہ نے حد ہی کر دی۔

جانے اسے اپنے اندازوں کے درست ہونے پہ اتنا پختہ یقین کیوں ہوتا تھا؟ یسریٰ نے ہر بار ملنے پہ یہ بات محسوس کی تھی کہ وہ زیادہ تر قیاس آرائیاں ہی کرتی تھی۔ چاہے وہ سسرال کے متعلق ہوں، شوہر یا پھر اہلِ محلّہ کے خلاف۔



خاموش سا کھڑا ان کی گفتگو سنتا اکمل بھی یکدم گڑبڑا گیا۔ زیادہ وزن کی وجہ سے بڑا جو وہ بے دھیانی میں نیچے رکھ چکا تھا، برجستگی سے دوبارہ اٹھا لیا۔

''مم..... مگر نازیہ!..... یہ میرے.....'' شاید وہ اس کی تصحیح کرنا چاہتی تھی، مگر ہکلا رہ گئی۔

''ویسے دعوت تو آپ کو دینی چاہئے بھائی جان! آپ بتائیں، یسریٰ کو لے کر کب ں گے؟ اسے تو اتنا عرصہ ہو گیا ہے یہاں آئے ہوئے۔ میں کتنی ہی دفعہ آپ کی ۔ آ چکی ہوں۔ مگر یہ لاکھ کہنے کے باوجود ایک دفعہ بھی نہیں آئی۔ اب آپ ہی اسے ہ لائیے گا۔'' وہ بڑے خلوص سے مسکراتے ہوئے دعوت نامہ دے رہی تھی۔ جبکہ ان ں کے منہ سے ہاں کا لفظ تک نہ نکل پا رہا تھا۔

یسریٰ نے دل ہی دل میں اپنی بری قسمت کو کوسا۔ وہ لاکھ اس عورت سے پیچھا انے کی کوشش کرتی، مگر وہ مزید چپکے جاتی۔

''جی..... ضرور آئیں گے۔'' یسریٰ کا رنگ بدلتا چہرہ دیکھ کر اکمل نے جان چھڑانے لئے اقرار کر دیا۔

''جی، اوہ ہو۔'' اس نے اثبات میں سر ہلاتے اپنے ماتھے پہ افسوس کے انداز میں ر مارا۔ ''آپ لوگوں کے پاس اتنے بھاری شاپر ہیں اور میں آپ کو روکے کھڑی ں۔ ایسی بھی کیا جلدی؟ دعوت تو گھر آ کر بھی دی جا سکتی ہے۔ آپ کون سا ابھی واپس ، جائیں گے۔ اور پھر میں کون سا دُور ہوں۔ سامنے والا فلیٹ میرا ہی ہے۔'' اپنی غلطی احساس ہونے کے باوجود اس نے مختصر سی بات کو بھی اچھا خاصا لمبا کیا۔

''تو پھر ہمیں اجازت دیں۔'' یسریٰ کے خاموش، سپاٹ تاثرات دیکھ کر اس نے ری سے اجازت مانگ لی، معاً وہ اپنے بھلکڑ پن میں کوئی نئی بات نہ شروع کر دے۔

''عجیب لیچڑ عورت ہے۔ جتنا اس سے بچنا چاہوں، اتنا ہی چپکتی ہے۔ اس کی رٹ ہابی دوسروں کی خیر خبر رکھنا ہے۔ اندازے دیکھو۔ اور ان پہ اتنا یقین ہے کہ منے والا خود کو ہی جھوٹ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔'' وہ سامان رکھنے تک مسلسل بڑبڑا تی تھی۔

''میں تو ان محترمہ سے پہلے کبھی نہیں ملا۔ تمہاری جاننے والی تھیں تو سچ بتا دیتیں۔'' سے یوں کھولتا دکھ کر وہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔

''میں نے تو اسے فرضی کہانی سنائی تھی کہ میرے شوہر بیرونِ ملک مقیم ہیں۔ اب اگر

میں یہ کہہ دیتی کہ تم میرے شوہر نہیں بلکہ نامحرم ہو اور میرے ساتھ ایک عرصہ سے رہ رہے ہو تو کیا کیا باتیں بناتی؟ کون ہماری پاکیزگی پہ اعتبار کرتا؟ ذلت اور رسوائی الگ۔"

نازیہ کی باتوں سے وہ سیخ پا ہو رہی تھی۔ اس پہ مستزاد اکمل کی بات اسے جلا گئی۔ دال ڈبے میں ڈال کر وہ پلٹی۔ اکمل وہاں نہیں تھا۔

"یہ کہاں گیا؟" وہ سب کچھ چھوڑ کر باہر آ گئی۔

☆★☆

اگلے کئی دن وہ عجیب پریشانی، اُلجھن اور کوفت میں مبتلا رہا۔ کسی کام میں بھی اس کا دل نہ لگتا۔ وہ اکثر یسریٰ کے چلے جانے کے بعد ہی اٹھا کرتا تھا۔ وہ ڈپلی کیٹ چابی سے دروازے کو لاک کر کے چلی جاتی۔ وہ اپنی مرضی سے اُٹھتا، کھاتا پیتا، ٹی وی وغیرہ دیکھتا، چھوٹے موٹے کام کرتا، کبھی کوئی بُک اٹھا کر پڑھ لی یا پھر بالکنی میں جا کر کھڑا رہا۔ مگر اسے بوریت کا احساس کبھی بھی نہیں ہوا تھا۔ اب وہ عجیب بے چینی کا شکار تھا۔ رات کو لیٹتا تو دائم کی آواز اپنے اردگرد سنائی دیتی۔

"تم سوچو اس کے بارے میں۔ یسریٰ سے بہتر تمہارے لئے کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی۔ پھر وہ بھی تمہاری طرح بے سہارا ہے۔ اچھا ہے، تم دنوں ایک دوسرے کا سہارا بن جاؤ۔" وہ چھٹکارا پانے کے لئے کروٹ بدلتا تو یسریٰ سامنے آ کھڑی ہوتی۔ ذلت و رسوائی کے ڈر سے لوگوں سے جھوٹ بولتی، پردے رکھتی۔ تنہا بے چاری۔

لامتناہی سوچیں تھیں۔ بہت سے سوال تھے، بغیر جواب کے۔

دائم بھی دُبئی چلا گیا تھا، ورنہ وہ اس سے کچھ مشاورت کر لیتا۔ وہ یسریٰ کے بارے میں اس انداز میں بالکل نہیں سوچنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے پاس رہ رہا تھا، اس کا دیا کھاتا تھا۔ اس کا ضمیر بالکل گوارا نہیں کر رہا تھا کہ وہ اس کے لئے اپنے جذبات میں تبدیلی محسوس کر لے۔ چاہے یہ تبدیلی مثبت ہی کیوں نہ ہو۔ مگر دل بھی کسی ضدی بگڑے ہوئے بچے کی طرح اڑ گیا۔ اپنے بدلتے محسوسات اور جذبات کو بار بار رد کرنے کے باوجود وہ شروع دن کی طرح پھر سے جھجکنے لگا تھا۔ کوشش کرتا، جہاں وہ ہو، وہاں سے ہٹ جائے۔ اس کی بہت ساری باتوں کے جواب میں سر جھکائے ہوں، ہاں میں جواب دیئے جاتا۔ اب تو وہ اس کی طرف دیکھنے سے بھی گریز کرنے لگا تھا۔ اسے اپنا آپ گنہگار سا لگنے لگا تھا۔ خود کو لاکھ سرزنش اور منع کر کر کے وہ ہار چکا تھا۔ اس کی بدلتی کیفیت کو یسریٰ نے بھی نوٹ کر لیا تھا۔



"ناراض ہو مجھ سے؟" اس نے چائے کا کپ پکڑاتے ہوئے استفسار کیا۔

"نن..... نہیں تو۔" وہ اسے ٹی وی دیکھتا چھوڑ کر بالکنی میں آ گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ئے لئے وہ وہیں آ گئی۔

"گھر والے یاد آتے ہیں؟"

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلا کر گرین چائے کا کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔

"دائم کے جانے سے خود کو تنہا محسوس کر رہے ہو؟" وہ ایک کے بعد ایک سوال تی جا رہی تھی۔ شاید اس نے بھی اُگلوانے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اس دفعہ اس نے کوئی ب دینے کے بجائے خاموشی اختیار کئے رکھی۔

"اتنی محبت کرتے ہو دائم سے، اتنا تو کوئی اپنے محبوب کی یاد میں بھی نہیں تڑپتا۔" ی کی خاموشی سے وہ یہی سمجھ سکی کہ وہ دائم کی وجہ سے اُداس ہے۔

وہ بالکل سیدھا رخ کئے چائے کے چھوٹے چھوٹے سِپ لے رہا تھا۔ جی چاہا کہ ی کی طرف دیکھے اور بتائے کہ وہ دائم کے لئے نہیں تڑپ رہا۔ آج کل تو وہ اس کی ف دیکھنا بھی نظروں کی گستاخی سمجھتا تھا۔ اسے اپنی یک طرفہ سی کیفیت جسے وہ محبت کا نہ دینے سے ڈرتا تھا، خیانت سی لگتی۔

"ایسی بھی کیا بے چینی؟ لیٹ نائٹ بغیر ساؤنڈ کے ٹی وی دیکھتے رہتے ہو۔ اگر ب پڑھ رہے ہو تو دھیان کہیں اور ہوتا ہے۔ یونہی ورق پلٹتے جاتے ہو۔ شیو دیکھو کتنی عالی ہے، چہرہ صدیوں کا بیمار لگ رہا ہے۔ پچھلے دو دن سے تم ناشتہ نہیں کر رہے، ت بھر سوتے نہیں۔ کبھی صوفے پہ اوندھے منہ، کبھی بالکنی پہ۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟" وہ ت کر بولی۔

"کہو تو دائم سے بات کرواؤں؟" ذرا توقف کے بعد اس نے پوچھا۔ اس کی پچھلے ں سے کی جانے والی حرکتیں دہرانے کے بعد اس نے کہا۔

"یسریٰ! تم نے کبھی خواب دیکھے ہیں؟" چپ کا قفل کتنے غیر متوقع سوال سے ٹوٹا ۔

"تم خواب دیکھنے لگے ہو؟" اس کی آنکھوں اور لہجے سے خوف عیاں تھا۔ اس ت سے تو وہ کئی سالوں سے گزر رہی تھی، بھلا وہ کیسے آشنا نہ ہوتی۔

"ہاں....." اس نے مبہم سے انداز میں سر ہلایا۔ "مجھے کچھ کچھ اندازہ تھا، جاگتے ا بھی خواب دیکھتے ہو۔" اسے بغور دیکھتے ہوئے وہ پوری سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی، جو

ساکت سا کھڑا تھا۔

''خواب چاہے جاگتے میں دیکھے جائیں یا سوتے میں، ان کی تعبیر ہر انسان کی اوّلین خواہش ہوتی ہے۔'' اس کا لہجہ کافی گہرا اور دھیما سا ہو گیا۔

اور وہ اس کی آنکھوں کے پرے پلتے خوابوں کو جانچنے کی سعی کر رہی تھی۔ اس کی بے قراری کی جڑ کو تلاش کرنا چاہتی تھی۔

''یسریٰ! تعبیر کیسے ملتی ہے؟'' گھروندے کی خواہش تو تھی مگر ریت ابھی اتنی نہیں تھی۔

''استقامت، مسلسل جدوجہد اور قربانیوں سے، بہت کچھ کھو کر، دے کے۔ حتیٰ کہ کبھی کبھار زندگی بھی۔ اُمید پہ یقین، عقیدے کی حد تک ہونا چاہئے۔'' کئی سال لگا کر سیکھنے والا سبق وہ کتنی آسانی سے اسے ازبر کروا رہی تھی۔

''استقامت اور مسلسل جدوجہد تک تو انسان ڈٹا رہ سکتا ہے، مگر قربانی۔''

''کچھ زیادہ کی نہیں، صرف اپنی انا، ضد، خود پسندی اور نفس کے ڈھیٹ پن کو مار پڑتا ہے۔ بس اندر جھگڑا نہیں ہونا چاہئے، سمت متعین ہونی چاہئے۔''

''تم کیا خواب دیکھتی ہو؟'' اس کے سبق کو اچھی طرح ذہن نشین کرتے اس نے پوچھا۔

''ابھی نہیں..... تم بتاؤ، کیا خواب ہے؟'' وہ ہولے سے مسکرا کر اسے ٹال گئی۔

''مجھے..... مجھے۔'' وہ اپنے چہرے کے سیدھے رخ کو ایڑیوں کے بل گھوم کر اس کی طرف مڑا۔ مقابل والی حرکتیں دہرانے کے بعد اس نے کہا۔

''یسریٰ! تم نے کبھی خواب دیکھے ہیں؟'' چپ کا قفل کتنے غیر متوقع سوال سے تھا۔

''تم خواب دیکھنے لگے ہو۔'' اس کی آنکھوں اور لہجے سے خوف عیاں تھا۔ اذیت سے تو وہ کئی سالوں سے گزر رہی تھی، بھلا وہ کیسے آشنا نہ ہوتی۔

''ہاں..... کیا تمہیں.....؟'' اس نے گھبرا کر استفسار کیا۔ وہ اس کے اتنا قریب کھڑا تھا کہ اس کے سانسوں کی گرم تپش اس کے ناک اور ہونٹوں سے ٹکرا رہی تھی۔

''مجھے اِک گھر بنانا ہے۔'' اس کے ہاتھ سے خالی کپ لئے وہ اسے ساکت وصامت چھوڑ گیا تھا۔

مجسمہ بنی یسریٰ کو شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ وہ اس کے ہاتھ سے صرف



نہیں بلکہ برسوں سے پرورش پاتے اس کے خواب کو بھی لے گیا ہے۔

☆☆☆

''مجھے اک گھر بنانا ہے۔'' ضبطِ جذبات سے بھاری ہوتی آواز، رات کے آخری پہر اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھی۔

''مجھے بھی اک گھر بنانا ہے، مگر تم..... تم کیونکر جان گئے اکمل!'' اس نے اپنی آنکھوں سے نکلتے گرم سیال مادے کو سختی سے رگڑ ڈالا۔

وہ آج بہت عرصے بعد رو رہی تھی۔ مگر عجیب بات یہ تھی کہ وہ وجہ نہیں جانتی تھی یا پھر جانتے ہوئے بھی نظریں چرا رہی تھیں۔ بالکل ویسے ہی جیسے اکمل کتنا جا رہا تھا۔

اس نے اپنی زندگی کے بائیس سال کوٹھے پر گزارے تھے۔ ہر رنگ، روپ، چہرے، مختلف فطرتیں، مردوں کے چہرے اور آنکھیں پڑھنے میں اسے کمال حاصل تھا۔ مرد کی چال اور چہرہ دیکھ کر بتا سکتی تھی کہ اس کا تعلق کس جبلت سے ہے؟ طوائف کے پاؤں میں گھنگھرو، اس کی کم عمری میں کھڑا ہونے پہ باندھے جاتے ہیں۔ مگر مرد کی فطرت سے شناسائی گھٹی میں ڈال کر پلا دی جاتی ہے۔ طوائف کے گھنگھرو کی جھنکار کا تعلق طبلے اور گیت کے سُر، تال اور لے سے نہیں بلکہ تماش بین کی آنکھوں کی چمک اور چہرے کے اتار چڑھاؤ سے ہوتا ہے۔ گھنگھرو کی چھن چھن، تماشائی کے جسم کی بدلتی حرکتوں سے شور پکڑنے لگتی ہے۔ کوٹھے کا رخ کرنے والے وہ شریف مردوں کو بھی جانتی تھی۔ گو کہ اس کا واسطہ اس پیشے سے نہیں پڑا تھا۔ مگر وہ بچپن میں ماں اور نانی اور لڑکپن اور جوانی میں بہنوں کو دیکھ چکی تھی۔ وہاں آنے والا شریف مرد ان کو عادتاً نہیں، کسی فطرتاً بھی شریف ہی کہا جا سکتا ہے جو نہ صرف عیاشی کے لئے نفس کو اضافی تسکین دیتے ہیں، جنہیں طوائف کی آغوش میں بھی اپنے ہونٹوں، آنکھوں اور ہاتھوں پہ ضبط ہے۔

جو نفس کی بھوک صرف ایک حد تک مٹاتے ہیں، اس سے آگے وہ ثواب اور گناہ کے پل اُلجھے رہتے ہیں۔ عورت کو سامنے پا کر نظریں نیچے کئے رکھنے والے مرد۔ مگر ان کے فعل سے یہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ وہ عورت کو تنہا اور کوئی سنہری موقع پا کر بھی نگاہ کر نہیں دیکھیں گے۔ ایسے مرد بہت سخت قسم کے ہوتے ہیں جو ہمیشہ نظر چرا کے جاتے ہیں اور ان کو موقع کی تلاش بھی عام لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے۔

مگر اکمل..... اکمل کو دیکھ کر اس کے لاشعور نے وارن کیا تھا کہ یہ سب سے انوکھی

اور نئی قسم کا مرد ہے، جس سے تمہارا واسطہ آج تک نہیں پڑا۔ ہوس سے پاک، شفاف کی آنکھیں، جن میں زیادہ دیر دیکھنا محال تھا۔ جو جھک جاتیں تو لگتا، زمین میں ہی گڑ گئی ہیں۔ چوڑی پیشانی بلند کردار کی گواہی دیتی، گفتگو میں شائستگی کی ایک خاص جھلک۔ وہ ہمیشہ اس سے ایک خاص فاصلے پہ بیٹھتا۔ کچھ نہ چھپاتے ہوئے بھی بہت سے راز رکھتا۔

چند دن پہلے اس کے بدلے بدلے تاثرات کو اس نے اپنا وہم سمجھ کر ٹالنا چاہا تھا۔ اس کی بے دار حس، جس ہونی کی طرف اشارہ کر رہی تھی، وہ اس طرف دھیان دینے سے کترا رہی تھی۔ مگر آج وہ اپنی بے خیالی اور کم عقلی میں اس کے وہم کو یقین میں بدل گیا تھا۔ ایسے شخص کے ساتھ کی خواہش تو اسے برسوں سے تھی۔ اکمل..... ہاں اکمل، یاں آ کر جب وہ اندر اسے پگھلنا چاہتی تھی تو اس کا اپنے ہی ہاتھوں سے دفن کیا ہوا ماضی بھرپور انگڑائی لے کر جاگ جاتا۔

''یہ سب نہیں ہونا چاہئے۔'' گہری سیاہ رات میں اس کی آنسوؤں بھری آواز اُبھرتی۔

☆☆☆

اگلے چند دنوں میں اس نے ڈاکٹر صلاح الدین کو جاب کے لئے ہاں کر دی تھی۔ اب وہ رات کو ان کی مدر کو لک آفٹر کرتی، دن میں ہسپتال کی ڈے شفٹ انجام دیتی۔ رات کو دس بجے اسے ڈاکٹر کے گھر سے گاڑی لینے آتی، صبح چھ بجے واپس چھوڑ جاتی۔ اسی طرح وہ صبح کے دس بجے ہسپتال جاتی اور شام کو وقت سے گھنٹہ بھر پہلے چار بجے لوٹ آتی۔ ڈاکٹر صلاح الدین نے اس کی سہولت کے مدنظر ٹائمنگ سیٹ کی تھی۔

اکمل نے نئی شفٹ کے بارے میں پوچھا تھا، مگر وہ نہیں چاہتی تھی کہ اسے اپنا آپ بوجھ محسوس ہو یا وہ احساسِ شرمندگی میں مبتلا ہو۔ اسی لئے جھوٹ بول گئی کہ کرائسس کی وجہ سے کچھ نرسنگ اسٹاف معطل کر دیا گیا ہے اور وہ ڈبل ٹائم ڈیوٹی دے رہی ہے۔ نہیں، وہ مطمئن ہوا تھا یا نہیں، مگر اس نے دوبارہ اس سے متعلق کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ اسے ہر روز رات کو جانے سے پہلے ڈھیروں نصیحتیں کرتا، اس کی ٹف ٹائمنگ کی وجہ سے وہ اس کی ضروریات کا خیال پہلے سے زیادہ رکھنے لگا تھا۔

یسریٰ کو گزرنے دنوں میں جو اس کے بدلتے رویے سے تشویش لاحق تھی، اس نارمل ری ایکٹ کرنے سے ختم ہوتی جا رہی تھی۔

''آج ہسپتال نہیں جانا؟'' اسے دس بجے کے قریب بھی گھریلو کپڑوں میں دیکھ اس نے پوچھا۔



''نہیں..... موڈ نہیں ہو رہا۔'' صوفے میں دھنستے اس نے لاپروا انداز اپنایا۔

''بہت تھک گئی ہو؟'' اسے کندھے اور گردن دباتے دیکھ کر اس نے پوچھا۔

''ہوں۔ مگر چھٹی اس وجہ سے نہیں کر رہی۔'' اسے اپنے لئے فکرمند سا دیکھ کر وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''پھر؟''

''پھر یہ کہ آج صبح واپسی پہ مجھ نائٹ شفٹ کی پے منٹ ملی ہے، پیسے دیکھتے ہی میرا موڈ بدل گیا ہے۔''

''تمہارے سر کیا سوچیں گے؟ عجیب لڑکی ہے، رقم ملتے ہی رفو چکر ہو گئی۔'' اس توجیہ پہ بھی وہ مسکرا دیا۔

''دوسروں کی چھوڑو، آج ہم اپنا سوچتے ہیں۔''

''ہم..... اپنا کیا سوچیں؟'' وہ گڑبڑا سا گیا۔

''میرا مطلب، کچھ اضافی پیسے ہیں۔ عیش کرتے ہیں۔ ایسا کرتے ہیں، کسی اچھے ریسٹورنٹ میں کھانا کھاتے ہیں، بعد میں ڈھیر ساری شاپنگ کریں گے۔'' اس نے مائمنٹ سے پلاننگ بتائی۔

ڈاکٹر صلاح الدین نے اس سے پے منٹ طے نہیں کی تھی اور اسے بھی پوچھنا سب نہیں لگا تھا۔ مگر وہ ڈاکٹر صلاح الدین کو اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ ایک اصول انسان ہیں، ناانصافی نہیں کریں گے۔ آج انہوں نے اسے پھولا ہوا خاکی لفافہ دیا اس کی توقعات کے بالکل برعکس۔ اپنے خوشگوار موڈ میں وہ یہ بھی بھول گئی تھی کہ وہ ف قریبی مارکیٹ اور کبھی کبھار ویک اینڈ پہ رات کو قریبی پارک تک ہی جایا کرتا ہے۔

''میں..... تمہارے ساتھ باہر نہیں جا سکتا۔'' وہ بے بس سی لاچارگی سے بولا۔ اس تینوں کولیگز ابھی تک حراست میں تھے، یقیناً اس کی تلاش بھی جاری تھی۔ یہی خوف ہر کام سے روکتا تھا۔

''تو کوئی بات نہیں۔ ہم یہ سب کچھ اندر رہ کر بھی سیلیبریٹ کر سکتے ہیں۔ پہلے ری اشیاء خرید کے لاتے ہیں، پھر مل کر کھانا بنائیں گے، بعد میں مووی دیکھیں گے شام کو پارک میں جائیں گے اور..... ہاں آئس کریم بھی کھائیں گے۔ ٹھیک ہے نا؟'' ما پہ چھائی پژمردگی دیکھ کر اسے بچوں کے انداز میں پکارتے اس نے پروگرام تیزی سے بدل دیا۔

☆★☆

''السلام علیکم بھائی جان!'' دروازہ کھلتے ہی نازیہ نے اسے سلام جھاڑ دیا۔

''وعلیکم السلام!'' اسے ذہن پہ زور دینے سے یاد آیا، یہ وہی عورت ہے جو اس دن سیڑھیوں کے نیچے ملی تھی اور انہیں اپنے ہاں آنے کی دعوت دے رہی تھی۔

''وہ یسریٰ تو گھر پہ نہیں ہے۔'' اسے اپنے پیچھے دیدے گھما گھما کر جائزہ لیتا دیکھ کر اکمل نے جلدی سے بتایا۔

''اچھا ہے کہ نہیں ہے۔ میں تو ویسے بھی آپ سے ضروری بات کرنے آئی ہوں۔''

نازیہ کی اندر آنے کی کوشش پہ وہ سائیڈ پر ہو گیا۔ نازیہ کی اکیلے اس کے ساتھ اندر آنے والی حرکت اسے بہت بری لگی تھی۔ بات تو وہ باہر سے بھی کر سکتی تھی۔ دوسرے فلیٹ کی تو کوئی عورت کبھی نہیں آئی تھی، پھر یسریٰ سے وہ اس عورت کے کافی قصیدے سن چکا تھا اسی لئے دروازہ ادھ کھلا چھوڑ دیا۔ اسے الجھن ہو رہی تھی اور وہ بالکل گھبرائے یا جھجکے بغیر اِدھر اُدھر تانکا جھانکی کر رہی تھی، جیسے وہ کوئی ممنوعہ چیز ڈھونڈنے آئی ہو۔

''جی، آپ نے کچھ کہنا تھا؟'' اکمل نے نرمی سے اسے یقین دلایا کہ وہ کسی کام سے آئی ہے۔

''ہاں، میں یہ کہنے آئی تھی۔'' وہ گھوم کر سیدھی اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ''آپ جانتے ہیں کہ ساری بلڈنگ والے کیا کہہ رہے ہیں؟'' اس نے کافی رازدارانہ آواز میں آگے جھک کر پوچھا۔

''نہیں.... ہمیں کیا ضرورت ہے کہ دوسروں کی سن گن لیتے پھریں؟'' نازیہ کی بات اور انداز دونوں اسے بہت کھٹکے تھے۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ کوئی نیا شوشا چھوڑنے آئی ہے۔

''مگر بات جب اپنے گریبان تک پہنچنے لگے تو کان دھرنے پڑتے ہیں۔''

''آپ کو جو کہنا ہے، ذرا جلدی کہئے۔ مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔'' نازیہ کی ذومعنی سی بات نے اس کے ماتھے پہ ناگواری تیوری ڈال دی۔

''دیکھئے، آپ میری باتوں کا برا نہ مانئے گا۔ میں آپ کی صرف ہمسائی ہی نہیں، خیر خواہ بھی ہوں۔ مگر لوگوں کا کیا ہے؟ ان کا منہ تو نہیں پکڑا جا سکتا نا۔ اب بھلا ان کو....''

''کیا کہہ رہے ہیں لوگ؟ پلیز سیدھی طرح بتائیے۔'' اکمل کے لہجے سے نرمی بھی غائب ہو گئی۔ اس کی طولانی اور باتونی عادت سے تو وہ واقف ہو چکا تھا، اسی لئے اسے ٹوک کر سیدھی لائن پر آنے کو کہا۔



اس کے تجسس بھرے جملے اس کے اندر شور سا مچا رہے تھے۔

''سب جانتے ہیں کہ آپ یسریٰ کے شوہر ہیں، بیرونِ ملک سے آئے ہیں۔ پہلے تو ریٰ دن کے وقت جاب کرتی تھی، چلو تب کی بات اور تھی۔ اور اب آپ کے واپس نے کے باوجود وہ رات کو بھی غیر مرد کے ساتھ لمبی لمبی گاڑیوں میں جانے لگی ہے۔ پ اس کے شوہر ہیں۔ منع کریں۔ لوگ کیسی کیسی.....''

''دیکھئے محترمہ!'' اس نے تیزی سے اسے مزید گوہر افشانی کرنے سے ٹوکا۔ ''آپ ب عورت ہیں، اسی ناتے میرے لئے قابلِ احترام ہیں۔ میں نے آپ کا لحاظ کیا ہے، نہ جتنی گھٹیا بات کی طرف آپ اشارہ کر رہی ہیں، میں آپ کو.....'' غصہ ضبط کرنے سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس عورت کو دونوں بازوؤں ں اٹھا کر پوری طاقت سے سامنے دیوار پر دے مارے۔

''آپ چلی جائیے یہاں سے۔ اور دوسروں کی ٹوہ رکھنے کے بجائے اپنے گھر اور لردار کی حفاظت کیجئے۔ چلی جائیے، اس سے پہلے کہ میں.....''

اسے اپنی جگہ پہ ڈٹا دیکھ کر اس نے لفظ چباتے ہوئے بات ادھوری چھوڑی۔

''اب جا رہی ہوں۔ مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے تم لوگوں کو نیک اور مفید مشورے ینے کا۔ ہونہہ، اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔'' وہ بھی تیز تیز بولتی ہوئی باہر نکل گئی۔

اس نے پورے زور سے دروازہ بند کر کے اپنا غصہ نکالنے کی کوشش کی۔ یسریٰ کو ڈبل یوٹی کرنے سے خود اس نے بھی منع کیا تھا۔ مگر اس کی مجبوری تھی، ہسپتال میں اسٹاف کم غا۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ لوگ اس طرح کی گھٹیا ذہنیت کا مظاہرہ کریں گے۔

☆★☆

"یسریٰ! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟..... باہر کیوں نہیں آ رہیں؟" وہ اُس کے بیڈ کے قریب کھڑا تشویش سے پوچھ رہا تھا۔

وہ دس بجے بھی کمرے سے باہر نہ آئی تو وہ دستک دے کر خود اندر آ گیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے بیڈ رومز میں بہت کم جایا کرتے تھے۔ ٹی وی لاؤنج، بالکنی اور کچن ہی ان کا معمول تھے۔

"سر میں بہت درد ہے، آنکھوں میں بھی تکلیف ہو رہی ہے۔" جواب دیتے ہوئے بھی اس نے آنکھوں پہ رکھا بازو نہیں ہٹایا تھا۔

"میڈیسن کیوں نہیں لی؟" اُس کی لاپروائی اسے بہت بری لگی۔

"کہا نا، آنکھوں میں بھی بہت درد ہے۔" اس کی آواز تکلیف کی شدت سے نقاہت زدہ سی تھی۔

"اچھا، میں ابھی آتا ہوں۔" وہ تیزی سے کچن میں چلا آیا۔ دودھ کو نیم گرم کر کے کیبنٹ میں رکھی سر درد کی گولی نکالی۔

"اُٹھو، دودھ پیو۔ اور یہ ٹیبلٹ بھی کھاؤ۔" اس نے نرمی سے اسے اُٹھنے کے لئے کہا۔

"اگر تمہیں رات کو درد تھا تو ڈیوٹی جوائن نہ کرتیں، واپس آ جاتیں۔" اس کی سرخ اور سوجی ہوئی آنکھیں دیکھ کر خود اسے بہت تکلیف ہو رہی تھی۔

"اب ڈیوٹی جوائن کر چکی تھی، واپس کیا آتی؟" اس نے گولی نگل کر دودھ کا گلاس منہ سے لگا لیا۔

"اکمل! صبح سے مجھے نیند نہیں آئی۔ اب ٹیبلٹ کھا کے سو جاؤں گی۔ رات کا سالن پڑا ہے، تم رائس بوائل کر لینا۔ اور پلیز مجھے مت اٹھانا۔ رات کا کھانا ہم اکٹھے بنائیں گے۔" اسے ہدایت کرتی وہ کروٹ کے بل لیٹ گئی۔



"ٹھیک ہے، تم سو جاؤ۔" وہ پریشان سا دروازہ بند کر کے باہر نکل آیا۔

اسی پل فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے لپک کر ریسیور اٹھا لیا، مبادا اس کی چیختی بیل اسے ڈسٹرب نہ کر دے۔

"السلام علیکم!" دوسری طرف کوئی لڑکی تھی۔

"وعلیکم السلام۔ کس سے بات کرنی ہے؟"

یسریٰ کی ساری فرینڈز موبائل پہ کنٹیکٹ کرتی تھیں۔ پھر یہ کون تھی؟

"میں یسریٰ کی نرس کولیگ بول رہی ہوں، یہ اسی کا نمبر ہے نا؟" اس نے تصدیق کی۔

"جی، ان ہی کا نمبر ہے۔ مگر وہ آپ سے بات نہیں کر سکتیں، طبیعت کی خرابی کی وجہ سے۔" وہ اس کے پوچھنے سے پہلے ہی بول پڑا۔

"اچھا، اب پھر....." وہ ہولے سے بڑبڑائی۔

"آپ مجھے میسج دے دیں۔ وہ آپ کو کال بیک کر لیں گی۔" اس نے یونہی سرسری کہا۔

"ایکچوئیلی جب تک نیکسٹ ڈیوٹی کی تمام نرسیں نہ آ جائیں، نائٹ والوں کو چھٹی نہیں ملتی۔ یسریٰ کی تو ہمیشہ ڈے ہی چلتی ہے، اس نے میری جگہ جوائن کرنا تھا۔ اب وہ ٹھیک ہوں تو....." وہ مزید کیا بتا رہی تھی، وہ قطعی سن نہ سکا۔ اس کے دماغ میں صف یہ الفاظ شدت سے گونج رہے تھے۔

"یسریٰ کی تو ہمیشہ ڈے ہی چلتی ہے، اس نے میری جگہ جوائن کرنا تھا۔"

اس نے بے جان ہاتھوں سے ریسیور، کریڈل پہ ڈال دیا۔ اس کی نظریں یسریٰ کے روم کے بند دروازے پہ ساکت سی ہو گئیں۔ اندر کہیں اتنا گہرا سناٹا چھا گیا تھا کہ اپنی دھڑکنوں کی آواز واضح سنائی دے رہی تھی۔ وہ چند دن قبل کہی گئی نازیہ کی باتوں کے زیر اثر نہیں تھا۔ وہ اس کی ساری بکواس کو جھٹک چکا تھا۔ اسے یسریٰ پہ اعتماد تھا۔ جو اس نے جیہہ پیش کی تھی، اس نے مان لی تھی اور ایک لمحہ کے لئے بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ ہسپتال جاتے ہوئے ہمیشہ اوور آل لیتی ہے۔ مگر نائٹ شفٹ میں وہ نہ صرف کلرنگ ڈریس میں بلکہ اوور آل کے بغیر ہی کیوں جاتی ہے؟ وہ اپنے دن بھر کی مصروفیات اس سے شیئر کرتی۔ اسے خود سے زیادہ یسریٰ پہ بھروسہ تھا۔ اس کا انتخاب اس نے بڑا سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ وہ خود ایک صاف شفاف، کھلے ذہن اور اچھے کردار کا تھا اور یسریٰ میں بھی

موجود اسی خوبی نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ وہ ابھی بھی اس پہ شک نہیں کر رہا تھا۔ یقیناً کہیں کچھ چھپایا جا رہا تھا۔ مگر کیا؟

سرِ شام ہی وہ اُٹھ گئی۔ اس کی تکلیف ختم ہو گئی تھی۔ وہ کافی فریش لگ رہی تھی۔ جبکہ وہ اتنا ہی خاموش اور سنجیدہ تھا۔ اس نے یا تو اس کی خاموشی کا نوٹس نہیں لیا تھا یا پھر نظرانداز کر دیا۔ رات کو ٹھیک دس بجے گاڑی اسے لینے آ گئی تھی اور وہ تیار ہو کر باہر نکل گئی۔ تب بھی اس اس نے اس کے متعلق کچھ نہ سوچا۔ مگر اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اسے روک لے۔ کبھی بھی باہر نہ جانے دے۔ اس نے پہلی بار ریلنگ پہ جھک کے اسے گاڑی میں بیٹھتے اور نظروں سے اوجھل ہونے تک دیکھا۔

☆☆☆

"ہیلو، یسریٰ آپی!"

ٹی وی لاؤنج کے صوفے پر بیٹھ کر، ہل ہل کر انگلش کی موٹی کتاب پڑھتی حفصہ نے خوش اخلاقی سے اسے پکارا۔ حفصہ اٹھارہ سال کی کیوٹ سی لڑکی، ڈاکٹر صلاح الدین کی بڑی بیٹی تھی، جو اکثر کورس کی موٹی سی کتاب پڑھنے میں مگن نظر آتی۔ یسریٰ اور اس کی سرسری ملاقات رہتی تھی۔ وہ رات کو اکثر اس وقت تک اپنے بیڈروم میں جا چکی ہوتی تھی۔

"آپ ابھی تک نیچے ہی ہیں؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"یس، ڈیڈی نے کہا تھا کہ آپ کو گرینڈ مدر کے لئے چند ایڈوائز کر دوں۔" اس نے زور سے سر کھجاتے ہوئے بتایا۔

"کیا میسج ہے؟" اس نے بھنویں اُچکا کر پوچھا۔

"گرینڈ مدر کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، انہیں بلڈ پریشر کی میڈیسن دینی ہے۔ وقفے وقفے سے بلڈ پریشر چیک بھی کرتے رہنا ہے اور طبیعت زیادہ خراب ہو جائے تو ہسپتال کال کر دیجئے گا۔" اس نے رٹے رٹائے انداز میں تفصیل بتائی۔

"کیا ہوا، بی بی جان کو؟" وہ فکرمند سی ہو گئی۔

بی بی جان بہت ہی مشفق، مہربان اور نرم دل خاتون تھیں یسریٰ کو ان سے خاص اُنسیت پیدا ہو گئی تھی ان کے چھونے پر وہ محسوس کرتی کہ مہربان ماں کا لمس اتنا ہی محبت بھرا ہوتا ہوگا۔

"ہمیشہ چاچو کو تنہا دیکھ کر ان کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ آج بھی چاچو آئے ہیں۔" اس نے خاصا برا سا منہ بنا کر بتایا، جس سے صاف ظاہر تھا کہ اسے چاچو کا آنا ذرا



چھا نہیں لگتا۔

"چاچو کہاں رہتے ہیں؟"

"یہ ساتھ والی کوٹھی ان ہی کی ہے۔" اس نے دائیں طرف اشارہ کر کے بتایا۔

"چاچو کی غلط حرکتوں کی وجہ سے ان کی مسز، دو کیوٹ سے بچوں کو لے کر اپنے رنٹس کے پاس امریکہ چلی گئی ہیں۔" اس کے لہجے میں بچوں کے چلے جانے کا دکھ تھا۔ نہ چاچو کے ذکر پر تو اس کے ماتھے پہ بل پڑ گئے تھے۔

"اچھا، آپ اپنے روم میں چلی جائیں، میں بی بی جان کو دیکھتی ہوں۔"

اس نے بڑے سے لکڑی کے دروازے کو آہستگی مگر مضبوطی سے دھکیل کر کھولا۔ بائیں رف لگے بیڈ پہ کوئی دروازے کی طرف چوڑی پشت کئے اونچا لمبا سا مرد، پولیس یفارم میں ملبوس، بی بی جان کے اوپر جھکا سرگوشی میں کچھ بتا رہا تھا۔ دروازے سے پیدا نے والی ہلکی سی چرچراہٹ نے بھی انہیں متوجہ نہیں کیا تھا۔

"السلام علیکم!" اس نے اونچی آواز میں سلام کیا۔

"ہوں۔" اجنبی اس آواز پہ تیزی سے سیدھا ہو گیا۔ اسے دیکھتے ہی بی بی جان کے د چہرے پہ ٹھنڈی سی مسکراہٹ ٹھہر گئی۔ وہ بیڈ کی دوسری طرف سے گھوم کر بی بی جان ے پاس بیٹھ گئی۔

"کیا ہوا بی بی جان؟..... حفصہ بتا رہی تھی کہ آپ ٹھیک نہیں۔" اس نے فکرمندی ے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

"میں اب بہتر ہوں۔ تم ان سے ملو، میرے چھوٹے لاڈلے بیٹے ہیں۔ ادھر پاس ا رہتے ہیں۔" اپنے بیٹے کا تعارف کراتے ان کی نیم جاں آنکھوں میں فخریہ سی چمک ا، جسے یسریٰ نے فوراً محسوس کر لیا۔ جوان بیٹے کی ماں کتنی متکبر ہوتی ہے۔

اس نے سامنے بیٹھے شخص پہ طائرانہ سی نگاہ ڈالی، مگر وہ چند ثانیے تک پلک جھپکنا ہی ل گئی۔ اس کے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑنے لگی۔ سانس ترتیب بھول کر رک سا یا۔ ایک لمبے عرصے بعد اس نے کسی مرد کی آنکھوں میں شاطرانہ چمک، چہرے پہ ٹت اور ہوس پھیلی دیکھی تھی۔ وہ تو لاکھوں میں بھی کسی ایسے کی خاص پہچان رکھتی تھی۔

"میں چلتا ہوں ماما! پھر آؤں گا۔"

یسریٰ کی خود پہ جمی نگاہوں میں خوف دیکھ کر وہ بی بی جان کے ماتھے پہ بوسہ دیتا اُٹھ ڑا ہوا۔ یسریٰ نے اس کے عجلت بھرے انداز کو خاص طور پر نوٹ کیا۔

بی بی جان اس کے متعلق کچھ بتا رہی تھیں اور وہ یہ سوچ کر خود کو تسلی دے رہی تھی کہ ہر پولیس والے کی نظریں ایسی ہی ہوتی ہیں، ان کے نزدیک ہر دوسرا شخص مشکوک ہوتا ہے۔

☆★☆

اکمل کے لبوں پہ ایک بار پھر جامد خاموشی آ ٹھہری تھی مگر یسریٰ اس قدر مصروف ہو چکی تھی کہ اس طرف دھیان ہی نہیں کیا گیا۔

وہ کئی دنوں سے اس کے ساتھ تفصیلاً بات کرنا چاہتا تھا۔ بات کہاں سے شروع کی جائے؟ وہ اس کو غلط ہی نہ سمجھ لے۔ اسی طرح کی طویل اور بامعنی سوچوں نے اسے بے کل سا کر دیا تھا۔ نازیہ کی گھٹیا گفتگو، لوگوں کے تبصرے اور اس کی نرس کولیگ کی فون کال۔ کئی بار ہر زاویے سے سوچنے اور پرکھنے کے باوجود وہ اس پہ شک نہیں کر سکا تھا۔ وہ خود اندر سے بری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ مگر یسریٰ پہ اپنے یقین کو ڈگمگانے نہ دیا تھا۔ ہر روز رات کو اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ اسے باہر جانے سے منع کرے، ہاتھ پکڑ کر روک لے۔

اس وقت بھی وہ جانے کے لئے تیار ہو رہی تھی۔ ساتھ ساتھ اسے معمول کی چھوٹی چھوٹی ہدایات بھی جاری کرتی جا رہی تھی۔ مگر اس کی توجہ یسریٰ پر نہیں تھی۔ کئی دنوں سے اُبلتا لاوا آج کھول رہا تھا، جو پھٹنے کے لئے تیار تھا۔ وہ لب بھینچے خود کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"یہاں بت بنے بیٹھے ہو۔ مجھے جواب کیوں نہیں دیتے" اپنے بالوں کو بینڈ میں جکڑتے وہ خاصی جلدی میں لگ رہی تھی۔ "میں جا رہی ہوں۔ دروازہ اچھی طرح بند کر لو۔" گاڑی کا ہارن سنتے ہی یسریٰ نے اسے کندھے سے پکڑ کر جھنجوڑ دیا۔ وہ واقعی اپنے ہوش و حواس میں لوٹ آیا تھا۔

"یسریٰ!" اس کی پکار میں اتنی سختی تھی کہ دروازے کو کھولتا اس کا ہاتھ ٹھہر گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا، جو سخت اشتعال میں تنی ہوئی رگوں اور سختی لئے اس کے قریب آ گیا۔ اس کے چہرے میں جانے کیا دیکھ کر اس نے تھوک نگلا، منہ سے پھر بھی نہ بولی۔

"تم باہر نہیں جاؤ گی۔" اس نے دروازے کو لاک کر کے چابی نکال لی۔

"اکمل! میں....."

"میں نے کہا نا یسریٰ! تم آج سے رات کو کبھی باہر نہیں جاؤ گی۔" ایک ہاتھ سے کنپٹی دباتے، آنکھیں سختی سے بند کئے اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیا تھا۔



"مم..... مم..... مگر....." اس کی بدلتی حالت دیکھ کر وہ ہکلا کر رہ گئی۔ اکمل کے اچانک رویے کی وجہ اسے سمجھ نہیں آ سکی تھی۔

"تمہیں میری بات سمجھ نہیں آتی، کیا بکواس کر رہا ہوں کہ رات کو باہر نہیں جاؤ گی۔" اونچی آواز میں دھاڑتے ہوئے اسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف زور سے کھینچا۔ اس کے دو پہ ہاتھوں کی آہنی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ تکلیف سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"تم جانتی ہو، اردگرد کے لوگ تمہارے بارے میں کیا بک رہے ہیں؟ کتنے گھٹیا اور غلط خیالات ان کے ذہنوں میں آ رہے ہیں؟"

اکمل نے اسے ایک جھٹکے سے صوفے پہ دھکیل دیا تھا۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھتے ہوئے منہ کے بل جا گری۔ آنکھوں میں جمے آنسو، گالوں پہ پھیلنے لگے اور ہونٹ مسلسل کپکپا رہے تھے۔ دل کی دھڑکنیں اپنی رفتار سے ہٹ کر جسم میں خون منجمد کر رہی تھیں۔

"اس دن تمہاری کولیگ کا فون آیا، بتا رہی تھی کہ تم صرف ڈے میں ہسپتال آتی ہو۔ رات کو کہاں جاتی ہو؟ یہ میں نہیں جاننا چاہتا۔ کیونکہ مجھے تم پہ اعتبار ہے۔ مگر لوگ..... ان کی تسلی کیسے کرو گی؟" غصہ میں تیز تیز بولتے اس کی سانس پھول رہی تھی۔ لہجے میں غصے کی پھنکار اور آنکھوں میں اشتعال انگیز شعلے لپک رہے تھے۔

یسریٰ کی مدافعت کی ساری قوتیں زائل ہو گئیں۔ وہ حیران و ششدر یک ٹک اسے تکے جا رہی تھی۔

نیچے گاڑی کا مسلسل ہارن دینے کے بعد اب ڈرائیور نے اسے موبائل پہ کال کرنا شروع کر دی۔ بیل کی کاٹتی آواز پہ وہ خاموش ہو گیا مگر خون آشام نظریں ابھی بھی اس کے روتے اور خوف زدہ چہرے پہ اپنی پوری وحشت کے ساتھ مرکوز تھیں۔ اس نے تھوڑا سا سیدھا ہو کر ہینڈ بیگ سے موبائل نکال لیا۔

"ہیلو۔" اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔

"آں..... ہاں، وہ کچھ پرابلم ہے۔ میں نہیں آ سکوں گی۔ تم حفصہ بی بی سے کہنا، خود ہی اپنی دادی اماں کو میڈیسن دے دیں گی..... اور ڈاکٹر صلاح الدین سے کہنا، وہ جانے سے پہلے بی بی جان کا بلڈ پریشر چیک کر جائیں۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ اس دوران وہ گاہے بگاہے سہمی ہوئی نظر اکمل پہ بھی ڈالتی جا رہی تھی، جس کے تاثرات میں اس گفتگو کے سنتے ہی تبدیلی کا تغیر آیا تھا۔ ایک لمحے میں وہ جان گیا تھا کہ وہ کس طرح کی شفٹ کرتی ہے۔

اپنے تنے ہوئے اعصاب کو بمشکل ڈھیلا چھوڑتا وہ سامنے والے صوفے پہ ڈھے سا گیا۔ وہ تیزی سے اس کے سامنے سے اُٹھی اور بلند آواز میں روتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"یسریٰ....." اپنی کمزور سی پکار خود اسے ہی سنائی نہ دے پائی۔

☆★☆

رات کے تین بج چکے تھے۔ وہ ابھی تک بالکنی میں کھڑا تھا۔ یوں کھڑے کھڑے اس کی ٹانگیں شل ہو گئی تھیں۔ سر بہت بھاری اور آنکھوں میں بار بار پانی آ رہا تھا۔ مگر اس کی اندرونی تکلیف، بیرونی درد پہ حاوی تھی۔ یسریٰ کے رونے کی آواز اندر جا کے بھی آتی رہی تھی اور وہ اس کا سامنا کرنے کا حوصلہ تلاشتا رہ گیا۔ اپنی اس انجانی غلطی کی تلافی کے لئے مناسب الفاظ بھی ہیچ لگ رہے تھے۔ اپنے جذبوں کی سچائی کو اس نے بہت جھٹلایا تھا، مگر سچائی کون سا کبھی جھکی ہے؟ خود پہ ضبط کے بڑے بند باندھے تھے۔ یسریٰ اور دل کے درمیان خاردار باڑ نصب کی تھی۔

مگر محبت..... ہاں، اس کمبخت محبت نے ہر حد اور پیش بندی کو پھلانگ لیا تھا۔ اس سے اپنے وجود کا اعتراف کروا کے ہی تازہ دم ہوئی تھی۔ اس اقرار کے بعد اس نے اپنے شعور میں یہ بات پختہ کر لی تھی کہ باقی ماندہ زندگی کی ہم سفر یسریٰ ہی ہو گی۔ شک اسے یسریٰ پہ نہیں ہوا تھا لیکن لوگوں کی باتوں نے اسے تپا دیا تھا۔ اور پھر یسریٰ کی غلط بیانی۔ اتنی سی بات کے لئے جھوٹ۔ جب گہرائی میں جا کر سوچا تو بہت سی حقیقتیں واضح ہو گئیں۔ اذیت تھی کہ درجہ بہ درجہ بڑھتی جا رہی تھی۔

اس کا خوف سے زرد پڑتا چہرہ، بھیگے گال اور کانپتے ہونٹ۔ اس کے ذہن میں ٹھہرا یہ منظر اسے درد سے دوچار کر رہا تھا۔

اپنی بڑھتی بے قراری کو کم کرنے کے لئے ہاتھ کا مُکا بنا کر زور سے دیوار پہ دے مارا اور پھر بے بس سا، نفی میں سر ہلاتا اندر آ گیا۔

یسریٰ کے کمرے کا دروازہ ادھ کھلا ہوا تھا، ورنہ وہ دونوں اپنے روم کو لاک کر کے سوتے تھے۔ وہ چند لمحے یونہی کھڑا رہا۔ پھر گومگو کی کیفیت کے زیر اثر چلتا ہوا اس کے کمرے میں آ رکا۔ اندر کی لائف معمول سے ہٹ کر روشن تھی، سامنے والی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ خود وہ سائیڈ کے بل لیٹی ہوئی تھی۔ چادر صرف نچلے حصے پہ تھی اور بازوؤں کا تکیہ بنا کر سر کے نیچے اور تکیہ زمین پر۔



اس کا دل بند مٹھی میں جکڑ سا گیا۔

اس نے دوسری طرف جا کر کھلی کھڑکی بند کی۔ چادر کو اچھی طرح اس کے اوپر ڈالا اپنے پیروں میں پڑے ہوئے تکیے کو اٹھا کر احتیاط کے ساتھ اس کے بازو، سر کے نیچے سے نکال کر رکھ دیا، لائٹ آف کی اور دروازہ بند کر دیا۔

ٹی وی لاؤنج میں کھڑا وہ کچھ دیر اپنے کمرے کی طرف دیکھتا رہا، پھر ہارنے والے انداز میں صوفے پہ ہی اوندھے منہ لیٹ گیا۔

صبح اس کی دیر سے آنکھ کھلی۔ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے رات کا واقعہ ذہن میں تازہ ہو گیا، جسے وہ بالکل ہی فراموش کر چکا تھا۔ وہ برق رفتاری سے اُٹھ بیٹھا۔ یسریٰ کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا کلاک پر سوا بارہ بج رہے تھے۔ وہ ہسپتال جا چکی تھی۔ وہ کچن میں چلا آیا جیسے اس کے ملنے کا امکان یہاں ہو۔ کچن بالکل صاف ستھرا تھا۔ ہر چیز ترتیب سے اپنی جگہ پڑی تھی۔ اس نے سنک کو دیکھا، جہاں آج ناشتے کے دھونے والے برتن نہیں تھے۔ یعنی وہ ناشتہ کئے بغیر ہی چلی گئی تھی۔ چار سُو روٹین کی خاموشی کا راج تھا۔ مگر آج اسے یہ خاموشی اور سناٹا کاٹ کھا رہا تھا۔

وہ ڈائننگ ٹیبل کی کرسی گھسیٹ کر وہیں بیٹھ گیا۔ کتنا وقت اسے یونہی گم سم سرک گیا تھا۔ اس نے اچانک کسی خیال کے تحت ٹراؤزر کی ہپ پاکٹ سے موبائل نکال لیا۔ بیل بج رہی تھی، مگر اس کی سماعتوں کو سکون بخشنے والی آواز سنائی نہ دی۔ اس کے بار بار کال کرنے پہ دوسری طرف سے موبائل آف کر دیا گیا تھا۔

☆★☆

رات کے نو بج چکے تھے۔ وہ عموماً شام کے چار یا پانچ بجے تک ہسپتال سے واپس آ جایا کرتی تھی۔ آج وہ فلیٹ پہ جانے کے بجائے اس قریبی پارک میں آ گئی، جہاں وہ دونوں اکثر ویک اینڈ پہ آیا کرتے تھے۔ اسے یونہی گم صم ٹکے کافی دیر گزر گئی۔ کب سے سر کو اٹھایا تو شام کا سرمئی اندھیرا، گھنگھور سیاہ رات میں بدل چکا تھا۔ پارک میں لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی تھی۔ بچے پارک میں لگے جھولوں کے لئے ایک دوسرے سے لڑ جھگڑ رہے تھے۔ عورتیں اپنے پسندیدہ موضوع پر زور و شور سے گفتگو کر رہی تھیں اور مرد بظاہر واک کرتے ہوئے آنکھ چرا کر ہلکی ہلکی محبت بھری نظر، عورتوں کے خوش باش چہرے پہ بھی ڈال لیتے۔ وہ دونوں اس منظر سے بہت لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔

پارک میں ہر اطراف میں سنگی بینچ نصب تھے، جہاں آنے جانے والے جوڑے، اپنے

اردگرد سے بے نیاز ہو کر سرگوشیوں میں مصروف نظر آتے۔ انہوں نے پہلے روز ہی کسی تنہا گوشے کو تلاشا تھا۔ تبھی مغرب کی طرف خودرو اُلجھی ہوئی جھاڑیوں سے تھوڑا سا آگے ایک سنگی بینچ نظر آیا۔ اندھیرے اور گھنی جھاڑیوں کی وجہ سے اس طرف لوگ کافی کم تھے۔

ابھی بھی وہ اسی بینچ پہ بیٹھی تھی، جس کے دوسرے کونے پہ اکمل بیٹھتا تھا۔ اِدھر اُدھر کی بے مقصد باتیں، تبصرے، ہنسی مذاق میں وہ دونوں ہلکی آواز میں قہقہے لگاتے۔ کبھی بلاوجہ یونہی خاموش اور لاتعلق ہو جاتے۔ مگر یہ خاموشی بڑی بامعنی اور بولتی سی ہوتی۔ پھر وہ باری باری ایک دوسرے کی طرف مسکرا کر دیکھتے یا کوئی بے مقصد سی بات سے خاموشی کو توڑ دیتا۔ اسے ہمیشہ اپنی طرف اُگی خودرو جھاڑیوں میں کسی شے کا وہم ستاتا۔ وہ سہم کر اس فاصلہ کو پُر کر جاتی، جو دونوں کونوں کے بیچ تھا۔

ابھی بھی متضاد سوچوں میں گرفتار اسے جھاڑیوں میں کسی شے کا انجانا وہم ہوا تھا۔ مگر وہ خوفزدہ ہو کر دوسری طرف نہیں کھسکی تھی۔ تبھی دوسرے سرے پہ کوئی آ کر بیٹھا اس نے ذرا سا رخ موڑ کر دیکھا۔ وہ بھی اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے چہرہ پھر سامنے موڑ لیا۔ مگر اس کے اس انداز میں غصے اور سختی کا اظہار بالکل نہیں تھا۔

بہت دیر تک وہ اجنبیوں کی طرح ایک دوسرے کو نظرانداز کئے چپ چاپ بیٹھے رہے۔ آج ان کے درمیان خاموشی بہت طویل اور بے معنی سی تھی۔ اکمل نے اپنا رخ پوری طرح اس کی طرف پھیر دیا، جو ابھی بھی ناک کی سیدھ میں، سپاٹ تاثرات لئے، اندھیرے میں گھور رہی تھی اور الفاظ بمشکل ترتیب دیئے۔

''میں تم سے معافی نہیں مانگوں گا۔ کیونکہ جو کچھ ہوا، تمہارے لئے میرے سچے جذبوں کی انتہا تھی۔ میری سطحی ذہنیت کا عمل دخل بالکل نہیں تھا۔''

''مجھے اچھا لگا، تمہارا حق جتانا۔ میرے جھوٹ سے تمہاری انا کو ٹھیس پہنچی، میں معذرت خواہ ہوں۔'' چہرے کی طرح لہجہ میں سپاٹ ضرور تھا مگر اس میں طنز یا ناراضی کا شائبہ تک نہ تھا۔

''انا کو نہیں، غیرت کو۔'' اس نے تصحیح کی۔

اس جملے پہ وہ یک ٹک اسے دیکھے چلی گئی۔ ایک ہی باکردار مرد، جس کی شرافت کی وہ خود گواہ تھی، کیا بول گیا تھا۔ اس کی یادداشت میں اپنے لئے کہا گیا ہر لفظ محفوظ تھا۔ مگر غیرت کا اتنا مکمل اظہار اس نے پہلی بار سنا تھا۔ وہ ہل نہ سکی تھی۔ آنسو بہت ہی بے اختیار ہو گئے تھے۔



''میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔'' اس کی آواز رُندھ گئی۔

''مگر میں نے سمجھ بوجھ کر تم پر اعتبار کیا۔'' وہ دوبدو بولا۔

''جب محبت کے وجود پہ حرف آتا ہے نا، تو جی چاہتا ہے، ہر چیز تہس نہس کر دیں، کاٹ پھینکنے اور برباد کرنے پہ دل آمادہ ہو جاتا ہے۔'' یسریٰ کے گالوں میں پھیلتی نمی اس کی آنکھوں میں بھی اُتر گئی تھی۔

''تمہاری عزت پہ کبھی کوئی حرف نہیں آئے گا۔'' ڈھکا چھپا اظہار ابھی نامکمل تھا۔

''اور میری عزت تم ہو یسریٰ!'' اعتراف سے بھرپور، مضبوط لہجہ اور اُٹھا ہوا سر۔

''اکمل!'' اس کی آواز، سرگوشی میں ڈوبتی گئی۔

اتنے مکمل یقین کے لئے صدیاں چاہئے تھیں مگر وہ صدیوں کا فاصلہ سمیٹ کر اس کے برابر آ بیٹھا تھا۔

''میں..... میں.....'' وہ شاید اپنے اقرار کی مہر ثبت کرنا چاہتی تھی۔ وہ ہاتھ اٹھا کر رک گیا۔

''محبت کے اقرار میں ڈھلے الفاظ بہت مقدس اور معتبر ہوتے ہیں، سننے والے میں زندگی کی روح پھونکتے ہیں۔ جذبوں میں وسعت ضرور رکھو، مگر دلِ برباد کو بے لگام نہ چھوڑو۔ ابھی اتنی ڈھیل کا مناسب وقت نہیں آیا۔''

وہ انجانے خدشوں کا شکار تھا۔ ضبط تو ویسے بھی انہیں خود پہ بہت تھا۔

''چلیں۔'' وہ یک دم اُٹھ کھڑا ہوا۔

''کہاں؟'' اس نے حیرانی سے استفسار کیا۔

''گھر..... اپنے گھر۔'' نم آنکھوں اور ہونٹوں کی مدھر مسکانا میں زندگی جینے کی بھرپور حرارت پوشیدہ تھی۔

''ہاں..... اپنے گھر۔'' ایک سکون سا اس کے اندر سرایت کر گیا۔ وہ اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر گھر تک کا سفر طے کرنے لگی۔

☆★☆

''یہ تم اتنی بری شکل بنا کر کیوں بیٹھے ہو؟'' وہ شام کی چائے کے ساتھ چپس اور نمکو لے کر آئی تھی۔

''یہ سب کچھ اچھا نہیں ہو رہا۔'' وہ کسی سوچ میں غرق بڑبڑایا۔

اس نے پہلے احتیاط کے ساتھ ٹرے اور پلیٹ، ٹیبل پہ رکھیں اور پھر خود نیچے کارپٹ

پہ بیٹھ گئی۔ اسے دیکھ کر وہ خود بھی اس کے برابر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

"کیا سب کچھ؟" چائے، کپ میں انڈیلتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"یہی سب کچھ۔" اس نے اپنی بات پر زور دیا۔ اس کا ذومعنی انداز، یسریٰ کے خاک پلے نہیں پڑا تھا۔

"اوں ہوں..... اکمل! سیدھی طرح بات کرو۔" اس نے برا سا منہ بنایا۔

"اب ہمیں اس طرح نہیں رہنا چاہئے۔" اس نے وضاحت دی۔

"ہم تو یونہی رہتے آ رہے ہیں۔ اب کیسے رہنا چاہئے؟" اس نے سوالیہ انداز میں اسے جانچا۔

"اب پہلے والی سچویشن نہیں رہی۔"

"اس سچویشن کو بھی تم نے ہی بگاڑا ہے۔ مگر میرے پاس حل ہے۔" اس کا اشارہ سمجھ کر وہ بے ساختہ بولی۔

"وہ کیا؟" چائے کا کپ اٹھا کر اس نے ہونٹوں سے لگا لیا۔

"سمپل شادی۔" اس نے جتنی برجستگی سے کہا تھا، اتنا ہی زبردست اچھو، اکمل کو لگا۔

"پاگل ہو گئی ہو؟..... ایک نکمے، نکھٹو اور فارغ بندے سے شادی کرو گی؟" چائے ٹرے میں رکھ کر اس نے ٹشو سے آنکھوں میں آئے پانی کو صاف کیا۔

"تو کیا تمہیں اپنی یہ اضافی خوبیاں، محبت کا شوشا چھوڑنے سے قبل نہیں معلوم تھیں؟" وہ ناراضی سے بولی۔ اس کا یوں خود کو برا بھلا کہنا اسے اچھا نہیں لگا تھا۔

"میں سیریس ہوں یسریٰ!..... پہلے ہماری فیلنگز پوشیدہ تھیں، اب ہم دونوں فیلنگز اور اموشنز میں یکساں تبدیلی آئی ہے۔ تم نے یقیناً سن رکھا ہو گا کہ تنہا مرد اور عورت کے درمیان تیسرا شیطان ہوتا ہے۔" اس نے نرمی سے اسے باور کرایا۔

"چلو جی، بحث ہی ختم۔ نہ تم مرد ہو اور نہ ہی میں عورت۔" اس نے لاپروائی سے ہاتھ جوڑے۔

"واٹ.....؟" وہ حلق کے بل چیخا۔ اس کے یوں چیخنے سے وہ اُچھل کر پیچھے ہٹی۔

"کک..... کیا ہوا؟" اس نے بوکھلاتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی تم نے کیا کہا؟..... نہ تم مرد اور نہ میں عورت، اتنی بڑی....." اس ہونقوں کی طرح منہ کھولتے ہوئے جواب طلبی کے لئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"ہاں، تو ٹھیک کہا نا۔ ابھی تو ہم لڑکا اور لڑکی ہیں۔" اس نے معصومیت سے کہا۔



"مائی گاڈ..... یسریٰ! تم بھی نا۔" اس نے خفیف سا ہنستے ہوئے صوفے کے بیک ٹیک لگا لی۔

"اچھا یہ بتاؤ، اب شادی کرنے میں کیا حرج ہے؟"

"حرج ہے یسریٰ! جب سے مجھے حقیقت معلوم ہوئی ہے کہ تم کچن چلانے کے لئے ٹائم شفٹ کر رہی ہو، اپنا آپ بہت ارزاں لگنے لگا ہے۔ میں..... میں کچھ نہیں کر سکتا۔ ستر لاکھ کم نہیں ہوتے، کیا کروں؟ سوائے یوں چھیننے کے۔" بالوں میں انگلیاں پھنسائے وہ کتنا بے بس لگ رہا تھا۔

"سب بہتر ہو جائے گا۔ تم فکرمند مت ہوا کرو۔" وہ اسے تسلی دینے لگی۔ حالانکہ جانتی تھی کہ وہ اب تسلی سے سنبھلنے والا نہیں۔

"ایک سال ہونے کو آیا ہے۔ دائم بھی تو نہیں۔ اس سے ہی کچھ خبر مل جایا کرتی تھی۔" اس نے بے چارگی سے کہا۔

"اکمل!" لمبے توقف کے بعد وہ بولی۔

"ہوں۔" اس نے ہنکارا بھرا۔

"میں تمہیں بتاتی ہوں نا، کہ بی بی جان مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں۔ بالکل بیٹیوں کی طرح۔ وہ اکثر مجھ سے کہتی رہتی ہیں، شادی کر لو۔ کیوں نہ میں ان سے تمہاری بات کروں؟"

"وہ اس سلسلے میں کیا کر سکتی ہیں؟"

"وہ تو نہیں، ان کا چھوٹا بیٹا پولیس آفیسر ہے، وہ تو کچھ کر سکتا ہے۔ اگر بی بی جان اس سے کیس ڈسکس کریں۔" اس نے آس بھرے لہجے میں اُمید باندھی۔

"ہاں، میں اس زندگی سے بہت تھک چکا ہوں یسریٰ! میں خود بھی اب کوئی رِسک لے لینا چاہتا ہوں۔ بعد میں جو ہو گا، نمٹ لوں گا۔" تھکن زدہ سا، وہ متفق ہو گیا تھا۔

"اکمل! تمہارا مسئلہ حل ہو جائے تو میں جاب نہیں کروں گی۔" بے اختیار ہی وہ بول گئی۔ شادی کے بجائے مسئلہ کا لفظ استعمال کرنے میں احتیاط برتی گئی تھی۔

"نہیں..... نہیں کرو گی۔" اس نے قطعیت سے کہا۔

اسے اپنے آئندہ زندگی کے ہم سفر پہ اتنا ہی یقین اور مان تھا۔ جاب کرنا، اپنا بوجھ اٹھانا اس کی مجبوری تھی۔ وگرنہ وہ خود کب یہ چاہتی تھی کہ باہر نکلے، مردوں میں آئے جائے۔

خوشی میں سرشار، مسرور سی، غیر ارادی طور پر ہی اس کا ہاتھ اکمل کے گھٹنے پہ جا ٹھہر
تھا۔ وہ بھی مسکراتے ہوئے اس کی رنگت میں ڈھلتے قوس وقزح کے رنگوں کو نظروں میں
مقید کر رہا تھا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟'' اس نے مصنوعی سا ڈپٹ کر پوچھا۔ اس کے یوں دیکھنے
سے وہ گھبرا گئی تھی۔

''یسریٰ! تم شادی کے بعد جاب نہیں کرو گی، مکمل طور پر گھر سنبھالو گی۔ میں جاب
کروں گا۔ ہم اس گھر کو خوب صورتی سے سجائیں گے، بالکل چھوٹی چھوٹی چیزوں سے۔
ہمارے گھر میں سکون ہو گا، محبت ہو گی، ایک دوسرے کا احترام۔ میں جب شام کو لو
کروں گا، تم میرا انتظار کرتی ملا کرو گی۔ تمہاری انتظار کی بے قراری اور دھیمی سی مسکان
میری دن بھر کی تھکن دُور کر دیا کرے گی۔ تم مجھ سے جھگڑا بھی کرو گی، پھر.....''

''پھر..... پولیس کا ڈنڈا تمہارے سر پر پڑے گا اور محبت کا سارا خنّاس نکل جائے
گا۔'' صاف مذاق اُڑانے والے انداز میں قہقہہ لگاتے وہ متوقع حملے سے بچنے کے لئے
دُور ہٹی۔ اکمل کے خواب ناک سے انداز میں کافی گہرائی تھی۔

''یسریٰ! بہت بدتمیز ہو تم۔'' اس نے کشن اُٹھا کر اس کے سر پہ دے مارا۔

جواباً اس نے دو کشن اُٹھا کر اس کی طرف اُچھالے تھے۔

☆★☆

''اکمل! میں نے بی بی جان سے بات کی تھی۔'' ناشتہ کرتے ہوئے اس نے بتایا۔

''پھر کیا کہا انہوں نے؟'' دودھ کا گلاس بھرتے اس نے پوچھا۔

''انہوں نے میری بات پوری توجہ اور محبت سے سنی۔ وعدہ کیا ہے کہ وہ تمہارا کا
ضرور کریں گی۔ بلکہ انہوں نے اپنے بیٹے کو میرے سامنے ہی فون کر دیا تھا، آج رات
آئے گا ان کا بیٹا۔'' اس نے ساری تفصیل سنائی۔

''تمہیں اُمید ہے، بی بی جان ساتھ دیں گی؟'' اس نے دودھ کا گلاس یسریٰ کے
آگے رکھ دیا۔

''ہوں۔ انہوں نے کافی حوصلہ افزائی کی ہے۔ آگے دیکھو۔''

''میرے خیال سے، ہر صورت میں سزا تو بھگتنی پڑے گی۔'' اس نے مایوسی سے کہا۔

''کیوں؟..... اگر کیس جھوٹا ثابت ہو جائے تو پھر کیسی سزا؟'' اس نے تنگ کر
پوچھا۔ اکمل کی خود ترسی کی عادت اسے بہت بری لگتی تھی۔ وہ کافی نا اُمید سا تھا۔



''پھر بھی، اگر سزا ہو گئی تو؟'' وہ ابھی بھی وہیں اٹکا تھا۔

''پھر کی پھر دیکھیں گے۔ تم یہ انڈا کھاؤ۔'' اس نے پلیٹ سے انڈا اُٹھا کر سلائس پہ
رکھ دیا۔

''یسریٰ! تم میری واپسی کا انتظار کرو گی؟'' کسی ان دیکھے خوف کی بدولت وہ ابھی
سے یقین دہانی چاہتا تھا، اسی لئے سلائس پر دھیان رکھے کافی توقف کے بعد بولا۔

''تم ایسا تو نہ سوچو اکمل!'' وہ اندر تک کانپ گئی۔

''یہ میری بات کا جواب نہیں ہے یسریٰ!'' وہ اصرار کر رہا تھا۔

''میں اپنی آخری سانس تک تمہارا انتظار کروں گی، تم نہ بھی لوٹ کے آئے، تب
بھی۔'' بھیگی آواز میں کہتی وہ تیزی سے کرسی گھسیٹ کے اُٹھ گئی۔

☆★☆

وہ بہت آس سے بی بی جان کے پاس آئی تھی۔ کل انہوں نے اپنے بیٹے کو اس کی موجودگی میں ہی فون کیا تھا اور اس نے آنے کا وعدہ بھی کر لیا تھا۔ وہ آج سارا دن ہسپتال میں بھی دعائیں مانگتی رہی تھی۔

''یسریٰ بیٹے! میں نے بات تو کر لی تھی، مگر وہ آ نہیں سکے گا۔ کچھ بزی ہے۔ تمہیں ڈیٹیلو بتانے کے لئے اس کے گھر جانا ہوگا۔'' اسے دیکھتے ہی بی بی جان نے خوشی کی خبر سنائی تھی۔

''ٹھیک ہے بی بی جان!'' وہ خوشی سے اثبات میں سر ہلانے لگی۔

''تم ایسا کرو، مجھے میڈیسن دے دو۔ میں تھوڑا آرام کروں گی۔ اور حفصہ کو ساتھ لے کر ابھی چلی جاؤ، وہ تمہارا انتظار کر رہا ہوگا۔ میں نے اس سے کہہ دیا تھا۔''

تیزی سے سارا کام نمٹا کر وہ بی بی جان سے اجازت لے کر حفصہ کے کمرے کی طرف آ گئی۔

''چاچو کے گھر؟..... مگر کیوں؟'' اپنے مخصوص انداز میں سر کھجاتے اس نے پوچھا۔

''وہ میرے ایک عزیز کا مسئلہ ہے، اسی کے متعلق ڈسکس کرنا ہے۔'' اس نے جلدی سے بات بتائی۔

''کام بن جائے گا۔ چاچو، گرینڈ مدر کا حکم کبھی نہیں ٹالتے۔'' حفصہ نے اپنے لان میں آ کر وہ چھوٹا سا گیٹ کھولا، دو دوسری طرف کے لان میں کھلتا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی حفصہ نے کسی چیز کو دیکھ کر جوش سے چیخ ماری۔ اس نے حفصہ کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا، جہاں ایک بلی اپنے بچوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔

''یسریٰ آپی! آپ جائیں اندر۔ میں ابھی بلی کے بچوں کے ساتھ کھیلوں گی۔'' وہ اُچھلتی ہوئی، بلی کی طرف لپکی۔ یسریٰ اُس کے بچکانہ انداز پہ مسکرائے بنا نہ رہ سکی۔ اس



بھی داخلی دروازے کو کھولنے کے لئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ وہ کھلتا چلا گیا۔ دروازہ لنے والا، بی بی جان کا بیٹا ہی تھا۔

''آیئے، میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔'' وہ سائیڈ پر کھڑا ہو گیا۔ وہ تھوڑا ہچکچاتے ئے اندر داخل ہوئی۔

''بیٹھ جائیں۔'' اسے کھڑا دیکھ کر اس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ اچانک یسریٰ گاہ بیرونی گلاس وال پہ پڑی، جہاں حفصہ، بلی کے بچوں کے لئے پاگل ہو رہی تھی۔ نظر سے تھوڑا سا اطمینان محسوس کر کے وہ بیٹھ گئی۔

''اور سنائیں، ٹھیک ہیں آپ؟'' وہ بڑی بے تکلفی سے ٹانگ پہ ٹانگ دھرے پوچھ تھا۔ اس نے سر اٹھایا، مگر وہ بڑی ہی عجیب چمک لئے بغور اسے دیکھ رہا تھا۔ یسریٰ کو یا، پہلی دفعہ بھی اس کے یوں دیکھنے پر وہ گھبرا گئی تھی۔

''میں آپ سے کیس کے متعلق ڈسکس کرنے آئی ہوں۔'' اس کے سوال کو گول کر وہ مطلب کی بات پہ آ گئی۔

''مگر میں نے آپ کو صرف کیس کے سلسلے میں نہیں بلایا..... بلکہ اور بھی بہت کچھ ہنا ہے۔'' اتنی دیر میں اس نے ایک لمحے کے لئے بھی اس کے چہرے سے نظریں ں ہٹائی تھیں۔

''مثلاً؟'' اپنے لہجے کی سختی کو چھپاتے وہ رسانیت سے بولی۔

''مثلاً۔'' وہ دہرا کے تھوڑی دیر کو رکا۔

''انتظار..... انتظار کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ نے کسی کا پورے سال انتظار کیا ہو اور وہ کسی معجزے کی طرح اچانک آپ کے سامنے بلکہ..... بلکہ آپ ا دسترس میں آ جائے، تو کیسا لگتا ہے؟'' اس کے معنی خیز انداز میں لاپروائی نمایاں تھی۔

''جی، میں سمجھی نہیں۔'' ضبط کی کڑواہٹ لئے وہ زور دے کر بولی۔

، وہ اسے فضول میں اُلجھا کر اِدھر اُدھر کی ہانک رہا تھا۔ اسے افسوس ہوا کہ وہ حفصہ کے بغیر ہی کیوں اندر آ گئی؟ یا پھر وہ واقعی سر پھرا تھا۔

''یہی سمجھانے کے لئے تو میں آپ کے فلیٹ پہ آنے والا تھا۔ مگر یہ میری نہیں، آپ کی خوش قسمتی ہے کہ آپ خود چل کے آ گئی ہیں۔'' اس کی نظروں کا زاویہ اب بھی نہیں رلا تھا۔ جیسے کسی پیاسے کو کنواں نظر آ جائے۔ وہ اس میں سے پانی پینے کے بجائے کھڑا نکتا رہے۔ یسریٰ کا چہرہ تمتمانے لگا۔ اس کی حالت نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن والی

تھی۔ جس مقصد کے لئے وہ آئی تھی، اس طرف تو وہ آ ہی نہیں رہا تھا۔

''آپ کیوں آنے والے تھے؟'' پہلو بدلتے ہوئے وہ کلس کر رہ گئی۔

''جب دو مجرم ایک ساتھ، ایک جگہ رہ رہے ہوں تو چھاپہ تو مارنا ہی پڑتا ہے نا۔'' وہ پُراسرار سا مسکرایا۔

''دو مجرم.....'' وہ زیرلب بڑبڑائی۔ ''دیکھئے، آپ کو جو بھی کہنا ہے، صاف صاف کہئے۔'' اُس کی خود پہ گڑی نظریں اور اس پر مستزاد بے معنی گفتگو نے اسے تلملا کے رکھ دیا۔

وہ مسکراتے ہوئے اپنی جگہ سے اُٹھا، ایک طرف رکھے ہوئے ریفریجریٹر کے پاس چلا گیا، اسے کھول کر دو بوتلیں اور ایک گلاس نکال لیا۔ آدھا گلاس کولڈ ڈرنک کا بھرا اور باقی میں وہسکی انڈیل دی۔ بلبلوں کے مانند جھاگ، کناروں سے باہر تک آئی۔ اب وہ برف کیوبز گلاس میں پھینک کر اسے ہلا رہا تھا۔

وہ اسے خاموشی سے یہ سب کرتا دیکھتی رہی۔ اس کے اندر خوف کی ہلکی سی لہر اُبھر کر معدوم ہوگئی۔ وہ اس سے دو کی وضاحت چاہتی تھی۔ وہ کب سے اسے فضول برداشت کر رہی تھی۔ اس نے گردن موڑ کر باہر دیکھا۔ لان میں اب حفصہ کے ساتھ دو ملازمین اور بھی تھے۔

''اس گھر کی ویرانی تمہیں محسوس ہو رہی ہے؟'' آپ سے تم تک پہنچتا وہ اس کے قریب آ گیا۔ وہ خاموش رہی۔

''اس گھر کے اُجڑنے کا سبب تم ہو۔'' گلاس میں سے گھونٹ بھرتا وہ اس کے برابر بیٹھ چکا تھا۔

''میں.....؟'' اس نے حیرت و استعجاب سے اپنی طرف اشارہ کیا۔

''ہاں، دو سال قبل دس لاکھ روپے، لاکھوں کے زیورات کے ساتھ ساتھ میرے گھر کا سکون اور چین لے کر بھاگ جانے والی ستارہ بائی تم ہو۔''

''سس..... سس.....'' اس کا حلق یک دم خشک اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ خوابوں کا شیش محل شاید بہت اونچی تعمیر سے زمین بوس ہوا تھا۔ اس محل کی کرچیوں نے صرف لہولہان ہی نہیں کیا تھا، مگر چھوڑنا تھا۔

''تم کیا سمجھتی تھیں، میرے..... یعنی ایس ایچ او کے چنگل سے بھاگ نکلو گی اور میں اتنی آسانی سے تمہیں جانے دوں گا؟'' وہ رک کر وہسکی کا گلاس ایک گھونٹ میں چڑھا گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔



جبکہ وہ ابھی تک ناقابلِ یقین ساعتوں کی ناہموار مسافت پر لٹی کھڑی تھی۔ کافی دیر اس نے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی۔ مگر وہ پہلے ہی کافی پیچھے تھی۔

''م..... میں.....''

''تم یسریٰ ہو، یہی کہنا چاہتی ہو نا؟'' وہ اسے کاٹ کر بولا۔ ''یہ دھوکا تم اپنے اس دو کے عاشق کو دینا، مجھے نہیں۔'' وہ زہرخند سا بولا۔

''تم اپنا یہ چہرہ اور ماضی مجھ سے نہیں چھپا سکتیں۔'' وہ مزید قریب ہو گیا۔

''اُس دن، جب میں نے تمہیں، بی بی جان کے کمرے میں دیکھا تو پہچان گیا تھا۔ نے تمہیں دکھا کر ہی سودا کیا تھا۔ مگر تمہاری بدقسمتی کہ مجھے پہچان نہ سکیں۔ میں تب تمہارے بارے میں معلومات اکٹھی کر رہا تھا۔ پتہ چلا، تم سب کچھ چھوڑ کر ایک نیک یف زادی یسریٰ بن چکی ہو اور مغرور شخص کے ساتھ رہ رہی ہو۔ اچھا ہے، تمہارے نھ ساتھ مجھے اس کا بھی سراغ مل گیا۔ بڑا خوار کیا ہے، سالے نے۔'' اس نے بلند و ب قہقہہ لگایا۔

''میں..... میں اپنا ماضی فراموش کر چکی ہوں۔'' وہ اس کے لہجے کی پھنکار اور نت سے کمزور پڑتی، جھوٹ نہیں بول سکی۔

''یقین کرو، میں بھی نہیں چاہتا کہ تم اپنے ماضی میں واپس لوٹ جاؤ۔'' وہ جھولنے انداز میں نفی میں ہاتھ ہلا رہا تھا۔

''تو پھر کیا چاہتے ہو؟''

''وہ دس لاکھ، جو تمہارے عوض بلن نے بٹورے۔ زیورات، جو تم لے کر بھاگ یں۔ میرا گھر اُجڑا اور وہ ساری خواری جو میں نے اُٹھائی، اس سب کا قرض چکا دو۔''

''م..... مگر کیسے؟'' خوف سے زرد پڑتی وہ ہکلائی۔

''وہ رات، جو اب تک اُدھار ہے، جس کے لئے میں نے لاکھوں بھرے تھے۔'' نے انگلی اٹھا کر ایک کا اشارہ کیا۔

''اب کی بار تم بھاگو گی نہیں۔ کیونکہ تمہاری کمزوری وہ تمہارا عاشق اور ہونے والا ہر، میرے رحم و کرم پر ہے۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو؟'' وہ حلق کے بل چلائی۔ اُس کی سانس پھول گئی اور ناک نتھنے پھڑکنے لگے۔ اس کا جی چاہا کہ اس شخص کا منہ نوچ کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔

''یہ بکواس ہی حقیقت ہے۔ صرف میں جانتا ہوں کہ تمہارے عاشق پر جھوٹا کیس

دائر ہے۔ ستر لاکھ تو ایم۔ڈی کا بیٹا لے کر انگلینڈ فرار ہوا ہے۔ اب اگر اکمل کو سزا ہو گی تو تم کیا کرو گی؟ ستر لاکھ تو وہ اگلے سو جنموں میں بھی نہیں دے سکتا۔ اور پھر اس جیسے مجرم کو ہمارے لئے پولیس مقابلے اور اِن کاؤنٹر میں گولی مارنا کون سا مشکل ہے۔" وہ لاپروا انداز میں کندھے اچکاتا، اُس کی سانسیں کھینچ لے گیا تھا۔

"نن..... نہیں..... تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔" لاچارگی میں اس نے دونوں ہاتھ اس کے آگے باندھ دیئے۔

"اسے بے گناہ صرف میں ہی ثابت کر سکتا ہوں۔ وہ بھی اس صورت میں کہ تم مان جاؤ۔"

"یہ بہت بڑا سودا ہے۔" اس کے بے لچک، اٹل انداز پر وہ شدت سے رونے لگی۔

"کیسے بڑا سودا ہے؟..... تم لاکھوں لے کر فرار ہوئی ہو، میں کوئی واپس مانگ رہا ہوں؟ میرا گھر اُجڑا، میں نے حساب کیا؟ تم ستارہ بائی سے یسریٰ بن گئیں، میں کسی کو بتا رہا ہوں؟ اور تمہارے اس ہونے والے شوہر کو بری کروا دوں گا۔ تم ہنسی خوشی باقی ماندہ زندگی اس کے ساتھ گزارنا۔ کیونکہ وہ بھی تو نہیں جانتا تمہاری اصلیت..... تم یسریٰ نہیں ہو۔" کوئی گرم سیال مادہ، یسریٰ کے جسم کو جھلساتا اب دل کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"نہیں، ایس ایچ او۔" اس نے روتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

"سوچ لو۔ آج کی رات نکال کر دو راتیں اور ہیں تمہارے پاس۔ تیسری رات تمہیں یہاں....." اس نے کمینے انداز میں ہنستے ہوئے اپنے روم کی طرف ابرو سے اشارہ کر کے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"دو دن بعد صبح واپسی پہ تمہیں اُس کی رہائی کے کاغذات بھی ملیں گے، یسریٰ!" اس کے نام پر اس نے خاصا زور دیا تھا۔

"ورنہ....." اس کا انداز اتنا سخت تھا کہ یسریٰ کپکپا گئی۔

"ور..... ورنہ....." وہ بے ربط سی ہوئی۔

"وہ عمر بھر کے لئے جیل میں یا اندھیری قبر میں۔ اور تم میرا سارا حساب چکتا کرنے کے بعد کوٹھے پہ، طوائف بن کے۔" وہ ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔

"جاؤ اب، ماما انتظار کر رہی ہوں گی۔ صرف دو راتیں اچھی طرح سوچو، اب مجھ سے مزید برداشت نہیں ہوتا۔"

اس نے ٹیبل پر دھرے خالی گلاس کو اُٹھا کر زور سے فرش پر دے مارا۔ شیشہ



کرچی کرچی ہو گیا تھا۔

☆☆☆

"اَن بلیو ایبل۔" یسریٰ کی زبانی ساری بات سننے کے بعد وہ نیچی آواز میں بولا۔ وہ بیچ میں ایک بار بھی نہ بولا تھا۔ حیرانی کے واضح تاثرات اس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ میں اُبھرتے اور مٹتے رہے تھے۔ اصولاً اسے خوش ہونا چاہئے تھا۔ مگر وہ خوشی کہیں مقید کئے، بے چین سا ہو گیا تھا۔

"ایس ایچ او کہہ رہا تھا کہ وہ ایم۔ڈی کو انسسٹ کرے گا کہ وہ تمہارا کیس واپس لے لے، آخر رقم تو اس کا بیٹا ہی لے کر فرار ہوا ہے۔"

وہ بہت کچھ چھپانے کی کوشش کرتی، ہلکا پھلکا موڈ اپنائے ہوئے تھی۔ وہ دونوں اپنی اپنی ذات سے راز و نیاز میں غرق تھے۔ ایک دوسرے سے بے پروا۔

اکمل جو یسریٰ کو جاننے کا دعوے دار تھا، جان نہ سکا کہ رات اس پہ کیا قیامت ٹوٹ کر گزر چکی ہے۔ حالانکہ قیامت اپنے آنے کے نشانات ضرور چھوڑ جاتی ہے۔

یسریٰ بھی نہ جان سکی کہ اتنی عمدہ کہانی سننے کے باوجود اکمل کے شعور کا کون سا خانہ بیدار ہو چکا ہے، جو اسے خوش نہیں ہونے دے پا رہا۔

وہ دن بھر بے چین رہی تھی۔ اس کا ذہن کسی ایک نقطے پر ٹھہر نہیں رہا تھا۔ رات کو بی بی جان کو میڈیسن دینے اور سلانے کے بعد وہ ایزی چیئر پر بیٹھ گئی۔ دن بھر کی تھکی ماندی سوچیں، انگڑائی لے کر پھر سے تروتازہ ہو گئیں۔ وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ صبح کا سورج طلوع ہونے سے پہلے اسے کسی نتیجہ پر پہنچنا ہو گا۔ ایزی چیئر کو اضطراری انداز میں حرکت دیتے اسے کچھ زیادہ نہیں، تھوڑا عرصہ پہلے کہے گئے الفاظ بہت ہی قریب سے سنائی دیئے۔

"تم اپنے ماضی اور حال سے بھاگنا چاہتی ہو نا۔" ایسی ہی مانوس آواز، اندھیرے کو مزید چیرتی گئی۔

"تو بھاگ جاؤ۔ ماضی سے جتنا بھاگ سکتی ہو، بھاگ لو۔ مگر جب تھک کر بدن چُور ہو جائے اور پیروں میں چھالے پڑ جائیں اور سوچو کہ ماضی بہت دُور رہ گیا، رک جانا۔ پھر یہ اندازہ کرنے کے لئے کہ تمہارا بھیانک کل تم سے کتنا پیچھے رہ گیا، مڑ کے مت دیکھنا۔ کیونکہ تمہارا ماضی، تمہارا حال بن کر سامنے کھڑا ہو گا۔" واقعی سچائی، ہر قید سے آزاد ہوتی ہے۔

"تو کیا میرا ماضی کسی آسیب کی طرح میرا تعاقب کرنا نہیں چھوڑے گا؟" سیاہ رات کی لامحدود چپ کو آنسوؤں کی دھیمی آواز توڑ رہی تھی۔

اگر اسے اپنے بیتے کل میں نہیں پلٹنا تھا، غلاظت کی دلدل میں نہیں اُترنا تھا، جیسا کہ ایس ایچ او کہہ رہا تھا تو پھر اس نے اکمل کو جھوٹی کہانی سنا کر آس کیوں دلائی تھی؟ کیا فیصلہ خود بخود ہو چکا تھا؟ وہ یونہی بے کار میں اُلجھ رہی تھی۔ شاید جتنا اختیار اس کے پاس تھا، بہت ہی بودا تھا۔ مگر..... مگر اتنی جلدی، صرف دو سالوں میں اپنے ابتدا کی طرف لوٹ آئی تھی۔ ایسے کہ اس کے پاس صرف دو صورتیں تھیں۔ دونوں ہی اسے کسی دیکھی بھالی، گہری کھائی میں دھکیل رہی تھیں۔ جس میں گرنے کے بعد اس کا نام ونشان نہ بچتا۔

وہ ایس ایچ او کا کہا مان کر اکمل کو دھوکے میں رکھ کر شادی کر سکتی تھی، تو کیا گارنٹی تھی کہ اسے کبھی پتہ نہیں چلے گا کہ وہ یسریٰ سے قبل ستارہ بائی، گندگی کا بدنما دھبہ تھی۔ ایس ایچ او کو انکار کے خمیازے میں اکمل کی موت اور خود کوٹھے پر بیٹھ کے اس کی بھی موت۔

مطلب سارا کچھ اگنور کر کے بھی حصے میں خسارہ ہی خسارہ آنا تھا۔

دونوں ہاتھوں سے اپنے بال، مٹھیوں میں جکڑ کر وہ نڈھال سی ہو گئی تھی۔ مگر بالآخر فیصلہ اس نے کر ہی لیا تھا۔

☆★☆

"تم سچ کہتی ہو؟ اتنی جلدی؟..... ابھی تو....." وہ شادیٔ مرگ کی کیفیت سے دوچار، بولنا بھی بھول گیا تھا۔

"ہاں..... کل رات میں تمہارے لئے آزادی کا پروانہ لے کر آؤں گی۔" اس نے دوبارہ دہرایا۔ وہ جلدی جلدی کھانا ختم کر رہی تھی۔

"بس پھر یسریٰ! کل تم وہاں آخری دفعہ جاؤ گی۔" وہ اپنی خوشی کے آگے یسریٰ کا دُھندلا پڑتا چہرہ نہ دیکھ سکا۔

"ہوں، کل آخری بار۔" اس نے سر اُٹھا کر عجیب سے لہجے میں کہا۔

"میں آج ہی بی بی جان سے کہوں گی کہ وہ کسی دوسری نرس کا انتظام کر لیں۔ ہسپتال میں بھی ریزائن کر دوں گی۔ ویسے بھی مہینے کی آخری ڈیٹ چل رہی ہے۔" اس نے بلاوجہ ہی نگاہیں چراتے بتایا۔

"اب مجھے اچھی سی جاب مل جائے تو ہم شادی کر لیں گے۔ تم....."

"میں تیار ہو لوں۔ ورنہ دیر ہو جائے گی۔" لمحہ ضائع کئے بغیر وہ پھرتی سے اُٹھ گئی۔



اسی رات یسریٰ نے بی بی جان کو ریفوز کر دیا تھا۔ وہ بے انتہا خوش ہوئی تھیں کہ وہ اپنا گھر بسا رہی ہے۔ انہوں نے ڈھیروں دائمی خوشیوں کی دعائیں دیں اور ایک پریشان، نفکرات میں گھری ماں کی طرح گھر بسانے کی ڈھیروں نصیحتیں کیں۔ وہ سر جھکائے، آنسو بہاتی ان کی ہدایات سنتی رہی۔ وہ انہیں کیونکر بتاتی۔

"کہ میری سہاگ کی سیج پر شب خون مارنے والا، ان کا اپنا بیٹا ہے، وہ بیاہنے نہیں، لٹنے جا رہی ہے۔"

ان بیچ کی دو راتوں (جن میں سے ایک گزر چکی تھی) نے بہت کچھ بدل دیا تھا۔ جو سفر اس نے جان جوکھوں میں ڈال کر دو سال میں بمشکل طے کیا تھا، اس سے واپسی میں صرف دو دن لگے تھے۔ جو خواب اس نے دس سال اپنے خوابوں میں جوڑا تھا، اس کے ٹوٹنے میں صرف ایک رات کافی تھی۔ بہت سے جذبوں کو نوچ دیا تھا۔ کئی خوابوں، خواہشوں کو سیاہ رنگ کے کفن میں لپیٹ کر دل کے ہی کسی گوشے میں دفن کر دیا تھا۔

ڈاکٹر صلاح الدین نے نیک تمناؤں کے ساتھ اسے گھر اور ہسپتال کی پے منٹ کر دی تھی۔ سفید پھولے ہوئے لفافے کو اس نے ہینڈ بیگ میں رکھ لیا تھا۔ چار بجے واپسی پہ اکمل سو رہا تھا۔ وہ بھی کپڑے بدل کر نو بجے کا الارم لگا کر سو گئی۔ صرف آج کا دن تھا اور اسے ابھی بہت سے کام نمٹانے لگے۔

صبح دس بجے کے قریب وہ بینک پہنچی، وہاں سے اپنی جمع پونجی جو صرف چند ہزار کی تھی اور لاکر میں رکھوائے گئے ضروری کاغذات نکلوائے، بینک سے لی گئی رقم لفافے میں ڈال کر کاغذات بھی بیگ میں ٹھونس لئے۔ اس کا اگلا سفر کورٹ تک کا تھا۔ تین گھنٹے کورٹ کی ضروری کارروائی میں سر کھپانے کے بعد وہ باہر آئی تو سورج پوری آب وتاب سے چمک رہا تھا۔ اس کی کنپٹیوں میں ہلکا ہلکا درد تھا۔ وہ کمزوری بھی محسوس کر رہی تھی۔ اسے یاد آیا کہ وہ ان دنوں ٹھیک طرح سے کھانا نہیں کھا رہی اور ناشتے کے نام پر اکمل نے زبردستی چائے کا کپ بلایا تھا۔ مگر اسے اپنی پروا کب تھی؟ تیز تیز چلتی وہ ٹیکسی اسٹینڈ تک پہنچی تھی۔ اب اس کا آخری سفر، رضوان بھائی کے آفس تک کا تھا۔

☆★☆

اپنی وارڈروب کھول کر اس نے سارے کپڑوں کو بغور دیکھا۔ پھر سیاہ رنگ کا سوٹ نکال کر وارڈروب بند کر دی۔ یہ سوٹ اس نے پچھلے دنوں ہی خریدا تھا۔ فٹنگ چیک کرنے کے لئے پہن کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی وہ خود کو تنقیدی زاویے سے دیکھ

رہی تھی کہ اکمل، چائے کا پوچھنے اندر آیا تھا۔ اس کی نظر اس کے سراپے پر پڑی تھی۔ وہ جم سا گیا تھا۔ کئی لمحوں تک وہ ساکت ہو گیا اور پھر اس کی نظروں کی تپش محسوس کرتے، سرخ چہرہ لئے رخ موڑ گئی تھی۔

''چینج کر کے باہر آنا۔'' اس کا لہجہ بہت بھاری ہو رہا تھا۔ وہ واپس پلٹ گیا۔ اپنی اس سوچ سے چھٹکارا پانے کے لئے وہ کپڑے اٹھا کر واش روم میں گھس گئی۔

دونوں کھانا کھا چکے تھے۔ وہ رات کو جانے سے پہلے چائے ضرور پیتی تھی۔ اکمل اس کے تیار ہونے تک چائے بنا رہا تھا، جب وہ چلی آئی۔

''بن گئی چائے؟'' اپنے سلکی بالوں کو لپیٹتے اس نے پوچھا۔

''ہاں، بس ڈال رہا ہوں۔'' اسٹینڈ سے مگ پکڑتے اس نے مڑ کر جواب دیا۔

''یہ کیوں؟'' وہ چائے ڈالنا بھول کر حیران نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

'کیا، کیوں؟'' وہ جانتی تھی، اکمل کس متعلق پوچھ رہا ہے۔

''یہ کپڑے کیوں پہنے ہیں؟'' اب اس کے پوچھنے کے انداز میں ہلکی سی خفگی تھی۔

''اب کپڑوں کو کیا ہے؟ اچھے بھلے تو ہیں۔'' وہ اس کے چہرے پہ چھائی خفگی کو نظر انداز کر گئی۔

''مگر ابھی یہ نہیں پہننے چاہئے تھے۔'' وہ چائے چھاننے لگا تھا۔

''اچھا، تو پھر کب پہننے تھے؟'' اس نے مزید دلچسپی لی۔

''جب ہماری شادی ہوتی۔'' اس نے کپ، یسریٰ کو پکڑاتے، نظریں چرا کے سادگی سے کہا۔

''میں سمجھی نہیں۔'' وہ جان بوجھ کر انجان بنی رہی۔

''یہ کلر بہت سوٹ کرتا ہے تم پر۔ بہت اچھی لگ رہی ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ جس چیز پر صرف میرا حق ہے، کسی اور کی نظر بھی پڑے۔'' اس نے غیر ارادی طور پر چائے کا کپ، ہونٹوں سے لگا لیا۔ چائے شاید زیادہ ہی گرم انڈیلی گئی تھی۔ اس کے حلق تک میں جلن ہو گئی۔

''تم نظر کی بات کرتے ہو، آج تو حق ہی چھن جائے گا۔'' وہ صرف سوچ کر رہ گئی۔ اس نے اکمل کو بتایا تھا کہ آج وہ ڈیوٹی پر آخری بار جا رہی ہے اور وہ ایس ایچ او سے ضمانت کے کاغذات لے کر ہی آئے گی۔ وہ بہت خوش اور مطمئن تھا۔ اس نے ایک دفعہ بھی یسریٰ سے استفسار نہیں کیا تھا کہ اتنا بڑا مسئلہ اس نے صرف تین چار دن میں کیسے حل



کر لیا۔

''اگر تمہیں اچھا نہیں لگ رہا تو میں چینج کر لیتی ہوں۔'' اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ صرف اس کا دل رکھنے کے لئے پوچھ رہی تھی۔

''نہیں، مجھے یقین ہے کہ تم صرف.....' استحقاق سے بھرپور انداز تھا۔ یسریٰ نے بات ہی کاٹ دی۔

''اکمل! تم جانتے ہو کہ میں..... میں پہلے شادی شدہ تھی؟'' کپ کو ساسر میں رکھ کر وہ بے اختیار بولی۔

''ہاں، مگر تمہارے ذہن میں یہ بات کیسے آ گئی؟'' اسے ازحد حیرت ہوئی تھی کہ ان کے درمیان یہ موضوع کبھی نہیں چھڑا تھا۔

''تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہے؟''

''نہیں۔'' وہ پوری سچائی سے بولا۔

''ابھی نہیں، کل یا پھر کبھی تو ہو سکتا ہے؟''

''یہ کیا اُلٹا سیدھا سوچنے لگی ہو تم؟ جس حقیقت سے میں اچھی طرح آگاہ ہوں، پھر کبھی اعتراض کا پہلو کیوں نکالوں گا؟ میرے ساتھ کوئی زبردستی تو نہیں ہو رہی۔'' وہ یسریٰ کے سوالوں پر جھنجلا سا گیا۔

''اور اگر ایسا کچھ ہو جائے، جس سے تم آگاہ نہ ہو؟''

''مجھے تم پہ اعتماد ہے۔ تم میرے ساتھ جھوٹ نہیں بولتیں۔'' وہ دوبدو بولا۔

''بس ایسے ہی۔'' اس نے سر نفی میں ہلایا۔

''تم پریشان مت ہو، میں ابھی آتی ہوں۔'' وہ اسے اُلجھتا چھوڑ کر اندر چلی گئی۔

''اکمل.....!'' اس نے ٹی وی لاؤنج میں جا کر اسے پکارا۔ وہ چائے چھوڑ کر فوراً باہر آ گیا۔

''یہ تمہارے لئے ہے۔'' اس نے بڑا سا، پھولا ہوا پیکٹ اس کی طرف بڑھایا۔

''کیا ہے اس میں؟'' اس نے پیکٹ اُلٹتے پلٹتے پوچھا۔

''تمہارے لئے شادی کا تحفہ ہے۔'' وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔

''شادی کا تحفہ؟..... مگر ابھی شادی تو نہیں ہوئی نا۔''

''ہو گئی تو۔'' اس کی آواز دھیمی ہو گئی۔

''نہیں یار! تم رکھو۔ تب دے دینا۔'' اس نے انکار کرنا چاہا۔ یسریٰ نے وال کلاک

کی طرف دیکھا، جہاں دس بج چکے تھے۔

"دیکھو اکمل! یہ تمہارے لئے ہے۔ میرے جانے کے بعد اسے کھول لینا اور بہت سنبھال کر رکھنا۔" اس نے اکمل کے ہاتھ پرے کر دیئے۔

اسی لمحے باہر گاڑی کا ہارن سنائی دیا تھا۔ وہ دوپٹہ اوڑھنے لگی۔ جبکہ وہ گومگو کیفیت میں کھڑا تھا۔

"مجھے باہر چھوڑنے جاؤ گے؟" اسے گم صم سا دیکھ کر یسریٰ نے ہولے سے پوچھا۔

"اوں..... ہاں۔" اس نے پیکٹ، سنٹر ٹیبل پہ رکھ دیا۔

"یسریٰ! میں تمہارا انتظار کروں گا، صبح ہونے کا، تمہارے لوٹ آنے کا۔"

اس نے بیرونی دروازہ کھولنے سے پہلے اس کے سراپے کو نگاہوں کے راستے دل میں اتارا۔ اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ رینگ گئی۔ اس کے بشاش چہرے پہ آنے والی قیامت کا نہ تو خوف تھا، نہ ہی شبہ۔ وہ ہمیشہ کی طرح پُراعتماد تھی۔

اس کا فلیٹ، سیکنڈ فلور پہ تھا۔ نیچے جانے کے لئے وہ کبھی بھی لفٹ استعمال نہیں کرتی تھی۔ ریلنگ کے پاس جا کر اس نے مڑ کر دیکھا۔

وہ دروازے کی چوکھٹ کے ساتھ ٹیک لگائے الوداعی مسکراہٹ سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ مسکرا نہ سکی۔ تبھی اس کی نظریں اس کے پیروں پر پڑیں، جہاں ایک سفید کفن میں لپٹی ہوئی لاش پڑی تھی۔ اگر یہ اس کا وہم تھا تو بہت خوف ناک تھا۔ اور اگر حقیقت تھی تو ناقابل یقین تھی۔ اس نے بے اختیار سر اُٹھا کر پھر اسے دیکھا، وہ ابھی بھی مسکرا رہا تھا۔ حالانکہ کفن میں لپٹی لاش کا دایاں بازو اس کے پاؤں کے انگوٹھے کو چھو رہا تھا۔ وہ پلٹی اور تیزی سے زینے طے کر گئی۔

☆★☆

ڈرائیور اور گاڑی، ایس ایچ او نے بھیجی تھی۔ باوردی ڈرائیور کی گاڑی چلانے کی اسپیڈ بہت تیز تھی۔ وہ بیک سیٹ پہ سر ٹکا کر آنکھیں موند گئی۔ اپنی محبت اور محبوب کو بچانے کے لئے اس نے انتہائی قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اپنے بارے میں وہ کچھ بھی نہ سوچ پائی۔

سب ہو جانے کے بعد اسے کیا کرنا چاہئے؟ آیا اکمل سے شادی کر لے یا پھر..... اس پھر سے آگے اس کی سوچیں سلب اور جسم منجمد ہو جاتا۔

ڈرائیور نے گاڑی روک دی۔ خود اُتر کر گیٹ لاک کھولا اور گاڑی، پورچ میں لے



یا۔ اس نے گلاس وال سے دیکھا، اندر کی تمام لائٹس آف تھیں۔ لان اور پورچ کی سی لائٹس کی روشنی بھی بہت کم تھی۔ سارے گھر میں جامد خاموشی کا راج تھا۔ نوکروں ک کی آواز نہیں تھی۔ ڈرائیور نے آگے بڑھ کر داخلی دروازہ کھولا، ٹی وی لاؤنج کی لائٹ شن کر کے وہ رُکا نہیں تھا۔ تھوڑا سا چل کے گول زینوں سے وہ دائیں طرف مڑ گیا۔ پھر کسی روم ڈور پہ دستک دے کر قدرے پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

دروازہ ایس ایچ او نے ہی کھولا تھا۔ شاید وہ ابھی آیا تھا، اسی لئے فل یونیفارم میں وس تھا۔ حتیٰ کہ کیپ بھی سر پر موجود تھی۔

"ویلکم..... ویلکم ڈارلنگ! آ جاؤ۔" اس کے انگ انگ سے خوشی پھوٹنے لگی۔ یسریٰ ود دیکھ کر چہرے کے تھکن زدہ تاثرات تازہ دم ہونے لگے۔

"میں جاؤں سر؟" ڈرائیور نے مؤدب آواز میں پوچھا۔

"ہاں، مگر باہر ہی رہنا۔ اور دھیان سے۔ باقی کام بعد میں۔" ڈرائیور سے آہستگی سے گفتگو کر کے اس نے ڈور لاک کر دیا۔

"ہوں۔" گہری سانس خارج کرتا وہ اس کے قریب آ گیا۔ وہ ابھی بھی کمرے کے وں بیچ کھڑی تھی۔

"مجھے معلوم تھا کہ تم ایک سمجھ دار لڑکی ہو، میری بات پر اچھی طرح غور و خوض کرو گی ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے گا۔ اور دوسری راہ کا رِسک تم جیسی سمجھ دار لڑکی نہیں لے لتی۔" وہ پھیلتا جا رہا تھا۔

"تم جانتی نہیں ہو، میں کتنا خوش ہوں۔" اس نے دونوں بازو پھیلا کر اپنی خوشی کا ظہار کیا۔ وہ بے تاثر سی اُس کے ہر ہر انداز کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے تباہ کرنے جا رہا تھا ور کتنا خوش باش تھا۔

"یہ کیا؟" وہ دوپٹے کا پلو پکڑے پوچھ رہا تھا؟"

"کیا؟" اس نے دفعتہً پلو نرمی سے چھڑا لیا۔ یسریٰ کو اس کی یہ حرکت سخت بری لگی تھی۔

"یہ تم نے سیاہ لباس کیوں پہنا ہے؟" اس نے کافی ناگواری سے پوچھا۔

"کیونکہ یہ اکمل کو بہت پسند ہے۔" اسے صاف چڑاتے ہوئے وہ لاپرواسی ہوئی۔

"تم اُس لونڈے کی نہیں، آج میری دسترس میں ہو۔ اور لباس بھی میری پسند کا ہی ہو گی۔" اکمل کے ذکر نے اس کا پارہ ہائی کر دیا۔

"یہ ڈریسنگ روم ہے..... جاؤ، جا کر چینج کرو۔ میں نے تمہارے لئے ڈریس خرید لیا تھا۔"

وہ ایک لفظ بھی بولے بغیر کمرے سے ملحقہ ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔ ڈریسنگ ٹیبل کی چیئر پر ایک بڑا سا ڈبا پڑا تھا۔ اس نے ڈھکن اٹھایا، جس میں فریش ریڈ کلر کا ستارے موتیوں سے مزیّن بھاری، کامدار شلوار قمیض تھا۔ یہ سب دیکھ کر اس کا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ اختیار کا ہر حق تو وہ کھو چکی تھی۔ جہاں اتنا سب کچھ ہونے جا رہا تھا تو یہ سب بہت معمولی تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل پر لپ اسٹک اور کاجل بھی دھرا تھا۔ یہ سب یقیناً اسی کے لئے رکھا گیا تھا۔ متضاد اور منتشر سوچوں میں وہ اُلجھنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے محض دس منٹ میں زندگی میں پہلی بار کسی کے نام کا ہار سنگھار کر لیا تھا۔

اس کے باہر آنے تک وہ وہسکی اور ڈرنک ملا چکا تھا۔

"واؤ..... امیزنگ۔ بہت خوب صورت..... حسین..... بالکل پہلی رات کی دُلہن۔"

اسے سجی سنوری دیکھ کر وہ ایک جھٹکے سے صوفے سے اٹھا تھا۔ صرف آنکھوں کی ہی نہیں، ہوس کی بھوک بھی بڑھ گئی تھی۔ اس کے جسم کا بوجھ بڑھنے لگا تھا۔

"میں بھی چینج کر لوں۔" اس کے گال کو نرمی سے چھوتے وہ محبت سے بولا۔

اس نے کیپ اُتار کر بیڈ کراؤن پر رکھی اور پھر بیٹھ کر بوٹوں کے تسمے کھولنے لگا۔ بوٹ اور جرابیں اُتار کر، ریوالور نکال کر بیڈ کی دراز میں ڈال دیا اور وارڈروب سے کپڑے نکال کر واش روم میں گھس گیا۔

وہ کھڑکی کے پاس کھڑی اسے غور سے دیکھتی رہی۔ پھر خالی کمرے کی کھڑکی کھول کر آسمان کو تکنے لگی۔

☆☆☆



"تم نے تو میرا نام بھی نہیں پوچھا ستارہ بائی!" وہ کھڑکی میں اس کے پاس آ کر ہی ڑا ہو گیا تھا۔ یسریٰ کو اس کا ستارہ بائی پکارنا بہت کھلا تھا۔ اس کا جی چاہا، اس کے منہ بوٹی بوٹی نوچ لے۔

"میرا نام ستارہ بائی ہے، ایس ایچ او! نسلوں سے طوائف پیشہ ہوں۔ ہمارے ہاں طوائف، روایت کے مطابق خریدار کا نام اور حسب و نسب نہیں پوچھا کرتی۔ پھر بھی بتانا ہے تو رگوں میں دوڑتے خون کا بتا دو۔"

"ستارہ بائی!" وہ غصے سے دھاڑا تھا۔ یہ الفاظ اسے گالی بن کر چبھے تھے۔ وہ لڑکی جو ی کچھ دیر بعد اپنی عزت گنوا کر اس کے پیروں کی دھول بننے جا رہی تھی، اسے کتنا بڑا انچہ مار گئی تھی۔

"اگر خوب صورتی اور حُسن میرے دل کی کمزوری نہ ہوتے تو....."

اس کے دونوں کندھے مضبوطی سے دبوچے وہ سرخ آنکھیں لئے ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ ان اور خوب صورت لڑکی کے قرب کی مدہوشی نے اس کی غیرت کو تھپک دیا تھا۔

"خوب صورتی، تمہارے دل کی کمزوری ہے، ایس ایچ او! اور حُسن تمہارے بھوکے ں کی۔" وہ اس سے ذرا بھی خائف ہوئے بغیر اس کی آنکھوں میں دیکھتی بولی۔ "غصہ وک دو۔ ورنہ آج کی رات تمہیں اپنے تڑپتے نفس پر تھوکنا پڑے گا۔"

"آسمان پر کیا دیکھ رہی تھیں؟" بات بدلنے کی غرض سے اس نے پینترا بدلا۔

"شام میں سورج ڈوبتے وقت، آسمانا کو دیکھا تھا؟" اس نے دوبارہ آسمان کو دیکھنا روع کر دیا۔

"سچ پوچھو تو آج ہم نے نہ کچھ دیکھا، نہ ہی کوئی کام کیا۔ ہم تو تمہارے ملن کی گھڑی انتظار شدت سے کرتے رہے، جواب جا کے ختم ہوا ہے۔" وہ اسے گہری محظوظ نظروں

سے دیکھ رہا تھا۔

''ایس ایچ او! خوش قسمت ہو کہ تمہارا انتظار ختم ہوا۔ ہمیں تو ابھی مزید سُولی پر لٹکنا ہے۔'' وہ گہرے لہجے میں بولی۔

''تم نے آسمان پر کیا دیکھا تھا؟'' معاً اس نے خیال آنے پہ پوچھا۔

''آج مغرب کی طرف آسمان بڑا سرخ ہو رہا تھا۔ سن رکھا ہے، جس شام آسمان پر لالی چڑھے، سمجھ لو، کہیں کسی ناحق کا خون ہوا ہے۔'' وہ آہستگی سے ٹھہر ٹھہر کر بات کر رہی تھی۔ اس نے بالا خانے پر جنم ضرور لیا تھا، مگر وتیرہ نہیں اپنایا تھا۔ مگر گُر تو اسے سارے ازبر تھے۔

''خون۔'' اس نے زیرِ لب دہرایا۔ ''نہ ستارہ بائی! میں تو بہت شریف سا بندہ ہوں۔ کہاں کسی کا ناحق خون کر سکتی ہوں؟'' وہ اس کے کندھے پر اپنی ٹھوڑی جماتے، مخمور لہجے میں بولا۔

''ہوں..... میں تمہاری بات تھوڑی کر رہی ہوں؟'' وہ ذرا دیر کو رُکی۔ ''ویسے آپ کی شرافت کی گواہی کون دیتا ہے؟'' اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

''سارا شہر۔'' وہ ہنوز اسی انداز میں بولا۔

''اور آپ اس گواہی کے بدلے میں عملاً کیا ثبوت دیتے ہیں؟'' اس کے چہرے کو اپنے کندھے سے ہٹاتی، وہ اسے زچ کرنے پر تُلی ہوئی تھی۔

''شرافت کو کسی گواہی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ خود اپنا آپ منوا لیتی ہے۔''

''اچھا، تو طوائف کے ہاں کا رُخ کرتے ہوئے یہ شرافت کہیں گروی رکھ کر جاتے ہیں یا پھر زینے چڑھتے اپنے ہی قدموں تلے روندتے چلے جاتے ہیں؟''

''ستارہ بائی!'' اس کے لہجے سے محبت یک دم غائب ہو گئی۔ اس کی پکار میں چٹانوں کی سی سختی تھی۔ وہ اس کے ساتھ کسی قسم کی اونچ نیچ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کتنے عرصہ بعد تو وہ قابو آئی تھی۔ مگر وہ تھی کہ اسے تپانے پہ تُلی ہوئی تھی۔

''برا مت ماننا۔ ہم نے تم جیسے شرفاء بہت دیکھے ہیں۔ ایس ایچ او، جو ہمیشہ عشاء کی نماز پڑھ کر آتے ہیں۔'' وہ ابھی بھی باز نہیں آئی تھی، ایک ایک لفظ پہ زور دے کر بولی۔

''یقین کرو ستارہ بائی! ایک عرصے سے ہم نے عشاء نہیں پڑھی۔ البتہ فجر ضرور پڑھتے ہیں۔'' اس نے کمینگی سے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ وہ بہت جلد نارمل ہو گیا تھا۔



''تو آج عشاء پڑھ لو، ایس ایچ او! بلکہ میرے حصے کے بھی صرف فرض پڑھ لینا۔ قضا ہونے میں کچھ وقت ہے۔ وعدہ ہے ستارہ بائی کا، صبح کی کرن پھوٹنے سے پہلے غ کر دے گی اور صبح کی فجر میں تمہارے ثواب کی بھی پڑھ دوں گی۔''

اس کا ٹھنڈا ٹھا سا لہجہ، برف کا، نہ پگھلنے والا تو وہ لگ رہا تھا۔ کافی دیر تک وہ بھی کچھ ل سکا۔

''بری نہیں لگ رہیں۔ میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں، ہر چراغ بجھنے سے پہلے تا ضرور ہے۔'' اس کے بالوں کی لٹ نکال کر انگلی پہ لپیٹتے ہوئے وہ اس کے جسم میں لگا گیا تھا۔

''تم یقیناً یہ نہیں جانتے ہو گے، ایس ایچ او! کہ اس بجھنے والے چراغ کے قریب بھی دامن بچا کر گزرنا چاہئے۔ کیا خبر، ٹمٹماتا شعلہ، آگ پکڑ لے۔''

''اچھی لگی۔ بہت ہی اچھی۔ پہلی طوائف دیکھی ہے، جو بات سیدھی منہ پر مارتی ۔ ہم تمہیں یہاں صرف بحث کرنے یا تمہاری زبان سے استفادہ کرنے کے لئے تو ں لائے نا۔'' وہ اس کے کان میں سرگوشی کرتا، اُس کے گرد بازو لپیٹ گیا تھا۔

☆★☆

''ستارہ بائی! میں نے قسم کھا رکھی تھی کہ جب تک تم نہیں ملتیں، اپنا حساب بے باق ں کرتا، تب تک میرے بیڈ روم میں دوسری عورت نہیں آئے گی۔ حتیٰ کہ میری بیوی نہیں۔ اب میں اپنی بیوی اور بچوں کو لینے امریکہ جاؤں گا، چند دنوں میں۔'' اس نے یڈ دراز سے اپنا ٹکٹ اور پاسپورٹ نکال کر دکھایا۔

''قسم تو میں نے بھی اٹھا رکھی تھی، ایسا ایچ او! کہ مجھے چھونے والا صرف ایک مرد ی زندگی میں آئے گا، وہ میرا شوہر ہو گا۔''

وہ تکیوں کے سہارے ٹیک لگائے کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح بیٹھی تھی۔

رات کی سختی کٹ چکی تھی۔ سیاہ گھنگھور اندھیرا اپنے وسیع سینے میں ایک اور گنہگار ت کا راز چھپائے دھیمے دھیمے گھٹتا جا رہا تھا۔

''تمہاری قسم تو ٹوٹ گئی۔'' وہ صاف مذاق اُڑاتا، مسخرے پن سے بولا۔

''کہتے ہیں، قسم ٹوٹ جائے تو کفارہ ادا کرنا پڑتا ہے۔'' وہ چھت کو یک ٹک گھورتی، ائز ہوتی لگ رہی تھی۔

"تم اسے اپنی غلطی سمجھ کر بھول جانا۔ ویسے بھی اب باقی کی ساری زندگی تمہیں ایک ہی مرد کے ساتھ گزارنی ہے۔" اس کی بات سنی ان سنی کرتا وہ اسے مسخرے پن سے مشورہ دے رہا تھا۔

"غلطی انسان بار بار دہراتا ہے، ایس ایچ او! اور بھولتا جاتا ہے۔ اس کی پکڑ بھی کم ہوتی ہے۔ جو کام انسان چاہے ایک بار ہی کرے، وہ اس کے ضمیر پر نہ بولنے والے بوجھ کے مانند دھرا رہ جائے، اسے گناہ کہتے ہیں۔ اور گناہ کا کفارہ تو بنتا ہے نا۔"

وہ ابھی بھی اپنی بات پر قائم تھی۔ اتنی جلدی گناہ ثواب کے چکر میں پڑنے والے، خود کو تباہ کرنے کی کوئی صورت نہیں چھوڑتے۔ توبہ استغفار بھی انہیں مطمئن نہیں کرتی۔ ان کی روح گناہ کے گناہ گار لمحوں میں پلٹا کھا کر جسم سے دُور ہو جاتی ہے۔ تڑپتی، دربدر ہوتی وہ اپنے متضاد جسم کو بھی پُرسکون نہیں ہونے دیتی، جیسے روح کی بے قرار گردش تیز ہوتی ہے، ویسے ہی جسم اپنے مدار سے ہٹنے لگتا ہے۔ ضمیر کا بوجھ، کفارہ، اضطراب، بے چینی ..... کسی پل قرار نصیب نہیں ہوتا۔

"تمہارے لئے یہ گناہ ہے تو تم شوق سے کفارہ ادا کرو۔ جب کہ میرے لئے تو یہ ایک غلطی ہے۔ غلطی بھی ایسی معمولی جسے میں اکثر دہراتا رہتا ہوں۔"

"مان جاؤ، ایس ایچ او! دونوں مل کر اس بوجھ کو ہلکا کر دیتے ہیں۔" اس نے اپنا ہاتھ اس کے گھٹنے پر رکھ دیا۔

"کیا بکواس کر رہی ہو تم؟ بکے چلے جا رہی ہو۔"

وہ بہت نارمل انداز میں اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اب اس نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا تو اسے محسوس ہوا، وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہے۔

"تمہیں کچھ یاد ہے، کتنا عرصہ گزرا، تم نے کسی کے جنازے میں شرکت کی تھی؟" اس نے بڑے مدھم سے لہجے میں پوچھا تھا، مگر وہ سن چکا تھا۔

"پاگل ہو گئی ہو تم، جاؤ جا کر سر میں ٹھنڈا پانی ڈالو۔ تمہارے ہوش ٹھکانے آئیں۔" وہ جھنجلا کر کہتا اس کے پاس سے اُٹھ گیا۔

اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا، جہاں پونے چار بج رہے تھے اور پھر کمرے سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد اندر آیا تو وہ ابھی بھی یونہی بیٹھی تھی۔ بالکل گم صم۔

"تم سے ابھی باقی کا حساب بھی چکتا کرنا ہے۔" اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں کو اس نے نفرت سے دیکھا۔ "جلدی کرو، ایس ایچ او! وقت بہت کم ہے۔"



"اُٹھو۔" اس نے بازو سے پکڑ کر اسے کھینچا۔ "اپنے بال سمیٹو اور حلیہ درست کرو، کوئی آنے والا ہے۔"

وہ اس کے یوں اُٹھانے پر اُٹھ کر واش روم میں چلی گئی۔ منہ پر پانی کے چھپکے مارنے سے اس کی آنکھیں کھل سی گئیں۔ ذہنی کیفیت بھی کسی حد تک بحال سی ہو گئی تھی۔ اب کی بار وہ بیڈ پر بیٹھنے کے بجائے چپ چاپ صوفے پر بیٹھ گئی۔ جبکہ وہ کمرے میں بے چین سا دائیں سے بائیں چکر لگا رہا تھا۔ گاہے بگاہے وہ ایک نظر اس کے جھکے ہوئے سر پر بھی ڈال لیتا۔ اسی دم دروازہ کسی نے بہت زور سے بجایا تھا۔

اس کے ہونٹوں پر شیطانی سی مسکراہٹ تھی۔

"میں نے کہا تھا نا، کہ ابھی باقی کا حساب چکتا کرنا ہے۔" اسے وارننگ دیتے اس نے جا کر دروازہ کھول دیا۔

آنے والا جیسے قدم اس کی طرف بڑھا رہا تھا۔ اس کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا جسم ہولے ہولے کانپنے لگا تھا۔ وہ اس کے قریب آ کر رک چکا تھا۔ وہ سر اُٹھا کر دیکھے بغیر بھی جان گئی تھی کہ وہ کون تھا؟ اُس کی آہٹ، اس کے دل میں ہمیشہ سے نقش تھی۔

"اوکے ینگ مین! تم اسے لے جاؤ۔ اور پیپرز بھی۔" اس کا شانہ تھپتھپا کے اُس نے سنٹر ٹیبل پر دھرے پیپرز کی طرف اشارہ کیا۔ "میں اب شاور لوں گا۔" بھرپور انگڑائی لیتا وہ ہٹ گیا تھا۔

اس نے اپنے دونوں آہنی ہاتھوں سے اس بت کو جکڑ کر سیدھا کھڑا کر دیا تھا۔ اس کے جسم سے نکلتی گرم تپش اسے بھی جھلسا گئی تھی۔

"یہ جو میری آنکھوں میں اس وقت نفرت ہے نا، تمہارے لئے نہیں، خود اپنے لئے ہے۔" اس کی آنکھوں کے ساتھ ساتھ لہجہ اتنا زہر خند تھا کہ وہ لمحہ بھر سے زیادہ دیکھ نہ سکی۔

"میں تمہیں اپنے وجود کا حصہ سمجھتا رہا، میرا وجود اتنا غلیظ نہیں ہو سکتا۔ میں تم پر اعتبار کرتا رہا، تم نے اعتبار سمیت مجھے بھی روند ڈالا۔ تم کہتی گئیں اور میں یقین کرتا چلا گیا۔ لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ اس یسریٰ نامی خوب صورت چہرے کے پیچھے ستارہ بائی کا مکروہ چہرہ چھپا ہے۔" اس نے پاگل ہوتے اسے پوری طاقت سے اندھا دھند دھکیل دیا تھا۔

وہ بے توازن سی صوفے اور سنٹر ٹیبل کے بیچ جا گری۔ دوپٹہ اُلجھ کر نیچے گر گیا۔ اس کا

پاؤں، ٹیبل کے ساتھ اتنی زور سے ٹکرایا تھا کہ انگوٹھے کا ناخن آدھا اُکھڑ گیا۔ سرخ خون ساری اُنگلیوں پہ بہہ گیا تھا۔ مگر تکلیف کی انتہائی شدت بھی اسے درد نہ دے سکی۔

یسریٰ کے کہنے کے مطابق اس نے جانے کے بعد پیکٹ کھولا تھا، جس میں سے کافی کاغذات پھسل کر اس کے پیروں میں گر گئے تھے۔ اس نے جھک کر ان کاغذات کو اُٹھا کر کھولا، وائٹ کلر کے لفافے میں رضوان کمپنی کی طرف سے اپائنٹمنٹ لیٹر تھا، اسی طرح کے ایک اور لفافے میں ساٹھ ہزار کی رقم اور تیسرے میں فلیٹ کی رجسٹری تھی، جو اب اس کے نام منتقل ہو چکی تھی۔ یہ سب کیا تھا؟ وہ یہ سب اسے کیوں دے گئی تھی؟

بہت سے سوال تھے۔ اور ان کے جواب اسے ساڑھے تین بجے کے قریب مل گئے تھے، جب باوردی ڈرائیور اسے لینے آیا تھا۔ اس نے ایس ایچ او کا کارڈ دکھایا تھا اور یسریٰ کی مختصر سی بات بھی۔ اسی ڈرائیور کے ہمراہ وہ یہاں تک پہنچا تھا۔

''کیوں کیا تم نے ایسا، ذلیل عورت! کیوں؟..... بولو، ورنہ میں تمہارا خون کر دوں گا۔'' وہ وحشیوں کی طرح اسے جھنجوڑنے لگا تھا۔

''میرے پاس تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں ہے۔'' اس کے حواس ٹھکانے ہی کب رہے تھے؟ اس کے ہاتھ جھٹکنے کی ناکام کوشش کرتی، وہ حلق کے بل چیخی تھی۔

''نہیں، تم بتاؤ گی کہ تم نے میرے ساتھ دھوکا کیوں کیا؟..... ورنہ میں تمہارا گلا دبا دوں گا۔ تم نے میرے سچے جذبات کو مار ڈالا، میرے تمہارے وجود کو ختم کر دوں گا۔''

اس نے دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبوچ لیا۔ اس کی سرخ انگارہ ہوتی آنکھیں اس کے اتنی قریب آ چکی تھیں کہ ان میں صرف نفرت ہی نہیں، حقارت بھی صاف جھلک رہی تھی۔ وہ کیونکر اُسے یقین دلاتی؟

''میں یسریٰ نہیں ہوں، ستارہ بائی ہوں..... ستارہ بائی۔'' اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر پرے دھکیلتے اس سے اپنا آپ چھڑایا تھا اور زمین پر بیٹھ کر کھانستی چلی گئی۔ رات جس پکار پر اس نے ایس ایچ او کو تخم کی گالی دے دی تھی، رات کے اسی پہر میں اس نے خود اس حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا۔

''کیوں چھپایا تم نے، کہ تم طوائف ہو؟'' پنجوں کے بل بیٹھا اس کا منہ اونچا کیے پوچھ رہا تھا۔ مگر اس کے دھیمے لہجے میں شکست خوردگی سی تھی۔ ٹوٹ کر بکھر جانے کا عمل



کتنا جان لیوا ہوتا ہے۔

''اک گھر بنانے کے لئے۔'' وہ رو دی تھی۔

''گھر.....'' وہ استہزائیہ ہنسا۔ ''گھر تو اک مرد سے بنتا ہے۔ تم جیسی عورتیں، جن کے نہ جانے کتنے مرد.....''

''گالی مت دو اکمل!..... مت دو گالی۔'' اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر وہ بے بسی سے دھاڑی۔

''ہاں، تمہیں رات کے اس پہر، اس حالت میں ایک غیر مرد کے بیڈروم میں دیکھ کر بھی گالی نہ دوں، حقیقت تمہیں گالی لگتی ہے، ٹھیک کہتی ہو تم ستارہ بائی!..... برائی کو کبھی گالی نہیں دی جاتی۔'' وہ سانپ کے مانند پھنکار اٹھا اور تیزی سے باہر نکلتا چلا گیا۔

رگوں کی گردش تھم کر اسے بے جان سا کر رہی تھی۔ شاید یہ سب پہلے سے طے ہو چکا تھا کہ اس نے اکمل کے پاس واپس نہیں جانا تھا، مگر اس طرح سے تو نہیں کہ وہ اس کی نفرت کے قابل بھی نہ رہی۔ اسی لمحے جب وہ اپنی زندگی ہارے، لاوارث بیٹھی تھی، ایس ایچ او، واش روم سے نکل آیا۔

''اب میرا حساب بے باق ہوا۔'' اس کے بلند و بانگ طنزیہ قہقہے پر اس نے مڑ کر دیکھا اور دیوانہ وار اُٹھ کر اکمل کے پیچھے بھاگی۔

وہ ابھی لان میں تھا کہ اس نے جا لیا۔

''اکمل.....!''

''میرا نام اپنی گندی زبان سے مت لو۔ نفرت ہے مجھے تم سے، تمہارے غلیظ وجود سے۔''

''تم نفرت کرو مجھ سے، ستارہ بائی سے، ایک طوائف سے۔ مگر یسریٰ سے نہیں، جو تم سے محبت کرتی تھی۔ کیونکہ میں نے یسریٰ سے ستارہ بائی کا سفر ایک رات میں طے کیا ہے۔'' وہ اس کے پیروں میں سر رکھے بے تحاشا رو دی تھی۔

وہ اسے خود سے پرے دھکیل کر چلے جانا چاہتا تھا، مگر وہ ایسا کر نہ سکا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ مجھے تم سے نفرت ہے، تم نے میرے یقین، مان کو توڑا ہے۔ مگر وہ متزلزل کیوں ہو رہا تھا؟ اس لڑکی کے آنسو اس کے دل کی زمین بھی گیلی کر رہے تھے۔ اس لڑکی میں وہ ہمیشہ اپنی زندگی تلاشتا تھا، جس نے اسے زندگی سے منہ چھپانے پر ہی مجبور کر دیا تھا۔

''تم نے یہ سب کرنے سے پہلے ایک بار بھی نہیں سوچا؟..... میری محبت میں تو

کہیں کھوٹ نہیں تھی۔" وہ خود بھی حوصلہ ہارتا جا رہا تھا۔ دو ضدی آنسو، روکنے کے باوجود بہہ گئے۔

"تمہیں دھوکا نہیں ہوا، یسریٰ کی تم سے محبت دھوکا نہیں تھی، دھوکا تو صرف ستارہ بائی تھی، جو کل رات یہ قدم اٹھانے سے پہلے یسریٰ کو سفید کفن میں لپیٹ کر تمہارے قدموں میں چھوڑ آئی۔ بہت بار میں نے سوچا، مگر اس کے سوا کوئی اور رستہ نہیں تھا۔ میں صرف ایک روپ میں زندہ رہ سکتی تھی، یسریٰ بن کر یا ستارہ بائی۔ یسریٰ بن کر مجھے کوئی جینے نہ دیتا۔ میں نے یسریٰ بننے کے لئے بائیس سال ظلم سہے، مگر میری ضد نہ ٹوٹی مگر..... مگر تمہاری محبت نے مجھے توڑ دیا۔ میں ہار گئی اکمل!..... صرف ایک رات میں سب کچھ ہار گئی، اپنی عزتِ نفس کی دھجیاں کر دیں، تمہیں بچانے کے لئے ستارہ بائی بن گئی۔ مار دیا یسریٰ کو میں نے..... مار دیا۔"

"میں کل بھی یقین کرتا تھا تم پر اور اب آخری بار پھر کر رہا ہوں۔ اگر یسریٰ مر گئی ہے تو تم مجھے جانے دو ستارہ بائی!..... میرے قدم چھوڑ دو، میری راہ کھوٹی مت کرو۔"

ضبط ڈانواڈول تھا۔ اسے اپنے بھیگتے گالوں کا احساس نہیں تھا۔

ٹوٹ کر بکھرنے کا عمل کتنا جان لیوا ہوتا ہے۔ جذبے تو ہمیشہ بے اختیار ہی ہوا کرتے ہیں نا!"

"جاؤ، چلے جاؤ۔" وہ اپنا سارا حوصلہ مجتمع کر کے اس کے پیروں سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"مگر جانے سے پہلے اپنے آنسو پونچھ لو۔ کیونکہ طوائف کے پاس سے آنسو لے کر جانے والے کو لوگ دیوانہ ہی نہیں بلکہ نجس اور ناپاک بھی کہتے ہیں۔"

اس نے بڑی عقیدت و احترام سے اپنی ہتھیلیوں سے اس کے گالوں کو رگڑا، نم آنکھوں کو جھکا کر اس کے پیروں کا بوسہ لیا۔

اکمل نے دُھندلی ہوئی آخری نگاہ اس پر ڈالی۔ آج وہ پہلی بار اس کے سامنے بغیر دوپٹے کے تھی، ورنہ وہ دوپٹہ ہمیشہ بہت اچھی طرح اوڑھا کرتی تھی۔ کھلے، بکھرے سلکی بال، متورم چہرہ، زرد رنگت، اندر کو دھنسی آنکھیں اور سرخ جوڑا، گالوں پر بہتا کاجل۔

شاید وہ ایک لمحے کی دیر کرتا تو زندگی بھر جا نہ پاتا۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتا دور چلا گیا۔

اس کے باہر نکل جانے تک اس نے سانس روکے، اس کے قدم گنے تھے۔ پھر سر



ما کر آسمان کی طرف دیکھا۔ رات کا سیاہ اندھیرا اب سرمئی رنگت میں بدلتا جا رہا تھا یعنی ح طلوع ہونے میں کچھ دیر تھی۔ وہ آنکھوں میں انتقام کی بھڑکتی آگ لئے، ایس ایچ او ے کمرے کی طرف بڑھی۔ کمرہ خالی تھا۔ واش روم کا دروازہ کھلا تھا۔ اس نے ڈریسنگ م کا ہینڈل گھمایا، کمرہ لاک تھا۔ وہ لمبے لمبے سانس لیتی اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ کچھ یاد نے پر اس نے پھرتی سے بیڈ کراؤن کا دراز کھول لیا۔ ایس ایچ او کا ریوالور موجود تھا۔ ا نے ریوالور غور سے دیکھا اور اس کا سیفٹی کیچ احتیاط سے ہٹا دیا۔ اسے دونوں ہاتھوں ا مضبوطی سے درست سمت میں تھام کر رخ ڈریسنگ روم کی طرف موڑ دیا۔

بالوں میں انگلیاں چلاتا وہ مسرور سا باہر نکلا تھا، مگر خود سے تقریباً چھ فٹ دور کھڑی ت اُسے ساکت کر گئی۔

"سس..... ستارہ....." الفاظ حلق میں ہی اٹک گئے تھے۔

"کہا تھا نا، ایس ایچ او! کہ صبح ہونے تک فارغ کر دوں گی۔ اور یہ بھی کہا تھا کہ گناہ کفارہ ادا کر دینا چاہئے۔ میرے اس گناہ کا کفارہ، تمہاری موت ہے، ایس ایچ او!"

وہ اس قدر بپھری ہوئی تھی کہ الفاظ ادا کرنے کے لئے اسے حلق پر خاصا زور دینا پڑا۔

"دیکھو..... میری بات....."

"نہیں، ایس ایچ او!..... نہیں۔" اس نے چیختے ہوئے بات کاٹی اور اندھا دھند فائر ل دیا۔

"خس کم جہاں پاک۔"

☆☆☆

اللہ ھُو..... اللہ ھُو..... اللہ، اللہ..... ھُو اللہ

اللہ ھُو..... حق اللہ ھُو..... اللہ، اللہ..... ھُو اللہ

او کھے پینڈے لمبیاں نے راہواں عشق دیاں

درد جگر تے سخت سزاواں عشق دیاں

اللہ ھُو.....

دربار کے اندر، بیچ احاطے میں لکڑیوں کا ڈھیر جلا کر الاؤ روشن کیا گیا تھا۔ احاطے پیچھے خالی جگہ پر لنگر پک رہا تھا، جہاں ہر وقت تین چار دیگیں چڑھی رہتیں۔ دربار باہر والی دیوار کے ساتھ مست، ملنگ، فقیر، عقیدت مند، بیعت کرنے والے، مانگنے

والے، غرض کہ ہر طرح کے لوگ بیٹھے رہتے۔ ان میں سے بہت سوں کا ڈیرہ یہاں مستقل تھا۔ برگد کے موٹے تنے کے ساتھ ٹیک لگائے ہمیشہ کی طرح پاک دامن بی بی، سر بیھوڑائے اپنے آپ سے بے نیاز بیٹھی تھی۔ چادر کا پلو، گھونگھٹ کے انداز میں آگے کو سرکا ہوا تھا۔ دوسری طرف قوال، چوکی بھرنے کی تیاری میں تھے۔

سفید، سرمئی اور مصری کبوتر، دربار میں جگہ جگہ غٹرغوں کرتے دانہ کھا رہے تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی دربار کو غسل دے کر سبز اور سیاہ چادریں صاف کر کے ڈالی گئی تھیں۔ عقیدت مند آ جا رہے تھے۔ ایک پُرسکون سی خاموشی تھی، جیسے ہر ذی روح، مدہوشی کی حالت میں ہو یا پھر کائنات دھیمے سے گردش میں ہو۔

جب دربار کے اندر ہر کوئی کچھ نہ کچھ کرنے میں مصروف تھا، دو سنجیدہ سے مرد دربار میں داخل ہوئے۔ وہ اِدھر اُدھر دھیان دیئے بغیر بوڑھے فقیر درویشوں کے پاس آ گئے، جہاں سائیں مست الست، پتلی کالی سیاہ چائے کی پیالی سُڑک سُڑک کر کے پی رہا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی پیالی رکھ کر فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور بنا کچھ کہے خاموشی سے چلتا ہوا برگد کے درخت کی طرف آ گیا، جس کے نیچے پاک دامن بی بی، ڈیرہ ڈالے بیٹھی تھی۔

پاک دامن بی بی، گھونگھٹ نکالے، برگد کے موٹے تنے کے ساتھ سر ٹکائے، سائیں ظہور کے کلام میں ڈوبی ہوئی تھی۔ یہاں مستقل رہنے والے لوگ، پاک بی بی کے بارے میں بہت کچھ جانتے تھے۔ کچھ قیافہ شناس بھی تھے۔ مگر چند ایک لوگ ہی اس بات سے آگاہ تھے کہ پاک دامن بی بی کو کبھی کبھار رات کے آخری پہر دورہ پڑتا تھا، تب وہ دربار کی غلام گردش میں ننگے پیر چک پھیریاں لگاتی پھرتی تھی اور صبح کی پو پھٹنے تک ماتم کرتی رہتی تھی۔ اس کے رونے کی آواز، درختوں پہ بسیرا کئے دن بھر کے تھک ہار کے لوٹے پرندوں کو بھی بے چین کر دیتی تھی۔

ان گزرے چھ سالوں میں ایسی ہی ایک رات سائیں مست الست اس کا راز پا گیا تھا۔ اس رات بھی پاک دامن بی بی کو دورہ پڑا تھا۔ ماتم کناں ہونے کے بعد اس نے ہمیشہ کی طرح فجر کی نماز پڑھی تھی۔ مگر وہ سارے درود و وظائف نہیں کئے، جو برگد کے ساتھ ٹیک لگائے، رات تک جاری رکھتی تھی۔ وہ صرف درود پاک پڑھتی رہی۔

اسے آج اپنا اندر بہت خالی خالی سا محسوس ہو رہا تھا، بہت ہلکا پھلکا۔ جو گناہ اس کے جسم پر بوجھ لگا کرتا تھا۔ جس کے لئے وہ اللہ کے حضور گڑگڑا کر معافی کی طلب گار تھی وہ گناہ شاید آج معاف ہو گیا تھا۔ اب وہ صبح سے بے سدھ سی بیٹھی تھی۔



"پاک دامن بی بی! آپ سے کوئی ملنے آیا ہے۔" سائیں نے سر جھکا کر، ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔ لوگوں کی وہ پہلے بھی کم ہی سن پاتی تھی، مگر آج تو سنوائی ہی نہیں تھی۔

"بی بی جی! اس درگاہ سے کوئی آس والا، خالی نہیں لوٹا۔ نظرِ عنایت کریں۔" اب کی بار سائیں کی آواز میں عاجزی تھی۔

وہ ان سے بولنے پر اصرار کیوں کر رہا تھا۔ بی بی نے تو کبھی بھی کسی کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ آنے والوں نے کچھ اُلجھن بھری نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور سائیں مست کی طرف مشکوک نگاہوں سے۔ ان دونوں کے چہروں سے بے قراری کے ساتھ اُمید بھی جھلک رہی تھی۔ مگر ایک تو شاید رو بھی دیا تھا۔ سائیں نے ان میں ایک کو اشارہ کیا کہ وہ کچھ بولے۔

"السلام علیکم!..... کیا آپ نے ہمیں پہچانا نہیں ہے؟" ان میں سے ایک بولا اور کہنے کے ساتھ ہی اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا تھا۔ کیونکہ چہرے پر تو گھونگھٹ تھا۔ وہ بھلا کیسے دیکھ سکتی تھی؟ اس کا جی چاہا کہ وہ یہ گھونگھٹ اُلٹ دے، تاکہ سارا تجسس ختم ہو جائے۔ کافی دیر اپنے سوال کا جواب انتظار کرنے کے بعد وہ پھر سے بولا۔

"اچھا، آپ کچھ نہ بولیں۔ مگر ہمارے ایک سوال کا جواب تو سر ہلا کر دے سکتی ہیں نا۔ کیا آپ کا نام یسریٰ ہے؟" وہ کب سے مراقبے کی حالت میں بیٹھی ہوئی تھی، اسے بالکل خبر نہیں تھی کہ کوئی اس کے قریب آ کر بیٹھا اس سے باتیں کر رہا ہے۔ مگر سامنے بیٹھے شخص کے منہ سے نکلا نام اس کے شعور میں کھٹک گیا۔ الفاظ بہت غیر متوقع تھے۔ درود پاک کا ورد کرتے اس کے ہونٹ اس نام پہ تھم سے گئے۔ اب کی بار بھی دوسری طرف مسلسل خاموشی محسوس کر کے بولنے والے مرد نے سائیں مست الست کو آنکھ بھر کے گھورا، جس نے انہیں گونگے بت کے سامنے لا بٹھایا تھا۔ اس نے اپنے ساتھ آنے والے مرد کو ٹہوکا مار کر اُٹھنے کا اشارہ کیا، جس کے ہر انداز میں ایک تڑپ سی تھی۔

"میں جانتا ہوں، آپ کسی سے بات نہیں کرتیں، مگر آپ کو میرے سوالوں کا جواب دینا ہو گا۔ آپ یسریٰ ہیں نا؟..... پلیز بتائیں۔" اس کے ٹہوکے کو نظر انداز کر کے کب سے خاموش بیٹھا اب التجا کر رہا تھا۔

پاک دامن بی بی کے درود پڑھتے ہونٹ تو کب سے ایک دوسرے میں پیوست ہو چکے تھے۔ اس نے بھاری پپوٹوں اور بھیگی پلکوں کو معمولی سی حرکت سے اٹھایا۔ کئی سالوں

سے جھکے سر کو دائیں سے بائیں ہلایا۔ اپنے ہلتے ہوئے گھونگھٹ کی اوٹ سے اپنے سامنے بیٹھے شخص کو دیکھا، جس کے ہونٹ اور تھوڑا سا ناک نظر آئے تھے۔ وہ اسے کیسے بھول سکتی ہے؟

ان گزرے سالوں میں بھی اس شخص کے خدوخال اُس کے دلی پر مدھم نہیں ہوئے تھے۔ اس کی شناخت وہ گزرتے اتنے سالوں میں بھی نہیں بھولی تھی۔ وہ تڑپ تو آج بھی اس آخری رات کی سی تھی۔ اس کے اور اللہ کے درمیان کئی بار یہ شخص حائل ہوا تھا۔ اس نے بڑے سجدے کئے، بڑا گڑگڑائی تھی۔

وہ ہمیشہ جذب اور عقیدت کے ساتھ گامزنِ سفر ہوئی، مگر یہ شخص، رکاوٹ کا باعث بن کر اسے زمین پر لا پٹختا۔ ایسا ہر بار کیوں ہوتا تھا؟ اس نے ہزار دفعہ اللہ سے شکوہ کیا اور آج اس شکوے کا جواب مل گیا تھا۔

اس رحمان و رحیم نے نہ صرف اس کی توبہ قبول کر لی تھی بلکہ اس کی رُوٹھی ہوئی کائنات اس کے سامنے ڈھیر کر دی تھی۔

شاید وہ خود سے بولتے بولتے مایوس ہو کر اُٹھ کر جانے لگا تھا۔ جب قدموں میں لفظ کی بھاری زنجیر آ پڑی۔

''اکمل!'' سرگوشی میں ڈھلی آواز، پھولتی ہوئی سانسوں سے نکلی۔

''یسریٰ.....!'' اس کے لہجے میں حد سے زیادہ بے یقینی تھی۔ وہ واپس بیٹھ گیا۔

''دائم، دبئی سے چار ماہ قبل ہی پاکستان شفٹ ہوا تھا۔ اس وقت بھی ہمیشہ کی طرح دائم ہی اکمل کے ساتھ تھا۔ تین دن پہلے ہی سائیں مست الست ان تک بڑی مشکلوں سے پہنچا تھا اور انہیں یسریٰ کے بارے میں بتایا تھا۔ دائم اب تک بے یقین تھا اور اپنی جگہ جم سا گیا تھا۔

''یسریٰ باجی!'' بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ شاید یہ حادثہ بہت بڑا تھا، جس کی امید کسی کو بھی نہیں تھی۔

وہ رونے لگی۔

☆★☆

آج سے چھ سال پہلے وہ اس رات اسے چھوڑ کر بلکہ ٹھوکر مار کر آیا تھا۔ چند دن اتنے بے سکون اور مضطرب گزرے تھے، اس نے کئی دفعہ سوچا کہ وہ خودکشی کر لے۔ وہ



زندہ کیوں ہے؟ مگر وہ کسی ایسی لڑکی کے لئے خود کو ختم کیوں کرتا، جو اسے کتنی خوب صورتی سے دھوکا دے گئی۔ اور پھر ختم تو وہ ہو ہی چکا ہے۔

جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا، بیتے لمحے اور تمام واقعات اسے بہت کچھ باور کراتے جا رہے تھے۔ ستارہ بائی سے یسریٰ بننا، رضوان اور سائرہ باجی کے گھر کے باہر بے ہوش ملنا، ہسپتال کی جاب، شادی شدہ ہونے کا جھوٹ اور خود اس کے ساتھ ایک سال رہنا۔ ان سارے واقعات کی کڑی سے کڑی ملا کر ایمان داری سے تجزیہ کیا تو بہت کچھ واضح ہوتا گیا۔ کچھ بھی تھا، اس رات اسے ایس ایچ او کے بیڈروم میں اس حالت میں دیکھنے کے باوجود بھی وہ اس سے اتنی شدید نفرت نہیں کر پایا تھا، جتنی اس جیسے مضبوط کردار کے شخص کو کرنی چاہئے تھی۔ اور پھر ایس ایچ او کا قتل..... وہ مزید اُلجھ گیا۔

اس سے لڑنے جھگڑے، ضد باندھنے اور بے تحاشا رونے کے سترہ دن بعد وہ ٹوٹا ہوا، سڑکوں پر مارا مارا یسریٰ کو ڈھونڈ رہا تھا۔ تمام حالات کے مشاہدے نے اسے باور کروا دیا تھا کہ وہ تو کچھ بھی لے کر نہیں گئی تھی۔ اس کے حصے تو کچھ بھی نہیں آیا۔ بلکہ اپنی سب سے قیمتی متاع، عزتِ نفس بھی ہار گئی تھی۔ اس کے لئے..... اسی کے لئے نا! اپنی محبت، اکمل کے لئے نا۔

جب اس نے آخری رات اسے دھتکارا تھا، وہ تب بھی خالی ہاتھ تھی اور وہ کتنے حق کے ساتھ اس کے فلیٹ پر آ گیا تھا۔ اس کا سگا باپ، جس کا خون اُس کی رگوں میں زندگی بن کر دوڑ رہا تھا، اُسے عاق کر چکا تھا اور وہ جس پر اپنی زندگی چھیننے کا الزام عائد کر رہا تھا، اسے اپنا بچا کھچا سرمایہ بھی سونپ گئی تھی۔ اس کے خونی رشتوں نے چھت چھینی تھی، جب کہ وہ اپنی چھت میں اسے پناہ دے گئی تھی۔ اس نے یسریٰ کو بہت ڈھونڈا تھا۔ وہ اس کے پیروں میں گر کر معافی مانگ کر اسے منانا چاہتا تھا۔ اس فلیٹ کو خود اس نے کئی بار گھر کہا تھا۔ وہ اسے واقعی گھر بنانا چاہتا تھا۔ وہ ہر چہرے کو متلاشی نظروں سے جانچتا۔

چھ سال یوں ہی گزر گئے۔ کہ ایک شام فقیر کے حلیے جیسا بندہ، اس کے پاس آیا۔ اسے ساری تفصیل بتائی کہ یسریٰ کہاں ہے۔ وہ ہکا بکا رہ گیا۔ اسے لگا کہ اللہ نے اس کے لئے کوئی فرشتہ بھیجا ہے۔ مگر وہ فرشتہ نہیں، بلّن تھا..... ہاں، بلّن! اُس کی حرکتوں کی وجہ سے ستارہ نہ ستارہ رہی تھی، نہ یسریٰ.....

ستارہ کے کوٹھے سے آنے کے بعد ایک تباہی نے ان سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سب سے پہلے تو ایس ایچ او نے انہیں دھرا اور سب کے سامنے ہی ایس ایچ او نے قسم کھائی کہ جب تک ستارہ بائی مل نہیں جاتی، وہ کسی دوسری عورت پر نگاہ بھی نہیں ڈالے گا۔

وہ چوٹ کھائے سانپ کی طرح پھنکارتا پھر رہا تھا اور بلّن کا ایس ایچ او سے واسطہ پرانا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ زبان کا کتنا پکا آدمی ہے۔ دوسرا جھٹکا اُنہیں چاندنی کی خفیہ شادی اور بیرونِ ملک روپوش ہو جانے نے دیا اور تیسرا، شمع کی پھندا لگا کر لٹکتی ہوئی لاش نے۔

جہاں آرا بیگم کا تو یوں بھی آخری وقت تھا اور تمنا بائی، غم کب تک سہہ سکتی تھی۔ اس نے بھی خاموشی سے کفن کی سفید چادر اوڑھ لی۔ رہ گیا، خالی ہاتھ بلّن۔ اسے درباروں کے علاوہ جگہ مل بھی کہاں سکتی تھی۔ اپنے آپ سے بے زار و بے نیاز اور دنیا کے دھتکارے ہوئے، ان ہی جگہوں پہ پائے جاتے ہیں۔

یہ قسم کی مہربانی تھی کہ جس دربار میں بلّن کا ڈیرہ تھا، وہیں یہ یسریٰ بھی آ کر گوشہ نشین ہو گئی۔

ایس ایچ او کی موت کی خبر آگ کی طرح پھیلی تھی، جو بلّن نے بھی سنی اور پھر ڈرائیور کا بیان بھی شائع ہوا کہ

"رات صاحب کے کمرے میں کوئی لڑکی تھی، اس نے قتل کیا ہوگا۔"

مگر ڈرائیور نے خود کو بچانے کی خاطر یہ چھپا لیا کہ وہ اس لڑکی کو خود جا کر لایا تھا، وہ اس کا فلیٹ بھی جانتا ہے۔ بلّن کو سو فیصد یقین تھا کہ یہ سب کچھ ستارہ نے کیا ہے۔

چھ سال گزر گئے، تب اس نے ایک رات دربار میں گھٹی گھٹی رونے کی آواز سنی۔ وہ آواز کے تعاقب میں دربار کی غلام گردش کی طرف آ گیا۔ برگد کے نیچے بیٹھنے والی، پاک دامن بی بی رو رہی تھی۔ بلّن خاموشی سے پلٹنے والا تھا کہ ٹھٹک گیا۔ بے بسی سے روتی ہوئی پاک دامن بی بی کا گھونگھٹ چہرے سے سرک گیا تھا۔ اس طرف روشنی ذرا کم تھی تو پاک دامن بی بی، بلّن کو نہیں دیکھ پائیں۔ وہ اپنی جگہ مبہوت سا کھڑا رہ گیا۔

"اتنے برسوں میں بلّن کو پہلی بار یہ یقین ہوا کہ توبہ کا در اس کے لئے بھی کھل سکتا ہے۔ صرف ذرا سی کوشش..... اس کوشش کی پہلی سیڑھی پہ اس ڈرائیور کو تلاش کرنا تھا، جو اس ایس ایچ او کے گھر ملازم تھا اور اب بھی وہیں پہ اس کی بیوی بچوں کی



خدمت کرتا تھا۔

بلّن کا حلیہ تو فقیروں سا ہی رہتا تھا اور اوپر سے ڈرائیور سے سوال جواب..... ڈرائیور کا اعتبار ڈانواڈول سا ہو گیا۔ اس نے بلّن کو پیر درویش سمجھ کر اپنے ناکردہ گناہ بخشوانے کے چکر میں یسریٰ کے فلیٹ کا ایڈریس بتا دیا، جہاں ابھی تک اکمل، یسریٰ کے پلٹ آنے کی اُمید کے ساتھ روز جیتا تھا۔

بلّن کہاں یسریٰ کی کہانی سے واقف تھا۔ اس نے ستارہ کا نام لے کر تصدیق چاہی اور اکمل تو اسی لمحے کی تلاش میں بھٹک رہا تھا۔ بلّن نے ستارہ سے اپنا تعلق، کوٹھے میں گزاری زندگی، ایس ایچ او والا واقعہ بتایا۔ اکمل کو اپنا آپ اتھاہ گہرائیوں میں گرتا محسوس ہوا۔ دوسری طرف اکمل کا ستارہ سے تعلق سن کر بلّن کو اپنی آخرت سنورتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ وہی اکمل کو دربار میں لایا تھا اور اس کے ساتھ اکمل کا واحد دوست دائم، جو ہر مشکل وقت میں اس کے ساتھ کندھا ملا کر کھڑا ہو جاتا۔ اس کے ساتھ گیا، دربار سے اسے کیسے واپس لایا گیا، یہ ایک الگ لمبی کہانی ہے۔ مگر کیا اتنا کافی نہیں ہے کہ وہ دو کمروں کے چھوٹے سے فلیٹ کے دائیں والا کمرہ، جو کبھی اکیلا اکمل کا ہوتا تھا، آج کی رات اس کمرے کے وسط میں بڑے بیڈ پر ریڈ کلر کا لہنگا زیبِ تن کئے یسریٰ، اکمل کی منتظر تھی۔

مگر یہ فیصلہ ذرا مشکل ہے کہ وہ ستارہ ہے۔ یسریٰ یا پاک دامن بی بی.....

دروازہ کھلا تھا۔ میرون رنگ کی شیروانی، جس کے کندھے پر گولڈن کلر کا نفیس سا کام تھا۔ ساتھ ہی گولڈن رنگ کا پاجامہ بلاشبہ اُس کی سفید، نکھری رنگت پہ بہت کھل رہا تھا۔ دروازے کا ہینڈل گھما کر وہ بیڈ پر اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ اس کی آہٹ محسوس کر کے وہ حیا سے سمٹ سی گئی تھی۔

آج رات میں کیسی جادوئی خوشبو تھی، جو اس کی نس نس کو معطر کر رہی تھی۔

"مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا۔" زیورات کے ساتھ، گلاب کی کلیوں سے سجا اس کا سنگھار دیکھ کر وہ مبہوت ہو گیا تھا۔ وہ خود بھی اسی کیفیت کا شکار تھی، دھیرے سے مزید جھکا گئی۔

"سر نہیں جھکاؤ، ورنہ منہ دکھائی نہیں ملے گی۔" اس کے سر جھکانے پر وہ ذرا تنک کر بولا۔ ابھی تو اس کی آنکھیں بھی سیر نہ ہو پائی تھیں۔ شرمگیں مسکراہٹ سے جھینپتے ہوئے اس نے سر کو تھوڑا سا اونچا کر لیا۔

"ہوں۔" وہ مسکراتا ہوا تھوڑا سا آگے ہو کر بیڈ کراؤن سے براؤن پیکٹ اٹھانے لگا۔

"یہ ہے تمہارا منہ دکھائی کا تحفہ۔" اس نے پیکٹ تھما دیا۔

"کیا ہے اس میں؟" وہ تھوڑی حیرت سے بولی۔

"اس فلیٹ کے کاغذات، جو تم میرے نام کر گئی تھیں۔ یہ پھر سے تمہارا ہے۔" اس نے وضاحت دی۔

"یہ تو سراسر دھاندلی ہے۔" وہ پیکٹ واپس اس کی گود میں رکھ کر ناراض ہو گئی۔

"دھاندلی کیسی؟"

"آپ نہ بھی کہیں تو یہ گھر میرا ہی ہے۔ چاہے آپ کے نام رہے یا میرے۔"

"اچھا، تو پھر یہ چلے گا؟" اس نے دراز سے بلیک مخملیں کیس نکالا، جس میں سونے کے جڑاؤ کنگن تھے۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر کلائی میں کنگن پہنانے تک وہ سر جھکائے شرم سے سرخ ہو چکی تھی۔

"تمہیں پتہ ہے، آج میں بہت خوش ہوں۔ کیونکہ آج کئی سالوں کے بعد مجھے یہ فلیٹ نہیں، گھر لگ رہا ہے۔ اور یہ گھر صرف تم سے ہے ستارہ!" اس کے حنائی ہاتھ میں بوسہ دیتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

مگر وہ اپنی جگہ ساکت سی رہ گئی تھی۔ اکمل کی طرف پہلی بار اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تھا اور جھکا نہ سکی تھی۔ ستارہ لفظ اس کے ذہن پر ہتھوڑے کے مانند برس رہا تھا۔ اس نے اپنا کپکپاتا ہاتھ چھڑانے کی سعی کی تھی۔ اور وہ اس کے دل کی کسک بھلا کیونکر نہ سمجھ پاتا۔

"تم نے خود ہی تو کہا تھا، یسریٰ مر گئی ہے اور اس یسریٰ سے تو میں نے صرف چھ ماہ محبت کی تھی۔ مگر ستارہ سے محبت میں نے پورے چھ سال کی ہے۔ میرے دل میں ستارہ کا پلڑا بھاری ہے۔ تو اب سے تم ستارہ ہو..... میری ستارہ۔" اس کی انگلیوں میں پڑی انگوٹھیوں سے کھیلتے ہوئے لاپروا سے انداز میں کتنی سچائی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر گالوں پہ بہہ گئے۔ معاً اس نے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"یار! روتی کیوں ہو؟..... اگلے سال یسریٰ آ جائے گی۔" اسے چھیڑتے ہوئے وہ بے اختیار ہوا تھا۔

"یسریٰ کہاں سے آ جائے گی؟" کاجل بھری آنکھوں میں حیرانی سمٹ آئی۔

"شادی کے بعد یسریٰ اور یاسر ہی آتے ہیں، تمہیں نہیں پتہ؟" وہ اتنی معصومیت



سے پوچھ رہا تھا کہ وہ شرمانا یا مسکرانا بھول کر اس کی مصنوعی سنجیدگی کو ہکا بکا دیکھ رہی تھی۔

"ایسے گھور کیوں رہی ہو؟ لوگوں کو اتنا فیض دیا تھا۔ میری ساڑھے چھ سالہ محبت کا اتنا بھی حق نہیں کہ تم مجھے....." وہ شرارتی انداز میں ہاتھ سے آگے بڑھا تھا۔ ستارہ نے دل سے مسکراتے ہوئے اس کے چوڑے سینے میں منہ چھپا دیا تھا۔ وہ اسے ایک دربار سے اٹھا کر اپنی محبت کے دربار میں لے آیا تھا۔

ایسے دربار میں، جس کی دہلیز پر ہی وہ سجدہ ریز ہو گئی تھی۔

(تمت بالخیر)